

میری جنت

فریادِ محو



ترتیب

- ۱- میری جنت 7
- ۲- میرے ماتھے پر بندیا سجادو 61
- ۳- پیشہ ہم پیشہ 133
- ۴- کس نے کھیل کھیلایا ہے 179
- ۵- بھول بھلیاں 219
- ۶- مستعار لی ہوئی مسکراہٹ 257
- ۷- پناہ گاہ 301
- ۸- سفید محل 343

تلاش کسی بھی ادیب اور مصنف کا تعارف اس کے اسلوب بیاں اور تحریر میں پنہاں ہوتا ہے اور پڑھنے والا آسانی سے اس کی شخصیت اس کے مزاج اور اس کے مطبع نظر کو سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی تحریروں میں اس کی مکمل شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ بھی کہ وہ اپنے پڑھنے والوں سے کس قسم کی تحریک کا متنبی ہے۔

زمانے، سوسائٹی، ورہ قوت کے کن پہلوؤں کن حالات پر اس کی نگاہ نرم ہے۔ کن پر سخت اور کس موڑ پر وہ سنجیدہ ہے اور کس پر غضب ناک..... جنہیں نہ کہ قلم آج رہرو کی مانند غلط اور صحیح سمتوں کی نشاندہی میں مصروف سبز رہنی ہے اور اپنے قارئین کو بھی ہمسفر بننے پر مجبور کر دیتی ہے جہاں اس کے سامنے زندگی کے نئے نئے واقعات اور تجربات کی دنیا ہوتی ہے۔ مسار ہٹوں اور قہربوں نے زمزمے ابلتے ہیں۔ دکھوں کی خوفناک گھٹیاں منہ کھولے کھڑی ہوتی ہیں، خوشبو کے لہلہاتے مرغزار اپنی طرف بلا تے ہیں۔ کچھ امتحانوں اور ایثار کے مرحلے بھی پیش رفت ہوتے ہیں اور یہ تمام چیزیں ایک واقعاتی زندگی سے ماوری نہیں ہوتیں۔ ہماری آپ کی اور تمام لوگوں کی زندگی کے لیے یہ کلیہ کوئی نیا نہیں۔

ہم جس ماحول، جس زمانے میں سانس لیتے ہیں ہماری تحریریں ہماری سوچیں بھی اسی رے عکاسی کرتی ہیں۔ اور میں سمجھتی ہوں ”اصلاح معاشرت“ کے سلسلے میں لوگوں کو — اچھائی، برائی سمجھانے کے لئے ”افسانہ نگاری“ اظہار کا ایک خوبصورت اور مؤثر طریقہ ہے بشرطیکہ اس میں سماجی اقدار کی نفی نہ ہو۔

”تلاش“۔ میرے منتخب افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو ملک کے بہت سے مشہور اور معروف ڈائجسٹوں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جنہیں قارئین نے بے حد پسند کیا۔ میں آپ کو بتاتی چلوں کہ میرا بنیادی تصور ”اصلاح معاشرہ“ ہے۔ اور میں نے زندگی کے ہر کردار۔ ہر موضوع پر خامہ فرسائی کی کوشش کی ہے۔

”محبت“ میری تحریک، میرا جذبہ اور عریانی میری نفی رہی ہے۔ ”محبت“ کے ہزاروں روپ، ہزاروں رنگ ہیں۔ ہر روپ، ہر رنگ۔ نے مجھے متاثر کیا ہے۔ وہ روپ جو مجھے ماں کی آغوش نے دیا۔ باپ کی شفقتوں میں نظر آیا، بھائی کی غیرت میں محسوس ہوا۔ وہ رنگ و فاجو عورت کی سرشت، محبوب کی محبت اور دھرتی کے شفاف سینے سے امرت کا چشمہ بن کر پھوٹا.....

میں نے انہی کرنوں سے اجالے اکتاب کیے۔ زندگی کی اندھیری گلیوں سے الفاظ کے موتی پئے۔ غم و راحت سے پیکر تراشے اور گونگے جذبوں کو زبان دی۔ جو کچھ بھی سوچا، جو بھی لکھا، جو بھی کہتی ہوں وہ میرے دل کی آواز ہے، میرے احساسات کا پرتو ہے۔

میں نے کوشش یہی کی ہے کہ میری تحریر میں مقصدیت کی روح زندہ رہے۔ حقیقی جدوجہد کا جذبہ کارفرما رہے۔ وہ مقصد وہ جذبہ جس کا حکم ہمیں ”الکتاب و سنت“ کی روشنی میں دیا گیا۔ یعنی ”سچائی و رحمت“ یہی دو چیزیں ازل سے انسان کی پوری زندگی پر محیط ہیں، جاہے سچائی ظلم و ناانصافی اور جھوٹ میں بدل جائے یا محبت، نفرت اور بے وفائی کا جامہ پہن لے ان کی اساس کبھی نہیں بدلے گی۔ ان کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ کیونکہ دنیا کی تمام برائیوں اور ساری اچھائیوں کا محور یہی دو چیزیں ہیں پھر اس کی نفی کا حق کس نے دیا؟ یہی دکھ، یہی اضطراب مجھے قلم فرسائی پر اکساتا ہے۔ یہی ”تلاش“ میری سوچوں کو نگر، صحر، صحرا اور گلشن گلشن لیے پھرتی ہے۔

مجھے وہ تحریریں بہت پسند ہیں جو محبت اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی اپیل کرتی ہوں جس میں لوگوں کو ان کے مقاصد زندگی اور انسانی حقوق کا احساس دلایا گیا ہو۔ رومانی افسانے ہوں تو اتنے صاف ستھرے، پاکیزہ کہ لڑکے اور لڑکیاں انہیں چھپ چھپ کر نہ پڑھیں جس میں تفریح و طبع کے ساتھ ساتھ حجاب اور شائستگی کا بھی خیال رکھا گیا ہو اور نئی نسل کے واسطے انسانیت کی تکمیل کا کوئی خوبصورت پیغام ہو اور ایسے ادیبوں اور مصنفین کو میں خراج تحسین پیش کرتی ہوں۔

مجھے سب سے زیادہ جس چیز نے مایوس کیا، وہ ہے ”عریاں نگاری“.....! ”عریاں نگاری“ میرے نزدیک کسی پوشیدہ اور ناکام جذبے کی تسکین کا اظہار ہے۔ ورنہ میں نہیں دنیا کی تمام نعمتوں اور نوازشوں میں اہل قلم ہونا انسان کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ قلم ایک امانت ہے جو آسمان سے دوایت ہوتی ہے تاکہ اسے مقصد حیات کی تکمیل اور شائستہ ادب کی نمائندگی کے لیے مشعل راہ بنائیں۔ اچھی سوچیں، خوبصورت خیالات دوسروں تک پہنچائیں۔ وہ باتیں وہ انداز فکر جو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کا سنگ میل رہی ہیں جو تاریک ذہنوں، تاریک راہوں کے لیے مینار، نور ثابت ہوئیں۔

یہی میری ”تلاش“ ہے۔

نور بانو محبوب

میرا جنت

”چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو“

وہ چیخ رہی تھی اور بار بار اپنا چہرہ چادر میں چھپا رہی تھی۔ مگر ملک و قوم کا وہ نام نہاد محافظ ایک ہاتھ سے اس کی نازک کلائی مضبوطی سے پکڑے کھینچ رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی سیاہ تلوار کی مانند کاٹ دار گھنی اور بڑی مونچھیں مروڑ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بھدے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر وہ اس کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے گھسیٹ کر اسے گاڑی تک لے گیا۔ جو اس لڑکی کی چیخ و پکار سن کر رک گئی تھی اور ایک جوان سنجیدہ چہرہ اپنی آنکھوں میں تشویش لیے اسے اپنی طرف آتا دیکھ رہا تھا۔

”اوائے جواناں گاڑی کا دروازہ کھول۔ ذرا تھانے تک جانا ہے۔“

وہ نو جوان بغیر کچھ کہے دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ ”کیا ہوا جناب۔ اس لڑکی نے کیا کیا ہے؟ کیوں لیے جا رہے ہیں اسے تھانے؟“

”اوائے تو کیا تھانے دار لگا ہوا ہے؟ خاموش رہ نہیں تو میں تجھے بھی اس کا ساتھی بنا کر لاک اپ میں بند کر دوں گا۔ زیادہ بک بک نہ کر۔ میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں۔“ اس نے بگڑے تیوروں سے کہا۔

وہ جوان مسکرایا۔ ”آپ یہ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں۔ آپ کا ساتھی یا اس کا ساتھی..... خیر چلیں ٹائم تو میرے پاس بھی نہیں ہے مگر اب تو مجھے چلنا ہی پڑے گا۔ آپ کی خاطر۔“ اس نے مسکرا کر کاسٹیشن سے کہا۔

لڑکی جو اپنا چہرہ چھپائے وحشت انگیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی دفعتاً اپنا ہاتھ چھڑا کر اس مہربان انسان کی طرف بھاگی۔

”صاحب جی مجھے تھانے نہ لے جائیں۔ میں ایک شریف لڑکی ہوں بدنام ہو جاؤں

گی۔ اس عذاب سے مجھے چھڑالیں۔“ اس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی شبنم ٹپکنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ وہ نوجوان ڈمگ گیا۔
 ”اوپاک دامن بی بی۔“ کانٹیل نے ایک ہاتھ اس کے جڑے پر مارا اور بولا۔
 ”ایسی ایسی شریف زادیاں میں نے بہت دیکھی ہیں رات کے اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی چل ادھر۔۔۔“ اس نے گاڑی کا دروازہ کھول کر لڑکی کو اندر دھکا دے دے دیا۔ اور وہ سسکتی ہوئی جلدی سے اپنی چادر ٹھیک کر کے کونے میں دیک گئی۔

وہ نوجوان بڑی ناگواری سے ستری بادشاہ کی یہ کارگزاری دیکھ رہا تھا، اس نے کار اشارت کر دی۔ اور کچھ دیر تیز چلنے کے بعد آہستگی سے رک گئی۔ تھانہ آ گیا تھا۔ گاڑی رکتے ہی وہ کانٹیل اپنی جگہ سے اٹھا مگر اس سے پہلے ہی وہ لڑکی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ نوجوان بھی اتر آیا۔ اس نے دھیرے سے لڑکی سے کہا۔ ”آپ گھبرائیے گا نہیں۔۔۔۔۔“

اس نے کھا جانے والی نظروں سے دونوں کو دیکھا اور لپک کر لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر تیز قدم اٹھاتا اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے وہ نوجوان بڑے آرام سے کار کی چابی انگلیوں میں گھماتا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اب وہ سپاہی لڑکی کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہو گیا تھا۔ باتوں کی تیز آواز اور جوتوں کی کھٹاپٹ سے انسپکٹر نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ سیاہ فام موٹے بھدے کانٹیل نے لڑکی کو آگے دھکا دیا اور خود کھٹ سے سلوٹ مار کر بولا۔
 ”سر۔۔۔۔۔ سر یہ لڑکی؟“

”کیا ہوا اس لڑکی کو۔۔۔۔۔؟“ انسپکٹر نے سامنے کھڑی سبھی لڑکی کی طرف دیکھا۔
 ”السلام علیکم۔“

ایک آواز آئی اور انسپکٹر کریم نے کھڑے ہو کر سلوٹ کیا۔ اور کچھ حیرانی سے بولا۔
 ”سر آپ۔۔۔ خیریت تو ہے۔“

”جی ہاں آپ کے عملے کی مستعدی اور فرض شناسی مجھے یہاں تک لے آئی۔“

اس سپاہی نے جو لڑکی کو گائے بکری کی طرح ہانک کر اپنے نمبر بڑھانے کے لیے لڑکی کے جرم کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے والا تھا ایک دم الرٹ ہو کر ہونٹ بھینچ لیے اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، دونوں بیٹھ گئے تو انسپکٹر کریم نے اس سے پوچھا۔
 ”یہ لڑکی کون ہے داؤر؟“

”مجھ سے پوچھیے۔ یہ کیا بتائے گا آپ کو؟“

”جی سر۔ آپ بتائیں یہ قصہ کیا ہے؟“

”ابھی تک تو کوئی قصہ کہانی نہیں بنا۔ ہاں آپ کے یہ داؤر صاحب بڑے ہنرمند

معلوم ہوتے ہیں۔ راہ چلتی لڑکیوں کو زبردستی تھانے لاکر اور کہانیاں گڑھ کر اپنا گراف اونچا کرتے ہیں۔ ذرا آپ ان سے پوچھیں کہ انہوں نے اس غریب لڑکی کا کیا جرم دیکھا تھا جو اسے زبردستی پکڑ لیا تھا وہ تو میں ادھر سے عام کپڑوں میں گزر رہا تھا، یہ مجھے پہچان نہ سکے اور میری گاڑی میں نہ صرف لڑکی کو بلکہ مجھے بھی یہ کہہ کر تھانے لے آئے کہ تم بھی اس کے ساتھی معلوم ہوتے ہو یہ ہے کارکردگی آپ لوگوں کی۔ اسی لیے پولیس بدنام ہوتی ہے۔“

”سوری سر۔ اسے تو میں لائن حاضر کر دوں گا، کیوں داؤر اس لڑکی کو کیوں یہاں پکڑ لایا ہے؟“

”سر۔ یہ بارہ بجے رات میں کہیں سے تنہا آ رہی تھی میں نے سوچا یہ لڑکی تنہا ہے یقیناً کوئی گڑبڑ ہے بس اسی شبے میں اسے یہاں لے آیا پوچھ گچھ کے لیے۔“

”تو کیا لڑکیاں کسی ضرورت سے تنہا باہر نہیں نکل سکتیں۔ کیا حکومت نے کوئی ایسا آرڈیننس پاس کیا ہوا ہے؟“

انسپکٹر کریم نے سخت نگاہوں سے داؤر کی طرف دیکھا وہ گڑبڑا کر بولا۔

”جی۔ جی سر۔ نو سر۔ غلطی ہو گئی۔“

”سوری سر۔۔۔۔۔“ انسپکٹر کریم نے کہا۔

”آپ بی بی کو لے جاسکتے ہیں اپنی گاڑی میں انہیں گھر پہنچا دیجئے۔ آئندہ ہم اس کا خیال رکھیں گے۔“

☆...☆...☆

وہ دوٹوں ساتھ ساتھ باہر نکلے۔

گاڑی کے پاس پہنچ کر نوجوان نے لڑکی سے کہا۔

”چلیے۔ میں آپ کو گھر پہنچا دوں آپ کا گھر کہاں ہے؟“

لڑکی کچھ نہیں بولی، اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ کچھ دور جا کر اس نے کہا۔

”بس آپ مجھے اس جگہ اتار دیجئے۔“

اس نے گاڑی روک لی۔ اور دونوں باہر آ گئے۔ وہاں دور ایک پسماندہ سی بستی تھی جس کے کچے نیم پختہ مکانوں اور جھونپڑیوں کے دروازوں پر ناٹ کے پردے جھول رہے تھے۔ ہوا میں عجیب سی بساندہ پھیلی ہوئی تھی۔

”یہ تو چھپوروں کی بستی معلوم ہوتی ہے۔ آپ یہاں رہتی ہیں۔“

”سر مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میری ایک درخواست ہے آپ سے۔“ لڑکی نے آہستگی سے کہا۔

”ماں ہاں کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”اگر میں آپ سے دوبارہ ملنا چاہوں۔ میرا مطلب ہے کسی قسم کی مدد درکار ہو آپ کی تو۔“

اس نے گھبرا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ لڑکی کی طرف بہ غور دیکھ رہا تھا۔

”کس قسم کی مدد آپ مجھ سے چاہتی ہیں؟“

”سر اس وقت میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ لڑکی نے پریشان ہو کر سر جھکا لیا۔

”ٹھیک ہے۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ اگر کبھی کسی وقت میری ضرورت پڑے تو اس پتے پر آ جانا۔“

”شکریہ سر.....“ اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔

وہ لمبے لمبے ڈنگ بھرتی۔ چادر میں چھپی بستی کی طرف جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گاڑی اشارت کردی اور سن سے گزر گیا۔ آگے جا کر اس بستی کے خدوخال اور نمایاں ہو گئے تھے۔ جگہ جگہ گندی نالیاں بہہ رہی تھیں وہ لڑکی اسے نہیں پتا کدھر چلی گئی تھی۔ اجلی اجلی رنگت کی دہلی پٹی اس لڑکی کی عمر مشکل سے بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔ جانے کیوں اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس بستی کی لڑکی نہیں تھی۔ پھر اسے اپنے اوپر غصہ آنے لگا کہ اس نے اس کا نام کیوں نہیں پوچھا؟

اس نے گاڑی موڑی اور دوسری طرف سے سڑک پر آ گیا۔

ابھی صبح کے نو بجے تھے کہ دھڑ دھڑ مین کا کزور دروازہ بجنے لگا۔

”ارے کون ہے ستیاناس جائے۔ کاہے کو دروازہ توڑے ڈالے ہو۔“

”چاچی۔ میں ہوں جیرا۔ دروازہ کھول۔“

وہ ہانپتی کانپتی گئی اور دروازہ کھول دیا۔ اور گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”وہ کہاں ہے چاچی شجہ؟“ جیرا غصے سے پھنکارتا ہوا بولا۔

”ارے بچہ۔ آہستہ بول وہ اندر ہے پر بات کیا ہوئی؟“

”آہ۔ کیسی بھولی بن رہی ہے چاچی۔ مجھ سے ایڈوانس لے کر تو نے مجھے الو بنایا۔ یہ تیرا ہی پڑھایا ہوا سبق ہوگا جو اس نے میرے ساتھ کیا ہے۔“

”ارے کچھ پھوٹ تو۔ آخر کیا ہوا؟“ چاچی خوف زدہ سی بولی۔

”جانتی ہے تو۔ اس نے مجھے اتنی زور سے دھکا دیا کہ پلنگ سے گرا اور میرا سر دیوار سے ٹکرا گیا۔ یہ دیکھ ڈھیروں خون سر سے بہہ گیا۔ اور وہ تیری لاڈلی بھاگ آئی۔“

”ارے یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ سچ تو ہے تیرے سر کی پٹی بھی لال ہو رہی ہے۔“

.....

”ہاں ہاں چاچی۔ اگر میں بھاگ نہ آتی تو اس نے تو مجھے کچا ہی نگل لیا ہوتا۔ ہڈیوں سمیت چرما جاتا مجھے۔ کیا تم نے اسی لیے وہاں بھیجا تھا۔ میری عزت اس کے ہاتھوں گروی رکھ دی تھی۔ وہ میرا جعلی ماما تو جانے کہاں مرکھپ گیا مجھے اس جہنم میں دھکیل کر۔“

پر میں اپنی عزت کا سودا نہیں کروں گی۔“ وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی چاچی نے جیرا کو جانے کا اشارہ کیا اور دروازہ بند کرنے کے بہانے اس کے پاس آ کر بولی۔

”اوائے تو زنا بھلا ہے اتنا غصہ گرمی ٹھیک نہیں کچھ دن ادھر نہ آؤ دو چار دن میں آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ میں تجھے بلالوں گی۔ کچھ گیانا رے؟“

”ہاں ہاں چاچی۔ مھک نہ کر۔ جیسا کہے گی ویسا کروں گا پر کسی اور سے نہ بات کر لچھو۔“

”اب چل ہٹ وہ کب کسی کو ہاتھ رکھنے دیوے ہے۔“

چاچی دروازہ بند کر کے اندر آ گئی۔ اور جھلنگا سی کھٹولی پر چپکے چپکے روتی ہوئی شجہ کو دیکھ کر پیار سے بولی۔

”اری شجہ۔ مت رو۔ جو ہوا اس پر خاک ڈال اور چل کر روٹی کھالے۔“

”خاک تو مجھ پر پڑ گئی چاچی۔ اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔ مجھے کچھ نہیں کھانا پینا۔“

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

”یہاں نہیں رہے گی تو کیا کوئی محل کھوٹی دیکھ لی ہے۔ بول کہاں جائے گی؟“ اس نے غصے میں بھبھک کر پوچھا۔

”پر یہ بات پلو میں باندھ لے کہ میں نے تجھ پر ہزاروں اٹھایا ہے۔ ایک ایک پائی وصول کروں گی، میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ تنتناتی ہوئی باہر نکل گئی۔

شجہ اسی جھلنگا سی کھٹولی پر اوندھی پڑی روتی رہی اور اس وقت ان دونوں کو کوستی رہی جب اس کی سیدھی سادی اور زمانے کی ستائی ہوئی ماں نے اپنے منہ بولے بھائی بشیرے کے ساتھ بنگلہ دیشی محصورین کمپ سے اچھے مستقبل اور روشن زندگی کی خاطر اسے پاکستان بھیج دیا تھا۔ بشیر ماما نے اس سے کہا تھا کہ وہ پاکستان میں ایک ادارہ چلا رہا ہے جہاں پر غریب نادار عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے گھروں جیسا تحفظ اور آرام میسر ہے۔ وہ کام بھی کرنی ہیں اور انہیں اجرت بھی ملتی ہے۔ وہاں پڑھائی کو تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ انہیں کام بھی سکھایا جاتا ہے۔ اور ان کے رشتے بھی کرائے جاتے ہیں۔ ہم نے اس طرح سینکڑوں لڑکیوں کے گھر آباد کیے..... بیچاری سیلہ بی بی آنکھیں بند کر کے اپنے منہ

بولے بھائی پر اعتبار کر لیا۔ وہ اس سے قبل بھی کیمپوں میں آتا جاتا تھا۔ اور کئی لڑکیوں کو وہ پاکستان بھیجوا چکا تھا۔ سلیمہ بی بی پر وہ کچھ زیادہ ہی مہربان رہتا تھا۔ جب آتا تھا تو کچھ کے لیے ریشمی کپڑے۔ لڑکیوں کے لیے آئی فیشنل جیولری اور سلیمہ بی بی کے لیے ساڑھی ضرور لاتا۔ اس طرح ان غریبوں کے دلوں میں اس نے جگہ بنائی تھی، کیوں کہ ان کی تلے اوپر چھ بیٹیاں تھیں.... اور بیٹیاں صرف ایک تھا۔ آہ کاش ہم پیدا ہوتے ہی مر جاتے۔

تھو سوچتے سوچتے بیتاب ہو کر اٹھ بیٹھی، ماضی کا ہر لمحہ اس کے سینے پر دودھاری تلوار کی مانند گزر رہا تھا۔ اس کا دل اس کی یادیں لہو لہو ہو رہی تھیں۔

ابا مزدوری کرتا تھا۔ ڈاب بیچتا تھا، کبھی ناریل کی سیکنس نکالتا اور کبھی بانس کی ٹوکریاں بناتا۔ اس کام میں بچے بھی لگ جاتے تھے۔ جب کام زیادہ ہوتا تو پیسے بھی زیادہ آتے اور اس دن ہماری لٹاں پچھلی کا شور بہ اور اُبلے ہوئے چاول پکاتی تھیں۔ یہ ہماری مرغوب غذا تھی، اور اس سڑی بسی جگہ پر جہاں گندگی اور زندگی شانہ بہ شانہ پلتی بڑھتی رہی تھی، اور سب اپنی اپنی کھال میں مست تھیں، تیسری بیٹی شجیہ تھی، اور اس سے چھوٹی تین بیٹیاں اور تھیں، جو ماں کے ساتھ محنت، مزدوری اور گھر داری میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ بشیرے نے تو چاہا تھا کہ تھو سے چھوٹی رفو بھی ساتھ میں چلے۔ مگر ابا اڑ گیا کہ یہ بہت چھوٹی ہے پہلے بڑی کا شور ٹھکانہ کر لو پھر یہ بھی چلی جائے گی۔

بشیرے کا وہاں پر بڑا رعب تھا۔ کئی لڑکیوں سے اس نے سلیمہ بی بی کو ملایا تھا جو پاکستان میں اچھی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ ان کے خاندان کے کچھ لوگ پاکستان میں رہتے تھے۔ اور ان کی اس نے کچھ مدد کر دی تھی۔ مگر یہ کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ بشیر لڑکیوں کی دلائی کرتا ہے، آتے وقت اس نے سارے پتے اور نام جعلی لکھوائے تھے، ادارے کا نام بھی جعلی تھا، لڑکیوں کو لانے کے چار چھ ماہ تک تو انہی پتوں پر خط و کتابت ہوتی رہتی۔ ایک دوسرے کی خیریت ملتی رہتی اس کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا جاتا۔ پھر کسی کو بھی کسی کی خبر نہ ہوتی۔ شجیہ کو کچھ دنوں تک وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں میں لیے لیے پھرا۔ خوب دعوتیں اڑائیں، تحفے تحائف ملے۔ گھومنا پھرنا۔ سیر و تفریح، شجیہ کا خوف جاتا رہا۔ ماں باپ کی دوری نے زیادہ پریشان نہ کیا۔ اس کے بعد بشیر اسے اپنی چاچی کے گھر لے آیا۔ یاد دوسرے معنوں میں اس نے تھو کو چاچی کے ہاتھ بیچ دیا۔ شجیہ کو کچھ خبر نہیں، وہ گھبرائی گھبرائی پھرنے لگی، وہ سارے خواب.....

وہ جنتیں.....

وہ نظارے.....

وہ مسکرائیں.....

وہ آسائیں.....

کہاں چلی گئی تھیں.....؟

جس کے لیے اس کا ماما اسے اس کی ماں کی آغوش سے چھین لایا تھا، اب وہ اتنی بھی چھوٹی نہ تھی جو ہوا کا رخ نہ سمجھتی، اس نے بھی پانچ جماعتیں پڑھی تھیں۔ ٹوٹا پھوٹا خط لکھ سکتی تھی، اخبار اور کتابیں پڑھ سکتی تھی، اس نے بہت چاہا کہ اپنے اوپر گزرنے والی پوری داستان الم لکھ کر ماں کو بھیج دے اور یہ بھی لکھ دے کہ ماں سب کو بتادے۔

منع کر دے.....

ہاتھ جوڑ کر.....

واسطہ دے کر.....

بنتی کر کے کہ خدارا بشیرے ماما جیسے وہاں جانے والے تمام ایجنٹوں۔ دلالوں۔

اور تمام منہ بولے ماما۔ چاچا۔ بابا۔ والے رشتوں کو آگ لگا دیں کہ کوئی اپنی معصوم بچیوں کا سودا نہ کرے۔

خون کے سینچے ہوئے اپنے چمن کی کوئی کٹی، کوئی پھول ان کی جھولی میں نہ ڈالے۔

ماں یہ ڈاکو ہیں عزتوں کے۔

قاتل ہیں پھول جیسی زندگیوں کے.....

یہ ماں اور بہنوں کی بولی لگانے والے وہ سفاک ہیں جو عذاب و ثواب کی حدوں سے نکل چکے ہیں، میری ماں، میری ماں.....

مجھے نہیں چاہیے یہ ہفتہ رنگ جھلملاتی زندگی۔

نہیں چاہیے سونے کا یہ لقمہ۔ جس کی خاطر تو نے اپنی گود سے نوج کر مجھے دوسروں کے حوالے کر دیا۔

مجھے سوکھی روٹی کا وہ ٹکڑا۔

ممتا بھری سوکھی باہوں کا وہ تحفظ دے دے جو مجھے دنیا کی ان حریص نگاہوں سے بچالے۔

جو اپنے دل کا حال لکھ کر ماں کو بھیج دیتی، جس کی منتظر آنکھیں بیٹی کی طرف سے کوئی اچھی خبر سننے کے لیے پھرائی جا رہی تھیں۔

کاش وہ پہلے ہی بشیرے ماما کی نیت کو بھانپ لیتی، کچھ تو اپنے بچاؤ کا سامان کر سکتی تھی۔ اب تو وہ نفس میں بند پرندے کی مانند پھڑ پھڑا کر رہ جاتی اور فرار کے راستے سوچتی رہتی تھی۔ چاچی کے پاس آ کر تو اس پر تازہ ہوا اور روشنی کے دروازے بھی بند ہو گئے تھے۔ بشیرے ماما کو پوچھتی تو وہ بھڑک کر جواب دیتی۔

”اوجھلی۔ کوئی تیرا ما۔ چا چا نہیں۔ وہ تجھے میرے ہاتھوں سوئپ کر ایک نیا شکار پھانسنے چلا گیا۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گا یہاں۔ مت اپنی زندگی اپنی جوانی برباد کر میرے راستوں پر چلے گی تو سکھ سے رہے گی، پھولوں میں کھیلے گی۔ ورنہ اسی کوٹھری میں پڑے پڑے سڑ جائے گی۔“

اور وہ ساری جان سے کانپ کر رہ جاتی۔

بشرے مچھلی جھینکے بیچنے لگتا۔ چاچی مجید اس کے مداحوں سے تھی وہ اس کے ذریعے ہر نیا اور پرانا مال سپلائی کرتی تھی۔ اور نہایت رازداری سے وہ اپنا کمیشن وصول کر لیتا تھا۔ کچھ ہی دن ہوئے جب بنگلہ دیش سے لائی ہوئی لڑکیوں اور چھوٹے لڑکوں کی ایک کھیپ وہ سمندر پار بھجوا چکی تھی اتفاق سے اسی دن اس کے ہاں پولیس کا چھاپہ پڑا۔ مگر پولیس کو سوائے شجیہ اور سونا کے کوئی لڑکی نہ ملی۔ چاچی نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا ہم انڈیا سے آئے ہیں۔ ورنہ پولیس تمہیں پکڑ کر لے جائے گی..... اور جب پولیس کے سپاہیوں نے ان سے پوچھ گچھ کی تو انہوں نے کہہ دیا۔

”ہم بھارت سے اپنے ماما کے ساتھ چاچی کے گھر آئے ہیں پاکستان دیکھئے۔“

پھر وہ لوگ بشرے کو ساتھ لے گئے شام تک وہ بھی آ گیا۔ معلوم نہیں کتنا دان دینا پڑا ہوگا اسے پولیس والوں کو۔ اس کے بعد بشرے پھر نظر نہ آیا۔ یہ باتیں بہت پہلے کی تھیں۔ پھر ایک دن پتا نہیں سونا کہاں چلی گئی شجیہ کو اس سے بڑی ڈھارس تھی اکیلے پن کا احساس نہیں تھا، بعض وقت دونوں اتنی گھبراہٹ تھیں کہ ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگتیں۔ وہ چٹا گنگ سے آئی تھی اور شجیہ ڈھا کہ سے۔ اور جب اسے سونا کا بستر خالی ملا تو جیسے کسی طوفان کی آمد کا اسے احساس بے چین کر گیا۔ قبل اس کے کہ وہ چاچی سے اس کے متعلق پوچھتی اس نے آ کر دھماکا کر دیا۔ بولی۔

”اوجھوری! چل نہا دھو کر یہ کپڑے پہن لے۔ آج رات تجھے ڈیرے پر جانا ہے۔“

مجید اس نے ریشمی گلابی جوڑے کا ڈبہ اس کے آگے ڈال دیا۔

”چاچی سونا کہاں ہے؟“ شجیہ نے اس کی باتوں پر دھیان دیے بغیر پوچھا۔

”تو کیوں پوچھتی ہے ری۔ سونا سناری کا ہوتا ہے اوہی اس کی چمک دمک اور قدر قیمت جانتا ہے سو میں نے سناری کے ہاتھوں میں سونا کو دے دیا۔ وہ بہت خوش ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تجھے بھی کسی قدر دان کے سپرد کر دوں عیش کرے گی۔“

اس کی سماعت میں ان الفاظ نے آگ لگا دی اور وہ گھبرا کر چیخ پڑی۔

”نہیں۔ نہیں چاچی۔“ اس نے روتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”مجھے یہیں رکھ لے چاچی۔ اپنے پاس میں تیری خدمت کروں گی، تیرے ہاتھ پاؤں دباؤں گی۔ اپنی بیٹی بنا لے مجھے۔ نہیں نہ بیچ چاچی۔“ وہ اس کے پاؤں پکڑ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

”چل ہٹ پرے۔“ مجید اس نے اپنا پاؤں چھڑاتے ہوئے نخوت سے کہا۔

”گھوڑا گھاس دانے سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا۔ میری خدمت کرنے کو مارتی

کیا کم ہے۔ اپنی پوری جوانی میرے پاس بتا دی۔ اب بڑھاپے میں کہاں جائے گی۔ مجھے کسی اور کی ضرورت بھی نہیں زیادہ شور نہ مچا اور جلدی سے تیار ہو جا۔“

یہ کہہ کر وہ مفلکتی ہوئی چلی گئی۔ ☆.....☆.....☆

شجیہ اجلی اجلی رنگت کی نوخیز کلی تھی لمبی دہلی پتی، لمبے سیاہ بال۔ بڑی بڑی آنکھیں، اور حد درجہ معصوم چہرہ وہ اپنے اوپر اٹھنے والی ہر اچھی بری نگاہ کو خوب سمجھتی تھی۔ بن ٹھن کر کسی

ڈیرے پر جانے کا مطلب بھی جانتی تھی جب سے سونا سناری کی ہوئی اسے ہر لمحہ اپنے ارد گرد خوف کی پرچھائیاں منڈلاتی نظر آنے لگیں بارہا وہ کعبہ دل میں سجدہ ریز رہی۔

اپنے خدا سے پناہ کی درخواست کی۔ بلک بلک کر اپنے لیے عافیت اور نیکی کے راستے مانگے۔ اور اب وہ یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ یہ نقد جاں۔ عزت جیسے اصول رتن پر ہزار بار قربان کی جاسکتی تھی۔ اس کے پاس تھا بھی کیا اس کے سوا.....!

بعض وقت اسے حیرت ہوتی تھی یہ دیکھ کر یہ سوچ کر کہ چاچی مجید اس بھی ایک عورت تھی اس کی اگر کوئی بیٹی ہوتی تو وہ سونا، اور شجیہ جیسی ہی معلوم ہوتی۔ پھر اس میں یہ سنگدل کہاں سے آئی؟

ایک دن اسے پارٹی نے بتایا۔

”ادھیڑ عمر کی یہ عورت بڑی مظلوم ہے تجو بچی۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اس چہرے کے پیچھے کون سا پرفریب اور مکار چہرہ کام کر رہا ہے۔ جوانی میں وہ بیوہ ہو گئی تھی اور برے لوگوں کے تھے چڑھ گئی تب ہی سے اس نے اپنے آپ کو بدل ڈالا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا اور جب کوئی بدی کی فصل کاٹتا ہے تو اس کے دل سے خوف خدا اور انسانیت کی شرم ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی بیٹی یا بیٹا ہوتا تو شاید کچھ لاج آتی۔ لیکن اب تو وہ شیطان کے کان کترتی ہے۔“ دو چار مہینے کے بعد پولیس کا چھاپہ محض خانہ پڑی کے لیے ہوتا ہے۔ یہ بھی گویا ایک اخلاقی اور قومی فریضہ تھا جو دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ادا کیا جاتا تھا۔ ورنہ نیچے سے اوپر تک۔

درجہ بدرجہ۔

کسی عنوان۔

کسی ضابطے کے تحت یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔

کوئی چہرہ اصل چہرہ.....

کوئی ہاتھ اپنا ہاتھ نہ تھا۔

ایمان....

نیکی....

انصاف....

رحم اور شرافت کی باتیں کرنے والوں کے نصیب میں ہمیشہ پھانسی کا پھندا رہا تھا۔ اور اب بھی وہ سلسلہ جاری تھا۔ شجیہ اور سونا جیسی ان گنت نوخیز کلیاں باؤسوم کے جھونکوں سے جھلس کر رہ گئی تھیں۔ گلستان اجاڑے جا رہے تھے اور پھولوں سے خالی شاخیں نوحہ کنال تھیں۔ ہوا میں ان کی خوشبوؤں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس رات وہ پہلی بار دُھن بنی تھی۔

اپنی مرضی کے خلاف اس نے وہ ریڈی میڈ ریشمی گلابی جوڑا پہنا تھا۔ جو بہت ہی معمولی کپڑے کا تھا زیور اور پھولوں سے بے نیاز دُھن۔

اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا.... ارے یہ دُھن ہے؟

”کیا دُھنیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں؟“ اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ اس نے اپنی بڑی بہن رانی کو بھی دُھن بننے دیکھا تھا۔

ہلکی بنارس سبز ساری میں موتیوں اور سونے کے ہلکے پھلکے زیورات۔ اور سستے قسم کی لپ اسٹک پاؤڈر میں بھی اس کے چہرے پر کتنی رونق۔ کتنا روپ اور آنکھوں میں کتنی جیا تھی کیا صرف بھاری زیورات، قیمتی جھلملاتے لباس اور بیونی بارلر ہی سے دُھنیں جیتی ہیں؟ نہیں بلکہ سادگی، معصومیت اور شرم و حیا دُھن کا سب سے قیمتی سنگار ہوتا ہے اس کی بہن رانی کا روپ آج بھی اس کی پلکوں میں قید تھا جو اس وقت آنسوؤں کے بے تحاشا ریلے میں دھل دھل کر اور نکھر گیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہے چھوری۔ اور یہ ٹسوے کس خوشی میں بہائے جا رہے ہیں کم بخت نے سارا پاؤڈر بھادیا، چل صاف کرا سے۔“ چاچی نے رومال دے کر اسے ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔

”چاچی تو مجھے کہاں بھیج رہی ہے؟“ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”اوو۔ ایک تو یہ لڑکی بال میں کھال نکالے ہے۔ اری دیکھ جیرا کب سے پیچھے پڑا ہے۔“

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ گھبرا کر چیخ پڑی۔

”تو مجھے اس بھیڑیے کے بھٹ میں بھیج رہی ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ چاچی میرا لگا

کاٹ دے پھری سے۔ مجھے مار ڈال....“ وہ دیوار سے سر نکا کر رو پڑی۔

”اری چھوری۔ تو اپنا دل نہ میلا کر۔“ چاچی نے اس کے آنسو پونچھ کر نرمی سے کہا۔

”وہ بھیڑیے کا بھٹ نہیں تیری جنت ہے اگر بات بن گئی تو تیرا نکاح اس سے

بڑھادوں گی۔ عیش کرے گی۔ میں کوئی تیری دشمن تھوڑی ہوں، چل آنسو پونچھ لے۔

گنگو تجھے لینے کے لیے آیا بیٹھا ہے۔“

”اٹھ چل شام باش۔“ وہ خوشامد پر اتر آئی۔ اور اس پر کالی چادر ڈال دی۔ اب وہ مکمل

طور پر گھر چکی تھی، نہ آگے جاسکتی تھی نہ پیچھے۔ سکتی تھی، دل میں اس نے ایک بار پھر اپنے

آپ سے کیا ہوا عہد دہرایا۔ اور چادر اچھی طرح لپیٹ کر اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی گنگو کے

پیچھے چلنے لگی۔

☆.....☆.....☆

رات کے دس بجے تھے۔

بستی پر ویرانی چھائی ہوئی تھی، جبرائیل اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا، آج اس

نے سلک کا کرتا اور ریشمی سرخ باڈر کی لنگی پہنی ہوئی تھی، بالوں میں اتنا تیل چڑھایا تھا کہ وہ

پیشانی تک بہہ آیا تھا جیسے وہ بار بار ہاتھ سے صاف کر رہا تھا، آج اس کی زندگی کی سب

سے خوب صورت رات تھی، اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے کتنے پاؤ بیلے تھے۔

چاچی مجیداں کی خوشامدی کی تھیں۔ اس رات کی بھاری قیمت ادا کی تھی۔

”تجو کا تصور کر کے اس کے اندر میٹھی میٹھی لہریں سی اٹھنے لگیں، آنکھوں میں نشہ سا ٹوٹنے

لگا۔ خیالوں خیالوں میں اس نے تجو کو پھولوں کی بیج پر دُھن بننے دیکھا جو سرخ زرتار

گھونگھٹ میں مسکرا رہی تھی، صرف گھونگھٹ اٹھانے کی دیر تھی، اتنے میں دھڑ سے دروازہ

کھلا اور گنگو اوندھے منہ جیرے کے قدموں میں آ کر گرا اسی دم کسی نے باہر سے زنجیر

چڑھادی۔

”ک۔ کون، کون ہے؟“ جیرا گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

اور وحشت انگیز ہنگاموں سے بند دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ گنگو کراہتا ہوا اٹھا۔

”مالک۔ وہ چلی گئی۔ اس نے مجھے دھکا دے کر باہر سے کنڈی چڑھادی۔“

”کون چلی گئی؟“

”وہی آپ کی تجو رانی، چاچی نے اسے میرے ساتھ کر دیا تھا پر وہ جُل دے کر چلی

گئی۔“

جیرے نے ایک زور کی ٹھوکر اسے ماری، نہایت غلیظ گالی دی، اور گریبان پکڑ کر ایک تھپڑ رسید کیا۔ اور غصے میں کف اڑاتا ہوا بولا۔

”اونگور کی اولاد۔ وہ کوئی چڑیا تھی جو تیری مٹھی میں آ کر اڑ گئی۔ بول۔“ پھر اس نے گھونسوں، لاتوں اور تھپڑوں سے اس کی تواضع شروع کر دی اور گنگو بڑی طرح چیخنے چلانے لگا۔

”مالک معاف کر دو۔ میں بن ماں باپ کا بچہ ہوں، اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“

”ہرگز تجھے معاف نہیں کروں گا۔ ایک جیتی جاگتی چھوری تیرے ساتھ چل رہی تھی تیرا بس نہ چلا، اور وہ تیری آنکھوں میں دھول جھونک گئی۔“ اس نے پھر ٹھوکروں پر اسے رکھ لیا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر پڑوس سے جیرے کا ساتھی دوڑا ہوا آیا۔ باہر سے زنجیر لگی دیکھی تو جلدی سے ٹھول کر اندر آ گیا۔

دہائی ہے باؤ مجھے بچالے۔“ گنگو گڑ گڑایا۔

”کیا ہوا جیرے گنگو کیوں چیخ رہا ہے۔ اسے کیا ہوا؟“

”میں اس کا قیمہ بنا کر کھاؤں گا۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”ارے یا، قیمہ ہی کیا کھانا ہے تو نیل گائے کا کھان۔ ہرن یا مرغی کا کھان۔ اس صحرائی بھینسے کا قیمہ؟ لاحول و لا قوتہ کیوں اپنے منہ اور پیٹ کا دشمن بنا ہوا ہے، چل چھوڑ اسے اور بتا قصہ کیا ہے؟“ شیدے نے گنگو کو جانے کا اشارہ کیا اور وہ بجلی کی مانند اٹھا اور باہر دوڑ گیا، تب جیرے نے بتایا کہ سالے نے پنجرے میں آیا ہوا پچھی اڑا دیا۔ کتنے مہینوں میں چاچی مجیداں کی خدمت کر رہا تھا۔ آج اس نے اسے پوٹ پھسلا کر بھیجا بھی تو اس نے کام خراب کر دیا اور وہ بھاگ گئی۔

”اچھا خیر، اپنا موڈ ٹھیک کر۔ وہ نہیں اور سہی، تیرے لیے چھوری کی کوئی کمی نہیں، اور مل جائے گی پھر اس بیچارے کو کیوں مفت میں ڈر رہا تھا، بے دام کا غلام مل گیا ہے نا تجھے۔ اگر چلا گیا تو یہ پچھی اور لالچ کا کام کون کرے گا؟“

”خیر۔ میں چاچی کو تو ضرور سبق سکھاؤں گا۔“ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح دھسکی پرا تر آیا۔

”اب اس میں چاچی کا کیا دوش، وہ لونڈا باہی جب نہ چاہے تو چاچی کیا کرے گی۔“ شیدے نے اسے بہلایا اور سمجھا بھجا کر آرام کی تلقین کر کے چلا گیا، مگر جیرے نے وہ پوری رات کانٹوں میں بسر کی۔

شجر نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے، وہ پیچھے تھی اور گنگو آگے جیسے ہی دروازہ اس نے کھولا تو شجر کو موقع مل گیا اور ایک ہی وار میں وہ اندر تھا اس نے تیزی سے باہر سے

کنڈی چڑھادی تاکہ کوئی اس کا پیچھا نہ کر سکے، اس سے نجات مل گئی پر علاقے کے سنتری نے اسے پکڑ لیا۔ اس کے جسم پر پولیس کی وردی، ہاتھ موٹا سا ڈنڈا دیکھ کر شجر کی جان نکل گئی۔ اس نے لاکھ اس کے ہاتھ جوڑے اور کہا۔

”میں شریف لڑکی ہوں، گھر جا رہی ہوں، تم مجھے کیوں پکڑتے ہو؟“

مگر مفت میں ہاتھ آیا ہوا مال کون چھوڑتا ہے۔ وہ تو اللہ نے شاید اسے بچانا تھا تب ہی وہ ڈی ایس پی فرشتہ بن کر آ گیا۔ اور ایک بار پھر وہ مرتے مرتے زندہ ہو گئی۔ قدرت نے اسے دوبارہ لٹتے لٹتے بچالیا تھا، معلوم نہیں زندگی اور موت کا یہ کھیل کب تک جاری رہتا ہے۔۔۔ اس نے سوچا اور ایک بار پھر تقدیر اسے اسی دہلیز پر لے آئی جہاں سے وہ عہد کر کے نکلی تھی کہ اب جیتے جی یہاں نہیں آئے گی، ابھی تو آدھی رات باقی تھی، اس نے اپنے پیچھے تاریکی اور ویران سناٹوں کو لپکتے دیکھا تو ڈر کر دروازے سے چٹ گئی۔ جی چاہا یہاں سے دور چل جائے۔ مگر اتنی بڑی دنیا میں اس کی کوئی جائے پناہ نہ تھی، کوئی اپنا نہیں تھا، سوائے اس در کے۔ اب جو بھی ہو۔ ڈوبتے کو تنکے کا یہی سہارا تھا اس نے ٹھہرا کر دروازے پر ہاتھ مارا۔

چاچی بڑی ہوشیار نیند سوتی تھی، کھٹکی کی آواز سن کر اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ اپنی دانست میں وہ کامیاب لوٹی تھی، وہ مسکرائی۔

”بڑی جلدی آ گئی۔ اسکیلی آئی ہے؟“

”گنگو چھوڑ گیا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ جلدی سے اپنی کوٹھری میں گھس گئی۔

چاچی بھی نیند میں ڈوبی ہوئی تھی، لیٹ کر پھر بے سدھ ہو گئی، مگر شجر کو نیند کہاں؟ وہ تمام رات یہی سوچتی رہی کہ آخر وہ ان بھڑیوں سے کب تک بچتی رہے گی، نہ کوئی سائبان نہ در۔ نہ چار دیواری، کھلے صحرا میں وہ بے یار و مددگار کھڑی تھی، سر پر آگ، اگلتا آسمان، قدموں تلے کانٹوں کا فرش، حدنگاہ تک پھیلتا ہوا ایک سراب تھا جس کی نہ کوئی تھا تھی نہ حد۔۔۔ وہ کیا کرے گی۔ کہاں جائے گی؟

روتی سسکتی جانے کب وہ سو گئی۔ اور کب تک سوتی رہی، چاچی بھی مطمئن تھی کہ بیچاری تنہی ہوئی ہے، اچھا ہے سولے، مگر جب دن چڑھے جیرا بولائے ہوئے کتے کی مانند اس کے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا تو چاچی گھبرا گئی۔ تب اسے پتا چلا کہ شجر جیسی گئی تھی ویسی ہی واپس آ گئی۔ اس کا تو بال بھی بیکانہ کیا لیکن کب تک؟ اس نے اٹھ کر غصے میں روتی کی طرح اسے دبا کر رکھ دیا۔ وہ چاچی سے پتی رہی۔ روتی رہی، اور اس سے لپٹ لپٹ کر یہی کہتی رہی۔

”چاچی تو مجھے مار ڈال۔ پر مجھے کہیں نہ بھیج۔ اپنی بیٹی بنا لے مجھے۔ یا پھر گڑھا کھود کر

آگئی تھی کہ میں بچ گئی، لیکن ایس بی صاحب اس نگر نگر پھیلے ہوئے انسان نما درندوں سے میں کہاں تک بھاگتی رہوں گی، مجھے پناہ چاہیے....“ اس نے اپنا چہرہ چادر میں چھپالیا، ظفر ایوب نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا ”شجہ تمہارے حالات سن کر واقعی مجھے بہت ڈکھ ہوا۔ میں ضرور تمہارے لیے کچھ کروں گا۔“ اس نے ایک سپاہی کو پانی لانے کے لیے کہا، اس کے حکم کی فوراً تعمیل ہوئی، اور پانی کا گلاس اس نے شجیہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ ظفر ایوب نے کہا۔

”آؤ میرے ساتھ....“

وہ پانی بی کو اپنی چادر سنبھالتی ہوئی اٹھی اور اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ ظفر ایوب اسے مسز رحمن عظیمی کے آفس لے گیا، وہ ایک ادارہ چلاتی تھیں جس میں بے سہارا، یتیم لڑکیوں، بیوہ عورتوں کے علاوہ بھی غریب خواتین کام کر کے اپنی روزی کماتی تھیں بے گھر عورتوں اور لڑکیوں کے لیے ادارے سے ملحق ہوٹل تھا، جہاں ان کے لیے ہر قسم کی مراعات حاصل تھیں اور ان کے لیے سیکورٹی فورس کا باقاعدہ انتظام بھی تھا، ظفر ایوب نے انہیں مختصر آبتایا۔

”ہزاروں بنگلہ دیشتی اور غیر ملکی بے سہارا لڑکیوں، عورتوں کی طرح یہ بھی انہی مہذب درندوں کا شکار ہے۔ جسے خوب صورت زندگی اور ایک آسودہ گھر کا خواب دکھا کر پاکستان اسمگل کیا گیا، مگر یہاں لا کر انہوں نے اپنے گھٹیا عزائم اور ذات پر اسے قربان کرنا چاہا، جب اسے ان کے مذموم ارادوں کا پتا چلا تو یہ فرار ہو گئی۔ تقدیر مہربان تھی کہ میں اسے مل گیا۔ اسے پناہ کی تلاش تھی اور آپ کی شفیق آغوش سے بڑھ کر مجھے اور کوئی پناہ گاہ نظر نہ آئی اس لیے انہیں لے کر حاضر ہو گیا، بیگم صاحبہ آپ اس کے سر پر ہاتھ رکھیں گی تو اس کو اپنی پچھڑی ہوئی ماں اور پچھڑے ہوئے گھر کا غم بھول جائے گا۔ اور یہ ایک بہت بڑی نیکی ہوگی۔“ مسز رحمن عظیمی بڑے پیار سے شجیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پھولوں کی گدازیت سے بولیں۔

یہاں پر رہنے والی ہر لڑکی، ہر عورت کی میں ماں ہوں اور یہ سب میرے خاندان کی طرح رہتے ہیں، بیٹی تھیں بھی یہاں کوئی تشنگی، کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی۔“ پھر انہوں نے ظفر ایوب کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اور میرے ادارے کو عزت دی، انشاء اللہ آپ اپنے فیصلے پر کبھی نہیں پچھتا میں گے۔“

”بیگم صاحبہ۔ اچھا بیوی اور محبتوں کی خوشبودار سے انسان کو کھینچ لیتی ہے، سو میں بھی اس خوشبو کے تعاقب میں چلا آیا۔“ ظفر ایوب نے ہنس کر مسز رحمن کی طرف دیکھا، اور کھڑا ہو گیا.... جاتے جاتے وہ شجیہ کی طرف مڑا۔

”جی ماں ڈی ایس بی صاحب، میں آپ کی مشکور ہوں کہ آپ کی عنایت سے میں نے ایک مکمل گھر کا سا سکون پایا، جہاں ماں کا پیار بھی ہے۔ اور بہنوں کی محبت بھی۔“ مسز رحمن نے اسے ایک بار پھر گلے سے لگالیا۔ اور ہنس کر بولیں۔

”یقیناً یہ بچی میرے ادارے کے لیے نیک شگون ثابت ہوگی انشاء اللہ۔“

پھر لمحے.... دنوں میں اور مہینے سالوں میں ڈھلتے گئے اور اسی تیزی سے شجیہ تعلیم و تربیت کے مراحل طے کرتی گئی۔ مسز رحمن عظیمی نے کچھڑ میں آلودہ ہیرے کو اٹھا کر اسے کسی شہنشاہ کے تاج یا کسی قدردان کی انگشتی میں جڑنے کے قابل بنادیا تھا۔ اس کی آب و تاب نے شجیہ کی زندگی کے تمام خفیہ گوشے منور کر دیے تھے۔ اب وہ پہلی جیسی ڈری سہی زرد روشنی نہیں تھی بلکہ ہمہ آفتاب بن چکی تھی۔ اس نے دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھ لیا تھا اور اپنے آپ کو وقت کے جدید تقاضوں میں سمولیا تھا۔ اب زمانے کے ساتھ چلنا اس کے لیے دشوار نہیں رہا تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب منیر رحمن کی محنت، شفقت اور شجیہ کی ذہانت نے گلستان کھلا دیے جس کی خوشبو ہر سو پھیل گئی۔

☆.....☆.....☆

”مس شجیہ مراد علی، آپ کو بی ایس سی کی اعزازی ڈگری اور گولڈ میڈل مبارک ہو۔“ شجیہ نے نہایت اعتماد اور وقار سے تھوڑا سرخم کر کے وہ ڈگری وائس چانسلر سر شوکت حیات کے ہاتھ سے لے کر شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے گولڈ میڈل اس کی خوب صورت گردن میں ڈالتے ہوئے پھر مبارک باد دی۔ اور وہ بے انتہا تالیوں کی گونج میں ڈائس سے اتر آئی، سب نے اسے گھیر لیا۔ مسز رحمن نے دونوں ہاں پھیلا دیں اور وہ ان میں سمٹ آئی، انہوں نے اس کی پیشانی کو چوما۔ مبارک باد دی اور بولیں۔

”شجیہ آج تک ہمارے ادارے کی کسی لڑکی نے یہ اعزاز حاصل نہیں کیا، جو تمہیں ملا ہے صوبے بھر میں ٹاپ کر کے تم نے میرا اور میرے ادارے کا وقار بڑھا دیا۔“ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

”شکریہ ماں۔ یہ سب آپ کی محبتوں اور پیار کا اعجاز تھا، ورنہ“ من آئم کہ من دائم....“ ”نہیں شجیہ۔ اس میں تمہاری محنتوں، تمہارے ارادوں اور تمہاری ذہانت کا بڑا کمال ہے ورنہ میں سمجھتی ہوں کہ میرے لیے ہر لڑکی قابل توجہ تھی تمہاری طرح، میں نے دیانت داری سے سب کو پورا وقت دیا تھا، اب یہ بات اور تھی کہ کسی نے تمہاری طرح اپنے کو منوالیا ہو۔“

یہ میری خوش نصیبی اور آپ کی قدر افزائی ہے ماں۔“ اس نے دوبارہ ان کے سامنے سرخم کر کے تعظیم دی۔ اور انہوں نے اس کی پشت پیار سے تھپتھپائی، پھر سب لڑکیوں نے

اور اس کے سحر انگیز تشخص کے گرویدہ تھے۔ اور مام کا یہ اصرار تھا کہ وہ اپنا ماضی بھول جائے۔

”مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے مام۔ کیا اعلیٰ اسٹیشن رکھنے والے تعلیم یافتہ لوگ میرے خاندانی بیک گراؤنڈ کے متعلق نہیں سوچیں گے؟“ وہ پریشان ہو کر مسز رحمن کی طرف دیکھنے لگتی۔

”سب کچھ ہو سکتا ہے بیٹی.....“ انھوں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔
 ”جب ماضی کے دروازے بند ہوں گے تو خاندانی بیک گراؤنڈ کا دروازہ کون کھولے گا؟“

”میری ہدایت میری نصیحتوں کو آنچل میں باندھ لو یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔“ وہ مسز رحمن کو اپنا نجات دہندہ سمجھتی تھی ان کی کسی بات کو ٹالنا اس کے لیے بڑا مشکل تھا اس نے ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

☆.....☆.....☆

جب قدرت کسی کو نوازنا چاہتی ہے تو وہ ایسے حالات اور وسائل پیدا کر دیتی ہے، شجیہ مراد علی کے ساتھ جتنی زیادتیاں جتنے ظلم توڑے گئے تھے اسے اپنوں سے جدا کر کے۔ اس کا اب ازالہ ہو رہا تھا۔ اس کے ایک ایک آنسو کے بدلے۔ اس کی راہوں میں ستارے بچھ گئے تھے اور اسے اس مقام تک لانے والی مسز رحمن عظمیٰ تھیں۔ اس لیے جب ملک کے مشہور بزنس مین سہیل انصاری نے اسے بیٹے جمیل انصاری کے لیے شجیہ مراد علی کا رشتہ مانگا تو انہیں خوشی تو ضرور ہوئی مگر حیرت بالکل نہ ہوئی۔ کیوں کہ شجیہ وہ نگینہ تھی جسے کسی کے بھی ایوان دل میں جڑا جاسکتا تھا، منیر رحمن عظمیٰ صرف سیٹھ صاحب کی پیشکش پر مسکرا کر رہ گئیں اور پارٹی ختم ہونے کے بعد انہوں نے سہیل انصاری کو آفس میں طلب کر لیا۔

”سہیل صاحب۔ آپ نے یہ انتخاب سوچ سمجھ کر کیا ہے؟“ وہ بغیر تہدید کے بولیں۔
 ”مسز رحمن۔ یہ میرا نہیں میرے بیٹے کا انتخاب ہے زندگی اسے گزارنی ہے میں اسے ہر صورت میں خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کی خوشی میری خوشی ہے۔“

”آپ کو پتا ہے کہ دارالامان اور ”نیشن“ جیسے اداروں میں کس قسم کی لڑکیاں آتی ہیں؟“

”میں جانتا ہوں مسز رحمن۔“ وہ مسکرائے۔

”پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں پر آنے والی ہر لڑکی ہر عورت اپنے ماضی سے نہیں حال اور مستقبل سے بچپانی جاتی ہے۔ یہ ہماری تربیت کا پہلا اصول ہے اسی

باری باری اسے گلے سے لگا کر مبارک باد دی۔ پھر کچھ دنوں بعد مسز رحمن عظمیٰ نے اس خوشی میں ایک پارٹی ترتیب دی۔ اس میں ملک کے کچھ مخیر حضرات بزنس مین اور کچھ سماجی کارکن بھی شریک ہوئے۔ اس میں سہیل انصاری کے صاحبزادے جمیل انصاری بھی مدعو تھے جو حال ہی میں جاپان سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی اعلیٰ ڈگری لے کر آئے تھے اور انہوں نے کاروں کا ایک شوروم قائم کیا تھا، وہ ایک جوان فکر اور خوب صورت پر سنائی کے ایک ذہین نوجوان تھے۔ ان کی نگاہیں برابر شجیہ مراد علی کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں پسندیدگی کا عنصر غالب تھا، شجیہ نے قابل توجہ رنگ روپ نکالا تھا، سنہری گندم جیسی رنگت گلابی ہو گئی تھی بڑی بڑی آنکھوں میں بنگال کا جادو بول رہا تھا، لمبی ڈبلی پتلی شجیہ اب قیامت بن گئی تھی، مگر اسے اپنے حشر برپا کر دینے والے حسن کا قطعی احساس نہیں تھا، وہ پہلی جیسی سنجیدہ اور سادگی پسند تھی، اظہار میں وہی برجستگی تھی، مسز رحمن کی پسند کا سبز گلابی امبریل سوٹ اس پر سج کر رہ گیا تھا، اس پر ننھی ننھی فریاں پڑی ہوئی تھیں..... کا مدانی کے بڑے سے دوپٹے میں اس کا چاند سا چہرہ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ گھنے سیاہ بالوں کی لمبی سی چوٹی اس کی پشت پر پڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی ہم جولیوں کے ساتھ پورے انتظامات کا جائزہ لیا اور واپس چلی گئی، اس نے بھی کسی لڑکے کی طرف نگاہ بھر کر نہیں دیکھا، اپنا مستقبل سنوارنے اور اپنے غیر دلچسپ ماضی کو دفن کر دینے کے لیے کتنی جدوجہد کی تھی آج اس کا خوشگوار حال اس کے تائیناک مستقبل کی نشاندہی کر رہا تھا۔ مگر ماضی تو انسان کی شناخت ہوتا ہے اسے نہ تو دفن کیا جاسکتا ہے نہ بھلایا جاسکتا ہے، سو روزِ اول کی طرح آج بھی وہ اپنے آپ کو اسی بد حال اور تعفن زدہ ماضی میں چلتا پھرتا پریشان دیکھ رہی تھی ہزار آنکھیں بند کرتی۔ ذہن کو جھٹکتی مگر کسی روزن، کسی کھڑکی دریتے سے اس کا ماضی جھانکنے لگتا، اور وہ بے بس ہو کر سوچنے لگتی۔ کیا بہتر حال اور خوشگوار مستقبل کو حاصل کر لینے کے لیے کوئی اپنا ماضی فراموش کر سکتا ہے؟ نہیں..... یقیناً نہیں۔

پھر کیوں کسی کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے خود کو خوش فہمی کا شکار کر لیا جائے؟ وہ اپنی حقیقت سے واقف تھی پھر یہ کیوں کر دیتی کہ ”پدر ما سلطان بود۔“

کسی کو بھلا اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ وہ ایک شہزادی ہے یا بھکاری؟
 وہ تو اس کی خوب صورتی۔

اعلیٰ ڈگری۔

شفاف ذہن۔

اس کی قابلیت۔

اصول کے تحت آپ کو شجیہ مراد علی کے ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا یہ بات میں آپ کو پہلے ہی ذہن نشین کرادوں کہ کل کلاں آپ اسے اس کے ماضی کا حوالہ دے کر شرمندہ نہ کریں۔“

”ایسا ہی ہوگا مسز رحمن، ہمیں کسی کے ماضی سے کیا لینا۔ آپ مطمئن رہیں۔“
 ”اس کے علاوہ میں کچھ باتیں مسٹر جمیل سے بھی کرنا چاہوں گی اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو انہیں یہاں بھیج دیجیے۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔“
 ”ضرور ضرور۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔
 کچھ لمحے انتظار کے بعد جمیل انصاری خوش باش چہرے اور دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

”میڈم۔ جب آپ نے پاپا سے ڈسکس کر لی تھی تو پھر میری کیا ضرورت تھی؟“
 ”اس لیے کہ شجیہ مراد علی کے ہمسفر آپ ہوں گے پاپا نہیں۔“
 وہ مسکرائیں۔

”میں چاہتی ہوں کہ آپ خلوص دل سے اس بات کا عہد کریں کہ آپ کبھی شجیہ کے ماضی کے متعلق اس سے کوئی سوال نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ اس کی عزت نفس۔ اس کی محبت اس کی خوشیوں کا تحفظ آپ کی ازدواجی زندگی کا بنیادی عمل ہوگا نواب زادوں اور جاگیردارانہ مزاج کی طرح آپ اسے دل کے ایوانوں میں کسی شوپیس کی طرح سجا کر بھول نہیں جائیں گے؟“

”یہی چند باتیں مجھے آپ کو سمجھانا تھیں، ورنہ بیٹا لڑکی دینے کے بعد پھر اس کے ماں باپ اور سرپرست بے بس ہو جاتے ہیں۔ اور تقدیر کا کام شروع ہو جاتا ہے۔“
 ”جی۔ آپ نے صحیح فرمایا۔ میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں انشاء اللہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔“

”جیتے رہو۔ بیٹے خوش رہو۔“ انہوں نے سچے دل سے اس کو دعا دی اور وہ چلا آیا۔
 شجیہ سے مسز رحمن نے کوئی بات نہیں چھپائی، تمام صورت حال سے اس کو آگاہ کر دیا۔
 بلکہ انہوں نے دونوں کی ملاقات کا انتظام بھی کر دیا۔ شجیہ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی وہ جمیل سے ملنا چاہتی تھی۔ بھلا وہ کیا کہے گی۔ مگر ماں کا اصرار تھا کہ ملنے میں کوئی حرج نہیں... سارا وقت وہ نظریں جھکائے رہی اور جمیل کی بیتاب نگاہیں اس کے چہرے کا طوائف کرتی رہیں، کچھ غیر رسمی گفتگو بھی ہوئی اس جزوی ملاقات نے جمیل کا اشتیاق اور بڑھادیا۔ شجیہ اسے پہلے زیادہ اچھی لگی۔

وہ تمام رات سوچتی رہی
 ”ماں باپ کے گھر کی طرح اسے یہاں سے بھی ایک دن پیا کے دیس جانا ہے پھر اب کیوں نہیں بہ ظاہر تو کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا، ماں اسے تمام عمر تو اپنے پاس نہیں رکھ سکتیں ان کی مجبوریاں بھی ظاہر تھیں، جمیل انصاری دیکھنے اور باتوں میں ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔ ان کی شخصیت بھی اچھی ہے اور وہ خود بھی اچھے ہیں پھر.....؟“
 وہ اپنے دل کو ٹٹولتی رہی۔ دماغ سے مشورہ کرتی رہی۔ آخر صبح اس نے ماں کو اپنا فیصلہ سنادیا۔

”مام، جو آپ بہتر سمجھیں کریں، آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔“ مگر ایک بات اسے کھٹک رہی تھی کہ جمیل انصاری کے گھر سے خواتین نے باقاعدہ آکر رشتہ نہیں مانگا تھا آخر اس نے پیچی نظروں اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنا یہ اندیشہ ان پر ظاہر کر دیا اور دھیرے سے بولی۔

”مام، ایسا تو نہیں کہ بات صرف مردوں کے درمیان ہو اور ماں بہنوں کو خبر بھی نہ ہو، کیوں کہ شادی کے بعد لڑکی کا واسطہ ساس نندوں سے زیادہ پڑتا ہے۔“ مام نے شجیہ کا سر سینے سے لگا کر پیار سے کہا۔

”تمہارا خیال درست ہے بیٹی۔ یہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔ جمیل کی والدہ کی مجھ سے فون پر بات ہو گئی تھی، تاریخ لینے وہ اپنی بیٹی کے ساتھ آئیں گی۔“

شجیہ چپ ہو گئی، مسز رحمن نے اسے اتنی محبت۔ اتنا اعتماد دیا تھا کہ وہ اپنے دل کی بات بھی ان سے کہنے میں تامل نہیں کرتی تھی، وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہو کر باہر کا نظارہ کرنے لگی، موسم بہت خوب صورت تھا۔ مچھی نہھی پھوار پڑ رہی تھی، بادل گھر کر آ رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائ نے گرمی کا تاثر ختم کر دیا تھا، سامنے نیم کے گھنیرے درخت میں کچھ لڑکیاں جھولا ڈالے جھول رہی تھیں، اس کا ذہن اسے ماضی کی گھپاؤں میں لے گیا.....! ہائے تقدیر تیرے کھیل؟

ماں باپ، بہن بھائی ہونے کے باوجود وہ ایک لاوارث، بے سہارا لڑکی کی طرح بیاہ کر سسرال چلی جائے گی، باپ کی دعاؤں اور ماں بہنوں کے آنسوؤں کی رم جھم کے بغیر.... اور اسے بچھڑے ہوئے چہرے۔

بچھڑے ہوئے شب و روز یاد آ کر ترپانے لگے۔
 یہ دوست تھا کہ فاقہ کشی، غربت اور حالات کی بھول بھلیوں میں وہ پٹی بڑھی، کبھی اس نے دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا، کیوں کہ اس کا باپ مراد علی ایک مزدور انسان تھا۔

بالس کی ٹوکریاں بنانے اور مچھلی کی فروخت میں اسے جو بھی ملتا، اتنا نہیں تھا کہ اس میں چودہ ہند رہ آدمیوں کا کنبہ دو وقت روٹی کھا سکتا، پھر بھی وہ اپنی نیند سوتی۔ اپنی نیند جاگتی تھی کوئی فکر، کوئی پریشانی نہیں تھی، مگر آج اس آسودہ ماحول میں اسے اپنا وہ زمانہ یاد آ رہا تھا، کس قدر قیمتی تھے وہ لمحے۔ جسے دنیا کے خزانے بھی واپس نہ لاسکے تھے۔

خدا یا۔ یہ محرومیاں یہ تشنگی تمام عمر میرے تعاقب میں رہے گی، وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی.... اور وقت آگے ہی آگے بھاگتا رہا، پھر ایک دن کچھ نئی آوازوں۔ اور نئی صورتوں سے ماحول آشنا ہوا تو پتا چلا کہ اس کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی ہے، وہ کمرے میں گم صم بیٹھی تھی اور ہم جولیاں اسے برابر چھیڑ رہی تھیں۔ تب ہی امام کے ساتھ دو خواتین اندر آ گئیں، شجیہ دوپٹا درست کر کے کھڑی ہو گئی۔

”ماشاء اللہ۔ میرے بھتیجا کی پسند لا جواب ہے۔“

”یہ جمیل کی بہن نزہت آ رہے ہیں جمیل بھیا کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن ہوں اور یہ میری امی ہیں یعنی آپ کی ہونے والی ساس۔“ وہ ہنس پڑی۔

اور شجیہ نے ان کی طرف دیکھ کر بڑے ادب سے سلام کیا۔ جس کے جواب میں انہوں نے خفیف سی گردن ہلا دی۔ ان کے جانے کے بعد شجیہ بڑی دیر تک گم رہی، جمیل کی امی کا رویہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ ان کے چہرے اور آنکھوں میں بڑی رعونت اور خشومت تھی، جبکہ نزہت اس پر صدقے واری جا رہی تھی، اماں اور بہن کی متضاد طبیعتیں اسے ابھی سے دہلائے دے رہی تھیں، آخر.... ایک ماہ بعد۔

وہ مسز جمیل انصاری کے روپ میں مسز رحمن اور ”نیشمن“ کی تمام لڑکیوں، عورتوں کی دعاؤں کا بھاری زور راہ لے کر رخصت ہو گئی، جمیل انصاری کے تمام بھائی بہنوں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا، شجیہ نے اس وقت نہایت قیمتی جھلملاتا عروسی جوڑا پہنا ہوا تھا وہ اس شاہانہ لباس میں کوئی شہزادی معلوم ہو رہی تھی، نزہت اس کی نذریں اتار رہی تھی، پھر دعوتوں کا سلسلہ ہفتوں تک چلتا رہا، اس کی شادی کو ایک ماہ ہونے کو آیا تھا مگر سوائے نزہت کے اسے کسی کی آنکھ میں اپنے لیے کوئی محبت، کوئی خلوص نہیں ملا تھا۔ آج اس کے سامنے بیک وقت تین زمانے اور تین دلہنیں آ گئیں۔

ایک اس کی اپنی بہن رانی جب دلہن بنی تھی، وہ اس کے اپنے ماں باپ کا اپنا گھر تھا، اس کی آنکھوں میں الگ ہی ایک سرشاری اور غرور تھا، رشتے ناتوں کا غرور.... اپنی چھیت اور سانسباں کا غرور.... دوسری بار۔ جب وہ چاچی جمید اس کے گھر ایک رات کی دلہن بنی تھی، آنسوؤں کی موتیوں کا سنگار کر کے دلوں کا سرور نہیں۔ اور آج اس کے کانوں میں دوسری

بار دلہن کا نام گونجا تھا، آئینہ اس سے کہہ رہا تھا.... ایسا روپ، اور بھاگوں والی دلہنیں دیکھ کر تو آسمان جھک جھک جاتا ہے۔ اور چندر مابدلیوں کا نقاب الٹ دیتا ہے، اور ستارے ٹوٹ کر اس کی پیشانی کا جھومر بن جاتے ہیں.... اور یہ کوئی خواب و سراب نہیں تھا۔

جمیل انصاری نے اسے زمین سے اٹھا کر کھکشاں پر بٹھادیا تھا، اتنا پیارا اتنی محبتیں دیں کہ وہ اپنے آپ کو بڑی مشکل سے یقین دلا سکی کہ آئینہ جھوٹ نہیں کہتا، وہ بلاشبہ اتنی ہی بھاگوں والی دلہن تھی کہ آسمان، چاند اور ستارے اس کی دید کو بجھکے آرہے تھے۔ جمیل اسے کالج کی کوئی گڑیا سمجھ رہا تھا، بولتا تو آہستہ کہ کہیں اس کی سماعت پر بار نہ ہو۔ ہنستا تو دھیرے سے کہ کہیں اس کا بیساختہ قہقہہ سن کر وہ گھبرانہ جائے، اس نے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ شجیہ کے نام کر دیا تھا، اور اس کے کاغذات و رقمانی میں پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

”شجیہ۔ میں روایتی سرمایہ دار یا دولت مند ہونے کا فائدہ نہیں اٹھاؤں گا، میرے ظرف اور میری صاف ستھری طبیعت کا اندازہ اس بات سے لگالینا کہ میں نے تمہارے ماضی کی کھوج نہیں لگائی، اس بات سے بھی نہ گھبرانا کہ میں کبھی تمہارے ماضی کا تمہیں طعنہ دوں۔ یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں ہے، خدا نے زمین پر بھیجے جانے والے اپنے کسی بندے کی درجہ بندی نہیں کی، یہ انسان ہی ہے جس نے اپنی مفاد کی خاطر انہیں غربت، امارت اور مفلسی کے چھوٹے بڑے خانوں میں بانٹ دیا ہے، مجھے اس کا اعتراف ہے، کہ تمہاری معصومیت، تمہاری سادگی، تمہارے پاک و شفاف دل نے مجھ پر اچانک شبخون مارا اور میں تمہارا اسیر ہو گیا۔ محبت کے ناتے میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ تمہیں میری ذات سے ذرا سی بھی تکلیف پہنچے، مگر شجیہ جان، میری ماں، اور گھر والے پوتڑوں کے رئیس اور روایتی سرمایہ دار ہیں وہ اپنے افعال و کردار کے خود ذمے دار ہیں۔ تم ان میں مجھے شامل نہ کر لینا۔ ہاں ان میں میری پیاری بہن نزہت اور میرا عظیم باپ شریک نہیں ہے، جن کی چاہت اور پیار نے میری محبت کا حصول آسان بنا دیا، ماں کل مجبور تھی مگر آج نہیں، تمہارے خلاف کچھ بھی کر سکتی ہے مگر تم گھبرانا نہیں، اور ایک بات جو میں تم سے اب تک نہ کہہ سکا وہ....؟“

ٹیلی فون ایک دم چیخ پڑا، دونوں چونک پڑے بات منہ کی منہ ہی میں رہ گئی۔

”ہیلو، وہ ابھی پاپا، میں آ رہا ہوں۔“ اس نے فون کریدل پر رکھتے ہوئے سچو سے کہا۔

”پاپا کا فون تھا۔ میں آفس سے کچھ لیٹ ہو گیا ہوں۔ کسٹمرز میرا انتظار کر رہے ہیں۔“ اس نے شجیہ کے رخسار پیار سے تھپتھپائے اور گاڑی کی چابی لے کر مسکراتا ہوا باہر چلا گیا، مگر سچو کے لیے ایک خلش پیہم چھوڑ گیا۔ وہ پہروں اس کی اس بات پر غور کرتی رہی کہ وہ اب تک اس سے کیا نہ کہہ سکا تھا، وہ بات کیا ہو سکتی ہے؟ پھر جمیل اپنی کاروباری

مصروفیت میں اس قدر گم ہو گیا کہ نہ اسے وہ بات بتانے کا خیال آیا نہ شجیہ اسے یاد دلا سکی، لیکن گھر کی پراسرار فضا نے اسے جیسے جکڑ سا لیا۔ لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے، ابھی دنوں جمیل کا رو باری سلسلے میں بردنائی جانا پڑ گیا۔ نئی نئی مارکیٹ ملی تھی۔ نیا نیا آفس قائم ہوا تھا۔ شجیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”کب تک آئیں گے آپ؟“ اس نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

”ارے ارے تمہاری آنکھوں میں آنسو؟“ جمیل نے اسے بازوؤں میں تھام لیا۔

”پریشان نہ ہونا۔ میں تمہیں برابر فون کرتا رہوں گا، جی تو میرا بھی تمہیں تنہا چھوڑنے کو نہیں چاہتا مگر مجبوری ہے۔“ اس نے پیار سے اس کے آنسو پونچھے۔

”نزدہت تمہارے پاس ہوگی۔ پاپا تمہارا خیال رکھیں گے۔ پندرہ دن کی تو بات ہے۔“ اس نے مسکرا کر چٹکی بجائی۔

”یوں گزر جائیں گے دن۔“ وہ چلا گیا۔

سہیل صاحب آفس میں اس قدر مصروف ہو گئے کہ کئی کئی دن گزر جاتے وہ ان کی شکل نہ دیکھ پاتی۔ جمیل کا فون صرف ایک بار آیا تھا اور نہ زہت کی سہیلی کی شادی تھی وہ اس کے انتظام و اہتمام میں لگی ہوئی تھی، گھر اور مارکیٹ کے چکر ہی ختم نہیں ہو رہے تھے ایک دو بار وہ شجیہ کو بھی کھینچ لے گئی تھی۔

اسے آج تک خریداری کا کوئی تجربہ نہیں تھا، اس لیے کہ ایسی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ یہ بڑے گھر اور بڑے لوگوں کے مشغلے اور دولت لٹانے، ہم چشموں میں مقبول ہونے کا خوب

صورت طریقہ تھا، اسے تو جو بھی مل جاتا خدا کا شکر ادا کر کے لے لیتی۔ ماں باپ کے راج

میں تو ہمیشہ چادر چھوٹی رہ جاتی تھی۔ سر ڈھکوتو پاؤں کھل جاتے تھے، پاؤں بند کرنے کی

کوشش کرتی تو سر کھل جاتا تھا، اس لیے ڈر ڈر اور سہم سہم کر سب بھائی بہن وقت کی اسی

کمزور اور چھدری چادر میں سمٹ سمٹا کر گزارہ کر لیتے تھے۔ جہاں قناعت اور سمجھوتے کا

موسم آ کر ٹھہر جائے وہاں صبر کی بڑی گنجائش نکل آتی ہے، پھر نہ کسی کو حالات سے شکوہ ہوتا

تھا نہ اپنے خالق سے۔ اللہ میاں بھی اپنے بے زبان بے وسیلہ اور معصوم بندوں پر کڑی

آزمائش ڈال دیتے ہیں۔ اتنی کہ وہ ایک ہی دائرے میں گھومتے گھومتے زندگی کی آخری

سرحد پر پہنچ جاتے ہیں اور جب حالات گردش نے اسے ماں کی مہربان آغوش سے نکل کر بشیرے اور چاچی کے بندی خانے اور مسز رحمن عظیمی کی پناہ گاہ میں پہنچایا تب بھی اس نے قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ دو وقت کی روٹی۔ اور ستر پوشی کے لیے کپڑا۔ اگر کوئی ہوس اور کوئی خواہش تھی تو یہ کہ وہ ذہنی تعمیر کرے اور ترقی کے جس قدر مواقع اسے

میسر آ سکیں وہ انہیں ضائع نہیں جانے دینا چاہتی تھی، ”نیشن“ میں آ کر اسے علم و ہنر کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ اپنے گزرے ہوئے شب و روز اور لمحوں کا اس درجہ اسے افسوس ہوا کہ وہ دنوں نہیں ہمینوں روٹی ہے، کاش وہ دن اسے کہیں پڑے ہوئے مل جاتے مگر؟ کھویا ہوا وقت کہیں نہیں ملتا، یہ دولت اپنی چمک دمک دکھا کر پھر سے اڑ جاتی ہے اور کوئی اس کے نقش قدم کو نہیں گن پاتا، جب اس نے ماں سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں کیا میں اس عمر میں پڑھ سکوں گی؟“

مسز رحمن کو ساری لڑکیاں، عورتیں، ”مام“ کہتی تھیں۔ انہوں نے ایک زبردست قہقہے کے ساتھ اسے لپٹا لیا اور نرمی سے کہا۔

”ارے بے وقوف لڑکی! ابھی تیری عمر کیا ہے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر تو گڑیاں کھیلنے اور

دھول دھپا کرنے کی ہوتی ہے تم نے تو چار پانچ کلاسیں پڑھ لی ہیں پھر آگے پڑھنا

تمہارے لیے کیا مشکل ہے۔ دیکھ لینا تم ”نیشن“ کی سب سے ہونہار لڑکی لنگوگی، سخت شرط ہے۔“ پھر انہوں نے حضرت شیخ سعدیؒ کا حوالہ دے کر کہا۔

”انہوں نے تو بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد پڑھنا لکھنا سیکھا اور فارسی کے

بہت بڑے دانشور اور مصنف گزرے ہیں، دنیا ان کی ذہانت پر حیران رہ گئی، اور یہ ثابت ہو گیا کہ تحصیل علم کی کوئی عمر نہیں ہوتی اور یہ کہ علم کی طاقت دنیا کی واحد سہر طاقت ہے جسے آج تک کوئی پہنچ نہیں کر سکا۔“

مسز رحمن کی باتوں سے اس کا حوصلہ بڑھا اور شجیہ کے اندر علم و دانش کے مخفی سوتے

جاری ہو گئے۔ اس نے رات دن کی محنت و طلب سے دیکھتے ہی دیکھتے بی ایس سی میں

ٹاپ کر لیا۔ اس کے ساتھ اور اس کے آگے پڑھنے والی لڑکیاں حیران رہ گئیں۔ یہ چھوٹی

سی، پس ماندہ جگہ سے آئی ہوئی غریب لڑکی، نہ جس کا ماضی تھا نہ حال نہ جسے ماحول ملانہ

کوئی بیک گراؤ نہ اور وہ ترقی کی اس معراج پر پہنچ گئی تھی کہ بڑے بڑے صاحب کردار

و افتخار منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔ بعض وقت خود شجیہ حیرانی سے سوچتی رہ جاتی جیسے کسی غیبی

طاقت نے اسی ڈرامائی انداز میں اٹھا کر اس مقام پر کھڑا کر دیا ہو۔ شاید یہی عوامل اور ذہنی

ارتقا کی انہی منزلوں نے اسے پکارا تھا اور حالات اسے ایک اجنبی ملک، اجنبی شہر اور اجنبی

لوگوں میں لے آئے تھے اور مسندِ علم سے اس نے جرے بھر بھر کر پیسے اتنے کہ سرشار ہو گئی۔ اپنی ذات کو منوانے کی طلب تو پوری ہو گئی تھی مگر از دو اجی زندگی کے پراسرار راستے اسے خوفزدہ کر رہے تھے۔ جمیل کو لگے تیسرا دن تھا کہ ایک دن اچانک کمرے کا دروازہ اس زور سے کھلا جیسے کسی نے ٹھوکر ماری ہو اور ایک جوان لڑکی تیزی سے اندر

داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے جمیل کی ماں تھی۔
وہ لڑکی خوب صورت تو نہیں ہاں قبول صورت کہی جاسکتی تھی جس نے گہرا میک اپ

”ہاں شجیہ، تم فی الحال انیکسی میں چلی جاؤ۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ یہ کمرہ
دل نشیں کا ہے۔ یہاں دل نشیں رہے گی۔“
”مگر امی جان میں وہاں تنہا کیسے رہوں گی۔ کچھ تو رک جائیں۔ جمیل کو تو آنے

دیں۔“
”چپ کر۔ اب جو تیری ناپاک زبان پر جمیل کا نام آیا تو زبان کھینچ لوں گی۔ وہ بلا
شرکت غیرے میرا اور صرف میرا ہے۔“

”تم جاؤ وہاں۔ تمہاری سب چیزیں وہاں پہنچ جائیں گی۔ چلو جلدی کرو۔“ انہوں
نے گہرا کر دل نشیں کو دیکھا۔ پھر ساس جی نے شجیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کرتے ہوئے
جیسے اطمینان کی سانس لی۔

اور اس کے دلہیز کے باہر قدم رکھتے ہی کمرے میں بھونچال آ گیا۔ کمرے کی ہر چیز
اٹھا اٹھا کر دل نشیں نے باہر پھینکنا شروع کر دی۔ جیسے اس پر جنون طاری ہو گیا ہو۔ کل
دان، کتابیں، شوپس، بیونی بکس اور ساری چیزیں بڑی بے دردی سے پٹک رہی تھیں اور
شجیہ آنکھوں میں آنسو بھرے دیوار سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ گھر کی بوڑھی ملازمہ نوراں
اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے گئی۔ کچھ دیر بعد نزہت آراء ہاتھوں میں بہت سے پیکٹ
سنجھالے خوش خوشی گاڑی سے اتر کر اندر آ گئی۔ آج وہ شجیہ بھابھی کے لیے ایک خوب
صورت قیمتی ساری اور اس کی میچنگ کی چپلیں اور جیولری خرید کر لائی تھی سہیلی کی شادی
میں شرکت کرنے کے لیے۔ صحن سے گزر کر جب اس نے کوریڈور میں قدم رکھا تو حیرت
سے گنگ رہ گئی۔ شجیہ کے کمرے کا سامان ٹوٹا پھوٹا بکھرا باہر پڑا تھا اور دل نشیں غضبناک
انداز میں اپنے شوہر اور سوکن کو گالیاں بگ رہی تھیں اور ساس صاحبہ اسے پیار سے سمجھا بجا
کر اس کا غصہ سرد کر رہی تھیں۔

”امی جان یہ سب کیا ہے؟“ نزہت کی آواز پردونوں نے پلٹ کر دیکھا۔
”اوہ تو آپ آ گئیں۔ مجھے پتا تھا کہ آپ آئیں گی تو سہی..... کچھ ہوگا۔“ اس نے
ناگواری سے کہا۔
دل نشیں نے میزھی نظر سے نزہت کو دیکھا اور کڑوا سا منہ بنا کر اپنا کمرہ سیٹ کرنے
لگی۔

”بیٹا تم انیکسی میں جاؤ شجیہ کے پاس۔“ انہوں نے بات بگڑتی دیکھ کر اسے چکارا۔
اور نزہت اتنی دیر میں سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ خون کا گھونٹ پیتی ہوئی وہ انیکسی میں پہنچی
اور پیکٹ مسہری پر ڈال کر سر جھکائے آنسو بہاتی ہوئی شجیہ سے لپٹ گئی۔

اور گہرے رنگ کے سبز کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ تن و توش پٹھانیوں جیسا تھا۔ اس نے کمر
پردونوں ہاتھ رکھے اور تنقیدی نظروں سے شجیہ کو دیکھ کر کہا۔ ”تو یہ ہے جمیل کی محبوبہ زہریلی
ناگن، جس سے جمیل نے دوسرا عقد کیا ہے۔“

شجیہ گہرا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ سے برش چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ ریشمی گھنے بال
پشت پر پڑے تھے پیچھے اس کی ساس کینہ تو نظروں سے اس کو گھور رہی تھی۔
”امی جان یہ کون ہیں؟“ وہ ان کی نفرتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
”تم خود ہی پوچھ لو۔“ انہوں نے طنزیہ نظروں سے اس آنے والی لڑکی کو مسکرا کر
دیکھا۔

”میں جمیل انصاری کی زندگی اس گھر اور اس کے آدھے کاروبار کی مالک اس کی بیوی
دل نشیں ہوں۔ کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا تھا؟“ وہ ہنسی۔

”جی جی نہیں۔ امی جان آپ نے بھی یہ بات مجھے نہیں بتائی، آئیے تشریف
لائیے۔“ شجیہ نے نہایت محبت اور رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر
اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”خبر دار جو مجھے ہاتھ لگایا۔ پرے ہٹ۔ معلوم نہیں کس غلیظ ماحول کس گھورے
کچڑ سے اٹھ کر آئی ہے۔“

اس نے اس قدر تحارت سے اس کا ہاتھ جھٹکا جیسے وہ کوئی کوڑھ زدہ ہو۔ شجیہ کا چہرہ
اس کی آنکھیں اس ذلت سے تپ اٹھیں اور پیچھے ہٹ کر اس شعلہ رو کو دیکھنے لگی۔

”میں یہاں بھی نہیں، کل ہی پہنچی ہوں تو معلوم ہوا کہ اس ذلیل انسان نے مجھ پر
سوکن لاکر بٹھادی ہے۔ اس سے تو میں بعد میں پوچھوں گی۔ پہلے میں تجھے مزہ چکھانی
ہوں۔ ابھی تو نے مجھے دیکھا نہیں ہے۔ جل نکل یہاں سے دھتورے کا پھول، بڑی آئی
مہارانی بن کر.... یہ کمرہ میرا ہے۔ یہاں میں پہلی بار دلہن بن کر آئی تھی۔ خالی کمرہ ہے۔
اب میں لمحہ بھر بھی تیرا ناپاک وجود برداشت نہیں کر سکتی۔ کھڑی ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہے۔ کیا
مجھے دھکے دے کر نکالنا پڑے گا؟“

وہ ستون بن کر جیسے زمین پر نصب ہو کر رہ گئی تھی۔ اچانک اس کی گرج سے اس سنگی
ستون میں لرزش پیدا ہوئی۔ اس نے بے بسی سے اپنی جرنیل قسم کی خوش دامن کی طرف
دیکھا۔

”مجھے معاف کر دو بھابی۔ میری وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی۔“

”مگر زہمت اتنی بڑی بات تم لوگوں نے مجھ سے کیوں چھپائی۔ آخر میں نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟“ وہ ہچکیاں لیتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ”کیا غریب کی زندگی ہمیشہ دولت مندوں کے لیے تفریح کا ذریعہ بنتی رہے گی۔ وہ اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں۔ تم نے مجھ سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ کم از کم تم تو مجھے بتا سکتی تھیں کہ تمہارے بھتیجا کی زندگی میں آنے والی میں پہلی لڑکی نہیں ہوں۔“

”بھابی مجھے معاف کر دیجیے۔ میں آپ کی مجرم ہوں۔ آپ کو نہیں پتا میرے اتنے اچھے بھتیجا پر کتنا ظلم ٹوٹا تھا۔“

ایک عرصے کے بعد۔ آپ کی صورت میں انھیں ایک چھوٹی سی خوشی ملی تھی۔ اس لیے میں نے محض ان کی خاطر زبان نہ کھولی۔ میں کتنی بار یہ بات بتانا چاہی مگر ہمت نہ کر سکی۔ یہ احساس دامن پکڑ لیتا کہ کہیں آپ بھتیجا کو چھوڑ کر اپنی مام کے پاس نہ چلی جائیں۔ کہیں آپ کی مام ان پے عائلی قانون کے تحت مقدمہ نہ دائر کر دیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً بھتیجا خودکشی کر لیتے۔ دل شیش بھابی دو سال ہوئے بھتیجا کو چھوڑ کر اپنے بھائی کے پاس لندن چلی گئی تھیں۔ ان کی بھی شوہر سے نہیں بنی۔ کیا آپ یہ سوچ سکتی ہیں کہ دنیا میں ماں کی ممتا بھی آج دولت کے ترازو میں تولی جاتی ہے مگر۔ آج کے دور میں بلکہ ہمارے گھر میں ایسا ہو رہا ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ میری ماں ایک دولت مند نمائش پرست اور بے رحم عورت ہے جس نے میرے پاپا کو اپنے حسن کی دھنک رنگ ریشمی زنجیروں میں باندھ کر بے بس کر دیا تھا۔ وہ تمام زندگی اس گھر اور پاپا پر حکمرانی کرتی چلی آئی ہیں۔ اور اب اولاد ان کے دستِ ستم کا شکار ہے۔“

زہمت پیار پیار سے شجیہ کے آنسو پوچھتی رہی اور آہستہ آہستہ بتاتی رہی۔ شجیہ اپنے گلے شکوے اور اپنا دکھ بھول گئی اور اپنی پیاری دوست اپنی مہربان نند کو گلے لگا لیا اور پیار کر کے بولی۔ ”میں نہیں جانتی تھی کہ اتنی بلند وبالا اور جست نظیر کوٹھیوں، بنگلوں میں رہنے والے لوگ بھی اتنے چھوٹے اور بے رحم ہو سکتے ہیں یا یہاں پر بھی کسی کو کوئی دکھ یا تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ قدرت کی مصلحتیں بھی عجیب ہیں کہ ایسے خود غرض اور کینہ پرور ماحول میں تمہارے بھتیجا کیوں پیدا ہو گئے یا تم نے ان کے مزاج کا کوئی عنصر کیوں قبول نہیں کیا۔ کیوں آخر کیوں؟“ شجی نے کہا۔

”ہاں بھابی ہے تو یہ واقعی ناقابل یقین لیکن آپ یہ شاید سنا نہیں کہ قدرت نے ہر عمل کا رد عمل پیدا کیا ہے۔ یہ میرے پاپا کی فتح تھی کہ ان کی اولاد اپنے باپ کا دل ذہن اور

ان کی سوچیں لے کر پیدا ہو ورنہ بیوی کے ساتھ ان کی اولاد بھی اپنے باپ کے ساتھ اعلان جنگ کر سکتی تھی، پھر تو پاپا کی تسکین اور خوشی کا ہر دریچہ ہر وزن بند ہو جاتا اور زندگی کی سانسیں ان پر تہمت بن جائیں.....“

”تم ٹھیک کہتی ہو پیاری بہن۔ اللہ بڑے لوگوں کا کسی سے سابقہ نہ ڈالے۔“ رات تک بچا کچھا سامان بھی نوکروں کے ہاتھ انیکسی میں پہنچ چکا تھا جو انھوں نے زہمت آراء کی نگرانی میں کمرے میں سیٹ کر دیا تھا۔ سہیل انصاری جب گھر کی گھٹن اور بیوی کی جھک جھک اور بک بک سے بیزار ہو جاتے تو انیکسی میں آ کر اکثر راتیں گزارتے تھے۔ تنہا اور خاموش۔ زہمت ان کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی اولاد تھی۔ اس نے اپنے باپ کی ضروریات کی بہت سی چیزیں وہاں لا کر رکھ دی تھیں اور کبھی کبھی وہ خود بھی آ کر اپنے باپ کے سینے پر سر رکھ کر سو جاتی تھی۔ وہ محبت اور دلداری جو ماں کی طرف سے بچوں کو ملنی چاہیے تھی وہ انہیں نہیں ملی تھی جب کہ زہمت بے حد حساس لڑکی تھی۔ وہ سب سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی مگر ماں کا سرد رویہ ہمیشہ اُسے دکھی کر دیتا تھا۔ رات جب دیر سے سہیل انصاری گھر آئے اور انھیں نئی واردات کی خبر ہوئی تو بے حد دل گرفتہ ہو گئے۔ انہوں نے نہ تو بیوی سے بات کی نہ دل نشیں کی طرف دیکھا۔ سیدھے انیکسی گئے تو شجیہ اپنے مہربان نیک دل سسر کو دیکھتے ہی ان کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔

”پاپا۔ امی جان نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا۔“ وہ سسک کر بولی۔ ”تمہیں بیٹی۔ تمہارا گھر تو تمہارے شوہر کا گھر ہے۔ تم تو یہاں مہمان تھیں۔ تمہارا بنگلہ گلشن میں تیار ہے۔ بس جیل کے آنے کی دیر ہے۔“

”مگر پاپا۔ وہ دل نشیں؟“ اس نے جواب طلب نظروں سے سہیل انصاری کی طرف دیکھا۔ ”آپ نے پہلے کیوں نہیں مام کو بتا دیا تھا کہ جیل شادی شدہ ہیں پھر شاید بٹوارے کا یہ تکلیف دہ عمل ظہور میں نہ آتا نہ امی کو دکھ ہوتا نہ دل نشیں کو۔“

”ہاں بیٹی اولاد کی محبت میں ہم سے یہ غلطی ہو گئی لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری حق تلفی نہیں ہونے دوں گا۔ دل نشیں جو چاہتی ہے کر لے۔ مہ جین جتنا چاہے تم توڑ لے۔ اب میں خاموش نہیں رہوں گا۔ شاید فیصلے کی گھڑی آ گئی ہے۔“ سہیل انصاری نے شجیہ کے آنسو پونچھے اور تیزی سے باہر چلے گئے۔

شجیہ اور زہمت گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ ”اب کیا ہوگا زہمت؟“ شجیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں بھابی، ہم سب لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ رات کا کھانا سہیل انصاری نے اپنی بیٹی نہت اور بہوشیہ کے ساتھ کھایا۔ وہ اس دن بہت اداس اور خاموش نظر آ رہے تھے۔

کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور نہت شجیہ کو لیے اپنے کمرے میں آ گئی۔

کبھی کبھی جب بیزاری حد سے بڑھتی یا اپنی ہیرا جیسی زندگی ضائع ہو جانے کا ملال گھیرنے لگتا تو انہیں وہ شوخ شوخ جوان امیگوں سے معمور ہنستا مسکراتا سہیل یاد آ جاتا جو اپنے حساس سینے میں ایک درد مند دل رکھتا تھا جس نے آج تک دانستہ کوئی چیونٹی ماری تھی نہ کسی کا دل دکھایا تھا، پھر نہ جانے قدرت نے کیوں اس پر ایک ناپسندیدہ ہستی کو نگران بنادیا کہ اس کے سارے اختیارات سلب ہو کر رہ گئے تھے۔ نہ اپنی مرضی سے وہ جی سکتا تھا نہ مر سکتا تھا.....

غم بانٹنے کی چیز نہیں پھر بھی دوستو

اک دوسرے کے حال سے واقف رہا کرو

☆.....☆.....☆

یہ تھے سہیل انصاری جو نہ صرف یہ کہ وہ ہر دل عزیز تھے بلکہ اللہ نے حسن ووجاہت ایسا دیا تھا کہ لڑکیاں تو لڑکیاں لڑکے بھی ان کی قربت اور دوستی کے لیے بیتاب نظر آتے تھے۔ شوخ، ہنس مکھ اور ذہین۔ وہ ایک بزنس مین کے اکلوتے فرزند تھے۔ ان کی امی ثروت آرا بیگم بڑی اچھی اور ہمدرد خاتون تھیں۔ اتنی دولت اور کدو فر کے باوجود ان کے دل میں ذرا بھی غرور نہ تھا نہ انداز میں رعوت۔ ان کے گھر سے ہمیشہ ضرورت مند مستفید ہوتے تھے۔ رشتے داروں پر ان کی خصوصی عنایت تھی۔ کسی بھتیجے کو انہوں نے پڑھنے کے لیے باہر بھیجا تھا تو کسی بھانجی کی شادی کرادی تھی کسی کو دکان کرادی کسی کو نوکری سے لگوا دیا۔ غرضیکہ حقوق العباد ادا کرنے کا ہنر اور دوسروں کے دل میں اترنے کا فن وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ میاں بزنس کے سلسلے میں زیادہ تر باہر ہوتے تھے۔

ان کا کام ان کا بزنس اپنے دیور جنید انصاری کے ساتھ مل کر بحسن و خوبی سنبھالتی تھیں۔ میکے اور سرسوال والوں سے انہوں نے بنا کر رکھی تھی۔ ہر شخص ثروت آرا کی عزت کرتا تھا انھیں خدا نے صرف ایک بیٹا دیا تھا۔ جو ہزار بیٹوں پر بھاری تھا۔

جو خوبیاں ایک سعادت مند اولاد میں ہونا چاہیے تھیں ان سے وہ سرتایا مزیں تھا، محبت کا پیکر، لیاقت اور ذہانت کا منبع، خوش اخلاق، خوش صفات۔ اس نے اعلیٰ تعلیم اپنے

ہی ملکہ میں حاصل کی تھی، بزنس میں ماسٹر ڈگری تھی۔ ٹیکنیکل کورس بھی کیے تھے۔ غرضیکہ تعلیم کے ساتھ ہنر بھی اس نے اسی شوق سے حاصل کیا تھا جیسے تعلیم۔ کالج اور یونیورسٹی میں ایک سے ایک حسین، اعلیٰ خاندانی لڑکیاں اس کی زندگی میں آنے کے لیے بے تاب رہتی تھیں۔ اس سے اپنا ہونے کا حق مانگتی تھیں۔ خود سہیل کو بھی وہ اچھی لگتی تھیں مگر مقدر تو اس کا مہ جبین کی دراز زلفوں میں الٹا ہوا تھا جو اس سے دو سال سینئر تھی شکل صورت میں بھی اچھی تھی لیکن تیزی اور طراری میں اس کا جواب نہ تھا۔ اس قدر بولنے اور لڑنے والی لڑکی تھ کہ اس کا نام لڑکوں نے ”لیڈی آکٹوپس“ رکھ دیا تھا۔ اس کی خاص نظر کرم سہیل پر تھی۔ جب وہ آتا اس کے آگے پیچھے بھرتی رہتی۔ کسی نہ کسی بہانے اس کی قربت حاصل کرنے کی خواہاں رہتی اور جو لڑکیاں سہیل کی محبت کا دم بھرتی تھیں ان سے بیاگ ڈل کہتی تھی۔ ”سہیل چیونٹی بھرا کباب ہے۔ اسے نگلنا آسان ہے نہ اگلا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس کے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ بہت بُرا“ وہ ان کی طرف دھمکی آمیز نظروں سے دیکھ کر زہریلی مسکراہٹ سے مسکرا کر کہتی۔ ”میرا نام مہ جبین ہے۔ مجھے چیلنج نہ کرنا ورنہ نقصان اٹھائو گی۔“ وہ اٹھلاتی ہوئی چلی جاتی۔ سہیل اس کی شکل ہی دیکھ کر کتر کر نکل جاتا۔ مشکل یہی تھی کہ مہ جبین کی والدہ ثروت آرا کی دوست تھیں اور ان کا گھر میں آنا جانا تھا جس نے مہ جبین کو نگلی تلوار بنا دیا تھا۔ جب بھی موقع ملتا وہ سہیل کا راستہ روک لیتی۔

”تم مجھے اس طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اگر تم نے میرے ساتھ شادی نہ کی تو میں اسی جگہ سب کے سامنے اپنے کو شوٹ کر لوں گی اور تم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔“

”مہ جبین۔ خدا کے لیے آہستہ بولو۔ کوئی سن لے گا۔ لوگ میرے متعلق کیا سوچیں گے؟“ سہیل نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”تو پھر میری محبت کا اقرار کر لو ورنہ میں مرجاؤں گی۔“ وہ لپک کر اس کے کاندھے سے اپنا سر لگا دیتی۔ وہ گہرا کر اسے پیچھے دھکیل دیتا۔

”یار کیا مصیبت ہے۔ یہ کالج ہے گھر کا لان نہیں۔ کیوں مجھے بدنام کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ کچھ شرم کرو۔“

اس کی کسی صورت دیکھ کر وہ بیباکی سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑتی۔

”بزدل کہیں کے۔ بدنام تو لڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہ لفظ تو ہم نے مردوں کے لیے کہیں نہیں سنا اور میں تمہارا مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔“

”یار واقعی سہیل یہ لیڈی آکٹوپس۔ بھوت بن کر تم سے ٹکرے گی۔ مان بھی لو اس کی

بات۔“ فیضی سہیل کا دوست تھا۔ فیضی کو دیکھ کر اسے اپنی انتہائی انسٹ محسوس ہوئی اور وہ غصے میں پاؤں پٹک کر بولا۔ ”اب یہ بھوت بنے یا چڑیل میں ہرگز اس سے شادی نہیں کروں گا۔ کوئی زبردستی ہے۔“ وہ تیزی سے مڑا اور دوڑتا ہوا درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ فیضی نے مسکرا کر مہ جبین سے کہا۔ ”مہ جبین۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“ اس کا چہرہ غصے میں پہلے ہی سُرخ ہو گیا تھا اب کے تو وہ پھٹ ہی پڑی۔ زور سے چیخی۔ ”مُشٹ اپ....“ اور پاؤں پٹکتی دوسری طرف چلی گئی۔ فیضی کا قہقہہ دور تک اس کا تعاقب کرتا رہا۔

اس واقعے سے مہ جبین نے اپنے دل میں اس کے حصول کے لیے بڑے بڑے پلان بنانا شروع کر دیے۔ اب اس کی محبت نے انتقام کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہر لمحہ اس کی نظریں سہیل کے تعاقب میں لگی رہتیں۔

ایک دن اس نے اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر مہ جبین کے متعلق اس کے ارادوں سے انھیں آگاہ کرتے ہوئے درخواست کی کہ آپ اس سے میرا چچا جھڑا دیجیے۔ وہ یہاں نہ آیا کرے۔ مجھے اس کا آنا جانا قطعی پسند نہیں۔ اگر کبھی آپ نے آنی کو کسی قسم کی آس دلائی تو میں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔

ثروت آرا کو اپنے بیٹے کی یہ بات حیرت میں ڈال گئی۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے بیٹے نے نہ کبھی جھوٹ بولا نہ کسی کو ستایا۔ یقیناً اسے مہ جبین کی طرف سے ڈکھ ملا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ انھی دنوں ان کے والد کا جہاز کریش ہو گیا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ ثروت آرا پر قیامت گزر گئی۔ اب سہیل انصاری پر گھر اور کاروبار کی تمام تر ذمے داری آ پڑی تھی۔ تعلیم سے وہ فارغ ہو چکا تھا۔ جنید بچا کے ساتھ کام کر رہا تھا اور باپ کے مرنے کے بعد تو کلی طور پر اپنے مستقبل کی فکر بھی دامن گیر ہو گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سال کے اندر ثروت آرا بھی اپنے شوہر کے پاس چلی گئیں۔ شوہر کی جدائی کو برداشت نہ کر سکیں۔ سہیل کے قدم لڑکھڑا گئے۔ ماں باپ دونوں ہی اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ کاہے کو بھی سوچا تھا کہ وہ اس بھری دنیا میں تنہا رہ جائے گا مگر وہ حوصلہ نہیں ہارا۔ چچی بچانے سمجھایا کسی کے ماں باپ ہمیشہ زندہ نہیں رہتے۔ تم جوان ہو، خود مختار ہو اپنا گھر اور کاروبار سنبھالو۔ کچھ دن چچا چچی گھر پہ رہ کر اس کا غم اور تنہائی بانٹتے رہے آخر چلے گئے۔ اور سہیل نے نہایت پامردی سے اپنے آپ کو بزنس میں مصروف کر لیا۔

سہیل نے ثروت آرا کی زبانی کتنی ہی بار شازلی کا نام سنا تھا۔ وہ ان کے رشتے کے بھائی احمد حسین کی بیٹی تھی جو گاؤں میں رہتی تھی۔ اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ سلیقہ مند، خوب صورت اور نہایت معصوم تھی۔ ثروت آرا کے دل میں بڑے دنوں سے یہ بات چھپی ہوئی تھی کہ وہ شازلی کو اپنی بہو بنائیں گی۔ جن دنوں سہیل نے مہ جبین کی شکایت ماں سے کی، انہوں نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا پورا ارادہ کر لیا تھا۔ پھر ایک دن وہ بھائی سے ملنے لاہور پہنچ گئیں، سہیل بھی ساتھ تھا۔ وہاں وہ شازلی سے ملا۔ اسے دیکھا، باتیں کیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اسے جنم جنم سے جانتا ہوا اور جب ماں نے اس کے کان میں چپکے سے پوچھا۔ ”تمہیں شازلی کیسی لگی؟“ تو وہ پھڑک اٹھا۔ ”امی، کیا واقعی آپ کو بھی وہ اچھی لگتی ہے؟“

”ماں بیٹا، تمہیں دکھانے ہی تو میں یہاں لائی تھی۔ بس تمہارے پاپا آ جائیں پھر میں اسے تمہاری دھن بنا کر لے آؤں گی۔“ انہوں نے اسے گلے سے لگالیا۔ صبح جب وہ بیدار ہوا تو شازلی ایک خوب صورت نوکری ہاتھ میں لیے حویلی کے باغ میں بھول توڑ رہی تھی۔ اس نے سفید جار جٹ کی میکسی پہن رکھی تھی۔ سیاہ لمبے بال کھلے پشت پر پڑے ہوئے تھے اور ان سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا جیسے وہ سیدھی غسل خانے سے باغ میں چلی آئی ہو سحر خیزی کے لیے اس نے سر پر سفید رومال باندھا ہوا تھا۔ وہ اس ڈھیلے ڈھالے سفید لباس میں کوئی بری معلوم ہو رہی تھی۔ کس قدر پاکیزہ اور دل موہ لینے والا حسن تھا اس کا جیسے موتیا کی آدھ کھلی کلی۔

جب تک وہ رہا بس دو تین بار ہی اس کی جھلک دیکھ سکا۔ چلتے وقت ثروت آرا نے اسے بتایا کہ ہم تمہاری نسبت شازلی سے ملے کر دی ہے۔ اب وہ تم سے پردہ کرے گی۔ گاؤں میں شہر کی بہ نسبت زیادہ ان چیزوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ لوگ شہر آ گئے اور پھر اوپر تلے حادثوں نے سہیل کو پاگل سا کر دیا اور مہ جبین کو موقع مل گیا۔ دونوں ماں بیٹی سہیل کی دلداری کے لیے آگئیں۔ خاندان والے سب ہی جانتے تھے کہ ماہ جبین کی ماں ثروت آرا کی دوست اور سہیلی تھیں اور ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایسے وقت میں جب کہ خاندان والے اپنا گھر بار چھوڑ کر زیادہ دن وہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ ثروت آرا کی سہیلی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر یہاں رہنا قبول کر لیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ ثروت میری بہن، دوست، سہیلی سب ہی کچھ تھی۔ اب اس مصیبت اور تنہائی میں کیا وہ سہیل کو اکیلا چھوڑ دیں گی۔ روزِ محشر اس کی ماں کو کیا جواب دیں گی؟

خاندان والے اور خصوصاً چچا چچی بہت ہی متاثر ہوئے بلکہ ان کا شکریہ ادا کیا کہ جو غم کا بوجھ ہمیں اٹھانا چاہیے تھا وہ اٹھا رہی ہیں اور سب لوگ مطمئن ہو کر چلے گئے۔ بس دو چار

اس واقعے سے مہ جبین نے اپنے دل میں اس کے حصول کے لیے بڑے بڑے پلان بنانا شروع کر دیے۔ اب اس کی محبت نے انتقام کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہر لمحہ اس کی نظریں سہیل کے تعاقب میں لگی رہتیں۔

ایک دن اس نے اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر مہ جبین کے متعلق اس کے ارادوں سے انھیں آگاہ کرتے ہوئے درخواست کی کہ آپ اس سے میرا چچا جھڑا دیجیے۔ وہ یہاں نہ آیا کرے۔ مجھے اس کا آنا جانا قطعی پسند نہیں۔ اگر کبھی آپ نے آنی کو کسی قسم کی آس دلائی تو میں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔

ثروت آرا کو اپنے بیٹے کی یہ بات حیرت میں ڈال گئی۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے بیٹے نے نہ کبھی جھوٹ بولا نہ کسی کو ستایا۔ یقیناً اسے مہ جبین کی طرف سے ڈکھ ملا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ انھی دنوں ان کے والد کا جہاز کریش ہو گیا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ ثروت آرا پر قیامت گزر گئی۔ اب سہیل انصاری پر گھر اور کاروبار کی تمام تر ذمے داری آ پڑی تھی۔ تعلیم سے وہ فارغ ہو چکا تھا۔ جنید بچا کے ساتھ کام کر رہا تھا اور باپ کے مرنے کے بعد تو کلی طور پر اپنے مستقبل کی فکر بھی دامن گیر ہو گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سال کے اندر ثروت آرا بھی اپنے شوہر کے پاس چلی گئیں۔ شوہر کی جدائی کو برداشت نہ کر سکیں۔ سہیل کے قدم لڑکھڑا گئے۔ ماں باپ دونوں ہی اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ کاہے کو بھی سوچا تھا کہ وہ اس بھری دنیا میں تنہا رہ جائے گا مگر وہ حوصلہ نہیں ہارا۔ چچی بچانے سمجھایا کسی کے ماں باپ ہمیشہ زندہ نہیں رہتے۔ تم جوان ہو، خود مختار ہو اپنا گھر اور کاروبار سنبھالو۔ کچھ دن چچا چچی گھر پہ رہ کر اس کا غم اور تنہائی بانٹتے رہے آخر چلے گئے۔ اور سہیل نے نہایت پامردی سے اپنے آپ کو بزنس میں مصروف کر لیا۔

سہیل نے ثروت آرا کی زبانی کتنی ہی بار شازلی کا نام سنا تھا۔ وہ ان کے رشتے کے

گھر کے نوکروں کے ساتھ مہ جبین اور ان کی والدہ صاحبہ مع سہیل کے پورے گھر پر قابض ہو گئیں۔ ان دنوں سہیل کو کچھ یاد نہیں تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ کس قسم کی سازشیں چل رہی تھیں۔ چچا نے نہایت دیانت داری سے کاروبار سنبھالا ہوا تھا۔ سہیل کے صحت یاب ہونے تک ڈاکٹر آرہے تھے۔ اکثر اوقات سہیل پر غشی طاری رہتی۔ رفتہ رفتہ وہ سنبھلنے لگا اور اس نے دیکھا ہر لمحہ مہ جبین اس کے پاس نظر آتی ہے۔ کبھی دوا پلا رہی ہے۔ کبھی منہ ڈھلا رہی ہے تو کبھی پھلوں کا بوس نکال کر پلا رہی ہے۔ ان کی امی بھی گھڑی گھڑی آ کر اس کی طبیعت کا پوچھتی تھیں۔ کچھ دن تو وہ یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ انھوں نے اسے اپنی محبت دی تھی خیال کیا کہ وہ کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اگر وہ ذرا سا بھی پریشان ہوتا تو مہ جبین اس کا ہاتھ تھام کر ڈھیروں آنسو بہا دیتی اور فریادی نظروں سے دیکھ کر پوچھتی۔ ”میرے ہوتے ہوئے تم پریشان ہو۔ میں مریکوں نہیں جاتی سہیل اب تو میری طرف دیکھ لو۔“

اور وہ گھبرا کر نوکروں کو آوازیں دینے لگتا۔ ”آخر یہ بابا ماہی، شکوراں کہاں مر گئیں۔ یہ سارے کام جوان کے کرنے کے ہوتے ہیں وہ تم اور انہی کیوں کرتی ہیں۔ پھر ان کا کیا مصروف ہے؟“

وہ روہانسا ہو جاتا۔ آنٹی آ کر اس کی بلائیں لینے لگتیں۔

”اے بیٹا۔ جو خیال ہم رکھ سکتے ہیں وہ نوکر کہاں رہیں گے۔ وہ سب گھر میں لگے رہتے ہیں۔ یہ بے چاری مہ جبین نے تو رو کر برا حال کر رکھا ہے۔ تمہیں اس حال میں دیکھ کر اس کی نیندیں اور کھانا پینا سب ختم ہو گیا ہے۔ اب ذرا تم ٹھیک ہوئے ہو تو اس کے چہرے پر بھی رونق آ گئی ہے۔ کل کہہ رہی تھی کہ سہیل کی صحت یابی پر جشن کا اہتمام کرے گی۔“ انہوں نے ہنس کر سر جھکائے ہوئے مہ جبین کی طرف دیکھا۔

وہ چلی گئیں تو سہیل نے ساٹ لہجے میں کہا۔ ”کسی جشن یا پارٹی کا اہتمام نہیں ہوگا۔ میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ اب مجھے کسی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں۔“

اس دن سے اس نے شکورن سے کہہ دیا۔ ”میں ناشتا سب کے ساتھ میز پر کروں گا۔ میرے لیے کوئی خصوصی ڈش تیار نہ کی جائے۔“

جب وہ اپنے کمرے میں آتا تو مہ جبین سولہ سنگار کیے پہلے ہی موجود ہوتی۔ وہ جھلبلا جاتا۔ ”کیا تم مجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتیں؟“

”نہیں جان من۔ میرا تمہارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔ تم میرا دل ہو میں اس کی دھڑکن ہوں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ دل بغیر دھڑکن کے زندہ رہے۔“ اس نے مسکرا کر اس کی

گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

”مہ جبین.....“ وہ چلا پڑا۔ ”خدا کے لیے تم یہاں سے چلی جاؤ۔ میرے اوپر تمہارا کوئی وار کارگر نہیں ہوگا۔ اگر تم نہ گئیں تو میں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔“

”کہاں جاؤ گے سرکار.....؟“ اس نے معنی خیز نظروں سے مسکرا کر اس کے چاروں طرف گھوم کر پوچھا۔ ”گاؤں۔ شازلی کے پاس؟“

سہیل کو جیسے کرنٹ سا لگ گیا۔ آہ وہ تو سب کچھ بھول گیا تھا۔ امی، پاپا کی دائمی جدائی نے اس سے اپنا آپ چھین لیا۔ شازلی کا ذکر اس کی یاد ماں کے ساتھ ہی دُفن ہو گئی تھی۔ وہ تو میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ حویلی کے باغ میں پھول توڑتی ہوئی۔ طلوع ہوتے آفتاب کی پہلی کرن کو زمین پر اترتے ہوئے سوچ رہی ہوگی۔ شاید یہ صبح اس کی امیدوں کے پھول کھلا دے۔ شاید وہ آجائیں۔ شاید.... شاید۔

”کیا سوچنے لگیں سہیل جی.....؟“ اُس نے اٹھلا کر ہلکا پھلکا تہقہہ لگایا۔

”تمہیں کس نے بتایا شازلی کے متعلق؟ بولو؟“ اس نے اُلٹا سوال کر دیا۔

”ابھی تھوڑی دیر ہوئی وہ بڈھا آیا تھا گاؤں سے۔ کیا نام تھا اس کا احمد حسین....“ اُس نے چاچا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”پھر کیا ہوا احمد حسین ماموں آئے تھے کہاں ہیں وہ؟“ وہ مڑ کر باہر جانے لگا۔

”ارے بھئی اتنی جلدی کیا ہے۔ پوری بات تو سن لو۔“ دفعتاً وہ دروازے کے سامنے آ کر بولی۔ ”ہاں یاد آیا۔ وہ تمہاری امی کے رشتے میں بھائی لگتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے بتائی تھی اور یہ بھی کہ ان کی بیٹی شازلی تمہاری منگیتر ہے میں نے بھی وہ گولی دی ہے اس بڈھے کو کہ ہمیشہ اس کے حلق میں انکی رے گی۔“ یہ کہہ کر مہ جبین ہنستی ہوئی جا کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی اور سہیل تیر کی مانند اس کی طرف جا کر بولا۔ ”تم نے احمد حسین ماموں سے کیا کہا تھا مہ جبین بولو۔ بولو؟“

”میں نے کہا تھا ان سے کہ آپ کی بہن بھی بڑی عجیب ساسٹ داں تھیں عجیب و غریب طبیعت کی مالک، وہ سب کو اسی طرح بیوقوف بنا کر خوش ہوتی تھیں۔ پہلے انھوں نے اپنے بیٹے کی منگنی میرے ساتھ کی پھر گاؤں جا کر آپ کی بیٹی سے کردی۔ یعنی آپ کا دل بھی نہیں توڑا اور مجھے بھی اپنا گھر بار سوپ گئیں۔ ہے نا عجیب بات.... وہ بے چارا بڈھا سر جھکا کر خاموشی سے چلا گیا۔“

وہ تہقہہ لگانے لگی۔ سہیل نے اس کے بال پکڑ کر ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر لگا دیا۔

”ذلیل لڑکی۔ تجھے کس نے حق دیا تھا یہ سب کچھ کہنے کا۔ تو نے احمد حسین ماموں کی تذلیل نہیں کی بلکہ میری مری ہوئی ماں کے قول و فعل کو جھٹلایا ہے، میری زبان کو جھٹلایا اور ایک غریب معصوم لڑکی کو بے گناہ زندہ درگور کر دیا۔“ اس نے خون آلودہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور چیخ کر کہا۔ ”نکل جاؤ۔ تم دونوں ماں بیٹی میرے گھر سے۔ میں جارہا ہوں۔ شام کو تمہاری شکل نہ دیکھوں۔“ وہ کمرے سے چلا گیا۔ سارا دن فانکوں سے سر کھپاتا رہا۔ چچا نے اس کے سامنے سارے حسابات رکھ دیے اور کہا۔ ”بیٹا۔ اب تم سنبھالو اپنا کاروبار۔“

مگر اس دن بالکل اس کا جی نہ لگا۔ رہ رہ کر اسے شازلی یاد آتی رہی۔ وہ اس کی خوب صورت آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں کو شمار کرتا رہا۔ سماعت میں اس کی سسکیاں گونجتی رہیں۔ تصور میں وہ اس کے آنسو پونچھتا رہا۔ اپنے ماموں سے معافیاں مانگتا رہا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ صبح کی پہلی ٹرین سے گاؤں چلا جائے گا۔ اب آئے گا تو شازلی اس کے ساتھ ہوگی مگر وہ رات ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی پر محیط ہوگئی تھی۔ وہ صبح کبھی نہ آئی جب وہ اپنی زندگی کے لیے سورج کی پہلی کرنوں سے اُجالے مانگنے اور شازلی کا دامن ہمیشہ کے لیے خوشیوں سے بھرنے جانے والا تھا۔

اس نے مارکیٹ سے کچھ چیزیں شازلی کے لیے خریدیں جوڑیاں، چٹل، پرفیوم، مٹھائی وغیرہ کیوں کہ گاڑی صبح اندھیرے میں جاتی تھی اس وقت کچھ بھی خریدا نہیں جاسکتا تھا۔ چند جوڑے ثروت آرانے بنالے تھے۔ کچھ زیور بھی تھا۔ وہ رات کو اپنی بیٹی میں رکھ لے گا اور صبح فجر کی نماز پڑھ کر روانہ ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر جب وہ خوشی خوشی گھر آیا اور کمرے میں گیا تو اسے گھر میں بڑی خاموشی نظر آئی۔ شکون ماسی وغیرہ کام میں مصروف تھیں۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا۔ کپڑے تیلی کر کے وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ تب ہی آہٹ پر اس نے دروازے کی طرف دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ مہ جبین اندر آ رہی تھی۔ اس نے اس وقت سیاہ جار جٹ کی ساری اور سیاہ بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ جس پر ننھے ننھے ستارے جھلملا رہے تھے۔ کھلے ہوئے بال پشت پر پڑے ہوئے تھے۔ اس نے کوئی بہت تیز خوشبو لگائی ہوئی تھی۔ کمرے کی فضا ایک دم مسحور ہوگئی۔ ”آپ آگئے۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔“

”تم لوگ ابھی تک گئیں نہیں؟“ وہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر بولا۔
 ”لوگ تو چلے گئے مگر میں رُک گئی آپ سے معافی مانگنے کے لیے میرا ضمیر مجھے برابر ملامت کرتا رہا ہے۔“ وہ بڑی بے تکلفی سے اس کے بالکل قریب مسہری پر بیٹھ کر

آنسو بھری آنکھوں سے سہیل کی طرف دیکھنے لگی اور ایک دم اس کے گھٹنے پر سر رکھ کر پلک پڑی۔

”مجھے معاف کر دیجیے سہیل۔ مجھ سے واقعی زیادتی ہوگئی۔ مجھے ماموں جان سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ آپ پلیز گاؤں چلے جائیے۔ ان سے میری طرف سے معافی مانگ لیجیے گا اور شازلی کو گھر لے آئیے۔ میں اب اس کے راستے میں کبھی نہیں آؤں گی۔“
 ”ارے ارے بھی رو کیوں رہی ہو۔ چلو معاف کر دیا۔“ اس نے اس کا سر اٹھا کر کہا۔
 ”سچ آپ نے معاف کر دیا۔ سہیل آپ کتنے اچھے ہیں۔“ وہ آنسو پونچھ کر سنبھل کر بیٹھنے ہوئے مسکرائی۔ سہیل نے بڑے غور سے اس کو دیکھا۔ اس کا بدلا بدلا روپ بدلے بدلے انداز دیکھ کر جانے کیوں اس کی بات پر اسے یقین سا آ گیا۔ اس نے نرم نگاہوں سے اس کو دیکھا۔

”اچھا ایک بات بتا دیجیے بالکل سچ سچ؟“ مہ جبین بچوں کی سی برجستگی سے بولی۔
 ”ہاں ہاں پوچھو۔“ سہیل کو بھی کچھ دلچسپی ہونے لگی تھی۔ وہ اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

”شازلی آپ کو بہت اچھی لگتی ہے؟“

”ہاں۔ اچھی چیز سب کو اچھی لگتی ہے۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔
 ”ٹھیک ہے سہیل۔ اپنا اپنا نصیب ہے کہ میں برسوں آپ کی پرستش کرتی رہی مگر دل میں جگہ نہ پیدا کر سکی اور اس نے لمحوں میں آپ کے دل میں نقب لگالی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”یہ غلط ہے مہ جبین۔ اس کی تو میں نے صرف ایک جھلک دیکھی ہے ورنہ میری کبھی اس سے بات نہیں ہوئی نہ وہ میرے سامنے آئی۔ سارے معاملات تو امی مرحومہ نے کر کے رکھے تھے۔“

وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور پوچھا۔ ”آپ نے کھانا نہیں کھایا؟“

”نہیں اس وقت مجھے بھوک نہیں ہے۔ کافی تھک گیا تھا۔“

”کیا ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں؟“ وہ بالکل قریب ہو کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”نہیں، بخدا نہیں، میں ناراض نہیں۔ میری غلط فہمی دور ہوگئی۔“ وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

”اچھا تو میں ایک کپ چائے بنا لاؤں آپ کے لیے۔ ساری تکان دور ہو جائے

گی۔

”ٹھیک ہے۔ چلو بنادو۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں مسکرا کر بولا اور وہ میٹھی میٹھی نظروں سے شکر یہ کہہ کر چلی گئی۔

اس نے چائے کا کپ بڑی ادا آنکھوں سے خمار چھلکاتے ہوئے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں دے دیا۔ سہیل پریشان سا اس کی طرف دیکھتا رہا جو نظروں ہی نظروں میں اس کے دل میں اترنے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ چائے پیتا رہا اور اس کے اندر سرد کی مدہم مدہم لہریں اٹھتی رہیں..... اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔ رات کا پتا نہیں وہ کون سا پتھر تھا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان پر آدھا چاند کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ سہیل جیسے کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ معلوم نہیں سوتے میں یا جاگتے میں۔

باہر شاید بارش شروع ہو گئی تھی۔ ماحول پہلے ہی خمار آلود تھا۔ اب وہ آتش ہو گیا تھا۔ گہرے گہرے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ آدھا چاند کھڑکی سے غائب ہو چکا تھا۔ دفعتاً فضا تیز خوشبو سے مہک اُٹھی۔ سفید سرسراتے کپڑوں میں بن آواز کوئی روح اندر داخل ہوئی اور اس پر اپنے شفاف اور گداز پر پھیلا دیے اور آہستہ آہستہ بولی۔ ”میں تم سے محبت کرتی ہوں..... تم میرے ہو..... یقین کرلو..... تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا..... یقین کرلو..... تم میری زندگی ہو.....“

وہ خوشبو وہ سرگوشیاں اس کے دماغ پر چڑھ گئیں۔ اور اب وہ سوتے جاگتے پوری طرح اس کی دسترس میں تھا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھیں۔ موسم شرابیں لٹا رہا تھا۔ اور کمرے میں اس کی تقدیر کے فیصلے ہو رہے تھے۔ وقت دم بخود تھا..... زندگی نامہربان اور قدرت اس کے ضبط اس کے ظرف کا امتحان لے رہی تھی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے بازوؤں پر سوئی ہوئی مہ جبین کی کھلی ہوئی عطر بیز رنفلوں کو بکھرے ہوئے دیکھا اور دل میں کوئی تیر سا پیوست ہو گیا۔ گھڑی دیکھی تو دن کے نو بج رہی تھی۔ اسے اپنی بربادی کا یقین ہو گیا۔ تقدیر نے اس کے ساتھ یہ کیسا کھیل کھیلا تھا۔ اس نے یکبارگی سے سوئی ہوئی مہ جبین کو دھکا دیا۔ وہ نیچے قالین پر جاگری اور جلدی سے اپنے بال سمیٹتی کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کے مقابل کھڑا نفرتوں کی بے انتہا تخیوں سے اسے گھورتا رہا۔

”بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟“ وہ غصے میں بھڑک کر بولا۔ ”ایک شریف

اور بے ضرر انسان کو تم نے اپنی بدکرداری کا زہر پلا کر اتنا کڑوا اتنا زہریلا بنا دیا ہے کہ تمہارے ساتھ کچھ بھی کیا جاسکتا ہے، تمہیں قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔ دھوکا دہی کے الزام میں اور حدود آؤ رڈیننس کے تحت تمہیں کڑی سزا بھی مل سکتی ہے۔ دنیا تمہارا مکروہ چہرہ دیکھے گی، تم پر تھو کے گی اور تمہاری پوری قوم پر لعنت بھیجے گی۔ بتاؤ مہ جبین، تم نے میرے ساتھ یہ فریب کیوں کیا، بولو، جواب دو؟“ سہیل نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور زور سے اس کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ وہ چیخ پڑی۔

”چھوڑ دو مجھے، چھوڑ دو مجھے۔“

وہ اپنے آپ کو چھڑا کر کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور انگلی اٹھا کر لمبی لمبی سانسون کے درمیان بولی۔ ”ایک قدم آگے مت بڑھانا۔ ذرا اپنی فرد جرم بھی تو سن لو.....“ اس کی آنکھوں سے جیسے خون ٹپک رہا تھا۔ ”سنو گنہگار میں نہیں تم ہو..... حدود آؤ رڈیننس کے تحت سزا مجھے نہیں ملے گی۔ قانون ثبوت مانگتا ہے اور ثبوت میں فراہم کروں گی۔ دنیا تم پر تھو کے گی، مجھ پر نہیں۔ مسٹر عزت مآب سہیل انصاری صاحب تم نے وہ مقولہ تو سنا ہوگا کہ کبھی گاڑی ناؤ پر اور کبھی ناؤ گاڑی پر..... آج کا دن میرا ہے، یہ لمحے میرے ہیں..... وہ بے رخی، وہ کج دانی، وہ طمانچہ، وہ دھکے، وہ نفرتیں، وہ سرومہری کا فرض جو تم پر تھا میرا، وہ میں نے وصول کیا ہے۔ محبت کا تاوان تو ابھی تم پر باقی ہے اور اس کے لیے تو پوری زندگی پڑی ہے۔“ وہ خونخوار شیرنی کی طرح جھپٹنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

”کیا بکواس کر رہی ہے ذلیل عورت۔ میرے جرم کا تیرے پاس کیا ثبوت ہے۔ میں نے کیا کیا ہے؟“

”ثبوت کبھی مل جائے گا۔ پہلے اپنے اندر اس عذاب سے گزرنے کا حوصلہ پیدا کرلو۔“

وہ تیزی سے باہر چلی گئی اور سہیل ہارے ہوئے جوار کی مانند تھکا تھکا، اُجڑا اجڑا سا سر پکڑ کر مسمری پر ڈھے سا گیا۔ جاتے وقت وہ باہر سے دروازہ بند کر گئی تھی۔ دو تین گھنٹے کے بعد نہادھو کر ایک نہایت دیدہ زیب سوٹ پہن کر نئے انداز سے بال سیٹ کر کے جب اندر آئی تو وہ بالکل بدلی بدلی سی مہ جبین لگ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ماسی ناشتے کی ٹرائی لیے ہوئے تھی۔ سہیل اس وقت باتھ روم میں تھا۔ مہ جبین نے مسکرا کر ماسی سے کہا۔ ”سب اب تم جاؤ، کوئی فون آئے یا ملاقاتی آئے تو کہہ دینا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔“ وہ سر ہلا کر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد کپڑے بدل کر تو لیے سے بال خشک کرتا سہیل اندر سے نکلا تو وہ سراپا محبت

بنی کھڑی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے تو وہ ڈگمگا گیا پھر چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔ اُلٹا سیدھا بالوں میں برش پھیرا۔

”سہیل صاحب ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ اُس نے آواز دی۔

مگر وہ لائق سے دروازے کی طرف بڑھا۔

”ارے یہ کیا کر رہے ہیں۔ ناشتا کیے بغیر ہی چلے جائیں گے۔“ وہ اس کے سامنے آگئی۔

”میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رُک سکتا۔“ وہ خونخواری سے بولا۔

”ٹھیک ہے مت رُکنا مگر ثبوت تو دیکھتے جاؤ۔“ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ آگئی۔

”کیسا ثبوت؟“

”میرے پاس ہے۔ میں لائی ہوں تمہیں دکھانے کے لیے مگر پہلے ناشتا کرلو۔“
”مہ جبین مجھے تنگ نہ کرو۔ زیادہ ستاؤ گی تو شوٹ کر لوں گا اپنے کو۔ مجھے ثبوت دکھاؤ۔“

اس نے آخر وہ لفافہ پرس میں سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور خود باہر چلی گئی۔ لفافہ کیا تھا موت کا پروانہ تھا۔ اس کی بے خبری کا عذاب تھا۔ اس میں وہ تمام تصویریں موجود تھیں جو اگر اس کے دوستوں یا کاروباری حلقے میں دکھادی جائیں تو واقعی وہ کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ لوگ اس کے مُنہ پر تھوکتے۔ مہ جبین نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ ایک دولت مند نوجوان نے ایک حسین نوجوان لڑکی سے جذباتی کھیل کھیل کر اپنی رات کو رنگین اور لازوال بنادیا تھا جس کے پل پل کی یہ تصویریں گواہ تھیں۔ سہیل کی انگلیاں کانپ رہی تھیں اور جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹ رہا تھا۔ دل میں آگ سی بھڑک اُٹھی تھی۔ پوری دنیا کی نظریں اُس پر لگی تھیں۔ لوگ انگلیاں اُٹھا رہے تھے، تہمتیں لگا رہے تھے آوازیں کس رہے تھے۔ دیکھو دیکھو دیکھو۔ یہ ہے شریف ماں باپ کی ارزل ترین اولاد جس نے اپنے خوب صورت چہرے پر ایک پاکباز نوجوان کا چہرہ لگایا ہوا تھا۔ آج وہ نقاب اُتر گئی تھی۔ اسے مارو سنگسار کر دو اسے قتل کر دو۔ سہیل کی لرزتی پلکیں خوفزدہ نظریں اپنے آپ سے شرمندہ تھیں۔ زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا اپنا یہ گھناؤنا وجود موت کی وادی میں اُتار دے ہمیشہ کے لیے مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اسے غیر مستح کر دیا گیا تھا۔ اس کی طاقت مہ جبین نے چھین لی تھی۔ اب اس کی ڈوری اس کے

ہاتھ میں تھی۔ جس طرح چاہے وہ اسے نچا سکتی تھی۔ وہ تصویریں لفافے میں بند کر کے اس نے میز پر ڈال دیں۔ معلوم نہیں کس وقت مہ جبین اندر آ گئی تھی۔ وہ لفافہ اُٹھا کر بولی۔ ”سہیل! اگر تم چاہو تو مجھ سے سمجھوتہ کر سکتے ہو ورنہ تم جاننے ہو کہ میں نے اتنا بڑا رسک کیوں مول لیا ہے۔ میں تمہیں ہر صورت سے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سہیل نے پوچھا۔ ”کس قسم کا سمجھوتہ کرنا چاہتی ہو مجھ سے؟“

اب کی سہیل کی آواز میں نہ گھن گرج تھی نہ طنطنہ۔ ”مجھ سے شادی کرلو۔ میں تمام زندگی تمہاری داسی بن کر رہوں گی۔“

☆.....☆.....☆

آخر مہ جبین نے وہ ناقابل تخیر قلعہ اپنی شیطانی حکمت عملی سے فتح کر لیا تھا جس کی بقا سہیل کے نیک نہاد اور با کردار اوصاف پر مبنی تھی۔ جس نے کبھی ایسی ذلت آمیز زندگی کا تصور بھی نہیں کیا تھا عوام پر مسلط کر دی گئی تھی۔ اس سازش میں مہ جبین کی والدہ اور خود اس کے وفادار ملازم شریک تھے۔ آج اسے معلوم ہوا کہ اس محبت و دلداری اور توجہ کے پس پردہ کون سے خوال کا م کر رہے تھے۔ بدی اگر جاذب نظر لباس اور چہرے پر فردوس کا حسن سجا کر آئے تو بڑے بڑے پارسیوں کے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ وہ تو پھر ایک سیدھا سادہ مرد ہے جس نے مشرقی اقدار کا سبق اس ماں سے سیکھا تھا جواب اس دُنیا میں نہیں تھی۔ کون اس کے آگے ڈھال بنتا۔ کون اس کے لیے سجدوں میں گر کر اپنے خدا سے اس کی عافیت کی دُعائیں مانگتا۔ وہ تو اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ جب گھر سے نکلتا تو وہ اس کا صدقہ اتارتی۔ جب گھر میں آتا تو شکرانے کے نفل ادا کرتی۔ وہ مہربان ساتھ کیا چھوٹا جیسے قدرت نے رحمت کا سایہ چھین لیا اور دنیا کا ہر فتنہ اس کے راستے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کس کس سے اپنے کو بچاتا۔ آخر پکڑا گیا۔

”مہ جبین۔ تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اس کا مجاہدہ تو روزِ محشر ہوگا لیکن مجھ سے کبھی وہ محبت و التفات نہیں پاسکو گی جس کے لیے تم نے یہ گھناؤنا قدم اُٹھا کر میرے اور شازلی کے درمیان دیوار کھڑی کر دی۔“

شادی کی پہلی رات یا قتل کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے سہیل انصاری نے بڑے دل گیر لہجے میں کہا۔ ”تم نے مجھے زندہ درگور کر دیا مہ جبین۔ اگر صرف جسم کا اتصال تمہاری کامیابی ہے تو میں تمہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں لیکن میرے دل اور میرے ذہن تک تم

کبھی رسائی حاصل نہیں کر سکوگی۔“

اس رات مہ جین نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے، گڑ گڑائی، اس سے معافی مانگی، روٹی اور تمام تصویروں کو مچ نیکٹو کے آگ دکھادی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر قسم کھائی کہ اس کا ارادہ یہ تصویریں کسی کو دکھانے کا نہ تھا۔ یہ تو محض ایک دھمکی تھی۔ ”میں نے یہ سارا ڈراما تمہیں گاؤں نہ جانے کے لیے کیا تھا کہ وہاں جا کر تم شازلی سے شادی نہ کر سکو۔ اگر میں یہ پلاننگ نہ کرتی تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھودیتی۔ سہیل یہ میری محبت کی انتہا تھی کہ میں تم سے بچھڑ کر نہیں جی سکتی تھی۔“

”مت لومیرے سامنے محبت کا نام۔“ وہ سرگوشی میں چیخا اور اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”کیا محبت کرنے والے اسی طرح اپنے محبوب کو بلیک میل کرتے ہیں۔ انھیں رسوائی کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں۔ محبت تو قربانیوں کا نام ہے مہ جین۔ لوگ تو وفا پر جان وارد دیتے ہیں تم..... تم نے مجھے مار دیا۔ کہیں کا نہ رکھا مہ جین۔“ وہ بے حد آب سیٹ تھا۔

”مجھے معاف کر دو سہیل۔ جو چاہے سزا دے لو پر مجھ سے منہ نہ موڑو۔“
”نہیں میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اب معافی کا لفظ تمہاری زبان پر نہ آئے۔“

وہ رات اور پھر بہت سی راتیں مہ جین کی روتے تڑپتے گزر گئیں مگر سہیل کے دل میں وہ ذرا بھی جگہ نہ بنا سکی اور ہاتھ سے سر پھوٹتی رہی۔

☆.....☆.....☆

گزرتے وقت کا ہر لمحہ مہ جین کو ایک مطلق العنان جابر ملکہ کے روپ میں ڈھالتا رہا۔ خدا نے اسے دو بیٹے دو بیٹیاں دیں مگر انھیں سہیل کی اولاد سمجھتے ہوئے باپ کی نفرتوں کا انتقام ان سے لیا۔ انہیں نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور خود پارٹی، کلب میں وقت گزارتی رہی سہیل نے کچھ نہیں کہا اور بچوں کو کیلجے سے لگا کر اس کے لیے بہتر سے بہتر گورنس کا انتظام کیا۔ وہ بڑے ہوئے تو لڑکوں کو ہوشل میں داخل کر دیا اور بڑی بیٹی عشرت آرا کی شادی اچھی جگہ کر دی۔ چھوٹی بیٹی میں تو ان کی جان تھی۔ وہ کالج میں پڑھتی رہی۔ جمیل انصاری ان کا بے حد ہونہار بچہ تھا۔ انہیں اس میں اپنی صورت نظر آئی تھی۔ اس کی خواہش پر اسے بزنس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیج دیا۔ دوسرا بیٹا کفیل بھی ان کا تابعدار تھا مگر تھوڑا سا ضدی تھا۔ اسے لیکچرار بننے کا شوق تھا اس لیے بڑھ لکھ کر وہ تدریسی شعبے سے منسلک ہو گیا۔ ماں سے ہر بچہ ڈرتا تھا۔ کوئی مطالبہ کوئی خواہش ہوتی وہ باپ ہی سے کہتے

اور وہ مطالبہ وہ خواہش ان کی فوراً پوری ہو جاتی تھی۔ یہ شاید سہیل انصاری کے صبر اور خاموشی کا صلہ تھا کہ چاروں بچے باپ کی طرح خوب صورت، دلکش، ذہین، شفیق اور محبت کرنے والے تھے۔ ماں سے خوفزدہ اور باپ سے قریب تر۔ یہ باتیں یہ مظاہرے مہ جین کو ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ اسے اذیت میں مبتلا کر دیتے کہ اس کی اولاد اس سے دور بھاگتی ہے جس نے انہیں پیٹ میں رکھا پھر تخلیق کے عذاب سے گزری مگر اس نے یہ نہیں سوچا کہ صرف پیٹ میں رکھنے اور پیدا کر دینے سے اس کو وہ درجات نہیں مل جاتے جو ماں کے منصب کو پورا کرتے ہیں۔ اس نے انھیں محبت اور توجہ ہی کب دی تھی۔ ان کے دکھ سکھ میں کب شریک رہی۔ جب وہ گوشت پوست کے مجبور و بے بس ننھے وجود تھے۔ اپنے ہاتھ سے منکھی اڑانے اور منہ میں غذا ڈالنے کے قابل بھی نہ تھے۔ جب انہیں ماں کی بھرپور توجہ، اس کی محبت کی ضرورت تھی اس وقت اس نے انہیں نوکروں کے اوپر چھوڑ دیا اور خود موسم بہار کی رنگین تلی کی مانند کلبوں اور پارٹیوں میں اڑتی پھری۔ ایسے وقت میں سہیل نے انھیں کیلجے سے لگایا۔ ان کی بے بسی پر آنسو بہانے اور گھر میں نوکروں کی لائن لگادی کہ بچوں کی نگرانی اور توجہ میں کسر نہ رہ جائے۔ پھر وہ اولاد اس بے رحم ماں کو کس طرح اپنی جنت کا درجہ دیتی۔ جنت یونہی تو ماؤں کے قدموں تلے نہیں رکھ دی گئی تھی۔ بغیر محبت اور ایثار کے بغیر دل جلانے، بغیر آنسو بہانے، آزمائش کھٹائیوں اور پل صراط سے گزرے بغیر۔

آج بھی سہیل کو شازلی کا وہ پہلا پہلا روپ یاد آ جاتا تو اس کے دل سے کراہ نکل جاتی اور وہ بے چین ہو جاتا۔ کون کہتا ہے کہ خورس صرف آسمان پر ہوتی ہیں۔ نہیں کبھی کبھی وہ زمین پر بھی راستہ بھول کر آ جاتی ہیں دنیا کی دلکشی بڑھانے کے لیے اور شاید شازلی بھی کوئی جھٹکی ہوئی حور تھی اسی لیے وہ اس کا مقدر نہ بن سکی۔

ویسے تو مہ جین کو اپنے بچوں کے حال اور مستقبل سے کوئی سروکار نہیں تھا مگر ایک کام ضرور کیا تھا کہ اپنی سوتیلی بیوہ بہن کی لڑکی دل نشین سے جمیل کی شادی کر دی تھی۔ یہاں پر ضرور اپنا حق استعمال کیا تھا۔ حالانکہ جمیل نے بہتیرا انکار کیا کہ مجھے دل نشین پسند نہیں مگر اس کی ایک نہ چلی۔ دل نشین زیادہ تر باہر رہی تھی۔ مغربی دنیا کی رنگینیوں اور آزاد فضاؤں کو اس نے اپنی سانسوں میں اتارا تھا۔ باپ کے مرنے پر وہ پاکستان اپنے ننھیال آ گئی۔ پڑھتی رہی۔ مگر اس کی عادتیں لڑکوں جیسی تھیں۔ اسکرٹ اور جینز پہننا، دھول دھپا کرنا اور سگریٹ نوشی اس کے محبوب مشاغل تھے۔ لڑکیوں جیسی نہ اس میں نزاکت تھی نہ شرم وحیا، نہ ذوق نفاست۔ لب و لہجہ بھی اکھڑ تھا۔ مہ جین اپنی بہن اور بھانجی سے بے حد

متاثر تھی اور دل نشیں بھی اپنی خالہ پر جان دیتی تھی۔ تب ہی انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دل نشیں کو اپنی بہو بنائیں گی۔ کوئی تو اس کا ہم خیال، ہم مشرب، ہمدرد ہوگا۔ پھر میاں جمیل کی خود مختاری اور چودھراہٹ کا سورج ہمیشہ کے لیے ڈوب جائے گا جو ہر دم باپ کے پہلو میں منہ گھسائے رہتا ہے بچوں کی طرح۔

مہ جبین اپنی سوچ پر مسکرا دی

شادی کے بعد پتا چلا کہ دل نشیں کی زبان کے نیچے بھی وہی بارودی خانہ چھپا ہوا تھا جو مہ جبین کو قدرت نے بخشا تھا۔ وہ بھی شوہر سے زیادہ اپنی ذات کو نوقیت دیتی تھی۔ محبت کے معاملے میں وہ بھی اپنی خالہ کی طرح بد نصیب نکلی۔ جس کے حصے میں شوہر کی محبت اور توجہ نہ آئی۔ اگر دل نشیں جمیل کو اپنا مجازی خدا سمجھتے ہوئے اسے وہی عزت اور محبت دیتی تو یقیناً جمیل کو بھی احساس ہوتا۔ وہ ہرگز اس کی حق تلفی نہ کرتا لیکن یہاں تو معاملہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا تھا۔ یہ رشتے شخص اپنا اور خود داری کی تسکین کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ رفاقت کے لیے نہیں۔

ان دنوں کفیل کے کالج میں تقسیم اسناد کی تقریب ہونے والی تھی اور صوبے بھر میں جس لڑکی نے ٹاپ کیا تھا وہ ایک فلاحی ادارے ”نشیں“ کی لڑکی شجیہ مراد علی تھی۔ مراد علی کا نام پکارا گیا تو ایک پیاری سی بڑی بڑی آنکھوں جھکی جھکی پلکوں اور خوب صورت نقش و نگار کی لمبی سی ڈبلی پٹلی لڑکی اپنی دوپٹا سنبھالتی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدموں سے ڈاس پر آئی۔ اس کی پشت پر گھنے بالوں کی لمبی چوٹی پڑی تھی۔ آتے ہی اُس نے جھک کر معزز مہمان کو سلام کیا۔ جمیل کو ایک ہی نظر میں وہ معصوم سی اجلی اجلی رنگت والی کامنی سی لڑکی اچھی لگی۔ سہیل انصاری بھی شجیہ مراد علی سے متاثر نظر آرہے تھے۔ وہ بیٹے کی طرف ہنسنے سے دیکھ کر مسکرا دیے جس کی نظریں بار بار اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور جب وہ گولڈ میڈل اور سند لے کر تالیوں کی گونج میں ڈاس سے اتری تب بھی جمیل کی نظریں اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ باپ بیٹوں میں انتہائی مفاہمت تھی۔ گھر جا کر جمیل نے کہہ دیا۔ ”پاپا! میں شجیہ مراد علی سے شادی کروں گا۔“

”دوسری شادی؟“ وہ بے ساختہ مسکرائے۔

”پاپا! میں کوئی حرج نہیں سمجھتا جبکہ مجھے اس کا حق ہے۔“

”ہاں! اگرچہ دل نشیں تمہیں اس کی اجازت دے دے۔“

”پاپا! دنیا جانتی ہے کہ ممانے زبردستی اسے میرے پتے باندھا ہے جب کہ میں راضی نہیں تھا۔ اب میں اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہوں تو انھیں بھی اعتراض نہیں کرنا

چاہیے۔“ اوکے بیٹا، مگر پہلے اپنی ماما کو تو بتادو۔ شاید وہ دل نشیں سے تمہاری سفارش کر دیں۔“ سہیل انصاری مسکرائے۔

”آپ بھی کتنے بھولے ہیں پاپا! اگر شجیہ مراد کسی وزیر کسی سفیر کی بیٹی یا بہن ہوتی تو بلا شبہ انہیں کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر ایک غریب ادارے میں پرورش پانے والی لاوارث لڑکی سے بھلا انہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ تو ہنگامہ کھڑا کر دیں گے۔“

ان دنوں دل نشیں لڑجھکڑا اپنے میکے چلی گئی تھی۔ ویسے بھی جمیل اسے منہ نہ لگاتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ بے تحاشہ اسموکنگ کرتی تھی۔ کمرے میں ہر لمحے سگریٹ کا دھواں اور اس کی موچکرائی چکرائی پھرتی تھی جمیل نے کتنی بار اسے اس کی اس قبیح عادت پر ٹوکا۔ ہر بار اُس نے سنی کی ان سنی کر دی اس لیے جمیل نے علیحدہ کمرے میں سونا شروع کر دیا۔ دنوں میں اسی بات پر جھگڑا ہوتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ ”شریف اور باحیا عورتوں کی طرح رہو۔ مجھے عورتوں کا سگریٹ نوشی کرنا سخت زہر لگتا ہے۔“

”میرا جو چاہے گا کروں گی۔ تم کون ہوتے ہو مجھ پر پابندی لگانے والے؟“ وہ غصے میں جواب دیتی۔

”میں تمہارا شوہر ہوں۔ اگر یہ پابندی قبول نہیں تو چلی جاؤ اپنے ماں باپ کے گھر۔“ اور وہ باہر چلا جاتا۔ اس پر دل نشیں رونا چیخنا اور اپنی خالہ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتی کہ اس نے میری قسمت پھوڑ دی۔ تب مہ جبین کو مداخلت کرنا پڑتی۔ اس کے بعد دل نشیں اپنی کسی سہیلی کو گھر لے آئی۔ مہ جبین نے کوئی توجہ نہ دی مگر جب وہ کئی دن تک واپس نہ گئی تو خالہ نے باز پرس کی۔ تب دل نشیں نے بتایا۔ ”اسے ماں باپ نے گھر سے نکال دیا ہے کیوں کہ یہ ایک موچی کے لڑکے سے شادی کرنے پر بضد ہے اور ماں باپ نہیں چاہتے۔ لڑکی کے والدین نہایت شریف اور کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ اپنی عزت کی خاطر انہوں نے لڑکی سے کہہ دیا کہ جہاں جی چاہے شادی کرو۔ رہو بسو مگر اب اپنی شکل ہمیں نہ دکھانا۔“

مہ جبین گھبرا گئیں اور بھانجی پر غصہ کرنے لگیں۔ بولیں۔ ”نہ بی بی۔ ہم پرانی مصیبت کیوں اپنے سر لیں۔ کل کلاں کو ہم پر اغوا کا مقدمہ چلا دیں تو ہم کیا کر لیں گے۔ چلتا کرو اسے۔ ہم اپنے گھر نہیں رکھ سکتے۔“ وہ غصے میں بھڑک ہی تو اٹھیں۔

اس پر خالہ بھانجی میں ٹھن گئی۔ دل نشیں نے ذرا بھی لحاظ نہیں کیا اور خوب سنائیں۔ برا بھلا کہا اور لڑجھکڑا کر چلی گئی۔ دوسرے دن سنا کہ لڑکی کا نکاح اس موچی کے لڑکے سے

ہو کیا دل نشیں کی کوششوں سے مگر پھر دل نشیں گھر نہیں آئی۔ اس کی ماں بے آرام سے کہا۔ ”وہ ابھی بچی ہے۔ تمہیں ہی پیار محبت سے سمجھانا چاہیے تھا۔ اب جا کر خود آؤ۔ وہ کہتی ہے جب تک خالہ لینے نہیں آئیں گی میں نہیں جاؤں گی۔“

الٹامہ جبین نے انھیں لاتاڑ دیا۔ بولیں۔ ”اے بی بس رہنے دو۔ ہاتھ بھر کی زبان تمہاری بیٹی کی اور مردوں جیسے پچھن۔ نہ باہر گھومنا پھرنا چھوڑنی ہے نہ سگریٹ پینا۔ میں کس کس بات پر اسے سمجھاؤں۔ میاں سے تو بنتی ہی نہیں تھی۔ اب اُس نے مجھ بھی زبان چلانا شروع کر دی۔ ذرا بھی جو عزت کرتی ہو میری۔ آتی ہے آئے نہ آ۔ میری جوتی سے۔“

مہ جبین سدا کی کڑوی زبان کی تھیں، اوپر سے بہو آئی نیم چڑھی۔ بالکل اپنے چھانٹ کر لائی تھیں تاکہ باپ بیٹے کو دبا کر رکھے مگر وہ تو ساس آنکھیں دکھانے لگی۔ مار بے چاری اپنا سامنہ لے کر چلی گئیں۔ اپنی ذات سے وہ اچھی عورت تھی مگر بیٹی نے خواہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد سے مہ جبین کا دل اس کی طرف سے کھٹا ہو گیا تھا۔ جمیل کے لیے تو دل نشیں کا وجود بھی عدم وجود کے برابر تھا۔ وہ رہتی یا جاتی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے بعد سنا گیا کہ دل نشیں اپنے ماموں کے پاس امریکہ چلی گئی۔ نہ اس نے میاں سے اجازت مانگی نہ ساس سر سے ملنے آئی، خس کم جہاں پاک۔ دل نشیں نے اطمینان کی سانس لی۔

اس کے دو تین ماہ بعد یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا یعنی تقسیم اسناد کی تقریب اور شجیہ مراد کا گولڈ میڈل کے لیے ڈاکس پر آنا جمیل انصاری کے لیے انقلاب لے آیا اور اس کی سوچیں بدل گئیں۔ گھر آئی اس نے پہلے باپ سے اپنے دل کی بات کہی پھر ماں سے بلا جھک اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ پہلے تو مہ جبین اپنے بیٹے کی شکل دیکھتی رہ گئیں پھر انہوں نے پوچھا۔ ”اپنے پاپا سے بات کی تھی؟“

”جی ہاں۔ انہوں نے اجازت دے دی ہے۔“

”جب پاپا نے اجازت دے دی تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ جو جی میں آئے کرو۔“ مہ جبین نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔

”اس لیے کہ سلسلہ جنہابی آپ کو کرنی ہے پاپا کو نہیں۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے دھیرے سے کہا۔

”ٹھیک ہے دیکھا جائے گا۔ چلی جاؤں گی۔“ انہوں نے گویا پیچھا چھڑایا۔

اس وقت مہ جبین کو دل نشیں پر غصہ تھا۔ اس نے ساس کی بات نہ مان کر سر اسراں کی

توین کی تھی۔ اب یہ اچھا موقع تھا کہ جمیل کو دوسری شادی کی اجازت دے کر وہ دل نشیں سے اپنی توہین کا بدلہ لیں۔ گھر میں سوکن آئے گی تو پتا چلے گا کہ شوہر اور ساس کے اختیارات کیا ہوتے ہیں اس لیے انہوں نے جمیل کی شجیہ مراد کے ساتھ شادی میں دلچسپی لی تھی، پھر سہیل انصاری نے بھی مہ جبین سے شجیہ مراد کا مختصر تعارف کرا کے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ دل نشیں کی جمیل سے زبردستی شادی کر کے جو زیادتی تم نے اپنے بیٹے کے ساتھ کی ہے شجیہ سے عقد ثانی کر کے تم اس کا کفارہ ادا کر سکتی ہو۔“

”لیکن دل نشیں اس گھر سے ہمیشہ کے لیے تو نہیں چلی گئی یا اسے طلاق تو نہیں دے دی گئی۔ آخر وہ آئے گی تو کیا اس کے ساتھ زیادتی ہوگی؟“ مہ جبین نے ناگواری سے کہا۔

”طلاق کی بات نہ کرو مہ جبین۔“ سہیل انصاری کو غصہ آ گیا۔

”اگر ہمارے خاندان میں طلاق کا رواج ہوتا تو میں سب سے پہلے تمہیں طلاق دیتا تاکہ آج تمہاری جگہ کوئی نیک، سمجھدار بیوی اور دل نشیں کی جگہ کوئی خوش قدم خوش اطوار بہو ہوتی، پھر نہ کسی شجیہ مراد علی کا ذکر ہمارے درمیان آتا نہ ہماری زندگی کو کسی خوشگوار تبدیلی کی ضرورت پیش آتی، ہمارا گھر جنت نظر ہوتا۔ رہ گیا دل نشیں کے ساتھ زیادتی کا معاملہ تو مہ جبین بھی تو انصاف کی بات کر لیا کرو۔ آخر خدا کے گھر جانا ہے۔ کیا منہ دکھاؤ گی اسے اپنی چھجکتی بہو کا طور طریقہ دیکھا ہے تم نے؟ شوہر تو شوہر، وہ تو تمہیں بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ کیا فرائض ادا کیے ہیں اس نے تمہارے اور گھر کے اور کیا حقوق ادا کیے ہیں اس نے شوہر کے؟ یہی ناکہ جہاں جی چاہا اٹھ کر چلی گئی۔ نہ کسی سے کہنے کی ضرورت نہ سننے کی۔ کیا گھر سے لڑ جھگڑ کر جانے میں تمہاری یا جمیل کی طرف سے کوئی زیادتی ہوئی تھی؟ چلو فرض کر لیا کہ اسے تمہاری کوئی بات بُری لگی تو پھر اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔ شوہر نے اس پر کیا ستم توڑا تھا کہ گھر سے ایسی نکلی کہ امریکہ جا پہنچی۔ تب بھی خیال نہ آیا کہ فون پر ہی شوہر سے بات کر لیتی۔ جب اسے ہم سے تعلق ہی نہیں تو جو چاہے کرنی پھرے۔ نہ ہم نے پہلے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی نہ آگے کرنے کا ارادہ ہے۔“

مہ جبین کڑوی کیسی نظروں سے شوہر کو دیکھتی رہی اور کسم کسم کر پہلو بدلتی رہیں۔ موقع نہیں تھا کہ زبان کھولتیں۔ جس مہرے کو لائی تھیں وہی پٹ چکا تھا۔ چنانچہ خاموش رہی اور شجیہ مراد علی جمیل انصاری کی دوسری بیوی بن کر ”جمیل پیلس“ میں آ گئی۔ سب ہی خوش تھے علاوہ مہ جبین کے۔ لاکھ اسے دل نشیں کی طرف سے دھچکا پہنچا تھا مگر اس کے یہ

خیالوں میں بوڑھے گنگا اور کرناٹلی تک ہاتھ پاؤں مارتی چلی گئی مگر اسے کوئی نشان نہ ملا۔ اس کی پلکیں آنسوؤں سے جھل جھل ہو گئیں مگر وہ ہونٹ بھیجنے خاموشی سے ان کی طرف کی لمبائی چوڑائی ناپتی رہی۔ تب مہ جبین نے کہا۔ ”تم ادھر انیکسی میں چلی جاؤ۔ یہ کمرادل نشیں کا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی دل نشیں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر دھکا دیا وہ گرتے گرتے بچی۔ گھر کی نوکرانی اس کا ہاتھ تھامے اسے انیکسی میں لے آئی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کے سامان کی چاند ماری شروع ہو گئی۔ جب سہیل انصاری کو معلوم ہوا تو وہ سیدھے انیکسی پہنچے اور سارا وقت بلکہ پوری رات انیکسی میں گزرا کر صبح وہیں سے آفس چلے گئے نہ گھر میں گئے نہ کسی سے بات کی۔ انہیں اس واقعے سے بے حد صدمہ پہنچا تھا۔ آفس سے انہوں نے جمیل انصاری کو فون کر کے پورے حالات سے آگاہ کیا اور کہا۔ ”تم اطمینان سے کام کرو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ جب آنا تو اپنے گلشن والے بنگلے میں آنا۔“

اور ایک ہفتے میں انہوں نے بنگلے کو سیٹ کر لیا۔ پھر زہت، شجیہ اور دونوں کڑوں کے ساتھ گلشن شفٹ ہو گئے۔ مہ جبین اور دل نشیں تملاکر رہ گئیں اور شجیہ نے آزادی کی سانس لی۔ اپنی سہیلی کی شادی تک زہت، شجیہ کے ساتھ رہی پھر ہوسٹ چلی گئی۔ دو تین دن جب سہیل گھر نہیں آئے تو مہ جبین نے فون کر کے پوچھا۔ ”آخر آپ گھر کیوں نہیں آ رہے ہیں۔ دل نشیں آپ کو بہت یاد کر رہی ہے۔ کم سے کم بہو سے ملنے تو آ جائیں۔“ انہوں نے فون پر ہی جواب دیا۔ ”مہ جبین۔ میں گھر کیوں نہیں آ رہا۔ اس کی وجہ تم جانتی ہو۔ گھر کو تم نے گھر کہاں رہنے دیا، اسے جہنم بنا دیا ہے۔ دل نشیں میری نہیں۔ وہ تمہاری بہو ہے۔ فی الوقت میں بہت مصروف ہوں۔“ فون بند ہو گیا۔

پندرہ دن بعد جمیل آ گیا۔ رات بڑی دیر تک شجیہ اس کی ہانپوں میں منہ چھپائے سکتی اور گلہ کرتی رہی کہ آخر آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ آپ کی کوئی پہلی بیوی بھی ہے اس میں کیا مصلحت تھی؟“

”شجیہ رانی۔ اگر میں بات بتا دیتا تو مسز رحمن عظیمی ہر گز ہر گز مجھ سے تمہاری شادی نہ کرتیں جب کہ تمہارا حصول میری زندگی بن چکا تھا۔ میں تمہارے بغیر ادھورا تھا۔ پاپا نے بھی اس مصلحت کی بنا پر یہ چھپالی اور امی ان دنوں چونکہ دل نشیں سے ناراض تھیں اس لیے وہ بھی چپ رہیں۔ اب تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔“ دوسرے دن جب جمیل انصاری ماں سے ملنے گھر گیا تو بجائے شرمندگی، نرمی اور محبت

بھی معنی نہ تھے کہ وہ سہیل انصاری اور اس کی اولاد سے ہار جاتی۔ ہر گز نہیں۔ جب کہ.... آج تک وہ اس آگ میں جل رہی تھی کہ سہیل انصاری نے اس کی محبت کو ٹھکرایا تھا۔ اسی دکھ نے انتقام کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دل نشیں سے جمیل کی شادی بھی انتقال کی ایک کڑی تھی اور اسی انتقام خود آرائی نے اس کے اس جذبے کو خاستر کر دیا تھا جسے ”ممتا“ کہتے ہیں۔ رحم اور انصاف سے خالی اس دل میں صرف اپنی ذات کا دکھ بھرا ہوا تھا۔ کسی کے لیے اس اندر کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ ایک طرف تو وہ دنیا دکھاوے کے لیے شجیہ مراد کو بہو بنا کر لے آئی۔ دوسری طرف اس نے اپنی بہن کو فون کر دیا اور بولی۔ ”اگر پاگل بے وقوف سے کہنا کہ اگر اپنا گھر بچانا ہے تو فوراً آ جائے۔ جمیل تمہارے اوپر سوکن لے آیا ہے۔“

یہ خبر ایٹم بم بن کر مٹھی اور دل نشیں کو ریزہ ریزہ کر گئی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ خود! منفرد اور ماوری سمجھنے والی کے مقابلے پر بھی کوئی آ سکتا ہے۔ یہ بات تو اس نے سوچی بھی نہ تھی۔ جمیل کو کاٹھ کا آٹو سمجھنے والا دل یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اسے بھی اپنے اختیارات کے استعمال کا ہنر آتا ہے۔“

پہلی فلائٹ سے وہ پاکستان آ گئی جب کہ جمیل بزنس ٹور پر برونائی میں تھا اور شجیہ کو علم نہیں تھا کہ اس کے تعاقب میں کوئی طوفان چلا آ رہا ہے۔ کسی نے بھی یہ نہیں بتایا کہ جمیل کی اس سے یہ دوسری شادی ہے۔ جب وہ آئی تو خالہ سے لپٹ لپٹ کر خوب روئی، معافی مانگی اور بولی۔

”آپ کے ہوتے ہوتے میری چھاتی پر سوکن آ گئی اور آپ کچھ نہ کر سکیں۔“

مہ جبین بھی سارے گلے شکوے بھول کر اس کی مدد کے لیے تیار ہو گئیں۔ ایک سے دوسرے بھلے کے مصداق۔ انہیں بھی حوصلہ ہوا اور اس طرح دل نشیں معصوم اور بے خبر شجیہ پر شیرنی کی طرح جھپٹ پڑی۔ شجیہ نے کچھ گھبرا کر، کچھ حیران ہو کر ساس کی طرف دیکھا۔ ”امی جان، مجھے تو کسی نے بھی یہ بات نہیں بتائی؟“

بجائے مہ جبین کے دل نشیں چمک کر بولی۔ ”کیوں کیا تمہارے اماں باوا نے چھان پھٹک نہیں کی تھی کہ بندہ کنوارا ہے یا شادی شدہ یا محض دولت مند اور گھبرو جوان دیکھ کر دو بول پڑھا دیے؟“ اس کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔

شجیہ کا دل لہلہا ہوا گیا۔ ”میرے اماں باوا۔ اللہ انھیں رہتی دنیا تک رکھے۔ کاش اگر وہی طاقت ور ہوتے یا اختیار ہوتے تو آج ہم اس طرح ٹھوکریں کھاتے ہوئے مقام بے ضمیری تک کیوں آ جاتے۔ معلوم نہیں وہ کہاں اور کس عالم میں ہوں گے۔“ وہ خیالوں

فرشتہ صفت شوہر پر نہ توڑی ہو۔ کس بے رحمی سے سنگدلی سے گھر اور بچوں سے اپنا دامن جھٹکا تھا اور دل نشیں جیسی نااہل بدکردار لڑکی کو جمیل کی بیوی بنا کر۔ پھر شجیہ جیسی بے زبان پھولوں جیسی پاکباز بہو کو ذلیل کر کے اپنے ظلم کے تابوت میں آخر کیل ٹھونک کر کیا پالیا تھا؟ جبر و کراہ سے گزرا ہوا ایک ایک پل ان سے حساب مانگ رہا تھا..... انصاف کا تقاضا کر رہا تھا اور وہ بولا ہی جارہی تھیں۔ آنکھوں پر سے پردے ہرک رہے تھے.....!

☆.....☆.....☆

اللہ بخشے اور نوازنے میں دیر نہیں لگاتا وہ بڑا نعم البدل ہے۔

شجیہ کو بھی خدا نے تمام کمال احسن و آسائش بخش کر جانے کن کن زیادتیوں اور دکھوں کا مداوا کر دیا تھا۔ جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو اسے اس رہزور پر کچھ کچھ دھندلے چہرے نظر آ جاتے۔ وہ اپنی روتی بلبلی ماں کو دیکھتی جو برسوں گزر جانے کے بعد بھی اپنی بیٹی کو نہیں بھولی تھی۔ وہ یا گلوں کی طرح انڈیا اور پاکستان سے آنے والے ان انسان نما مہڑیوں کا دامن پکڑ کر پوچھتی تھی۔ ”بتاؤ میری بیٹی کہاں ہے؟ میری سچو ٹھیک تو ہے؟ اس کا شوہر کیا کرتا ہے؟ کتنا بڑا آدمی ہے وہ؟ اس کے کتنے بچے ہیں؟ اسے ایک نظر لاکر مجھے دکھا دو۔ میری آنکھیں ترس گئی ہیں۔“

اور وہ لوگ ایک کمروہ تہقہہ لگا کر اس دیوانی کو الٹی سیدھی تسلیاں دے کر چلے جاتے پھر کسی ماں کی گودا جازنے کے لیے۔

اب اس کے سامنے اس کا بوڑھا کمر خیدہ باپ تھا جس کی آنکھیں بے نور اور چہرہ پتھر کا ہو گیا تھا اور نوکریاں بنا بنا کر اس کی انگلیاں میڑھی ہو گئی تھیں۔

پھر اس کے خیف و زار بہن بھائی نظر آئے جو ناریل کے خشک پتوں سے تیلیاں نکال نکال کر گٹھے بناتے اور داب توڑ توڑ کر بیچتے تھے۔ زندگی کس قدر محال ہو گئی تھی۔ انہیں لوگ روٹی کے ایک سوکھے ٹکڑے کو محتاج تھے اور انہیں صاحب لوگوں کے کتے بلیاں نرم قالینوں پر آرام فرما رہے تھے۔ یہ تیسری دنیا کا ایک بڑا المیہ اور ہمارے ارباب اقتدار کی بے حسی کی زندہ تصویریں تھیں۔

اس نفسا نفسی بے خونی اور خود پرستی کے دور میں بے وسیلہ بے سہارا لوگوں پر روزگرتی قیامتیں ٹوٹتی ہیں؟ یہ کوئی ان سے جا کر پوچھے کہ طوفان میں گھرے ہوئے ٹوٹے پھوٹے انسان زندہ کیسے ہیں؟ جب بھی اسے بنگلہ دیش میں محصورین پاکستانیوں کے بوسیدہ اور زندگی کی سہولتوں سے محروم کمپسوں میں رہنے والے خاندانوں کی حالت زار کا خیال آتا جن میں اس کے اپنے ماں باپ بھائی بہن بھی ہوتے تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا

سیلا اُمند بڑتا۔ حلق میں نوالے انک انک جاتے۔ وہ اس قدر بے اختیار ہو جاتی کہ اس کا جی چاہنے لگتا کہ وہ جمیل سے کہے کہ مجھے میرے ماں باپ کے گھر چھوڑ آئیں۔ میں انھی کے ساتھ جینا اور انھی کے ساتھ مرنا چاہتی ہوں۔ مجھے نہیں چاہیے تمہارا یہ بنگلہ کوٹھی، یہ دھن دولت، سونا چاندی، نہیں چاہیں یہ لذیذ کھانے، ریشمی قیمتی لباس اور نرم بستر۔ خدارا۔ مجھے انھی بے ریا خلوص سے لبریز، محبتوں سے پھلکتی فضاؤں میں لے چلو جن کی نرم پیار بھری بانہوں میں جھولا جھولتے، ہنستے کھیلتے میں نے بارہ سال گزارے تھے۔ وہ میرا گل ہے.... میں اس کے بغیر ادھوری ہوں.....

”نہیں شجیہ تم ایسا نہیں کرو گی....“ اس کے کانوں میں مسز شفیق کی شفیق اور نرم آواز گونج گئی۔ ”وعدے کا بھرم گرٹوٹ گیا تو پھر پاتی کیا بنے گا....؟“

اور شجیہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ وہ بھول گئی تھی کہ اس کی مہربان مام نے رخصت کرتے وقت اس سے ایک عہد لیا تھا۔ انہوں نے گلے سے لگا کر کہا تھا۔ ”بیٹی۔ میں نے تمہیں اس معاشرے میں اعلیٰ مقام دینے کے لیے بڑی محنت کی ہے۔ اگر میں نے تمہارے چہرے، تمہارے ذہن کو نہ بڑھا ہوتا تو شاید میں تمہیں بھی ایک عام لڑکی کی طرح کسی اسکول بچہ کے حوالے کر دیتی مگر تم عام لڑکی نہیں تھیں۔ غربت اور امارت کی طرح ذہانت بھی کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ یقیناً تم ایک شریف ماں باپ کی بیٹی تھیں۔ زمانے نے تمہارے ساتھ جو بھی سلوک کیا ہو مگر میں نا انصافی نہیں کر سکتی تھی۔ میرے ادارے کو عرصے کے بعد تم جیسی لڑکی ملی تھی۔ میں تمہارے جو ہر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ لاکھوں شکر کہ آج خدا نے مجھے سُرخ رو کیا اور تم اپنی تعلیم کے شاندار ریکارڈ کے ساتھ ایک اچھے گھر کی بہو اور ایک محبت کرنے والے قدردان شوہر کی بیوی بن کر جا رہی ہو یہاں سے۔ ایک وعدہ کرو کہ تم ابھی اپنے ماضی کی یہ سربہ مہر کتاب نہیں کھولو گی۔ یہاں آنے والی ہر لڑکی اپنے حال اور مستقبل سے پہچانی جاتی ہے، اپنے ماضی سے نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ یہاں آنے والی لڑکیاں کتنی مجبور اور مظلوم ہوتی ہیں اور کوئی بھی مہذب خاندانی انسان ان کے ماضی کا حوالہ پسند نہیں کرتا۔ اب تمہاری دنیا..... تمہاری پہچان، تمہارا ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ تمہارا شوہر اور اس کا خاندان ہے.....!

یہ وعدہ ایک ماں نے اپنی بیٹی سے لیا تھا۔ اس کی خوشی اور سلامتی کے لیے.... اور بیٹی نے ماں کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر یقین دلایا تھا کہ میں آپ کے اعتماد کو نہیں نہیں پہنچاؤں گی۔

تو کیا وہ اپنے عہد سے پھر جائے گی؟

نہیں، میں اپنے محبوب شوہر کو ماضی کا بھیا نک چہرہ دکھا کر کس بات کا سزا دوں گی....

لوگ کیا کہیں گے؟..... بچے کیا سوچیں گے؟..... میرا یہ بڑا سکون گہوارہ..... میرا گھر..... میر جنت جس کے لیے میں نے اپنی ہستی منادی میں اس پر کبھی غم کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوا گی۔ میں اپنی زندگی تو قربان کر سکتی ہوں مگر جمیل کا اعتماد اس کی فرشتوں جیسی شفاف مجاہد کا بھرم نہیں ٹوٹے دوں گی جو ہوا سو ہوا۔ میرے ماں باپ، میرا خاندان، میرا ماضی بوڑھا گنگا کے سیلاب میں بہہ گیا۔ کچھ بھی نہیں بچا۔

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے ماضی سے ہمیشہ کے لیے دامن چھڑا لیا کہ اب موسم بدلا رہا تھا۔ پت جھڑکی ریش بہاروں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ نہ صرف اس کے اندر بلکہ خاندان میں بھی ایک حسین انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ مہر جیس نے اپنے عظیم شوہر کے قدموں سے لپٹ کر معافی مانگ لی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مہر جیس نے سہیل کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ یہ بات الگ تھی کہ اس کا طریق کار غلط تھا۔ جو چیز کسی سے طلب کی جاتی ہے اسے حکم نہیں دیا جاتا اور نہ ملنے پر اسے سزا بھی نہیں دی جاتی ہے اسے تو دل میں گھس کر حاصل کیا جاتا ہے۔ محبت میں اگر ناشامل ہو جائے تو وہ محبت نہیں خود غرضی بن جاتی ہے پچیس سال تک مہر جیس اسی فلسفہ محبت پر عمل کرتی رہیں۔ جو سراسر غلط تھا۔ وہ تو دل نشیں کے انجام پر سہم گئی تھیں آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ اگر خدا نہ کرے اسی طرح مجھے ٹھکرا دیا گیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ سہیل کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی؟

تب ہی صدق دل سے آنسوؤں کے درمیان اس نے سہیل کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا اور نیک دل شوہر نے اسے گلے سے لگا کر معاف کر دیا۔ آخر وہ اس کے بچوں کی ماں تھیں پچیس سال سے دونوں ہی ایک چھت کے نیچے رہتے چلے آ رہے تھے۔ بچوں کے حوالے سے کبھی کبھی سہیل نے مہر جیس کی شدت سے ضرورت محسوس کی تھی۔ وہ جذباتی دور بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اب تو وہ سہیل کی باقی ماندہ زندگی کی ساتھی اور رفیق تھیں۔

نزدہت کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی گئی تھی۔ کفیل نے بھی اپنی پسند کی شادی کر لی تھی۔ جواب مہر جیس اور سہیل کی آنکھوں کا تارا تھی۔ شجیہ کو مہر جیس نے گھر کی بڑی بہو کا درجہ دے کر اسے پورے گھر کا مالک و مختار بنادیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اب وہ سب کے ساتھ مل کر رہے مگر جمیل نے ماں کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر بڑے دلار سے کہا۔ ”مما آپ ہمیں وہیں رہنے دیں۔ الگ زندگی کا قرینہ آجائے گا۔“

مجھے تم سب کی خوشی عزیز ہے۔

اور پھر آہستہ آہستہ شجیہ مراد علی نے زندہ رہنے کے سارے قرینے سیکھ لیے۔

☆☆☆

ماتہ پہ بندیا سجادو

(السن) چھوٹے سے خوبصورت گھر میں قدم رکھتے ہوئے یہ احساس ہوتا جیسے خوشبوؤں کے بادل اس کے وجود سے لپٹ گئے ہوں اور وہ اسے اڑائے لیے جا رہے ہوں۔ ہر طرف پھولوں کی فراوانی تھی۔ اس کا لان نیلے، چنبیلی اور سفید گلابوں سے بھرا ہوا تھا۔ دیوار پر بوگن ویلیا کے سفید گچھے لٹک رہے تھے۔ لیموں کے درختوں اور کروٹن کے پودوں کی شاخیں سفید پھولوں سے لدی جھکی ہوئی تھیں۔ ہر طرف چاندنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے کوئل کے آرتھک ذوق کا اندازہ ہوتا تھا۔ اسے سبز اور سفید رنگ ہمیشہ پسند تھا۔ حتیٰ کہ کمرے کی کھڑکیوں کے پردے پلنگ کی چادریں، کٹن، میز پوش بھی سبز سفید پھولوں کی میچنگ یا سفید زمین پر سبز ڈیزائن کے ہوتے تھے۔ کمروں کے باہر سفید پھول سبز پتیوں میں منہ چھپائے مسکراتے نظر آتے اور وہ زیادہ تر سفید لباس پہنتی تھی یا پھر سبز یہ دونوں رنگ اس کے حسین پیلر پر جگمگاتے تھے۔

والدین کو بھی بیٹی کی پسند بہت عزیز تھی۔ کوئل کے دو بھائی، دو بہنیں تھیں۔ ایک بہن کینیڈا میں اپنے ماموں کے پاس تھی۔ ماموں لاؤلیہ تھے انہوں نے بھانجی کو گود لے لیا تھا۔ اب وہ اسے بڑھا لکھا رہے تھے۔ دوسری کوئل تھی۔ اس سے چھوٹے دو بھائی تھے کوئل نے اپنی بہن کو صرف الہم کی تصویروں میں دیکھا تھا۔ کبھی کبھی ماموں جان کا فون آ جاتا تو بائیں ”ہیلو“ اور ”ہائے“ آگے نہ بڑھتی تھیں۔ البتہ امی ابو سے باتیں ہوتی تھیں۔ ایک دن کوئل نے بڑے اداس لہجے میں باپ سے کہا۔

”ابو جی! آپ نے میری بہن کو ماموں جی کے ساتھ کیوں بھیج دیا۔ نہ تو ماموں جان کبھی آتے ہیں نہ میری بہن کو کبھی بھیجتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے باجی کو بھی ہماری محبت نہیں

ورنہ پندرہ سالوں میں کبھی تو آ جاتیں ہم سے ملنے۔“
شکیلہ بیگم نے اسے گلے سے لگایا اور باپ نے بیٹی کو مسکرا کر دیکھا اور پیار سے بولے۔

”بیٹی! جو چیز کسی کو دے دی جاتی ہے اس پر دعویٰ نہیں کیا جاتا۔ اس پر اپنا زور ختم ہو جاتا ہے۔ تمہارے ماموں کا وہاں بڑا کاروبار ہے۔ انہیں خدا نے کوئی اولاد نہیں دی۔ اسے انہوں نے مجھ سے مانگ لیا۔ ویسے بھی ان کا سفینہ پر حق تھا۔ ان کی تنہائی دیکھی نہ گئی۔ سفینہ ان سے مانوس بھی بہت تھی۔ میرے پاس تم تھیں اس لیے سب کی یہی مرضی تھی۔ وہ اپنے ماموں کی بیٹی بن کر رہے۔ تمہاری ممانی سماجی کارکن ہیں۔ ان کے گھر دو بچے اور بھی رہتے ہیں۔ ایک گونگا ہے۔ دوسرا نایا۔ اللہ نے ان نیکیوں کے صلے میں انہیں وہاں بہت آسودگی دی ہے۔ انہیں اتنی فرصت کب ہوتی ہے کہ وہ کسی اور طرف دیکھیں۔“

کول نے بڑی معصومیت سے کہا۔
”پھر آپ باجی کو یہاں بلا لیں۔ جب وہاں اور بچے بھی ہیں۔ ماموں کا دل بہلانے کے لیے۔“
”ارے نہیں بیٹا۔“ باپ نے اس کا سر سینے سے لگالیا۔

”ان بچوں سے تمہاری سفینہ باجی کا کیا مقابلہ وہ تو شہزادیوں کی طرح رہتی ہے۔ ماموں، ممانی اس پر جان دیتے ہیں اور بیٹا..... کہیں دی ہوئی چیزیں بھی کسی سے واپس لی جاتی ہیں۔ اب اگر وہ آ گئی تب بھی یہاں رہنا پسند نہیں کرے گی۔ وہ امریکہ کی آزاد خود مختار فضاؤں میں پلٹی بڑھی۔ اس گھٹے ہوئے ماحول میں کیسے رہ سکتی ہے۔“

”ہاں بیٹی۔ تمہارے ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تمہاری بہن میں اور تم میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ وہ سراپا مغرب کی اندھی تقلید میں سانس لینے والی نئی روشنی کی چکا چوند میں آنکھیں کھولنے والی، مغرب زدہ لڑکی سے اور تم خالص مشرقی زندگی، مشرقی روایات اور مشرقی تہذیب کی نمائندہ نہ تم اسے سمجھا سکو گی۔ نہ وہ تمہیں مطمئن کر سکے گی۔ دونوں کی راہیں متضاد ہوں گی پھر بات کیسے بنے گی۔ جو تھوڑی بہت اپنائیت اور محبت ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے اسے وہیں رہنے دو۔ دور کی صاحب سلامت صحیح ہے۔“

کول کی سمجھ میں کچھ باتیں آئیں۔ کچھ نہیں آئیں۔ البتہ تنہائی کا احساس اسے رلا رلا گیا۔ بہنیں تو ایک دوسرے کی دوست اور سہیلیاں ہوتی ہیں۔ اب تو اسے اپنے کو یہ سمجھانا پڑا۔ وہ اللہ کے یہاں سے شاید تنہا ہی آئی تھی۔ اس کی کوئی بہن نہیں۔

☆.....☆.....☆

اس دن لان میں احمد حسین کھرپی لیے پودوں، گملوں کی گوڈی کر کے کیاریوں اور لان کی صفائی کر رہے تھے اور نئے پودے لگا رہے تھے۔ فرصت کے لمحوں میں ان کا زیادہ وقت باغبانی میں گزرتا تھا اس لیے اور بھی کہ ان کی لاڈلی بیٹی کو گلاب اور موتیا سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ دوسرے وہ خود بھی سبزے اور پھولوں کے شوقین تھے۔ ہر طرف سبزہ اور رنگ برنگ پھولوں سے آنکھوں میں تراوٹ آتی تھی۔ تب ہی کول کی سہیلی ارم آ گئی۔ سامنے ہی ہرا بھرا پھولوں سے سجا ہوا لان تھا۔ کچھ دیر وہ کھڑی تعریفی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی خوشبو اندر اتارتی رہی۔ کیاریوں اور گملوں میں سلیقے سے پھول اور پودے لگے ہوئے اچھے معلوم ہو رہے تھے۔ ہری ہری ترشی ہوئی گھاس اور دیواروں پر چڑھی ہوئی بوگن ویلیا کے پھولوں کے سفید سفید گچھے ہوا میں جھولتے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی مڑی اور اندر چلی گئی۔

”السلام علیکم آئی۔“

شکیلہ بیگم نے مسکرا کر دعائیں دیتے ہوئے خیریت پوچھی۔
”ہیلو۔“ کول ایک دم آ کر اس سے لپٹ گئی۔

”بھئی تمہارے گھر آ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ ہر طرف پھول۔ ہر طرف خوشبو باغ و بہار ماحول ہمارا لان تو تمہارے لان سے بہت بڑا ہے درخت بھی زیادہ ہیں مگر ہمارا مالی بڑا پھو ہڑ ہے۔“

پھو ہڑ کے نام پر شکیلہ بیگم اور کول نے ایک ساتھ تہقہہ لگایا۔
”یار! یہ پھو ہڑ کا لفظ تو عورتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔“ کول نے ہنستے ہوئے کہا۔
”جی بات تو یہ ہے کول۔ مجھے لفظ استعمال نہیں آتا، بات صرف اتنی ہے۔ تم کسی دن اپنے مالی کو ہمارے ہاں بھیج دو۔ وہ ہمارے مالی کو گائیڈ کرے گا تو اسے بھی کچھ سلیقہ آ جائے گا۔“

”بیٹی! مالی تو ہم نے کبھی رکھا نہیں۔“ شکیلہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ شوق تو ان کے ابو اور کول کا ہے۔ زیادہ تر کول کے ابو لان اور پھولوں پودوں کی دیکھ رکھ کر کرتے ہیں۔ یہ ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس وقت بھی وہی کیاریوں میں نئے پودے لگا رہے تھے۔“

”ہائے آئی۔ وہ انکل تھے۔“ ارم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”سوری آئی... میں نے انکل کو مالی بنادیا۔“ وہ شرمندہ شرمندہ سی بولی۔

”تو کیا ہوا بیٹا! پو کوئی بری بات نہیں۔ ہر باپ اپنے گھر کا مالی ہی تو ہوتا ہے۔ گھر اور خاندان ہی اس کا باغ اور بچے پھول پودے ہوتے ہیں۔ وہ اس کی دیکھ بھال اور پرورش

کر کے خوش ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ اپنے گلستان کو سنوارتے سجاتے ہیں۔ دیو یہ لہر باغ کوئل کے ابو کی محبت، انکی محنت اور شوق ہی کی وجہ سے اتنا شاداب، معطر اور دلقریب لگ رہا ہے۔

”ادھ! آئی زندگی کا یہ فلسفہ تو میں نے آپ ہی سے سنا۔ واقعی بالکل صحیح تشریح کی۔ آپ نے باغ اور مالی کی۔ مجھے بہت اچھی لگی یہ بات آپ کی۔“

”اچھا آؤ ارم۔“ کوئل اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی اور اسٹین لیس اسٹیل نقشین کنورہ اٹھلائی۔

”یہ کیا ہے؟“

”دیکھتی جاؤ۔“ کوئل نے اس پر رکھا ہوا ایک بھیگا ملل کا رومال ہٹایا۔ اس کے اندر نیلے کی کلیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ کلیوں نے اپنے لب کھول دیئے تھے۔ جیسے مسکرا رہی ہوں فضا مہک اٹھی۔

”اللہ کتنی ادھ کھلی کلیاں ہیں۔ ان کا کیا کرو گی؟“

”ان کی مالا اور کنکن پرووں گی۔ صبح کالج جاتے ہوئے پکی پکی کلیاں توڑ کر ملل کے بھیکے ہوئے کپڑے میں لپیٹ کر پیالے میں رکھ دیتی ہوں۔ شام کو یہ کھل جاتی ہیں تو اڑی کی بانہوں میں انہیں پرو دیتی ہوں اور کبھی کنکن بنا کر امی کو پہنا دیتی ہوں۔ کبھی گجر بنا کر جوڑے میں لپیٹ دیتی ہوں۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

”ارے یہاں تو مٹکے اور صراحی پر بھی نیلے کے ہار لپٹے نظر آ رہے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”یہ امی جان کا شوق ہے۔ شاخ پر کھلے ہوئے پھولوں کو توڑ کر وہ ہار مٹکے اور صراحی پر ڈال دیتی ہیں۔“

”مگر کوئل۔ میں نے تو تمہیں بھی ہار پھول پہنے نہیں دیکھا؟“ ارم نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”ہش۔ کہنا نہیں کسی سے۔“ وہ شرما کر بولی۔

”امی کہتی ہیں۔ کنواری لڑکیاں تو خود ادھ کھلی کلیاں ہوتی ہیں۔ انہیں پھول پہننا چاہیے نہ خوشبو لگانا چاہیے۔ ورنہ ان پر جنات کا سایہ ہو جاتا ہے۔ تب سے مجھے بڑا خوف آنے لگا ہے۔“

”کس سے۔ جنات سے یا پھولوں سے؟“

ارم نے پوچھا تو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

”پھولوں سے تو مجھے عشق ہے۔ ہاں جنات سے ڈر لگتا ہے۔ نظر جو نہیں آتے۔“ کوئل نے کہا۔

امتحان قریب تھے ارم اور کوئل دونوں مل کر اسٹڈی کرتی تھیں۔

کوئل ارم کے گھر چلی جاتی تھی۔ کیونکہ وہاں ٹیوٹر اسے پڑھانے آتے تھے اور یہ اصرار ارم کا ہی تھا۔ شکیلہ بیگم کو اجازت دینی پڑی۔ دونوں گھروں کے درمیان ایک لمبی چوڑی سڑک آتی تھی۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ ویسے بھی آپس میں تعلقات خوشگوار تھے۔ آنا جانا تھا۔ ایک دن کوئل کی نگاہ دیوار پر لگی ایک خوب صورت تصویر پر ٹہر گئی۔ وہ ایک وجہ اور پرکشش نوجوان کا پورٹریٹ تھا۔

”ارم! یہ موصوف کون ہیں؟“

”ارے بھول گئیں۔ یہ میرے بھائی جان فرازی کا پورٹریٹ ہے۔ میں نے بتایا تو تھا کہ وہ کینیڈا پڑھنے گئے ہیں۔“

”اچھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا کہ تم نے اپنے کسی بھائی جان کا نام لیا ہو مگر۔“ م کیسا ہے ان کا۔ فرازی۔ گھوڑا پیادہ، با بھی وغیرہ۔ کیا شطرنج بہت کھیلتے ہیں؟“

”ارے نہیں۔ نام تو انا کا فراز احمد ہے۔“ کے دوست انہیں فرازی کہتے ہیں اور تم نے وہ الف بھی درمیان سے ہٹا کر فرازی بنا دیا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کمال کی بات ہے۔ لوگ ناموں کے ساتھ کیسی چھانٹ کاٹ کرتے ہیں۔ اچھا خیر اب یہ کہاں ہوتے ہیں؟“

”بس آنے والے ہیں۔ امی ان کی شادی کا سوچ رہی ہیں۔ ظاہر ہے باجی اپنی سسرال چلی گئیں۔ ایاز بھیا کی مفتنی ہو گئی۔ امی دونوں بھائیوں کی ایک ساتھ شادی کا پروگرام بنا رہی ہیں۔ مگر فراز بھائی اپنی پڑھائی کا بہانہ بنا کر قیام طویل کرتے جا رہے ہیں۔“

”وہیں پر کوئی لڑکی پسند آ گئی۔ مگ؟“

”ارے جانم۔ آج کل لڑکیوں کی کیا کمی۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں۔ لگتا ہے کچھ دنوں میں لڑکیوں کا جمعہ بازار لگنے لگے گا۔“ ارم ایک آنکھ دبا کر مسکرائی۔

”جمعہ بازار تو اب بھی لگتا ہے۔ بس دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔“ اس کا لہجہ اداس سا تھا۔

”ارے بھئی، سیر لیس کیوں ہوتی ہو، میں تو مذاق کر رہی تھی۔ ویسے معصوم لڑکیوں کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہوتی ہے۔“ ارم نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”یہ تو ہم اور تم کہتے ہیں یہ زیادتی ہے لیکن حالات اور آنے والا زمانہ تو نہیں کہتا۔ ہر دور میں ہماری قیمت لگتی رہی ہے۔ اب کیا نئی بات ہو گئی ہے۔“ اس کا لہجہ بدستور جلا کٹا تھا۔

”اچھا خیر چھوڑو۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ امتحان قریب آ گئے ہیں۔ ہمیں

فائل کی بھرپور تیاری کرنی ہے۔“ دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
کچھ دنوں کے بعد کول نے محسوس کیا جیسے آتے جاتے وہ تصویر اس سے سرگوشیاں
کرنے لگی ہے۔ خواہ مخواہ اس کی نگاہیں ادھر اٹھ جاتیں تو اس کے لبوں پر نمایاں طور پر
مسکراہٹیں لرزنے لگتیں۔ آنکھوں میں شرارت ناپنے لگتی۔ کول کے ہونٹ بھی کچھ کہنے
کے لیے پھڑکنے لگتے۔ جب وہ تنہا ہوتی تو خاص کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ
اس کے دل میں اس تصویر والے کے لیے نرم گوشے پیدا ہونے لگے۔ جب وہ سامنے
جانی تو اسے پورے کا پورا اندر اتار کر اپنے دل کا دروازہ بند کر لیتی کہ کوئی نہ دیکھ نہ لے۔

”میری امی آنٹی سے ملنے جا رہی ہیں ویک اینڈ پر۔“
”تو میری آنٹی سے ملنے کی کامیابی تھی۔ وہ تو اس سے قبل بھی امی سے مل جاتی ہیں۔“
”نہیں۔ اب خصوصی طور پر ملنے جا رہی ہیں۔“ اس نے معنی خیز نگاہوں سے کول کو
دیکھا۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔

”آنٹی کو بتادینا اور دیکھو تم بھی ذرا ڈھنگ کا کوئی خوبصورت لباس زیب تن کر لینا۔“
ارم اسے ستانے پر تلی ہوئی تھی پھر وہ اسے حیران و پریشان چھوڑ کر چلی گئی اور وہ سوچتی
رہ گئی۔ یہ کیا کہہ گئی ارم کہ اچھے سے کپڑے پہن لینا کیوں؟

اور اس کیوں کا جواب اسے جلد ہی مل گیا۔ ارم کی امی نے اپنے ہونہار ڈاکٹر بیٹے فراز
احمد کے لیے کول کا رشتہ مانگا تھا اور کہا تھا کہ وہ آنے والا ہے۔ میں اس کے آتے ہی
شادی کی تاریخ لے لوں گی اور یہ کہ میری شروع سے ہی یہ خواہش تھی کہ میں کول کو اپنی بہو
بناؤں گی اور یہ کہہ کر انہوں نے شکیلہ بیگم کی رضامندی سے کول کی انگلی میں فراز کے نام کی
انگوٹھی ڈال دی۔ شکیلہ بیگم کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا ارم کی اور کول کی دوستی چار سالہ کالج
کے سفر کے ساتھ پروان چڑھی تھی۔ دونوں گھر انے ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔
کیا واقعی دل کی آواز اللہ نے سن لی تھی۔ اتنی جلدی باریابی کی سند بھی مل گئی.....
کول کو انگوٹھی پہنانے کے بعد ایک رات جب فراز کا فون آیا تو ارم نے اسے
خوشخبری سنائی۔

”امی نے آپ کی نسبت طے کر دی ہے۔ اب آپ جلدی سے آجائیے۔“ فراز نے
ماں سے بات کرانے کے لیے کہا۔

”امی کو فون دو۔“

”ہاں بیٹے کیسے ہو؟“

”السلام علیکم امی! میں ٹھیک ہوں۔ ابو کیسے ہیں اور سب لوگ؟“

”بیٹا! خوش رہو۔ یہاں سب خیریت ہے۔“
”امی! یہ ارم کی بچی کیا بکواس کر رہی تھی؟“ اس نے کچھ مذاق اور کچھ جھنجھلاہٹ۔ پوچھا۔
”میرے جان۔ وہ بکواس نہیں کر رہی تھی۔“ اس کی ہنسی کی آواز فضا میں گونج گئی۔
”وہ بھیک کہہ رہی تھی کہ میں نے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ اب تم جلدی آنے کی
تیار ہو۔“ اس نے بڑا مذاق سے کہا۔ اس نے کہا۔ ”اب اس جاب بھی کر لیا۔ خوب گھوم پھر
لیے۔ تمام حسرتیں نکال لیں۔ اب اپنی ماں کے ارمان بھی پورے کر دو بیٹے۔“
”مگر امی.... وہ کون ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔ کس کی بیٹی ہے۔ کیسے لوگ ہیں۔“

”ہاں ہاں بیٹا۔ ہم تمہیں یہی بتانا چاہ رہے تھے۔ اچھی پیاری سی لڑکی ہے۔ نام پوچھ
کر کیا کرو گے۔ وہ احمد حسین کی بیٹی ہے۔ جن کی صدر میں اسپینر پارٹس کی دکان ہے۔
بہت اچھے لوگ ہیں۔“

ماں نے ہنس کر بات ختم کی تو ارم نے فون جھپٹ لیا۔
”بھائی جان۔ آپ کس کو بہت کھیلتے تھے۔ ذرا بوجھتے تو۔ اسے نیلے کی کلیاں۔ نیلے
کے پھول بہت پسند ہیں۔ وہ کول کا منی سی لڑکی پھولوں کی طرح نرم و نازک اور حسین
ہے۔“ اس نے تہقہہ لگایا۔

اور فون بند ہو گیا اور وہ ہاتھ میں ریسیور پکڑے حیرانی سے سوچتا رہا۔
”وہ کون ہے؟ احمد حسین کی بیٹی..... احمد حسین کی بیٹی.....“ وہ بڑبڑایا۔ ”اس نے بھی تو
یہی نام بتایا تھا اپنے باپ کا۔ ان کی بھی اسپینر پارٹس کی دکان تھی صدر میں.....“ وہ چکر میں
آ گیا۔

اس کی اس سے ملاقات ایک اسٹور میں ہوئی تھی۔ وہ شیونگ کریم اور پرفیوم خریدنے
گیا تھا اور وہ میک اپ کا سامان لے رہی تھی۔
”ایلیکسیو زمی۔ کیا آپ پاکستانی ہیں؟“ وہ بڑی نزاکت سے مسکرا کر اس کی طرف
بڑھی۔

”جی ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم؟“ اس نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

”آپ کے رنگ و روپ اور باتوں سے۔“

”تو گویا آپ کو چہرے پڑھنے میں ملکہ حاصل ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”نہیں خیر۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”آپ یہاں کب سے ہیں اور آپ کے والدین پاکستان کے کس شہر میں رہتے
ہیں؟“

”میرے والدین تو اب کراچی میں ہوتے ہیں۔ میں تو بچپن سے اپنے ماموں کے

ساتھ کینیڈا میں ہوتی ہوں۔ اب جانے والی ہوں۔“

”اوہ۔ یہ عجیب اتفاق ہے۔ میرے پاپا بھی وہیں ہوتے ہیں ناظم آباد میں۔ آپ کے والد ماں کا کام کرتے ہیں۔ کیا نام ہے ان کا؟“

”میرے بابا کی صدر میں ایسٹ انڈین کمپنی کی جگہ ہے۔ ان کا نام احمد حسین ہے۔“

”اچھا اچھا تو پھر ملاقات ہوگی۔ یہ میرا کارڈ ہے۔“

اس نے مسکرا کر کارڈ بڑھایا۔

”تھینک یو۔“ وہ مسکراتی ہوئی شاپر اٹھائے باہر نکل گئی۔

لینے سے پہلے اچانک اسے یاد آیا۔ وہ دوڑ کر میز سے کارڈ اٹھا لائی اور فون کے پار بیٹھ گئی۔

”اوہ۔ ڈاکٹر فراز احمد۔ ایم بی بی ایس۔“ اس نے مسکرا کر کارڈ پر نظر ڈالی۔ اس کے آگے فلیٹ کا فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اس نے جھٹ ریسور اٹھا لیا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”ہیلو۔ میں سفینہ بول رہی ہوں۔ یقیناً آپ پہچان گئے ہوں گے فراز صاحب۔“

”آپ پہچاننے کی بات کر رہی ہیں۔ لگتا ہے ہم بھی ابھی نہیں تھے۔ دل سے دل کوراہ ہونے میں دیر کب لگتی ہے۔ ابھی دل آمادہ نظم ہوا تھا کہ لیک کی آواز آگئی۔“

شکر یہ مس سفینہ۔۔۔!“

پھر ان کی ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ اور درمیان سے فاصلے سمٹنے لگے۔

☆.....☆.....☆

سفینہ ہمیشہ سے خود پسند، خود پرست اور خود آرا تھی۔ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ تھوڑی تھوڑی مغرور بھی تھی۔ قسمت سے اس کو جو ملا اپنی طلب اور خواہش سے بڑھ کر ملا تھا۔ ماموں کی چونکہ کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے بہن کی موت کے بعد جب بھائی

ایک عرصے کے بعد بیوی کے ساتھ پاکستان گئے تو مرحومہ بہن کی نشانی کے طور پر اس کی چھ سالہ بیٹی سفینہ کو بھی ساتھ لے آئے۔ حالانکہ احمد حسین اور شکیلہ بیگم کو دل پر بھاری پتھر

رکھ کر ان کی اس خواہش کا احترام اس لیے اور کرنا پڑا کہ وہ اولاد کو ترسے ہوئے تھے پھر سفینہ کی نانی کا بھی اصرار تھا۔ ورنہ انہوں نے اسے اپنے جگر کے ٹکڑے کی مانند پرورش کیا

تھا۔ اس وقت شکیلہ بیگم کی گود میں کول دو ماہ کی تھی۔ تب ممانی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ان کے آگے جھولی پھیلا کر کہا تھا۔

”بہن۔ تمہارے آگے تو اولاد ہے۔ اللہ اور دے گا مگر میرا دامن تو بالکل خالی ہے“

اسے اپنی محبت سے بھر دو۔“

تب شکیلہ بیگم نے خاموشی سے سفینہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

مگر اس کے دل میں ابھی وہ بے چین، بے چین سارے گھر میں پھرتی رہیں۔ نکال کر دے دیا ہو۔ کتنے ہی دنوں وہ بے چین، بے چین سارے گھر میں پھرتی رہیں۔

روتی رہیں۔ آخر میں کول کی معصوم مسکراہٹوں میں پناہ لے لی اور اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بہل گئیں لیکن وہ اسے ہمیشہ یاد کرتی تھیں اور اس کے لیے دعا گو تھیں۔ کبھی

کبھی ماموں۔ ممانی کے ساتھ اس کا بھی فون آ جاتا تھا اور اسی پیار اور محبت کا اظہار کرتی تھیں۔ ممانی گونگے بہرے اسکول میں ملازمت کرتی تھیں بلکہ انہوں نے اپنی ایک بیوہ

بھتیجی کو بھی گھر میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے پورا گھر سنبھالا ہوا تھا۔ سفینہ کی حیثیت اس گھر میں شہزادیوں جیسی تھی۔ جو چاہتی کھاتی۔ جو چاہتی پہنتی۔ جب جی چاہتا، جہاں چاہتی

گاڑی لے کر نکل جاتی۔ کوئی اسے نہیں روکتا تھا۔ جب تک وہ اسکول کی بچی رہی ماموں، ممانی اس سے بڑا لاڈ کرتے رہے۔ اس کی ہر ضد پوری کرتے رہے مگر جب وہ جوان

ہوئی اور کالج جانے لگی تو پھر پنڈلیوں کے اوپر پہنا ہوا اسکرٹ بلاؤز انہیں برا لگنے لگا۔ اس کے لیے انہوں نے پاکستانی ڈریسز بنوائے۔ اسے سمجھایا۔

”بیٹی! تم امریکہ میں ضرور ہو مگر بنیادی طور پر تم ایک مشرقی اور پاکستانی لڑکی ہو۔ تمہیں یہ عریانی زیب نہیں دیتی۔ یہ ڈریس بے شرمی سکھاتا ہے۔ ستر نہیں چھپاتا بیٹا۔ شرم

وحیا لڑکیوں کا زیور ہوتا ہے۔“

”تو پھر آپ یہاں کیوں رہتے ہیں۔ آپ کو پاکستان میں ہونا چاہیے تھا؟“

اس نے بڑی ناگواری سے انہیں دیکھ کر پوچھا۔

ماموں کو آج پہلی بار شاق سا گزرا۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری بولے۔

”بیٹا! روزگار کی مجبوری ہمیں یہاں لے آئی۔ ہم شوق سے یہاں نہیں آئے۔ دنیا بھر کے لوگ تلاش معاش کے لیے دوسرے ممالک میں جاتے ہیں۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔

یہاں کے لوگ بھی ہمارے ملک میں کام کرتے ہیں لیکن ہمیں اپنی روش نہیں چھوڑنی چاہیے۔“

مگر ماموں جان! ہمارے بڑے تو کہتے ہیں جیسا دیں ہو، ویسا بھیس اختیار کرنا چاہیے تو کیا وہ غلط کہتے ہیں؟“ وہ اپنی بات کو منوانے کے لیے ان سے بحث میں الجھ رہی تھی۔

”نہیں بیٹی! یہ غلط نہیں مگر ان کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ دوسروں کی اندھی تقلید میں تم ان کی طرح بے لباس ہو جاؤ۔ بے شرمی کے مظاہرے کرنے لگو۔ کبی فراک۔ اسکرٹ اور

پوری آستین کا بلاؤز پہنو۔ سر پہ اسکارف باندھو۔ یہاں بھی تو خواتین یہ لباس پہنتی ہیں۔ جسم کی نمائش کرنا ہمارے مذہب میں جائز نہیں جو چیز بری ہے وہ بری ہے۔ بس تم نے

”میں بھی تمہارے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں کر سکتی فراز! میں بھی اسی سلسلے میں پاکستان جانا چاہتی ہوں۔ اپنے پاپا اور مئی کو تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار کرنا ہے۔ جب تک میں انہیں نہیں بتاؤں گی وہ کیا جان سکیں گے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔“

”ہاں تو پھر ہم ساتھ ہی کیوں نہ چلیں؟“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں۔ میں نے ٹینا کو ٹائم دے دیا ہے۔ بتا دیا ہے کہ میں آرہی ہوں۔ میرا نیویارک جانا ضروری ہے۔ وہ انتظار کرے گی۔“

”تو پھر تم کب تک پہنچو گی؟“ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں انتظار کرتا رہوں اور میری شادی ماما اپنی پسند کی لڑکی سے کر دیں۔“ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”اب تم مجھے خوفزدہ تو نہ کرو۔ ایسی موم کی ناک ہو۔ خرد دار جو میرے بغیر تم نے کوئی قدم اٹھایا۔ تمہیں بھی ماردوں کی اور اسے بھی۔“ وہ منہ پھلا کر بولی۔

”اسے کون؟“ فراز کو ستانے میں مزہ آنے لگا۔

”وہی تمہاری چیمٹی۔ کوئی بھی ہو۔“

”تمہارے سوا بھی میری کوئی چیمٹی ہو سکتی ہے؟“

اس کے لہجے میں محبت کے جام چھلک رہے تھے۔

”پتا نہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔

”اچھا سنو۔ میرا خیال ہے۔ میں رتب جاتا ہوں۔ پہلے تم چلی جاؤ۔ نیویارک سے سیدھی پاکستان پہلے تم اپنے مئی پاپا سے اپنا کیس ڈسکس کر لو۔ اتنے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”چلیں یونہی سہی۔ میرا دل کہتا ہے میرے پاپا بہت خوش ہوں گے پھر شادی کے بعد ہم واپس کینیڈا آ جائیں گے۔ تم اپنا کلینک کھول لینا۔ میں تمہارے گھر کو رشک جنت بنا دوں گی۔ ہمارے پھولوں بھرے لان میں ہمارے خوب صورت ننھے منے بچوں کے معصوم قہقہوں کی جلتنگ گونجے گی۔ کتنی رونق ہوگی۔“ وہ آنکھیں بند کر کے سرشاری سے بولی۔

وہ پیار بھری نظروں سے اس کی بند پلکوں میں سجے ہوئے خوابوں کی حسین تعبیر دیکھنے لگا۔ یہی تمنا تو اس کی بھی تھی۔ اسے بچوں کا کتنا شوق تھا۔ وہ مسکرایا۔

پھر وہ ایک ڈوبتی کبر میں لپٹی سرد شام کو جنگل کی روشنیوں کے جلو میں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق فراز اپنے وقت پر پاکستان فلائی کر گیا۔ وہاں اس کی شادی کے تمام انتظامات مکمل تھے۔ فراز احمد کے والدین بہت خوش تھے۔ گھر میں

پڑھائی کر لی۔ بجائے سروس کے تم اپنے بابا کے پاس پاکستان چلی جاؤ۔ تمہاری ممانی بیا رہنے لگی ہیں اور میں ہوٹل میں مصروف رہتا ہوں۔ تمہاری فکر مجھے الگ پریشان کرنا ہے۔ تمہاری شادی پاکستان میں ہو جائے گی تو میری فکریں بھی دور ہو جائیں گی۔“

پہلے تو وہ ہکا بکا ماموں کو دیکھنے لگی۔ وہ حیران بھی ماموں اتنا خطرناک پروگرام بنا۔ بیٹھے ہیں۔ تب وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ سے کہنے لگی۔

”پلیز ماموں جان! مجھے یہاں سے نہ بھیجئے میں اس ماحول میں ایڈجسٹ ہو گئی ہوں۔ میرا دل وہاں نہیں لگے گا۔ میں آپ لوگوں سے جدائی کا تصور نہیں کر سکتی۔ آپ ج کہیں گے کروں گی مگر میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔“ وہ منہ بسورنے لگی۔

”ارے نہیں بیٹا۔ شادی کر کے اپنے شوہر کے ساتھ پھر یہاں آ جانا۔ کیا تمہارے بغیر مجھے یہاں اچھا لگے گا۔ میں تو تمہیں محفوظ ہاتھوں میں دینا چاہتا ہوں۔“ وہ اس کا سر سہلا کر مسکرائے۔

”ہاں ماموں! یہ بات آپ کی درست ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے اٹھی اور پرس جھلاتی ہوئی چلی گئی۔

وہ دونوں اسی اسٹور کے عقب میں جہاں دونوں پہلی بار ملے تھے اکثر ساتھ ساتھ چائے پیتے نظر آتے تھے۔ اس کے بعد گھومنے پھرنے نکل جاتے۔

”آپ کب تک پاکستان جا رہی ہیں؟“ ایک دن فراز نے اس سے پوچھا۔

”بس تیاری مکمل ہے۔ مگر جانے سے پہلے اپنی دوست سے ملنے نیویارک جاؤں گی۔ ہم دونوں نے ساتھ ساتھ گریجویشن کیا پھر ڈیزائنرز کا کورس کیا اس کا ارادہ ہوتیک کھولنے کا تھا۔ بڑی پلاننگ کی تھی لیکن پھر اس کی شادی ہو گئی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ نیویارک چلی گئی۔ صرف ایک بار ہماری ملاقات ہوئی تھی شادی کے بعد۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں نیویارک ضرور آؤں گی۔ اب جبکہ میرا پاکستان جانے کا پروگرام طے ہو گیا ہے تو مجھے اس سے ملنے ضرور جانا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ اس کے بعد ان کی فرصت کا لمحہ لمحہ ساتھ گزرنے لگا۔ ہوٹل میں۔ باغوں، پارکوں اور سمندر کے کنارے بھیگی بھیگی ریت پر وہ دونوں گھٹنوں بیٹھے ایک دوسرے میں کھوئے رہتے یا ریت پر الٹی سیدھی لکیریں بناتے رہتے۔ فراز نے ایک دن یہ کہہ کر اسے چونکا دیا۔

”امی! میری شادی کرنا چاہتی ہیں بلکہ مجھ پر زور دے رہی ہیں کہ تم فوراً آؤ، قبل اس کے وہ اپنی محبت اور ارمان میں میری تقدیر کا فیصلہ سنا دیں میں چلا جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنے دل کی بات انہیں سمجھا سکوں اور تمہارے متعلق ان کے ذہن کو موڑ سکوں۔“

”امی! میری شادی کرنا چاہتی ہیں بلکہ مجھ پر زور دے رہی ہیں کہ تم فوراً آؤ، قبل اس کے وہ اپنی محبت اور ارمان میں میری تقدیر کا فیصلہ سنا دیں میں چلا جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنے دل کی بات انہیں سمجھا سکوں اور تمہارے متعلق ان کے ذہن کو موڑ سکوں۔“

”امی! میری شادی کرنا چاہتی ہیں بلکہ مجھ پر زور دے رہی ہیں کہ تم فوراً آؤ، قبل اس کے وہ اپنی محبت اور ارمان میں میری تقدیر کا فیصلہ سنا دیں میں چلا جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنے دل کی بات انہیں سمجھا سکوں اور تمہارے متعلق ان کے ذہن کو موڑ سکوں۔“

”امی! میری شادی کرنا چاہتی ہیں بلکہ مجھ پر زور دے رہی ہیں کہ تم فوراً آؤ، قبل اس کے وہ اپنی محبت اور ارمان میں میری تقدیر کا فیصلہ سنا دیں میں چلا جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنے دل کی بات انہیں سمجھا سکوں اور تمہارے متعلق ان کے ذہن کو موڑ سکوں۔“

”امی! میری شادی کرنا چاہتی ہیں بلکہ مجھ پر زور دے رہی ہیں کہ تم فوراً آؤ، قبل اس کے وہ اپنی محبت اور ارمان میں میری تقدیر کا فیصلہ سنا دیں میں چلا جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنے دل کی بات انہیں سمجھا سکوں اور تمہارے متعلق ان کے ذہن کو موڑ سکوں۔“

”امی! میری شادی کرنا چاہتی ہیں بلکہ مجھ پر زور دے رہی ہیں کہ تم فوراً آؤ، قبل اس کے وہ اپنی محبت اور ارمان میں میری تقدیر کا فیصلہ سنا دیں میں چلا جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنے دل کی بات انہیں سمجھا سکوں اور تمہارے متعلق ان کے ذہن کو موڑ سکوں۔“

مہمان بھرے ہوئے تھے۔ فراز کو کچھ گھبراہٹ ہونے لگی۔ تب ماں نے کہا۔
 ”بس بیٹا! تمہاری شادی میں چند دن رہ گئے ہیں۔ میں نے ساری تیاری کر لی۔
 تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس تم تو سہرا باندھ کر بجی سجاوٹی کار میں بیٹھ جانا اور
 دلہن کو بیہ لانا۔“ پھر وہ تہنہ مار کر بس دیں اور بہنوں نے اس کی بلائیں لے لیں۔

☆.....☆.....☆

احمد حسین کی یہ پہلی خوشی تھی۔ انہوں نے اب تک جو بھی کیا، وہ کول کے جہیز کے لیے
 بہت تھا۔ شکیلہ بیگم نے کینیڈا فون کر کے ماموں بھانجی کو بھی شادی میں شرکت کے لیے
 بلایا تھا۔ بھلا بہن کی شادی میں بہن نہ شریک ہو یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ماموں نے فون پر
 انہیں مبارک باد دے کر کہا۔

”شکیلہ بہن! آپ کی بھالی بیمار ہیں۔ میں نہیں آسکوں گا۔ میں سفینہ بیٹی کو بھیج رہا
 ہوں۔“

یہ بھی بہت تھا۔ خصوصاً کول سفینہ کے آنے کی خبر سن کر بہت خوش تھی کہ وہ پہلی بار اپنی
 بہن سے ملے گی۔ وہ کتنی خوش ہوگی۔ فراز کے آنے کے تیسرے دن اس کی مہندی تھی۔
 بڑا جشن منایا جا رہا تھا۔ وہ مطمئن اور خوش تھا اس کی شادی احمد حسین کی بیٹی سے کی جا رہی
 تھی۔ اس خواب اور سرشاری میں گم تھا شادی کا دن سر پہ آ گیا۔ جس دن دولہا کی طرف
 سے مہندی اور دلہن کے جوڑے باگے آنا تھا وہ رات کی فلاٹ سے گھر پہنچی تھی۔ کول کی
 شادی میں شرکت کے لیے سفینہ کو دیکھ کر ماں باپ نے اسے بے اختیار پٹنایا۔ پیار کیا پھر
 وہ بہن سے ملی۔ اللہ کول اس کی بہن کتنی پیاری تھی۔ دونوں بہنیں دیر تک گلے سے لگی
 رہیں۔ ماں نے شکوہ کیا۔

”بیٹی! تم اتنی دیر سے کیوں گھر پہنچیں؟“

”ممی۔ اصل میں مجھے نیویارک میں دیر ہوگئی۔ میں اپنی دوست سے ملنے گئی تھی۔
 وہاں اس کی شادی کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی جا رہی تھی۔ بس مجھے وہیں رکنہ
 پڑا۔ ورنہ وہ ناراض ہو جاتی۔“

”خیر ٹھیک ہے۔ کل کول کی بارات آرہی ہے۔ ذرا ٹھیک ٹھاک تیاری رکھنا۔“ سفینہ
 بہت خوش تھی اس نے کول سے پوچھا۔

”تمہارا دولہا کیسا ہے؟“

”بہت اچھے ہیں باجی۔“ وہ نگاہیں جھکا کر شرمائی شرمائی سی بولی۔

”کیا نام ہے ان کا؟“

”فراز احمد۔“ وہ اس کا پورا نام ہی بول گئی۔

”اچھا۔ وہ تم سے محبت کرتے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”ارے تم نے انہیں دیکھا ہے۔ وہ تمہیں پسند ہیں؟“

وہ شرما کر چپ ہوگئی۔

”ارے بھئی۔ مجھ سے کیوں شرماتی ہو۔ میں تمہاری بہن بھی ہوں اور دوست بھی۔“

اس کا دل بھرا آیا۔ آج پہلی بار کسی نے اس سے اتنی محبت اور اعتماد سے پوچھا تھا۔ جی
 چاہا اپنا دل نکال کر اس کے سامنے رکھ دے۔ محبت تو راز داں ڈھونڈتی ہے لیکن وہ دل
 نکال کر نہ رکھ سکی اس کے سامنے۔ نہ اپنے کسی راز میں اسے شریک کر سکی۔ کہا تو صرف
 اتنا۔

”باجی۔ میرا تو سب کچھ وہی ہیں۔ میری آرزوؤں کا مرکز میری زندگی کا

حاصل.....“

”ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ خیر خوش رہو۔“

”اور باجی۔ آپ نے بھی وہاں کسی کو پسند کیا ہے؟“ کول نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں کول۔ وہ بھی آنے والا ہوگا یا پھر آچکا ہوگا۔ ہم دونوں نے شادی کا وعدہ کیا
 ہے۔ اب تم خیر سے رخصت ہو جاؤ تب میں پاپا کو ملواؤں گی اس سے۔ ہم نے سوچا ہے
 کہ شادی کے بعد ہم کینیڈا میں ہی رہیں گے۔ بڑی رومانٹک جگہ ہے۔“

دوسرے دن بارات آئی تھی۔ کول کی امی نے دولہا کے لیے روایتی سہرا آرڈر پر بنوایا
 تھا۔ جو پورے قد کا بیلے کی کلیوں اور گلابوں کو پرو کر بنایا گیا تھا اور جسے دولہا کے دوست
 پکڑے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ یہ ان کے خاندان کا رواج تھا۔ حالانکہ فراز نے بڑا
 شور مچایا کہ میں سہرا نہیں باندھوں گا نونچ کر پھینک دوں گا۔ سہرا باندھ کر انسان اچھا خاصا
 چلتا پھرتا مزلو لگتا ہے اور میں ابھی زندہ ہوں۔ مزار نہیں بنا جو مجھ پر پھولوں کی چادر
 چڑھائی جائے۔“

”ارے بھائی جان! یہ رسم و رواج تو تھوڑی دیر کے لیے ہوتے ہیں۔ نکاح اور آرسی
 مصحف کے بعد یہ سہرا ہٹا دیجیے گا۔“

ارم اور چھوٹے بھائی کے سمجھانے پر وہ خاموش ہو گیا۔ بارات بڑی دھوم دھام سے
 کاروں، اسکوٹروں اور جیپوں پر روانہ ہوگئی۔ جب دولہا کو بجی ہوئی کار سے اس کے
 دوستوں نے سہرا سنبھال کر نیچے اتارا تو ان پر پھولوں کی بارش ہوگئی اور سفینہ جو لڑکیوں

کے جھر مٹ میں دور کھڑی تھی دولہا کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”یا اللہ۔ مُمی! دولہا کو یہ آپ نے کیا پہنا دیا ہے۔ اس کا تو چہرہ ہی چھپ گیا۔ ذرا شکل تو دکھادیں۔“

”نہیں بھئی۔ یہ سہرا تو جملہ عروسی ہی میں اتارے گا اور سب سے پہلے اپنا چہرہ دلہن کو دکھائے گا۔“ دولہا کی کزن نے ہنس کر کہا۔

”ارے واہ یہ تو اٹنی گنگا بہادی آپ نے۔ ہم نے تو سنا ہے کہ دولہا پہلے دلہن کا چہرہ دیکھتا ہے۔“ سفینہ نے حیرت بھری مسکراہٹ سے کہا۔

”دیکھتا ہوگا مگر ہمارے گھر کی یہی رسم ہے۔“ کزن نے تڑخ کر جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

”عجیب لوگ ہیں اور عجیب رسمیں ہیں یہاں کی۔“ سفینہ نے کندھے اچکائے۔

”اے بی بی۔ تم یہاں کے رسم و رواج کو کیا سمجھو گی۔ تم نے تو اپنا زیادہ وقت امریکہ کینیڈا میں گزارا ہے۔“ کول کی خالہ نے مسکرا کر کہا۔

”تو کیا ہوا آئی۔ آج کا دور تو جدید دور کہلاتا ہے۔ اب یہ پیروں تک پھولوں کی لڑیاں گوندھنے کو کس نے کہا ہے۔ کس کتاب میں لکھا ہے؟“

سفینہ کی باتوں پر کچھ عورتوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ شکلیہ بیگم نے ماحول بگڑتے دیکھا تو جلدی سے اس کو وہاں سے ہٹا کر اندر لے گئیں بولیں۔

”بٹی! یہ پرانے لوگ ہیں۔ رسم و رواج کو زیادہ مانتے ہیں۔ ان کی بات کا برا نہ ماننا۔ یہاں خاندانوں کی اکثریت ایسی ہی شادیوں کی تمہیں نظر آئے گی۔ انہی رسموں سے تو شادی میں خوشیوں کے رنگ بھرتے ہیں۔ ورنہ پھر شادی کیسے معلوم ہو۔“ وہ ہنس پڑی۔

”چلو دو چار گھنٹے کی بات ہے۔“

”خاموشی سے سب کچھ دیکھتی جاؤ۔ تم نے ابھی یہاں کی شادیاں دیکھی کہاں ہیں۔“

”مُمی! شادیاں تو ہم نے وہاں بھی پاکستانی اور ہندوستانی فیملیز میں دیکھی ہیں مگر میں نے وہاں دولہا کا اتنا بڑا جنائی پیروں تک سہرا نہیں دیکھا جسے دو باڈی گارڈ اٹھا کر چلتے ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔ یہ ایک انوکھا اور جدید اسٹائل بھی دیکھ لو۔“ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

اور واقعی سفینہ ہر چیز بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ میں اپنی شادی میں ہرگز اپنے دولہا کے لیے اتنا بڑا سہرا نہیں بنوانے

دوں گی۔ بلکہ سرے سے سہرے والی رسم ختم ہونا چاہیے۔

پھر نکاح ہوا فراز تو سہرے کی وجہ سے الجھن میں تھا۔ اس نے دلہن کے نام پر توجہ ہی نہیں دی۔ ذہن میں تو یہی تھا کہ اس کی شادی سفینہ سے ہی ہو رہی ہے۔ کول کے نام پر چونکا ضرور لیکن سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے والدین نے اس کا نام کول رکھا ہو۔ سفینہ نام اس کے ماموں نے رکھا ہو۔

لوگ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ اس نے کئی بار دوستوں کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا۔

”یار! کچھ دیر کے لیے سہی۔ اس پھولوں کی چادر سے مجھے نجات دلا دو۔ جو ہمارے سر والوں نے زندہ مرقد پر چڑھا دی ہے۔“

”کیوں بدشگون کی بات کرتے ہو یار۔“ دوستوں نے کہا۔

”جہاں اتنا برداشت کر لیا ہے وہاں تھوڑی دیر اور سہی۔“

وہ تو خیر گزری کہ موسم سردی کا تھا اگر گرم موسم ہوتا تو پھولوں کا یہ بوجھ ناقابل برداشت ہو جاتا۔ رخصتی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ آوازیں آنے لگیں.....

”ابھی آرسی مصحف کی رسم تو ہوئی نہیں۔“

کوئی بولا۔ ”دولہا کو سلامی کے لیے لاؤ۔“

کوئی چیخا۔ ”ارے دولہا کو دودھ کا گلاس تو دو.....“

دولہا نے جب یہ سب سنا تو دہلیز ہی سے پلٹ کر اپنے دوستوں کے ساتھ تیزی سے کار کا دروازہ کھولا اور بیٹھتے ہوئے چیخ کر کہا۔

”جلدی کرو یار! کوئی آنہ جائے گاڑی تیز چلاؤ۔“

اتنے میں اس کی امی اور ارم بھاگتی ہوئی آئیں۔

”یہ کیا کر رہے ہو بیٹا! اکیلے جا رہے ہو۔ دلہن بھی تو ساتھ جائے گی۔ بس ایک منٹ..... نیچے اترو بیٹا۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ انہوں نے پیار سے کہا۔

”نہیں مُمی۔ پلیز یہ من بھر کا بوجھ اب ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔ خیریت اسی میں ہے۔ آپ ہمیں جانے دیں۔ میں گھر پر آرام کروں گا۔ آپ لوگ دلہن کو ساتھ لے آئیے گا۔“

اور گاڑی زن سے نکل گئی۔ ماں بہن منہ دیکھتی رہ گئیں۔ ان کے آس پاس اور بھی کئی لڑکے لڑکیاں عورتیں آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ہنسا شروع کر دیا۔ لڑکے اور لڑکیوں کے مشترکہ قہقہوں کے اونچے اونچے فائر بڑی دور تک ان کا تعاقب کر رہے تھے۔

”بیٹی! کتنی دور گھر رہ گیا ہے؟“ نانی نے گھبرا کر پوچھا۔
”بس نانی اماں! تھوڑی دور اور چلنا پڑے گا۔“

آخر وہ بوڑھی بڑیاں بے چاری اور کتنی دور گزرتی رہیں۔ ایک جگہ تھک کر بیٹھ گئیں۔
سڑک کے کنارے پتھر پر۔

”بس بیٹا۔ اب ہم سے نہ چلا جائے۔“ انہوں نے بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں لے کر کہا۔
”اے کتنی بسیں بدلیں۔ کتنا پیدل چلے۔ اللہ مارا یہ راستہ تو شیطان کی آنت ہو گیا۔“
وہ باقاعدہ ہانپنے لگیں۔ ظاہر ہے۔ ڈرگ روڈ سے سرجانی ٹاؤن کا سفر کچھ تھوڑا نہیں
تھا۔ نانی نے اپنا خیمہ نما برقعہ پیچھے سے آگے کیا اور اس کے کونے سے اپنے چہرے کا پسینہ
پوچھنے لگیں۔

مریم گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ کر اپنی چادر سنبھالنے لگی۔

”اٹھ جاؤ نانی! لوگ آتے جاتے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ جانے کیا سمجھیں۔
ذرا سارا راستہ اور رہ گیا ہے۔“

مریم نے ایک ہاتھ سے ننھی سی بچی کو سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے وہ نانی کا ہاتھ پکڑ کر
اٹھانے لگی۔ وہ ہانپتے ہانپتے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں مریم کی طرف دیکھ کر بولیں۔
”بچی کو مجھے دے دے تو اٹھائے اٹھائے تھک گئی ہوگی۔“ وہ چمکار کر بچی کی طرف
دیکھنے لگیں۔

”نہیں نانی اماں! یہ تو پھولوں کا بوجھ ہے۔ تمام عمر اگر اٹھا کر چلتی رہوں تب بھی نہ
تھکوں۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔

”بس وہ سامنے والی گلی میں جانا ہے۔“

”چلو شکر ہے۔ گھر تو آیا۔“ نانی جیسے تازہ دم ہو کر مسکرائیں۔

کچھ دیر بعد وہ دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ دروازہ اس کے بھائی شفیق نے کھولا۔

”ارے باجی۔ آپ۔ خیریت تو ہے؟“ اس نے لپک کر بچی کو گود میں لے لیا اور نانی
سامنے پر پڑے ہوئے پلنگ پر بیٹھ کر اپنی سانسیں درست کرنے لگیں۔
”امی کہاں ہیں؟“

اس آواز میں جانے کیا تھا زہرہ لپک کر اندر سے نکلیں۔ مریم دوڑ کر ماں سے لپٹ کر
چینیں مارنے لگی۔

”امی۔ امی۔ میں برباد ہو گئی۔ جلیل نے مجھے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ میں نے

لاکھ رو رو کر اس سے معافیاں مانگیں۔ خوشامد کی مگر وہ نہ مانا اور طلاق دے دی۔“
ماں بیٹی دونوں ایک دوسرے سے لپٹی بلک رہی تھیں۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو زہرہ
نے اس کے آنسو پونچھے۔ بھائی نے پانی لا کر پلایا اور اندر سے کرسی لا کر زبردستی بہن کو بٹھا
دیا تب انہیں بچی کا خیال آیا۔
”بچی کہاں ہے؟“

”امی۔ وہ سو گئی تھی۔ میں نے اندر لٹا دیا ہے۔“ شفیق نے کہا۔

”امی! اس نے بچی کو مجھے دے کر کہا۔ لے جا اسے بھی جانے کس کا باپ ہے یہ۔
اس نے مجھے کپڑے اور سوٹ کیس بھی نہیں لینے دیا۔ آخر میں نے اپنا پرس اور چادر
اٹھائی۔ بچی کو گود میں لیے روتی ہوئی باہر آ گئی۔“ اس کے آنسو پھر تیزی سے بہنے لگے۔
”نہ رو میری بچی۔ صبر کر۔ اللہ دیکھنے والا ہے۔“

”اگر میرے ساتھ یہ نانی اماں نہ ہوتیں تو جانے میرا کیا حشر ہو جاتا۔ یہ جلیل کی چیخ و
پکار سن کر باہر آ گئی تھیں۔ مجھے اندر لے گئیں۔ بڑی لعن طعن کی اسے۔ مجھے سمجھاتی رہیں
کہ شکر کر بچی واپس کر دی ورنہ کیا ہوتا اور میں نانی کے ساتھ آ گئی۔“

”اماں! اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میری بچی کو گھر تک پہنچا دیا۔ ورنہ جانے کہاں
جاتی۔ میرا فیصلہ تو اللہ ہی کرے گا۔ کتنا ستایا ظالم نے میری بچی کو۔“
زہرہ نانی کا شکر یہ ادا کرتی جا رہی تھیں اور آنسو پونچھتی جا رہی تھیں۔

”اے بی بی! کیا تم نے پہلے نہیں اس کی چھان پھٹک کی تھی۔ کہ وہ موا کیسا ہے۔ اچھا
یا برا؟ لوگ تو ڈھور ڈنگر بھی ہرا بھرا سبزہ دیکھ کر چھوڑتے ہیں۔ تم نے کیا دیکھ کر اس
بد معاش کے حوالے اس بچی کو کر دیا۔ میں روز سنوں تھی کیسا مارے تھا بچی کو مگر شاباش
ہے۔ یہ منہ سے بھاپ بھی نہ نکالے تھی۔ پر جو ہوا سو اچھا ہوا۔ دکھیا ری کو نجات مل گئی۔“
نانی نے اپنے بٹوے سے چھالیہ تمباکو نکال کر پھانکی۔

”ارے اماں! سب نصیبوں کی بات ہوتی ہے۔ آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے ورنہ کون
اپنے جگر کے کٹڑے کو یوں اپنے سے جدا کرتا ہے۔ اللہ انہیں سمجھے جنہوں نے اس شیطان
کو فرشتہ بنا کر آسمان پر بٹھا دیا تھا اور ہم نے یقین کر لیا تھا۔ یہ تو آپ کی زبانی معلوم ہوا
کہ میری نازوں کی پتی پر اس ظالم نے اتنے ستم توڑے۔ ورنہ آج تک اس نے کبھی مجھ
سے کچھ نہ کہا۔ ایک میرا دوسرا داماد بھی تو ہے اللہ اسے قدم قدم سکھ کی چھاؤں دے۔ میری
بیٹی کیسی خوش ہے اس کے ساتھ۔“

پھر زہرہ نے نانی سے کہا۔

”اماں! منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھاپی لیں اور آرام کریں۔ میں آپ کو شفیق کے ساتھ بھیج دوں گی۔“

”چندا! میرے پوتے پوتی میرے بغیر نہیں رہے، وہ مجھے نہیں پائیں گے تو باہر نکل جائیں گے۔“ وہ ہنسیں۔

نانی نے منہ ہاتھ دھو کر کمر نکالی تھی۔ تب زہرہ نے روح افزا کا گلاس انہیں دیتے ہوئے بیٹے سے کہا۔

”شفیق! اماں کو گھر چھوڑ آؤ بیٹے۔“

”نہیں بچے۔ بس مجھے گاڑی میں بٹھا دینا۔ وہ مجھے دروازے پر اتار دے گی۔“
یہ کہہ کر انہوں نے برقعہ اٹھایا۔ زہرہ کو گلے لگایا۔ مریم کو پیار کیا اور چلی گئیں۔ زہرہ انہیں دروازہ تک چھوڑنے لگی۔

”جیتی رہو۔ بیٹا! اللہ تمہیں بچوں کی خوشیاں دکھائے۔“ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔

زہرہ نے مریم سے کہا۔ ”بیٹی۔ ظلم کرنے اور ظلم سہنے والے دونوں مجرم ہوتے ہیں۔ تم نے اپنے اوپر بڑی سختیاں جھیلیں۔ دکھ اٹھائے مگر انہیں کی۔ اپنے پیاروں، عزیزوں سے بھی کچھ نہ کہا۔ اب عورت اتنی بھی کمزور اور مظلوم نہیں ہوتی کہ اپنے حق کے لیے زبان نہ کھول سکے۔ اس کا حق تو ہمیں خدا اور اس کے رسول نے بھی دیا ہے پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”امی! ایک تو وہ اپنے اوباش دوستوں کو گھر بلا کر ناؤ نوش میں انہیں شریک کرتا تھا۔ تنکے کباب کی فرمائش کر گئے بنواتا اور پھر مجھ سے کہتا کہ یہ سارا سامان ٹرائی میں سجا کر خود ان کے سامنے لے جاؤں۔ میں انکار کرتی تو مارتا پیٹتا اور گالیاں دیتا۔ مجبوراً مجھے اندر جانا پڑتا اور ان کی اپنی طرف اٹھی ہوئی غلیظ نگاہوں سے میں پانی پانی ہو جاتی تھی کئی بار میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے کہا۔

”جلیل! آپ بے شک مجھے مار لیں مگر اپنے دوستوں کے سامنے مجھے نہ بھیجا کریں۔“

”تو انکار کر کے تو دیکھ۔ ہاتھ پاؤں نہ توڑ دوں تو کہنا۔ میں تڑپ کر رہ گئی۔ پھر جب میری بچی ہوئی تو گود میں لینے سے انکار کر دیا جانے کس کا باپ ہے۔ یہ بچی میری تو نہیں لگتی۔“

”امی۔ اس دن میرے دل کے ہزار ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے رو رو کر انہیں انی

پاکد امنی کا یقین دلانا چاہا تو بولا۔

”اگر بیٹا ہوتا تو کچھ تو اس میں میری چھب ہوتی۔ مگر یہ تو جانے کس کا گند اخون ہے۔“ وہ زور زور سے تھپتھپ لگانے لگا۔ وہ بے تحاشا ڈرنک کرتا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر۔ ایسے میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتی تھی کہ کوئی اس کا دوست شراب کے نشے میں دھت میرے کمرے میں نہ گھس آئے پھر جلیل نے کام پر جانا چھوڑ دیا۔ تمام دن گھر میں رہتا۔ فرمائشیں کر کے چیزیں پکواتا۔ ایک دن میں نے پوچھا۔

”آپ کام پر کیوں نہیں جاتے۔ کیا نوکری چھوڑ دی؟“ اس کے جواب میں ایک بھڑک میرے منہ پر پڑا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا انتہائی سرخوشی میں بولا۔

”اب مجھے کیا ضرورت ہے کام کرنے کی۔ میرے ہاتھ میں دولت کی کنجی جو آگئی ہے۔“

”کیا مناب ہے آپ کا؟“ میں چونک پڑی۔
”اب کیا مطلب بھی تجھے سمجھانا پڑے گا۔ رات میں اچھے کپڑے اور میک اپ کر کے تیار رہنا۔“ اور میں انگاروں پر لوٹنے لگی۔ کیا کوئی شوہر اس قدر بے حس اور بے غیرت بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ کسی خریدار کو لایا تھا۔ میں نے اس رات نہ کپڑے بدلے نہ کٹنری کی بلکہ اسے بے نقطہ سنائیں جو منہ میں آیا۔ بس میں نہیں تھا کہ اس کا منہ بوجھ لیتی یا شوٹ کر دیتی۔ اس دن اس نے مارا مار کر میرا جوڑ جوڑ ہلا دیا۔ میں چیختی تڑپتی رہی کوئی میری مدد کو نہ آیا اور وہ آدمی بھی شاید بھاگ گیا تھا۔ میں نے صاف کہہ دیا چاہے آپ مجھے مار ڈالیں مگر میں وہ نہیں کروں گی جو آپ چاہتے ہیں تب ہی اس نے مجھے یہ کہہ کر طلاق دے دی! اب تو میرے کام کی نہیں رہی۔ جانگل یہاں سے۔ میں دوسری کر لاؤں گا۔“

یہ کہہ کر مریم رونے لگی۔ ماں نے پیار کر کے چپ کرایا اور کہا۔
”بیٹی۔ اس ذلت کی زندگی سے طلاق بہتر تھی۔ خدا نے تیری سن لی تھی تب ہی تجھے اس عذاب سے نجات مل گئی۔ دو سال میں تیرا گھر آباد بھی ہوا اور اجڑ بھی گیا۔ یہ سب تقدیر کے کھیل تھے۔“

اس کے بعد زہرہ نے اپنے علاقے کے کونسلر سے کہہ کر جلیل کے نام نوٹس بھجوا دیا طلاق نامے کے لیے ایک ہفتے بعد عدالت سے تصدیق شدہ طلاق نامہ بھی آ گیا۔ اب ماں باپ کو مریم کی دوسری شادی کی فکر لاحق ہو گئی۔ انہی اس کی عمر کیا تھی صرف بائیس سال لیکن اس پر طلاق پر کا داغ لگ چکا تھا پھر اس کی ایک بچی بھی تھی۔ اس لیے اچھے رشتے ماننا بھی مشکل تھے۔ اس کے باوجود کوشش جاری تھی۔

مریم کے والد کی اس علاقے میں نائز ٹوب کی دکان تھی۔ کوئی امیر آدمی نہیں تھے۔ بس ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں۔ سرجانی ٹاؤن میں قرعہ اندازی میں پلاٹ نکل آیا تھا۔ تب انہوں نے رفتہ رفتہ مکان بنوا لیا۔ پہلے وہ لیاقت آباد میں رہتے تھے کرائے پر۔ دکان بھی وہیں کرتے تھے۔

احمد حسین کے والد اکبر حسین ان کے پڑوسی اور دوست تھے ان کی اسپئر پارٹس کی صدر میں دکان تھی۔ اکبر حسین کا انتقال جب ہوا تو اس وقت وہ لیاقت آباد ہی میں تھے۔ احمد حسین کالج میں پڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ گھر میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا جو گھر اور دکان سنبھالے۔ چنانچہ اس نے کالج چھوڑ کر دکان سنبھال لی۔ انٹر کیا تھا۔ گریجویشن اس نے پرائیویٹ کیا۔ بڑی بہن کی شادی باپ کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی۔ ان کے گھر زہرہ کا آنا جانا تھا۔ مریم کی شادی لیاقت آباد والے گھر ہی میں ہوئی تھی۔ کیونکہ سرجانی ٹاؤن والا گھر زیر تعمیر تھا۔ شادی کے بعد مکان مکمل کروا کر اس میں شفٹ ہو گئے اور دکان بھی وہیں لے لی۔ نئی آبادی کی وجہ سے نائز ٹوب کی دکان خوب چلی۔

زہرہ کبھی کبھی احمد حسین کی ماں سے ملنے ضرور جاتی تھی۔ جب زہرہ نے مریم کی طلاق کے بارے میں انہیں بتایا تو احمد حسین کی ماں کو بے حد افسوس ہوا۔ وہ سناٹے میں رہ گئیں۔ اتنی پیاری بچی کے ساتھ یہ ظلم۔ اتنی سی عمر میں وہ دلہن بھی بنی اور طلاق یافتہ بھی ہو گئی۔ مریم انہیں بہت پسند تھیں۔ تب ہی انہوں نے زہرہ کو اپنے بیٹے کے لیے مریم کا رشتہ دے دیا۔ احمد حسین کی نیکی، شرافت اور کردار کو کون نہیں جانتا تھا۔ ہر شخص اس کی تعریف کرتا تھا۔

احمد حسین کو جب ماں نے مریم کے متعلق بتایا تو اس کا دل بھی ہل گیا۔ واقعی مریم بہت اچھی لڑکی تھی۔ وہ کسی طرح جلیل جیسے اوباش اور بدکردار شخص کے لائق نہیں تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے اپنی مہربان ماں کے فیصلے سے بڑی خوشی اور اطمینان ہوا۔ یہ تو بڑی نیکی تھی۔ ماں نے ایک زندگی برباد ہونے سے بچالی تھی اور مریم اس کی زندگی میں داخل ہونے والا خوشبو کا وہ جھونکا تھا جس نے احمد حسین کے گلستان حیات کو نئی تازگی اور بہاروں سے ہمکنار کر دیا تھا۔ مریم نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا یہ سوچ کر کہ دنیا کا ہر مرد جلیل نہیں ہوتا۔

کچھ دنوں بعد احمد نے بچی کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا جو نانی کے زیر سایہ پرورش پا رہی تھی۔ سفینہ کو وہاں ماں باپ اور دادی کا بھرپور پیار ملا۔ اس نے سکے باپ کی طرح بچی کا

ہر طرح خیال رکھا۔ مریم کے دل میں شوہر کی طرف سے ٹھنڈے جھرنوں کی پھوار پڑتی گئی۔ محبت سے زیادہ اس کے دل میں احمد حسین کا احترام تھا۔ اس نے بھی اس کی بے پناہ خدمت اور محبت سے اس کا دل جیت لیا تھا۔

بچی کے حوالے سے وہ اس پر مزید غبار ہونے لگی۔ ساس کو اس نے ماں سے بڑھ کر چاہا لیکن جب خدا نے ہر طرف سے سکھ اور فارغ البالی دی تو جلیل کی طرف سے لگائے ہوئے زخم اور احساس ذلت کو دینے لگے۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹنے بکھرنے لگی اور ماضی کا یہ دکھ بیماری کی شکل اختیار کر گیا۔ احمد حسین اس کا اور خیال رکھنے لگا۔ اسے گھمانے لے جاتا۔ اس کی پسندیدہ چیزوں۔ پسندیدہ لباس اور جیولری کے لیے وہ اسے شاپنگ سینٹر لے جاتا۔ اسے آرائش خانہ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اپنی مرضی سے جس طرح چاہتی سبائی خرچ کرتی۔ بچی کو جو چاہتی پہنائی کھلاتی بلکہ احمد حسین اپنی پسند سے سفینہ کے لیے فراہم کرتے جو تے وغیرہ لے کر آتا تو وہ ہنس کر کہتی۔

”پہلے ہی اس کے پاس کپڑوں، جوتوں اور چیزوں کا ڈھیر پڑا ہے۔ مزید آپ اور لے آئے۔“

”چلو۔ کچھ وہ پہنے گی اور کچھ اس کی چھوٹی بہن....“ وہ مسکراتا۔

”چھوٹی بہن کہاں سے آگئی؟“ مریم نہ سمجھتے ہوئے کہتی تو احمد حسین کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔

”ارے بھئی! آ نہیں گئی۔ آئے گی۔“

اور شوہر کی میٹھی میٹھی مسکراہٹ سے جب وہ سمجھی تو شرما کر اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا۔ لیکن دوسرے لمحے وہ اداس ہو جاتی۔ اسے بخار رہنے لگا تھا۔ اندر ہی اندر جیسے وہ ڈوبتی جا رہی تھی۔ سینے کا درد اسے بے چین کر دیتا۔ احمد حسین نے علاج میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ اسے مریم سے بے حد محبت تھی۔ وہ اسے کھونے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ ہر طرح اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا اور مریم عشاء کی نماز کے بعد گھٹنوں سجدے میں رو کر خدا سے دعا کرتی۔

”اے میرے رب۔ تو نے میری محرومیوں۔ دکھوں کا اتنا بڑا اجر دیا ہے احمد حسین کی شکل میں۔ اب میں مرنا نہیں چاہتی۔ زندگی مجھے اچھی لگنے لگی ہے مجھے میرے لیے نہ سہی اپنے اس نیک بندے بوزھی ماں اور معصوم بچی کے لیے زندہ رکھ۔ میں تجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگتی ہوں۔“

لیکن سفینہ ابھی چار سال کی تھی کہ مریم نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور

احمد حسین کی دنیا تاریک کر گئی۔ تین سالہ فاقہ میں مریم نے اسے اتنی محبت، اتنا سکھ دیا تھا اس کی موت نے زندگی کی ساری لافیت، تمام خوشیاں چھین لی تھیں۔ پانیٹ خالی ہو گئی تھی۔ زہرہ نے بچی کو لے جانا چاہا مگر دادی نے اسے کلیجے سے لگا لیا۔ آسوس میں آنسو بھر کر بولیں۔

”میں اسے اپنے سے جدا نہیں کروں گی۔ مجھے لگتا ہے میری مریم چھوٹی ہو کر میری گود میں آگئی ہے۔ نہ وہ باپ کے بغیر رہ سکتی ہے۔“

وہ ہر دم احمد حسین کے ساتھ چپکی رہتی تھی۔ وہ بھی اس ننھی سی جان کو مریم کا نعم البدل سمجھتے۔ اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔

پھر ماں نے چھ ماہ بعد ہی احمد حسین کی دوسری شادی کر دی۔

انہوں نے لاکھا انکار کیا مگر ماں نے انہیں گلے سے لگا کر کہا۔

”بیٹا! موت تو برحق ہے لیکن کسی کے مرنے سے دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔ اس گھر کو گھر والی اور معصوم سفینہ کو ماں چاہیے اور تمہارے لیے ایک رفیق۔“

وہ چپ ہو گیا پھر شکیلہ بیگم نے مریم کی خالی جگہ پر کر دی۔ رشتوں کی زنجیر اور مضبوط ہو گئی۔ شاید اچھے لوگوں کو اچھے ہی لوگ ملتے ہیں اس نے آتے ہی سفینہ کو کلیجے سے لگا لیا۔

اسے ماں کا بھرپور پیار دیا اور کچھ دنوں کے بعد سفینہ اس کے آگے پیچھے پھرنے لگی۔ ساس کو ماں اور شوہر کو خدا کا درجہ دینے والی شکیلہ خاندان بھر میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھی جانے لگی۔ احمد حسین سجدہ شکر بجالائے پھر خدا نے انہیں ایک پیاری سی بیٹی سے نوازا۔ اس کی بعد شکیلہ کے دو بیٹے ہوئے۔ ماں، بیٹے بہو کو پھلتا پھولتا دیکھ کر مطمئن سی عدم آباد کو سدھار گئیں۔

زہرہ کا بڑا بیٹا کئی سال پہلے کسی ملکینک کے ساتھ کینیڈا چلا گیا تھا۔ پہلے وہ ملازمت کرتا رہا پھر اس نے وہاں اپنا ہوٹل کھول لیا اور وہیں پاکستانی فیملی میں شادی کر لی لیکن اولاد سے محروم رہا۔ مریم کی بہن کی دوسری شادی میں بھی وہ نہ آیا۔ وہاں سے آنا کچھ آسان نہیں ہوتا لیکن جب بہن کے انتقال کی خبر سی تو آگیا اپنی بیوی کے ساتھ۔

زہرہ نے بیٹے کو بارہ تیرہ سال بعد دیکھا تھا۔ مل کر بہت روئیں۔ جاتے وقت اس نے احمد حسین سے سفینہ کو لے جانے کی درخواست کی اور کہا۔

”تمہارے پاس ایک بیٹی ہے مگر میں خالی ہاتھ ہوں۔ مجھے سفینہ کو دے دو۔ میں اسے شہزادیوں کی طرح رکھوں گا۔ اللہ تمہیں اور اولاد دے دے گا۔“

ممائی نے بھی شوہر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ بولیں۔ ”بھیا! میری ممتا کی تسکین ہو جائے

گی۔ یہ کوئی غیر نہیں۔ اپنی نند کی نشانی سمجھ کر ہمیشہ اسے دل کے قریب رکھوں گی۔“ لہجہ التجا یہ تھا۔ شکیلہ نے کہا۔

”جی تو نہیں چاہتا اسے اپنے سے جدا کروں مگر اس پر آپ کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا۔ آپ اس کے ماموں ہیں یقیناً محبت سے رکھیں گے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

اس طرح سفینہ پانچ سال کی عمر میں اپنے ماموں کے ساتھ کینیڈا چلی گئی۔ وہ اسی ماحول، اس معاشرے میں پلتی بڑھتی رہی اور احمد حسین نے اپنی تسکین کو مل کے معصوم وجود میں ڈھونڈ لی۔ گھر میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے معصوم تہقہوں اور شرارتوں سے رونق ہو گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھے۔ اللہ نے اپنی رحمت سے بڑا نوازا تھا۔ انہیں مریم کی بیٹی سے بھی اتنی ہی محبت تھی جتنی اپنی کوئل سے۔ شکیلہ نے بھی کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔ سفینہ کی

ماں زندہ نہیں ہے یا کوئی دوسری ہے۔

اب بھی سفینہ کے فون کبھی بھی آتے تھے۔ وہ شکیلہ سے اپنی محبتوں کا اسی طرح اظہار کرتی تھی۔ اپنے اور بہن بھائیوں کے متعلق پوچھتی تھی۔ یہی وجہ تھی احمد حسین نے کوئل کی شادی میں ماموں کی پوری فیملی کو دعوت نامہ بھیجا تھا مگر چونکہ ممائی بیمار تھیں اور ماموں مصروف۔ اس لیے صرف سفینہ آگئی تھی۔ ماں باپ کے ناتے انہوں نے بھی سفینہ کے لیے شادی کے جوڑوں کا اہتمام کیا تھا۔ جسے دیکھ کر اور پہن کر سفینہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اس کے لیے تو یہ سب بالکل نیا نیا اور خوب صورت تھا۔

☆.....☆.....☆

دولہا کے اچانک اس طرح شادی کے بھرے گھر سے بغیر دلہن کے چلے آنے سے خواتین میں چمگوئیاں ہونے لگیں۔ سب نے برا منایا۔ بلکہ چند ایک نے اسے بدشگونئی سے بھی تعبیر کیا مگر شکیلہ بیگم اور ام کی امی نے سب کو سمجھا کر خاموش کر دیا۔

”یہ کوئی بات نہیں ہے۔ دولہا تھکا ہوا بھی تھا اور اپنے سہرے سے گھبراہٹا ہوا بھی۔ نکاح تو ہو ہی چکا تھا اس لیے وہ گھر چلا گیا کچھ دیر آرام کر لے گا۔ پیچھے سے دلہن بھی چلی جائے گی۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

فراز پھولوں کی چادر اوڑھے اوڑھے آنکھیں بند کیے گاڑی کی سیٹ پر پاؤں پھیلا کر لمبا ہو گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ کار کی کھڑکی سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ اس کی ناک میں پھولوں کی خوشبو بھی جا رہی تھی جس نے اسے مست والست کر دیا۔ دوستوں کو اس پر بڑا ترس آ رہا تھا اور وہ اپنے دل میں سوچ رہے تھے کہ ہم شادی ضرور کریں گے لیکن اپنے

پر پھولوں کا من بھر کا یہ بوجھ لیے لیے نہیں پھریں گے۔ ورنہ شادی سے توبہ۔ انہوں

نے سوتے ہوئے فراز کی طرف دیکھا۔ تھوڑا سا چہرہ کھول دیا تھا تاکہ نیند خراب نہ ہو۔
ساجد اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔

”ٹھیک ہے یا رسو جا۔ ابھی تو جانے کتنی راتوں کا رت جگا تیرے نصیب میں لکھا ہوگا۔“

سارے دوست ہنس پڑے اور گاڑی فرائٹے بھرتی رہی۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ گھر پہنچے تو دو گھنٹے بعد۔ حالانکہ دو گھنٹے پہلے پہنچنا تھا۔ اس اثنا میں دلہن کو دوبارہ میک اپ کر کے جلہ عروسی میں پہنچایا جا چکا تھا۔ ہر طرف موتیا اور گلاب مہک رہے تھے۔ کمرہ رشک چین بنا ہوا تھا اور سبھی سبائی چاند چہرے والی لڑکیاں اسے گھیرے ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ تب دولہا کے دوست اس کا سہرا سنبھالے اور اسے تھامے ہوئے اندر لائے۔ لڑکیاں ہنستی کھلکھلاتی ہوئی اٹھ کر جانے لگیں۔ ماں نے پوچھا۔
”کہاں رہ گئے تھے تم لوگ؟“

”ارے آنٹی! ٹائر پنچر ہو گیا تھا۔ ٹائر بدلتے اور پنچر لگواتے اتنی دیر ہو گئی۔ اب آپ جلدی سے دولہا میاں کے سر سے یہ بوجھ اتار دیجیے۔ ورنہ یہ ابھی غش کھا کر گر پڑیں گے۔“

اور ماں لڑکیوں کو اشارہ کر کے چلی گئیں اور دوستوں نے اسے پھولوں کی بیج پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”بس نوشہ جی! آپ اپنا سہرا ہٹا سکتے ہیں۔ دلہن سامنے بیٹھی ہے۔ گھونگھٹ اٹھانے کا تکلف بعد میں پہلے یہ بوجھ ہٹا لیجیے۔ اچھا خدا حافظ۔“

ساجد اور راہول نے ایک قہقہہ لگایا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا اور فراز نے واقعی بے تابی سے سر پر ہاتھ مارا تو کلاہ مع سہرے کے سرسراتی ہوئی گود میں آ کر گر گئی۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔

”لاحول ولا قوۃ۔ کتنی بے ہودہ رسمیں ہیں۔“ اس نے سہرا کرسی پر اچھال دیا۔

اب جو نگاہ اٹھائی تو سامنے دلہن بڑا سا گھونگھٹ نکالے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اسے بڑا اچنبھا سا ہوا کہ اتنی تعلیم یافتہ، ایڈوانس مغربی ماحول کی پروردہ لڑکی ایک روایتی دلہن کی طرح ریشمی سرخ کپڑوں کی گٹھری بنی بیٹھی تھی۔ اسے ہنسی آ گئی یہ سوچ کر شاید اسے بھی میری طرح شادی کے رسم و رواج سے سمجھوتہ کرنا پڑا ہوگا۔ خیر کوئی بات نہیں۔

اس نے اطلس کی آف وائٹ شیروانی اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دی اور ہاتھ روم میں چلا گیا۔ بڑی دیر تک وہ ہاتھ منہ دھو تارہا پھر فریش ہو کر آیا تب بھی دلہن اسی پوزیشن

میں بیٹھی ہوئی تھی اس نے تولیہ سے اچھی طرح ہاتھ منہ خشک کیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش پھیرا اور کپڑوں میں پرفیوم چھڑکا۔ پھر آئینے میں اپنا جائزہ لے کر مسکراتا ہوا نہایت خوشگوار دھڑکنوں کے ساتھ آہستہ آہستہ چل کر دلہن کے قریب بیٹھ گیا۔ اور مسکرا مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔ ریشمی گٹھری میں حرکت ہوئی اس کا سر اور جھک گیا۔

”یار۔ یہ کیا تماشا ہے۔ اتنا لمبا گھونگھٹ نکالا ہے سفینہ جان تم نے؟ اب اٹھا ہی دوسر۔“

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھا کر گھونگھٹ الٹ دیا۔ دونوں کی نظریں حیرت سے ایک دوسرے کے چہرے پر جم سی گئیں۔

سفینہ جان کا لفظ ایٹم بم تھا جس نے کول کو حواس باختہ کر دیا اور اپنی شرم و حیاء بالائے طاق رکھ کر وہ اس دیوتا کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی تصویر کو اس نے مسلسل دو سال تک اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپا کر پوجا تھا اور جب وہ دیوتا جیتا جاگتا تصویر سے نکل کر اس کے سامنے آیا تو اس نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ اس کی زبان پر کسی اور پجاری کا نام تھا اور وہ پجاری کوئی اور نہیں۔ اس کی اپنی بہن تھی، کول کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا اور فراز نے ایک جھٹکے سے اس کا گھونگھٹ چھوڑ دیا۔

”کون ہو تم.....؟“ اس نے غصہ ضبط کر کے سلگتے لہجے میں پوچھا۔

”سفینہ کہاں ہے؟“

مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا تب وہ چیخا ہوا اٹھا۔

”امی!“

”پاپا!“

”ارم!“

تب سب ہی لوگ دوڑ پڑے۔

”کیا ہوا بیٹا۔“ ماں سب سے آگے تھی۔

”امی! یہ کون ہے؟“ فراز نے کول کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

سب حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہے تھے۔ کیسا عجیب سوال کیا تھا اس نے.....؟

”بیٹا۔ یہ تمہاری دلہن ہے کول۔“

”نہیں امی۔ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ آپ لوگوں نے میرے خلاف سازش کی ہے۔“

لیکن مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہاں اس جگہ۔ اس بیچ پر سفینہ کو میری دلہن کے روپ میں ہونا چاہیے تھا۔ تم یہاں کیسے اور کیوں آئیں اور یہ کہ کیا تم سفینہ کو جانتی ہو اس سے کوئی صورت ہو سکتی ہے ملاقات کی اور یہ بھی سن لو کہ میں تمہیں نہیں جانتا کہ تم کون ہو میرا تم سے کوئی تعلق نہیں اگر کسی غلط فہمی کی بنا پر تم سے عقد ہو بھی گیا ہے۔ تب بھی اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ تم مجھ سے طلاق لے سکتی ہو۔“

لفظوں کی بمباری مسلسل جاری تھی۔ جس نے کوئل کو پارہ پارہ کر ڈالا تھا۔ اب چپ رہنا مشکل ہو گیا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر بڑے ضبط کے ساتھ اس سنگدل دیوتا کو دیکھا جسے پوجنے کی غلطی وہ کر بیٹھی تھی۔ جس نے لمحہ بھر میں اسے عرش سے اٹھا کر بڑی بے دردی سے فرش پر پھینک دیا تھا۔

”میں جانتی ہوں۔ آپ مجھ سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے اور میں کون ہوں؟ یہ آپ کی والدہ اور بہن بھائی بہتر طور پر بتا سکتے ہیں۔ میں یہاں از خود نہیں آئی۔ لائی گئی ہوں۔ اگر آپ اپنے پروگرام اپنی والدہ اور بہن بھائی کو بتا دیتے تو آج یہ رنگ محفل نہ ہوتا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ جہاں جس بیچ پر میں آج بیٹھی ہوں۔ کل یا دو دن بعد اسی جگہ۔ اسی بیچ پر سفینہ دلہن کے روپ میں آپ کی منتظر ہوگی یہ میرے اختیار میں ہے لیکن ایک شرط ہے میری۔“

”کیسی شرط؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”آپ طلاق دے کر مجھے رسوا نہیں کریں گے“ یہ میرا وعدہ ہے میں دوبارہ آپ کے سامنے نہیں آؤں گی۔“ یہ کہہ کر کوئل نے جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ فراز کچھ سوچنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے لیکن اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ میں سفینہ کے سوا کسی سمجھوتے پر راضی نہیں، مجھے صرف سفینہ چاہیے۔ میں یہاں اسی سے شادی کرنے آیا تھا۔ اگر تم نے میرے ساتھ کوئی کھیل کھیلا تو یاد رکھنا تمہاری زندگی انگاروں پر گزرے گی پھر میں کسی شرط کا پابند نہیں رہوں گا۔“ وہ منہ پھیر کر جلدی سے نیچے اتر گیا۔

”اور انگاروں پر کیسے ڈالا جاتا ہے ڈاکٹر فراز احمد۔ اس سے بڑھ کر اور کون سا جہنم ہوگا میرے لیے“ مگر وہ صرف آنسو پی کر رہ گئی اور فراز کو نے میں پڑی کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ وہی عروسی بھاری جوڑا جس کی ہر جنبش سے اس کے ارمان جاگتے تھے۔ اب اس کا ہر تازہ ہر ستارہ اسے ڈسنے لگا تھا۔ بدن میں سونیاں چھو رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھی۔ اپنا بھاری شرارہ سوٹ سنبھالا اور الماری سے کپڑے نکالنے لگی پھر اس نے اپنا سارا زور ایک

”یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔ کیسا دھوکا۔ کیسی سازش؟“ سب حیرانی سے اس کو دیکھ رہے تھے اب ان کی آنکھوں اور چہرے پر خوف بھی تھا۔ ”ہاں امی۔ جس لڑکی سے میری شادی ہوئی تھی وہ یہ نہیں سفینہ ہے۔ وہ شادی کے لیے ہی نیویارک سے آئی تھی یہاں۔ ہم دونوں نے شادی کا پروگرام بنایا تھا۔“ نئے نئے انکشافات نے ماں باپ کے علاوہ بھائی بہنوں کو بھی سکتے میں مبتلا کر دیا تھا۔ ماں آگے بڑھیں۔

”بیٹا! تم نے اپنے کسی پروگرام کے متعلق ہمیں نہیں بتایا تھا۔ ہم سفینہ کو نہیں جانتے۔ ہم نے تو بہت پہلی تمہاری نسبت کوئل سے طے کر دی تھی اور تمہیں فون پر بتا بھی دیا تھا پھر یہ دھوکا کیسے ہو سکتا تھا۔ اگر تم نے اپنے دل میں کوئی پلاننگ کر لی تھی تو بھلا ہمیں کیا خبر۔ کیوں تم ہم کو ذلیل و خوار کرنے پر تلے ہوئے ہو..... جاؤ اندر اپنی دلہن کے پاس۔ تمہیں مزید جو کچھ کہنا ہے صبح کہنا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”مگر یہ میری دلہن نہیں ہے امی۔“

”کیوں نہیں ہے اس کے ساتھ تمہارا عقد ہوا ہے۔“

”میں اسے قبول نہیں کرتا۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔ اب ہم صبح تم سے بات کریں گے اور خبردار جو تم نے دلہن سے کچھ کہا اور اول فول بکا۔“

وہ سب چلے گئے اور ماں نے باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔ فراز نے مارے غصے کے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا مگر وہ باہر سے بند تھا۔ وہ پلٹا۔ دلہن کی طرف کھا جانے والی نگاہ سے دیکھا مگر وہ اسی پوزیشن میں نظریں جھکائے چپ بیٹھی تھی لیکن اب اس کا گھونگھٹ کھلا ہوا تھا اور اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

وہ غصے میں ہونٹ بھیجنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ لگ رہا تھا اس کا اٹھتا ہوا ہر قدم کوئل کے سینے پر پڑ رہا ہو۔ اس کا دل لہو لہان ہو رہا تھا۔ کوئل نے اس جا بردیوتا کی ایک ایک بات سن لی تھی اور اب وہ اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کے لیے اپنے کو تیار کر رہی تھی۔ فراز غصے سے اپنی بندھن دوسرے ہاتھ کی تھیلی پر زور زور سے مار رہا تھا۔

آخر کچھ سوچ کر وہ ایک بار پھر اس کے سامنے مسہری پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ کوئل کا معصوم پریوں جیسا حسین چہرہ اور اس پر پھیلی ہوئی بے چارگی بڑی بے رحمی سے دیکھتا رہا پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بڑی رعوت سے بولا۔

”تم کوئل ہو۔ شیتل ہو۔ زمین کی ہو یا آسمان کی کوئی مخلوق، مجھے اس سے غرض نہیں

ایک کر کے اتارا اور رومال میں باندھ کر سنگھار میز پر رکھ دیا پھر کپڑے لے کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔ جب کچھ دیر بعد وہاں سے نکلی تو اس کے ریشمی صندل سے بدن پر سلسک کا ایک سادہ سوٹ تھا۔ عروسی جوڑا اس نے احتیاط سے بینگر میں ٹانگ دیا تھا۔ فراز ہونٹ بھیجنے خشکیمیں نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

”آپ یہاں لیٹ جائیے۔ میں ادھر صوفے پر چلی جاتی ہوں۔“ کول نے دھیرے سے کہا۔

”نہیں۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ یہاں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔“

دروازے کا لاک کسی نے کھول دیا تھا۔ وہ اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ کچھ دیر دروازے کی طرف دیکھتی رہی پھر مسہری پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”یا اللہ۔ یہ میرے کس گناہ کی پاداش میں مجھے عمر قید ملی ہے۔ میرا کیا قصور تھا؟“

بڑی دیر تک وہ روتی رہی۔ سوچتی رہی کہ ابھی تو طوفان دے پاؤں آیا ہے۔ ابھی اس کی تباہ کاریاں اور گھن گرج کسی نے نہیں سنیں۔ جب سفینہ باجی کو حقیقت کا علم ہوگا تو وہ کیا کہیں گی۔ کیا سمجھیں گی۔ مجھ پر کتنے الزام لگیں گے۔ لوگ سنیں گے تو کیا رائے قائم کریں گے کہ میں نے اپنی بہن کے حق پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ہائے میری ماں کا رد عمل کیا ہوگا۔ میرے باپ کے دل پر کیا قیامت گزر جائے گی۔ اے رب تو جانتا ہے اس میں ہم سب لوگ بے قصور ہیں حالات اچانک اس سچ پر آگئے تھے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ معلوم نہیں کس سے کہاں غلطی ہوئی تھی لیکن نقصان سونی صد کول کے حصے آیا تھا۔ ہر شخص اس زیادتی کو محسوس کرنے کے باوجود چپ تھا۔ کول نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ زہر کا پیالہ خود ہی اس نے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح بڑے سے ہال کمرے میں گھر والے جمع تھے اور ڈاکٹر فراز احمد نہایت غصے میں ماں باپ سے جواب طلب کر رہے تھے۔

”آپ لوگوں نے فون پر مجھے تفصیل کیوں نہیں بتائی۔ میری رائے کیوں نہیں مانگی۔ اتنی جلدی سارے کام پینانے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ کیا میں بھاگا جا رہا تھا۔ یا میں نے آنے سے انکار کر دیا تھا میرے ساتھ یہ زیادتی کیوں ہوئی۔ میں نے لڑکی کا نام پوچھا تو بہن صاحبہ مجھ سے کسوٹی کسوٹی کھیلنے لگیں۔ اسے بیلے کی کلیوں اور پھولوں کے بیج لاکھڑا کیا۔ نام نہیں بتایا۔ صرف باپ کے نام پر میں دھوکا کھا گیا۔ کیونکہ سفینہ نے اپنے والد

کا نام بھی احمد حسین بتایا تھا ان کی بھی صدر کراچی میں اسپتیر پارٹس کی دکان تھی اور امی نے بھی لڑکی کے باپ کا نام احمد حسین بتا کر کہا تھا کہ ان کی صدر میں اسپتیر پارٹس کی دکان ہے۔ اچھے لوگ ہیں۔ کیوں پایا۔ آپ مجھے بتائیے کیا شادی کے لیے ہی معلومات کافی ہوتی ہیں؟ امی جان۔ اب وہ دور نہیں رہا جب ماں باپ اپنی بیٹی۔ بیٹوں کو گائے بکری کی طرح جڈھر چاہیں ہنکاریں۔ اب تو لڑکیاں بھی وہ سب کچھ جانتا چاہتی ہیں جہاں انہیں تمام عمر گزارنا ہوتی ہے۔ میں ایک لڑکا ہوں جس نے چار سال کینیڈا میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں کی آرافضاؤں میں گھوما پھرا۔ میں نے دنیا کی رنگینیوں اور فطرت کے تقاضوں کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اگر اس ترقی اور سائنسی دور میں بھی ہم قدیم روایتی جہالت کا ثبوت دیتے رہے تو ہماری تعلیم، ہماری روشن خیالی سے فائدہ۔ کم سے کم میں اس نا انصافی کے لیے تیار نہیں۔ آپ لوگ سفینہ کے والدین سے آج ہی بات چکی کر دیں۔ کل ہمارا نکاح ہوگا اور پرسوں ہماری کینیڈا کی فلائٹ ڈیش آل۔“ وہ جانے کے لیے مڑا۔

”اور کول کا کیا ہوگا بیٹے؟“ ماں نے گھبرا کر سوال کیا۔

”وہ عقل مند اور صلح پسند ہے امی۔ میری زندگی سے خود ہی نکل گئی۔“ وہ ہنسا۔

ماں اب پہلے سے زیادہ سراسیمہ ہو کر اس کی طرف لپکیں۔

”سنو تو بیٹا! کیا تم نے اسے طلاق دے دی؟“ ایسا کہتے وقت ان کا گلارندہ گیا تھا۔

فراز کے قدم رک گئے وہ پلٹ کر رساں سے بولا۔

”نہیں امی! ہمارے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اب وہ ہمارے راستے میں نہیں آئے گی۔“ اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ ماں کچھ سمجھیں، کچھ نہیں، باپ پہلے ہی اس سے ناراض تھے وہ منہ پھیر کر اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ بہن بھائی اور ماں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے.....

کول صبح ہی ارم کو سارے واقعات بتا کر نوکر کے ہمراہ گھر جا چکی تھی۔ روتے روتے ارم کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ابھی اس نے ماں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

ارم کی ماں کو شکلیہ بیگم نے ایک بار بتایا تو تھا احمد حسین کی دو بیٹیاں ہیں ایک چھوٹی عمر میں اپنے ماموں کے ساتھ کینیڈا چلی گئی تھی۔ کول کی شادی میں آنے والی ہے مگر فراز سے اس کا کیا تعلق تھا۔ کسی نے کچھ نہیں بتایا شاید انہیں خود بھی پتا نہ ہو ہائے کول تو بے گناہ ماری گئی۔ ارم اور ان کی امی کا یہ سوچ سوچ کر کلیجہ کٹنے لگتا تھا۔ آخراں سے فون نمبر لے کر

فراز نے احمد حسین کے گھر فون کیا تو فون سفینہ نے اٹھایا۔

”ہیلو۔ میں سفینہ بول رہی ہوں۔“

”اوہ سفینہ! تم کب آئیں؟“

”ہائے فراز! تم آگئے۔ ہاں مجھے نیویارک میں دیر ہوگئی تھی۔ میں عین بہن کی شادی

والے دن پہنچی ہوں مگر تم کب آئے؟“

”میں شادی سے دو دن قبل یہاں آیا ہوں۔ ماں باپ نے میری شادی کا پورا انتظام کر رکھا تھا بس مجھے پکڑ کر دولہا بنا کر قاضی سے نکاح پڑھوا دیا۔“

”کیا کہا تمہارا نکاح پڑھوا دیا۔ کہاں کس کے ساتھ؟“ وہ فون پر چیخ پڑی۔

”تمہاری بہن کوئل کے ساتھ۔ تم نے مجھے کب بتایا تھا کہ تمہاری کوئی بہن بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے تم بھی اس سازش میں شریک ہو۔ تم نے میری زندگی تباہ کر دی۔“ وہ سخت غصے میں تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے فراز؟“

”ہو چکا ہے سفینہ اب تم بتاؤ۔ کیا پروگرام ہے تمہارا؟“

”میں کیا بتاؤں فراز؟“ وہ فون پر رو پڑی۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہ سب کیسے ہو گیا۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دو۔ میں زندہ نہیں رہوں گی۔“ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

”اچھا بس۔ آنسو پونچھو اور میری بات غور سے سنو۔ تمہاری بہن تمہارے حق میں دستبردار ہوگئی ہے۔ میں امی کو بھیج رہا ہوں تمہارے گھر۔ کل ہر صورت میں میرا نکاح تم سے ہوگا اور پرسوں ہماری کینیڈا کی فلائیٹ ہوگی۔ میں نے سارے انتظام کر لیے ہیں۔ میں ایک منٹ سے بھی زیادہ اس ماحول میں نہیں رہ سکتا۔ تم پریشان نہ ہونا۔“ فون بند ہو گیا۔

سارے حالات جاننے کے بعد اب فراز کی ماں کے پاس ایک یہی راستہ رہ گیا تھا۔ وہ احمد حسین سے جا کر معافی مانگیں اور ان کی دوسری بیٹی سفینہ سے فراز کے نکاح کی بات کریں۔ چنانچہ صبح ہی ارم اور ان کی امی کوئل کے گھر روانہ ہو گئیں۔ فراز کے والد نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ بھی مجبوراً آئیں۔ آخر وہ ماں تھیں۔ سفینہ فراز کے فون کے بعد غصے میں اپنی ایک دوست کے پاس چلی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ایک قیامت تو آ کر گزر چکی تھی۔ شکلیہ بیگم نے جب ایک رات کی اجڑی ہوئی دہن کو

تہا نوکر کے ہمراہ گھر کی دہلیز پر کھڑا دیکھا تھا۔ ابھی تو گھر والے نیندا سے بھی نہیں جاگے تھے۔ وہ اونچی آواز سے رو بھی نہیں سکتی تھیں۔ کمرے میں نڈھال سی بیٹی کو اپنے سینے سے لگائے لگائے آ گئیں۔

تب ہی کوئل نے ماں کے سینے پر سر رکھ کر روتے سسکتے سب کچھ بتا دیا اور کہا۔

”امی۔ یہ ہماری اور آپ دونوں کی آزمائش کا وقت ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اور اب آپ جو کچھ کریں گی۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ ابھی تو صرف ایک زندگی برباد ہوئی ہے مگر باجی کا عقد فراز سے نہ ہونے پر تین زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔ بڑی تباہی مچے گی۔ جس کے لیے میں تیار نہیں۔ فراز کے والدین کو آپ یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں کریں گی۔ یہ میری خواہش ہے۔“

معلوم نہیں کب احمد حسین بھی آ کر دروازے پر کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے ساری باتیں سن لی تھیں۔ وہ گم صم ہو کر اپنی نازوں پٹی پھولوں کی طرح لطیف جذبات رکھنے والی بیٹی کو دیکھنے لگے جو اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر آئی تھی اور کسی کو خبر نہ ہوئی تھی۔ کوئل نے اپنے مہربان باپ کو سامنے دیکھا تو دوڑ کر ان کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔ وہ اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے پھیرتے خود بھی آنسوؤں میں ڈوبنے لگے۔

”نہ روؤ بیٹی۔ ہم وہی کریں گے جو تو چاہے گی۔“ اور آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔ شکلیہ بیگم چکر کر رہ گئیں۔ یہ کیا ہو گیا میرے مولا۔

احمد حسین الگ کش و پش میں تھے کہ بیٹیاں تو دونوں انہی کی تھیں۔ زندگی کا یہ کیسا موڑ آ گیا تھا۔ انصاف کا ترازو ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ دل نے کہا۔

”کوئل تمہاری حقیقی بیٹی ہے۔ اس کے ماں باپ دونوں حیات ہیں اور سفینہ تمہاری پہلی بیوی کے پہلے شوہر کی بیٹی تھی جس کی ماں مر چکی ہے مگر تم نے اسے ایک باپ کی حیثیت سے پالا وہی محبت دی جو ایک سگا باپ دے سکتا تھا۔ تم نے اسے کبھی سوتیلا نہیں سمجھا تھا اور مریم نے مرنے سے پہلے تم سے وعدہ لیا تھا کہ سفینہ کو اپنی حقیقی بیٹی سمجھ کر اس کے حقوق کی حفاظت کرو گے۔ ہر چند کہ وہ زیادہ دن تمہارے پاس نہیں رہی لیکن تم نے بیٹی ہی کی طرح اسے چاہا۔ اس کا خیال رکھا۔ اب اس وقت تمہاری اپنی بیٹی کی پوری زندگی کا سوال ہے۔ اسے ناکردہ گناہوں کی سزا دی جا رہی ہے۔ کیوں؟ اس کا اس سارے واقعے میں کیا قصور ہے۔ اس وقت سفینہ کے حق میں فیصلہ دے کر تم سراسر کوئل کے ساتھ نا انصافی کرو گے..... مگر تم نے مرتے وقت مریم سے جو وعدہ کیا تھا؟“ اس کے ضمیر نے ٹوکا۔

”احمد حسین تمہیں مرنے والی سے اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے ورنہ حشر کے دن تم سے مواخذہ کیا جائے گا“ آخر احمد حسین نے شکیلہ کو سارے اختیارات دے کر کہا۔

”سفینہ کے ساتھ کوئی نا انصافی نہیں ہونی چاہیے۔“

شام کو ارم کی والدہ اپنی بہن اور بیٹی کے ساتھ آگئیں۔ شکیلہ بیگم کو گلے لگا کر بہت روئیں اور کہا۔

”میں بہت مجبور ہو کر آئی ہوں مجھے معاف کر دینا بہن۔ اگر دل کھول کر دکھانے والی چیز ہوتی تو تم دیکھتیں بیٹے کے ہاتھوں میں نے کتنے زخم کھائے ہیں۔ میں تم سے کتنی شرمندہ ہوں۔ کولم بیٹی کی مجرم ہوں۔“

”نہیں یوں نہ کہیں۔ میں جانتی ہوں کہ ہم میں سے کوئی قصور وار نہیں یہ سارے کھیل تقدیر کے ہیں۔ آپ جس مقصد سے آئی ہیں۔ وہ پورا ہوگا۔ کل آپ چند لوگوں کو لے کر آ جائیں اور سفینہ کو وادع کر کے لے جائیں۔“

یہ کہہ کر وہ دوسری طرف چلی گئیں اور ارم ماں کے ساتھ کولم کے کمرے میں۔ ماں نے پیار سے اس کو سینے سے لگا لیا اور رونے لگیں۔

”بیٹی! ایسا کہیں نہیں ہوا جواب ہو رہا ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔ تم مجھے اتنی ہی عزیز ہو جتنی مجھے ارم عزیز ہے بعض وقت انسان اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی قبر آپ کھودنا پڑتی ہے اور اپنا زندہ لاشہ خود دفنانا پڑتا ہے میں بھی جیتے جی قبر میں اتر گئی ہوں بیٹی! تم نے جو قربانی دی ہے اس کا صلہ قدرت تمہیں دے گی۔ تم بہت عظیم ہو۔“

شام کو سفینہ بڑے بگڑے تیور سے کولم کو دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

”یہ پلاننگ کب سے ہو رہی تھی؟“

”کیسی پلاننگ باجی۔ یہ سب کچھ لاعلمی اور غلط فہمی کی بنا پر ہوا۔“

”غلط فہمی یا جان بوجھ کر ہم سے سو تیلہ پن نکالا گیا ہے۔“

شکیلہ بیگم نے اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

”نہیں بیٹی سفینہ! ہمیں تم لوگوں کے پروگرام کا قطعی علم نہیں تھا کہ تم نے فراز کے ساتھ شادی کا کوئی پروگرام بنایا ہے۔ اگر تم نے نہیں تو فراز کو تو اپنی ماں سے کہنا چاہیے تھا۔“

”میں اس مفروضے کو نہیں مانتی۔ آپ نے مجھ سے اپنی سوکن کی بیٹی ہونے کا بدلہ لیا ہے۔“

”ایسی بات نہیں کرتے بیٹا اپنی ماں سے۔“ احمد حسین نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”یہ میری ماں کبھی تمہیں نہ ہی پایا۔ بلکہ آپ بھی میرے باپ نہیں۔ یہ تو مجھے اب پتا چلا کہ میں تو آپ دونوں کے لیے سونپلی تھی پھر آپ کیوں تحقیق کی ضرورت سمجھتے۔ شادی میری نہیں آپ کی بیٹی کی ہو رہی تھی۔“ وہ ایک دم رو پڑی۔

”تمہارا خیال غلط ہے سفینہ بیٹی۔ ہم نے تو ہمیشہ تمہیں کلچے سے لگا کر رکھا..... اپنی اولاد کی طرح اور تحقیق تو وہاں کی جانی ہے جہاں کوئی شبہ ہوتا ہے تمہارا باپ ایک عام سا بندہ ہے۔ اسے غیب کا حال کیا معلوم جو ہوا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے بیٹا۔ میں تمہیں تمہارے حق سے محروم نہیں کروں گا۔ تمہاری بہن پہلے ہی تمہارے حق سے دستبردار ہو چکی ہے۔ کل فراز احمد سے تمہارا نکاح ہو جائے گا اور تمہارے معاہدے کی توثیق ہو جائے گی۔“

سفینہ نے آنسو پونچھ کر کڑی نظر سے باپ کو دیکھا۔

”اوندہ! بڑا احسان کریں گے آپ۔ یہ سب آپ اپنی عزت کی خاطر کر رہے ہیں ورنہ ہم کورٹ میں جا کر بھی عقد کر سکتے تھے۔ ہمیں بھلا کون روک سکتا تھا۔“

سفینہ نے بڑی حقارت سے کہا اور دھم دھم کرتی چلی گئی۔ کتنی نفرت تھی اس کی نگاہوں میں۔ کتنی رعونت تھی اس کے لہجے میں۔ شکیلہ اپنا کلیجہ تھام کر نیچے بیٹھتی چلی گئیں۔

شام ہو گئی تھی۔ ہر شخص اپنی جگہ خاموش اور پریشان تھا۔ گھر کی فضا میں لگ رہا تھا جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔

کچھ دیر کے بعد ایک گاڑی دروازے پر آ کر رکی اور چند عورتیں لڑکیاں اندر آ گئیں۔ ان کے ساتھ ایک سوٹ کیس بھی تھا۔ شکیلہ نے انہیں اس کمرے میں پہنچا دیا جو مہمانوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ایک خاتون نے ان سے پوچھا۔

”کیا آپ سفینہ بیگم کی والدہ ہیں؟“

”جی ہاں فرمائیے۔“

”یہ چیزیں دیکھ لیں.....“ انہوں نے وہ چیزیں نکال کر صوفوں اور کرسیوں پر رکھنی شروع کر دیں۔

”یہ دلہن کا جوڑا ہے۔ یہ جیولری ہے۔ یہ چھوہارے۔ مٹھائی اور ہار پھول ہیں اور یہ بیوٹی بکس۔“

پھر خاتون نے ایک خوب صورت لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ بیوٹیشن ہے۔ سفینہ کو دلہن بنائے گی۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر شکیلہ چلی آئیں۔ کولم کمرے سے نہیں نکلی۔ وہ گزرتے وقت کی نیرنگیاں دیکھ رہی تھی۔ مغرب کے بعد مردانے میں قاضی جی آگئے تھے۔ اس کے بعد

چند دوست دولہا کو لیے آ گئے۔ اس نے قیمتی سوٹ پر صرف ایک بار گلے میں ڈالا ہوا تھا۔ پھر فراز احمد اور سفینہ ازدواجی بندھن میں منسلک ہو گئے۔ چھوہارے تقسیم ہوئے اب تو تلیں پلائی گئیں۔ خواتین نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور رخصتی کی تیاری ہو گئی۔ خواتین نے سامان سمیت کرسوٹ کیس میں ڈالا اور کھڑی ہو گئیں۔

شکیلہ نے سفینہ کو اپنے سے لگاتے ہوئے مبارک باد دی اور کہا۔

”بیٹی! سدا سہاگن رہو۔ خوش اور آباد رہو۔“

جب خواتین باہر نکلیں تو احمد حسین نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور گاڑی بنا اس کے ساتھ گئے۔ ارم اور ان کی امی کی آنکھوں میں صاف آنسو چمک رہے تھے۔ ان کے ہونٹ ہنسنے ہوئے تھے۔ گاڑیاں روانہ ہو گئیں۔ دونوں لٹے لٹے سے اندر آ گئے انہوں نے کول کو ہاتھوں میں چہرہ جھکائے سسکتے ہوئے دیکھا۔ شکیلہ کے ضبط کے پرے اڑ گئے اور دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ایک دوسرے سے لپٹی دیر تک روتی رہیں پھر شکیلہ نے اسے پیار کیا آنسو پونچھے۔ احمد حسین انہیں دیکھتے رہے۔ بولے۔

”بس کرو شکیلہ۔ کول کو سنبھالو۔ یہ مقام بڑی آزمائش اور صبر کا ہے۔ خدا۔ استقامت کی دعا مانگو۔“ وہ چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ رات کول پر بڑی بھاری گزری۔ لگ رہا تھا بستر پر کسی نے شیشے کی کرچیاں بچھا دی ہیں۔ ہر پہلو چل رہا تھا۔ دل تھا کہ زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا۔ ہر چیز اٹھل پھٹھل ہو رہی تھی۔ آنکھیں بند کرتی تو وہ وہی منظر۔ آنکھیں کھولتی تو وہی منظر..... کروٹ بدلتی تو وہ دشمن جان فریم سے نکل کر اس کے آگے جھک کر میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرنے لگتا۔ وہ گہرا کھنکتی تو منظر پھر بدل جاتا.....

وہ اپنے بخت رسا پر جتنا ناز کرتی کم تھا۔ جو اس نے چاہا پا لیا تھا۔ سہاگ رات میں گھونگھٹ کے اندر اس نے بڑی سرشاری سے مسکرا کر سوچا تھا..... وہ اپنے دیوتا پر چیلا دان کر دے۔ اپنے آپ کو لٹا دے۔ کس طرح اس کا استقبال کرے مگر لمحے طویل ہونے لگے تب ہی وہ آیا۔ اس کا گھونگھٹ اٹھانے کو جھکا۔ دل دھڑک دھڑک کر بے قابو ہونے لگا۔ مگر یہ کیا؟

”کون ہو تم۔ سفینہ کہاں ہے؟“ بے رحم سوالوں کے بھنور نے اسے چکرا دیا۔ ٹھنڈک ٹھنڈی پر کیف سہج چلتی ہوئی ہواؤں نے بادِ سموم کا روپ دھار لیا۔ آنکھوں کی نرمی۔ لہجے کی مٹھاس حقارت اور اجنبیت میں بدل گئی۔ میٹھی میٹھی سرگوشیوں کی جگہ اٹھا

بنائی دی اور اس کے خواب دھڑ دھڑ جلنے لگے اور جب اسے حقیقت کا ادراک ہوا تو اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی اور آرزوؤں نے کفن اوڑھ لیا اور اس نے اپنی سچ اپنا سہاگ اپنی زندگی کی ہر خوشی بہن کی جھولی میں ڈال دی۔

طلاق کے عوض یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔ وہ نہیں تو اس کا نام تو ہوتا اس کے پاس.....

قدرت جن خوش نصیبوں کے دامن میں چاند سورج اتارتی ہے۔ سفر ان کا بھی جاری رہتا ہے اور جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ داغ داغ جگر تار تار دامن کے سوا..... زندہ وہ بھی رہتے ہیں۔ زندگی ان کی بھی آخر گزر رہی جاتی ہے۔

☆.....☆.....☆

فراز احمد اور سفینہ بھی اپنی منزل مراد کی طرف روانہ ہو گئے۔

زندگی کا ایک باب ختم ہوا۔ دوسرا شروع ہو چکا تھا۔ فراز کے والدین کو یہ احساس مارے ڈال رہا تھا کہ انہوں نے ایک معصوم لڑکی پر ظلم توڑا تھا۔ وہ تمام زندگی اسے نا انصافی کی اس صلیب پر لٹکا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے احمد حسین پر زور دیا کہ وہ طلاق کے لیے کول کو راضی کر لیں۔ آخر یہ پہاڑ جیسی زندگی اس کی تنہا کیسے گزرے گی لیکن اس نے ماں سے کہا۔

”شادی صرف ایک بار ہوتی ہے اور لڑکی اپنی زندگی میں داخل ہونے والے کسی شخص کو ایک بار قبول کرنے کا اعزاز بخشتی ہے پھر دل کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ کسی کے لیے نہیں مٹھتے۔“

کول کے انکار نے ارم اور ان کے والدین کو اور احساس جرم میں مبتلا کر دیا۔ انہوں نے کول کا تمام جہیز واپس کرنا چاہا تو احمد حسین راضی نہیں ہوئے بولے۔

”میں نے یہ جہیز بیٹی کو دیا تھا۔ کول نہ سہی سفینہ سہی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔“ ارم کی ماں نے کہا۔

”میں سفینہ کو اپنی بہو تسلیم نہیں کرتی۔ نہ کبھی بیٹہ کو معاف کروں گی۔“ وہ رو دیں۔

”بہن! ماں باپ اولاد کی خوشی کے لیے ہی مرتے ہیں۔ جیتے ہیں۔ اولاد خوش ہے۔ اتنا کافی ہے۔“ احمد حسین کے گھر سے جب وہ آئی تھیں۔ گھنٹوں نہیں دنوں بے چین رہی تھیں۔ غصہ خدا کا فراز ماں باپ سے اتنا فرٹ تھا کہ اس نے کوئی چیز ماں کی لائی ہوئی نہیں لی۔ نہ بات کی۔ خود وہیں اپنے دوستوں کی بیویوں کو لے کر چلا گیا اور جوڑا چیل چیل کر ضروری چیزیں جو بھی ہو سکتی تھیں۔ خرید کر لے آیا اور نکاح ہو گیا۔ بہن اور ماں اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی رہیں۔ کھانا بھی ہوٹل سے آ گیا اور ہوٹل

ہی کے بیروں نے مہمانوں کو سرو کیا۔ گھر سے کوئی نہیں آیا۔ اکثر لوگ حیران ہو کر باہر دوسرے سے سوال کر رہے تھے کہ کل کس لڑکی سے نکاح ہوا تھا اور آج کس لڑکی سے؟ کیا چکر ہے۔ سب چپ تھے جواب کون دیتا۔

اسی خیال سے ارم ان کی امی ابو گھر سے چلے گئے تھے صرف دونوں بھائی گھر میں تھے دوسرے دن جب وہ لوگ کینیڈا فلانی کر گئے تب وہ آگئے۔ دل خون کے آرزور ہاتھا۔ ہر لمحہ ان کے دل میں یہی خیال آتا کہیں اس نا انصافی پر اللہ کا عذاب نہ ہم نازل ہو جائے لیکن اللہ پاک دلوں کا حال جاننے والا ہے اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ اولاد ماں باپ کو کتنا رسوا کرتی ہے..... کچھ دن اور گزرے ماں کے دل سے تھوڑا دھند چھٹی تو انہوں نے سوچا شاید بیٹے کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ ایک دن انہوں نے شکلیہ سے کہا۔

”میرا فراز ایسا کٹھور تھا نہیں۔ میں سوچتی ہوں جب اسے میری ناراضگی کا احساس ہوگا تو وہ بہت روئے گا۔ میں اپنے بیٹے کو جانتی ہوں۔ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ زیادہ دن مجھ سے ناراض نہیں رہ سکتا مگر اس کے لیے کچھ وقت لگے گا۔ آپ خدا سے دعا کریں۔“

شکلیہ بیگم ہنس پڑیں۔

”آپ ماں ہیں نا۔ اولاد کو ماں سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔ بیٹا تو ماں سے راضی ہو جائے گا مگر میری بچی کے زخموں کا مرہم کہاں سے ملے گا۔ اس کے دکھ کا مداوا کون کرے گا۔ شاید کچھ دنوں کچھ عرصے بعد ماں کو تسکین کا آسرا مل جائے مگر میں اپنا مقدمہ کس عدالت میں لے جاؤں۔ مجھے کون انصاف دے گا؟“

انہوں نے شکلیہ کو گلے لگا لیا۔

”آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔“

☆.....☆.....☆

وقت اچھا برا گزر جاتا ہے۔ زخم کتنے بھی گہرے کیوں نہ ہوں آہستہ آہستہ بھر جاتے ہیں۔ کوئل نے بھی اپنے کو سمیٹ لیا تھا۔ ایک بڑے فلاجی ادارے میں اس نے ملازمت کر لی۔ جہاں غریب نادار اور ضرورت مند لڑکیوں، عورتوں اور بچوں کو زندگی کی بنیادی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔ علیحدہ علیحدہ تعلیم اور ہنر کے شعبے تھے۔ انہیں ایک کارآمد انسان اور باکردار شہری بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ خدمت خلق کا یہ ادارہ کوئل کے ذوق اور طبیعت کے عین مطابق تھا۔ یہاں آکر لڑکیوں، عورتوں کے درمیان ان کا عم بانٹ کر رہے گی۔ تیری زندگی پر کچھ حق تو ہمارا بھی ہے۔“

اور میں مسکرا کر ان کے آنسو پونچھ لیتی ہوں۔ میں کہوں ان سے کہ میری بھولی ماں۔ یہ قربانی نہیں۔ یہ ایک نیکو، وفا شہی۔ جب میری انگلی میں اس کے نام کی انگلی ڈالی گئی تھی۔ تب ہی میں نے اپنے دل پر اس کا نام کندہ کر لیا تھا۔ آنکھوں اور دل کے لیے تو

ان کا کام کر کے اسے بڑی تسکین ملی تھی۔ یہ سوچ کر دنیا میں بڑے بڑے غم زدہ لوگ پڑے ہیں جن کے سامنے اس کا عم اس پر گزری ہوئی ٹریجڈی بہت چھوٹی تھی۔ اپنا دکھ اسے معمولی لگا تھا۔

مگر جب اس کی نگاہ دائیں ہاتھ کی چھنگلی کے برابر والی انگلی میں پہنی ہوئی انگلی پر پڑتی تو اس کا درد انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا۔ اس دشمن کی صورت سامنے آ جاتی، جس دن وہ شادی کی تاریخ لینے آئی تھیں انہوں نے فراز احمد کے نام کی انگلی میں ڈال دی تھی۔ یہ انگلی ایک دستاویز تھی چاہے ساری دنیا جھٹلا دے لیکن اس کا دل نہیں جھٹلا سکتا تھا فراز احمد سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ اسی لیے اس نے اپنی سسرال سے آئی ہوئی ہر چیز سے منہ موڑ لیا تھا۔ کپڑے، زیور، سنگھار، مگر یہ انگلی اس کی سسرال سے نہ اتار سکتی تھی۔ اس میں ننھے ننھے جڑے ہوئے ہیروں میں اسے فراز احمد کی شکل نظر آتی تھی یہی انگلی اس کا زیور، اس کا سنگھار اور اس کا سہاگ تھا۔ جدائی اور رسوائی کی اس رات والی کوئی بات وہ یاد رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ سوائے اس کے کہ دوسرے دن سفینہ نے بڑی حقارت سے اس کو دیکھ کر الفاظ کے دیکھتے انگارے اس کی طرف اچھال دیے تھے۔ الزام لگایا تھا۔

”تم غاصب ہو۔ تم نے میری محبت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ تم مجرم ہو..... تم قابل گردن زدنی ہو۔“

اور وہ صرف اس کی طرف چپ کی مہر لگائے دیکھتی رہی تھی۔ سوچتی رہی تھی کہ معلوم نہیں مجرم کون ہے؟ کس کی محبت پر غصے نے ڈاکہ ڈالا ہے؟ میں نے یا تم نے؟ کاش..... کوئی منصف ہمیں یہ بتا سکتا کہ قابل گردن زدنی کون ہے۔ تم یا میں؟ یا کاش سفینہ بیگم۔ تمہارا ضمیر احساس دلا سکتا کہ اس ظلم کی کوئی تلافی نہیں جو تم نے مجھ پر ڈھایا ہے۔ سب سے زیادہ نقصان تو میرے حصے میں آیا تم تو آج بھی راج کر رہی ہو۔ تمہاری تو ہر رات شب برات اور ہر دن عید کا دن ہے۔ تمہارا سفینہ تو پارلگ گیا مگر تم نے میری کشتی حیات موجوں کے حوالے کر دی۔ ماں مجھ سے پوچھتی ہے۔ بیٹی تو نے تو حاتم کو بھی قبر میں شرمندہ کر دیا ایسی سخی داتا نکلی کہ اپنا سہاگ ہی دوسرے کو دان کر دیا۔ ایسی سخاوت، یہ قربانی تو میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ یہ بتا اب تیرے مستقبل کا کیا ہوگا۔ آخر کب تک تو جو گن بنی رہے گی۔ تیری زندگی پر کچھ حق تو ہمارا بھی ہے۔“

اور میں مسکرا کر ان کے آنسو پونچھ لیتی ہوں۔ میں کہوں ان سے کہ میری بھولی ماں۔ یہ قربانی نہیں۔ یہ ایک نیکو، وفا شہی۔ جب میری انگلی میں اس کے نام کی انگلی ڈالی گئی تھی۔ تب ہی میں نے اپنے دل پر اس کا نام کندہ کر لیا تھا۔ آنکھوں اور دل کے لیے تو

پہلے ہی وہ اجنبی نہ تھا۔ ماں باپ بیٹی کے اس فیصلے پر خاموش تھے۔ شاید مشیت کا ہم فیصلہ یہی ہو۔ جب کوئل نے نوکری کر لی تو وہ مطمئن سے ہو گئے۔ بیٹی کو مصروفیت مل گئی تھی۔ ایک بار باپ نے بیٹی کے سر پہ ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”بیٹی تو خوش ہے؟“

”ہاں ابو۔ میں بہت خوش ہوں۔ وہاں جا کر اور لڑکیوں، عورتوں کے مسائل دیکھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ دنیا میں کس قدر دکھ پھیلا ہوا ہے اللہ کی غریب مخلوق کتنی دکھی اور بے اختیار ہے اور صاحب اختیار زبردست طبقہ ہمیشہ سے اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کے پاس ان کے لیے نہ انصاف ہے نہ تحفظ۔“

”ہاں بیٹا۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ دوسروں کے غم دیکھ کر انسان کو تسلی ہو جاتی ہے اور صبر کی گنجائش نکل آتی ہے۔ غموں کے اس ڈھیر میں خوشیوں کو تلاش کرو بیٹی۔ ان کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے منہ سے خوشی کی بات سننا چاہتا ہوں تم مسکراتی ہو تو میرے دل کی کلی کھل جاتی ہے تم اداس ہوتی ہو تو میری دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ ہماری خوشیاں ہمارے غم سب تمہاری ذات سے وابستہ ہیں۔“ انہوں نے اداس مسکراہٹ سے اس کو دیکھا۔

”ارے میرے پیارے ابو جان۔“ وہ ہنس کر ان سے لپٹ گئی۔ ”کیا آپ کو مجھ میں تبدیلی نظر نہیں آئی۔ میری آنکھوں کے گرد کیسے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ دیکھیے اب کہیں وہ حلقے نظر آرہے ہیں۔ چہرہ گلاب کی طرح تروتازہ ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں ستارے بھر گئے ہیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی ہے۔“ وہ باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں بیٹی۔ ماشاء اللہ۔ خدا کرے تو اسی طرح ہنسی رہے۔“ انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ شکیلہ بیگم بیٹی کی باتیں سن کر قریب آ گئیں مسکرا کر بولیں۔

احمد حسین نے اکثر تنہائی میں یہ عقدہ حل کرنا چاہا کہ آخر سفینہ نے ایسا کیوں کیا۔ میری محبتوں اور سلوک کا یہ صلہ دیا کہ بھری محفل میں اس نے مجھے اور شکیلہ کو سوتیلے ماں باپ کا طعنہ دے ڈالا۔ یا خدا میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ مریم اگر آج زندہ ہوتی تو مارے صدمے کے اس کا تو دم ہی نکل جاتا مگر اس میں نہ مریم کا قصور تھا نہ سفینہ کا۔ اس کے اندر اس کے ادب و شرافت جیسا کہ بدکردار باپ کا گندہ خون بول رہا تھا۔ اگر وہ کسی شریف باپ کا خون ہوتی تو کبھی ایسا نہ کہتی۔ کچھ تو اسے اپنی بے گناہ بہن کی قربانیوں کا احساس ہوتا۔ وہ تو غیروں سے بھی زیادہ غیر نکلی۔ ہم سوتیلے سہی مگر ہم نے بھی کسی کمی اور محرومی کا

اسے احساس نہیں ہونے دیا۔ ایک دن شکیلہ کا دل بھر آیا۔ اور وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر سسکنے لگیں۔ کوئل دفتر میں تھی اور بچے اسکول میں۔ احمد حسین پاس آ کر بیٹھ گئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

”کیوں پریشان ہوتی ہو شکیلہ جو ہوا اس پر کلپنے سے کیا فائدہ..... دل کو سنبھالو اور اس کی بہتری کی دعا مانگو۔“

”ہاں احمد حسین۔ میں خدا سے دعا ہی تو کر رہی ہوں..... اللہ فراز کے دل میں ڈال دے کہ وہ کوئل کو طلاق دے دے اور کوئل کے دل کو فراز کی طرف سے پھیر دے تاکہ میری بچی کو منزل مل جائے۔ مجھ سے اس کی انتہائی اداسی نہیں دیکھی جاتی۔“ احمد حسین مسکرائے۔ انہوں نے رسان سے بیوی کو سمجھانا چاہا۔

”تم اس کی ماں ہو اور ماں تو بیٹیوں کے اندر کا حال بغیر بتائے جان لیتی ہیں۔ تم صرف بیٹی کے سکون کی دعا کرو۔ کیا تم آج تک نہ جان سکیں کہ تمہاری بیٹی نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا۔ میری بیٹی تو کارواں سے بچھڑ گئی ہے مگر منزل تو اس کی وہی ہے جو میر کارواں کی ہے اور بھٹکے ہوئے کارواں کو ایک نہ ایک دن آخر منزل پر پہنچنا ہی ہوتا ہے۔“ ”مجھے معلوم ہے احمد حسین لیکن میرے سینے میں ایک ماں کا دل ہے اور ممتا خود غرض ہوتی ہے۔ مجھے اس کا ہمیشہ دکھ رہے گا کہ میری بیٹی کی بربادی میں سفینہ کا ہاتھ ہے۔ اسے میں بھی معاف نہیں کر سکتی۔“ شکیلہ بیگم سسکیاں لے کر بولیں۔

”نیک بخت۔ کیوں اپنی نیکیاں برباد کر رہی ہو۔ وہ ہم سے نفرت کرتی ہے یا محبت۔ ہمارے ساتھ اس نے اچھا کیا ہے یا برا۔ اس سے قطع نظر یہ سوچو کہ قدرت نے جو کام ہمارے سپرد کیا تھا وہ ہم نے بہ حسن و خوبی نبھایا ہے یا نہیں۔ مریم نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ سفینہ کو اپنی اولاد سمجھ کر اسے پرورش کرنا یہ میری امانت ہے تمہارے پاس اور میں نے اس امانت میں کوئی خیانت نہیں کی۔ اس کی حفاظت اور اسکی خوشیوں کا خیال ہم نے ہر نفع و نقصان سے بالاتر ہو کر کیا۔ شکیلہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھو انسان کے عمل کا صلہ خدا دیتا ہے بندہ نہیں۔ چنانچہ ہماری بیٹی کے ساتھ بھی وہی انصاف کرے گا۔“ اور شکیلہ بیگم خاموشی سے آنسو پونچھتی ہوئی اپنے نیک شوہر کو دیکھنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

ایک دن جب کوئل گھر آئی تو اس کے ساتھ ایک دہلی تیلی لمبی سی پیاری اور خوش شکل لڑکی تھی، کوئل نے ماں سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”امی! یہ محسنہ ہے۔ میرے ادارے کی سب سے ذہین خدمت گزار اور معروف

لڑکی۔ اس کی ماں کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی تھی۔ اس کی ساس یعنی محسنہ کی دادی نے اسے زندہ جلانے کی کوشش کی تھی وہ مرنے نہ سکی مگر معذور ہو گئی۔“

”مگر بیٹا۔ ساس نے ایسا کیوں کیا؟“

”وہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ وہ انہیں پوتا یعنی بیٹے کا وارث دے سکے۔ محسنہ کی پیدائش سے ہی گھر میں ہنگامے شروع ہو گئے تھے اور بیٹا بھی ماں کا ہم خیال ہو گیا۔ محسنہ کی صرف ایک بیوہ نانی تھی اور ایک عیال دار ماموں وہ بہن کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس لیے بے چاری شوہر اور ساس کا ہر ظلم سہتی رہی۔ آخر ایک دن کھانا پکاتے وقت پیچھے سے کپڑوں میں آگ لگا دی۔ اسے خبر جب ہوئی جب اس کے بالوں نے آگ پکڑ لی۔ وہ چیختی ہوئی باہر بھاگی لیکن اسے کسی نے بچانے کی کوشش نہ کی۔ بال جل گئے چہرہ جھلس گیا۔ دونوں ہاتھ جھلس کر ٹیڑھے ہوئے۔ محلے کی عورتوں نے کسی طرح اسے اسپتال پہنچایا۔ اس کے بعد اس نے سسرال جانے سے انکار کر دیا۔ پولیس نے پان لکھنا چاہا تو اس نے کہہ دیا ”آگ میری غفلت کی وجہ سے لگی تھی اس میں کسی کا قصور نہیں۔“ پھر ادارے والے خود اسے لے آئے۔ مسز اعوان جو اس ادارے کی سربراہ ہیں انہوں نے اس کا بڑا علاج کرایا اب اس کے ہاتھوں نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ ٹھیک ہو گئی ہے۔ لڑکیوں کو کنگ اور کروشیا کا کام سکھانی ہے۔ محسنہ نے پچھلے دنوں میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ اب اس کی یہی دنیا ہے۔ بہت سی عورتوں نے مستقل وہاں پناہ لے رکھی ہے جو ساس مندوں کی ڈسی ہوئی ہیں۔ وہاں بہت خوش اور محفوظ ہیں۔ وہاں ان کی ساس نہیں۔ نند نہیں، ظالم شوہر کی مار پیٹ نہیں۔ مسز اعوان نے انہیں بڑی سہولتیں پہنچائی ہیں۔ یہاں رہ کر ان کے جو ہر کھلے بڑی صلاحیتیں ہیں ان میں۔ انہوں نے اپنے ہنر اور صلاحیتوں سے ادارے میں چار چاند لگا دیے.....

امی وہاں جا کر پتا چلا کہ دنیا میں کتنی دکھی اور مظلوم عورتیں ہیں۔ ان کے خاوندوں اور سسرال والوں نے ان پر کتنے ستم ڈھائے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ عورت ہوتے ہوئے انہوں نے عورتوں پر کتنی زیادتیاں کی ہیں اور امی سفینہ باجی بھی تو ایک عورت تھیں.....“

کول ایک دم جذباتی ہو گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شکیلہ بیگم نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”بیٹی۔ ان آنسوؤں کو اندر اتار لو اور ان غم زدہ خواتین کی طرف دیکھو ان کا غم تم سے بہت بڑا ہے۔ دنیا میں اسی طرح ہوتا آیا ہے ہر زبردست کمزور پر حاوی ہونا اپنا حق سمجھتا ہے۔ بھول جاؤ سب کچھ۔“

پھر کول نے آنسو پونچھ کر محسنہ کی طرف دیکھا جو اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”امی! محسنہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہر ایک کی خدمت کے لیے تیار۔ ہر ایک سے مسکرا کر ملتی ہے۔ سب ہی اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔“

”ہاں بیٹی! جو اچھے لوگ ہیں وہ ایک ہی نظر میں پہچان لیے جاتے ہیں کچھ لوگ ہوتے ہیں محبت کیے جانے کے لائق۔“ شکیلہ بیگم نے محسنہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

پھر شام کی چائے سب نے مل کر پی شکیلہ نے چائے کے ساتھ کافی لوازمات کا اہتمام کیا تھا۔ چائے سے فارغ ہو کر کول نے محمد حسین سے کہا۔

”بھیا! محسنہ کو بس یہ بٹھا دینا، وہ خود ہی چلی جائے گی آخری اسٹاپ کے سامنے ہی تھا گوشہ عافیت۔“

”تو کیا انہیں آخری اسٹاپ تک لے جانا ہوگا؟“ محمد حسین نے مسکرا کر بہن سے پوچھا۔

”ارے نہیں، ویسے اگر تمہارا جی چاہے تو تمہاری مرضی۔“ کول نے مسکرا کر بھائی کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گیا۔

”باجی! رہنے دیں میں چلی جاؤں گی۔“ وہ شرماتے ہوئے بولی۔

”نہیں بھئی یہ تکلیف نہیں دستور ہے۔“

”آئیے جناب۔“ محمد حسین باہر نکل گیا۔ محسنہ بھی سب کو سلام اور خدا حافظ کہتی ہوئی پیچھے چلی گئی۔ کول اسے چھوڑنے دروازے تک آئی۔

”امی! محسنہ کیسی لڑکی ہے؟“ کول نے مسکرا کر ماں سے پوچھا۔

”ارے میری جان! لڑکیاں سب اچھی ہوتی ہیں۔ بس اللہ ان کا نصیب بھی اچھا کرے۔“

”ہاں امی! لڑکیاں سب اچھی ہوتی ہیں.....“ وہ ماں کے الفاظ دہراتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔

حالانکہ شکیلہ بیگم کول کے اشارے کو سمجھ گئی تھیں مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”باجی! وہ آپ کی دوست پھر نہیں آئیں۔“ ایک دن محمد حسین نے کول سے پوچھا۔

”کون دوست؟“ کول نے جان بوجھ کر انجان بننے ہوئے پوچھا۔

”وہی ادارے والی.....“

”اچھا..... اچھا محسنہ کی بات کر رہے ہو؟“ وہ مسکرائی۔

”کہو تو بلا لوں اسے؟“
”نہیں نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ وہ جھینپ کر بولا۔

”کوئل نے ایک تہقہہ لگا کر اس کی طرف دیکھا۔
”بچو میں تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔“ کوئل اس کی طرف پیار سے دیکھ
ہوئے بولی۔

☆...☆...☆

افروز کوئل کی بچپن کی دوست تھی۔ میٹرک دونوں نے ساتھ ساتھ کیا تھا پھر وہ اسے
والد کے ساتھ سنگا پور چلی گئی ان کے والد کا وہاں کاروبار تھا وہیں اس نے گریجویشن کیا مگر
خط اور فون پہ دونوں کا رابطہ رہا۔ ایک دو بار وہ اپنے ماموں نانی سے ملنے کراچی آئی تو
اس سے بھی ملنے آئی بڑی گرجوشتی اور محبت سے ملی۔ اس نے ارم سے بھی اسے ملوایا۔ پھر
وہ کراچی گئی کچھ دنوں بعد اس کے فون سے پتا چلا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور اسے
شوہر اسے جاپان رخصت کر اکر لے جائے گا۔ اس کے بعد پورا سال گزر گیا نہ اس کا کوئی
خط آیا نہ فون۔ اس اثناء میں کوئل کی شادی بھی ہوئی اور بربادی بھی۔ لیکن وہ افراز کو
بتا سکی کہ اس پر کیسی قیامتیں گزر گئی ہیں۔ دو سال بعد اچانک افروز سے کوئل کی ملاقات
ہوئی تو وہ اس سے لپٹ کر روتے روتے بے حال ہو گئی۔
”کہاں چلی گئی تھیں تم افروز تمہیں کچھ خبر نہیں میں نے کتنے آگ کے دریا عبور
کئے؟“

افروز نے اس کے آنسو پونچھے اور اسے سامنے کرسی پر بٹھا کر بڑی دیر تک اسے دیکھی
نظروں سے دیکھتی رہی۔

”میں جانتی ہوں..... مجھے سب خبر ہے....“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مگر مجھے تم
پر اتنا غصہ تھا اگر سامنے ہوتیں تو تمہیں شوٹ کر دیتی۔“
”کیوں.....؟“ وہ بڑی معصومیت سے افروز کو دیکھ کر بولی۔

”تم ہمیشہ سے میری طبیعت سے واقف ہو کوئل کہ میں نے کسی کی طرف اپنا حساب
نہیں رکھا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا میری فطرت ہے۔ مگر میں تم سے اسی بات پر
شکا کی رہی کہ اپنا مزاج بدلؤ جو جیسا کرے تم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو ورنہ یہ
دنیا تمہیں جینے نہیں دے گی۔ اور تم ہنس کر ناں دیتی تھیں۔ تمہارا تو یہ حال تھا کہ اگر کوئی
ایک گال پر تمہارے پیٹھ لگا دیتا تو تم اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دیتیں اور اسی بیوقوفی اور
سادگی کا مظاہرہ تم نے افراز اور سفینہ کے سلسلے میں کیا خوشیوں اور نعمتوں سے بھرے ہوئے

تھاں ٹھکرا دیئے اپنی ذات کا فخر زندگی کی تمام تر خوشی تم نے دوسروں کی جھولی میں ڈال دی
اتنی سخی تم کب سے ہو گئی تھیں؟“
”نہیں افروز میں نے کوئی نعمت، کوئی خوشی نہیں ٹھکرائی، جو چیز میری دسترس ہی میں نہ
تھی اسے ٹھکرانے یا رکھنے کا کیا سوال، اس کی تو وہی دعوے دار تھی اس پر میرا کوئی حق نہیں
تھا۔“

”میری سمجھ میں تو تمہاری کوئی بات نہیں آئی کیا افراز کی وہ محبت، وہ عبادت جو تم دو
سال تک کرتی آئی تھیں سرباب تھا۔ فریب تھا؟“
”ہاں افروز وہ میری بھول تھی نادانی تھی میں نے شاید ایک ہاتھ سے تالی بجانے کی
کوشش کی تھی۔“

پھر شکلیہ بیگم نے افروز کو پورے حالات تفصیل سے بتا کر کہا۔
”بیٹی! اس نے جو کچھ کیا شاید درست تھا ورنہ سفینہ ہمارا جینا دو بھر کر دیتی اور افروز کوئل
کو طلاق دے دیتا، کوئل نے طلاق نہ لے کر اپنے تمام حقوق سفینہ کے نام منتقل کر دیئے
یہی ہمارے لیے بہتر تھا۔“
پھر افروز اسے کمرے میں لے کر آ گئی۔

”کوئل! تم نے اتنی آسانی سے ہتھیار کیوں ڈال دیے۔ اسے قائل کیوں نہ کیا؟“
”کیسی بچوں جیسی باتیں کرتی ہو افروز، جب اس نے خود اپنی زبان سے اعتراف کر لیا
کہ وہ میری نہیں سفینہ کی محبت ہے وہ میرا نہیں اس کا طلبگار ہے تو کیا میں اس بے رحم بے
حس انسان کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے بتاتی کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں آج سے
نہیں صدیوں سے..... نہیں افروز مجھے اپنے جذبات کی یہ رسوائی پسند نہیں تھی۔ محبت کرنے
والے تو خاک ہو جاتے ہیں اور زبان سے اف نہیں کرتے پھر میں وہ ”بیج اور سہاگ“
لے کر کیا کرتی جس پر میرا کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا۔“

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو ناگوں چنے چبوا دیتی۔ مجال تھی عائلی قوانین کے تحت بغیر
میری مرضی کے وہ دوسرا نکاح پڑھوا لیتا اسے عدالت میں بھیج کر بلوائی، اتنا تنگ کرتی کہ
ساری چوڑی ساری ڈاکٹری بھول کر یا تو بھاگ جاتا یا پھر سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو جاتا
ارے بے وقوف تمہاری طرف تو اپنے پرانے گھر والے سبھی تھے۔ پورا قانون تھا پھر تم نے
اپنی کمزوری کا ثبوت کیوں دیا جیسے مجرم وہ نہیں..... تم تھیں اسے پارسائی کا سرٹیفکیٹ
دے کر تمام غلطیوں سے مبرا کر دیا۔“

”آؤ بیٹی! چائے پی لو۔“ شکلیہ نے آواز دی۔

”خالہ جان! ذرا اندر آئیے اس سے کہیے پہلے میرے اعتراضات کا جواب دے پھر چائے پیوں گی۔“ وہ مقابلے پر ڈٹ گئی تھی۔ وہ ہنستی ہوئی اندر آ گئیں۔
 ”ارے بیٹی وہ کیا جواب دے گی۔ تم تو جانتی ہو وہ سدا کی صلح جو اور دیو لڑکی ہے۔ وہ مسکرا کر بولیں۔

”اصل میں میرا کیس سفینہ نے کمزور کر دیا تھا، سگے اور سوتیلے کا جھگڑا پیدا کر کے کرنے کو تو ہم بھی بہت کچھ کر سکتے تھے عائلی قانون کے تحت تمہارے انکل کے دوست ایڈوکیٹ تیور عباس نے کہا تھا کہ آپ اجازت دے دیں تو ہم فراز صاحب سے بات کر لیں نہیں تو عدالت کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے سیدھی انگلی اگر گھمی نہ نکلے تو انگلی کو ٹیڑھا کرنا پڑتا ہے۔ آپ کا داماد اپنے اختیارات سے غلط فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اسے روکنا آپ کا قانونی حق ہے۔ مگر اس سے پہلے ہی سفینہ نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بیٹا ہم عزت داروں کا یہ بڑا المیہ ہے کہ روتے بھی ہیں تو گھٹ گھٹ کر کہہیں کوئی سن نہ لے۔ کول کے ابوا انتہائی خاموش اور امن پسند طبیعت کے مالک ہیں۔ اونچی آواز سے بات بھی نہیں کرتے۔ اور یہ معاملہ سراسر ان کی بیٹی کی عزت کا معاملہ تھا۔ اس لیے عباس صاحب سے انہوں نے معذرت کر لی۔ اب جو ہوا سو ہوا میری کول کے ساتھ تو ظلم ہوا ہے اور اس کا ازالہ بھی قدرت ہی کرے گی۔“ وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔
 افروز نے خاموش بیٹھی کول کو دیکھا تو اسے گلے لگا کر پیار کرنے لگی۔

”ناراض ہو....؟“

”نہیں ناراض تو میں اپنی تقدیر سے بھی نہیں کہ یہ قلم تو مشیت کا قلم تھا چل گیا سو چل گیا۔“

”تم نے وہ حدیث پڑھی ہے کہ ظلم کرنے اور ظلم سہنے والے دونوں کا مواخذہ کیا جائے گا۔“ افروز نے کہا۔

”کلمہ حق کہنے والے تو دار پر بھی نہیں چوکتے۔ یہ تو سچائی کا نعرہ ہے۔“ اس نے مسکرا کر کول کو دیکھا۔

”ہاں افروز مجھے اعتراف ہے کہ میں خوفزدہ تھی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا میں ساری دنیا سے نہیں لڑ سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں پیش کر دیا وہ جو بہتر چاہے گا فیصلہ کرے گا۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں کیا بتاؤں میری دوست.....“

عمر بھر جس کی ملاقات کی حسرت تھی مگر وہ ملا بھی تو ملاقات نے دل توڑ دیا

راس آئی نہ مسرت کی ملن رات مجھے
 اک مرادوں کی حسین رات نے دل توڑ دیا
 ☆...☆...☆

سفینہ اور فراز احمد بہت خوش تھے۔

اپنی خوشی اور سرشاری میں انہیں قطعی یہ احساس نہ رہا کہ انہیں یہ خوشی یہ کامیابی کتنے دل توڑ کر کتنے رشتے پامال کر کے اور کتنے معبد ڈھا کر ملی تھی۔ انہوں نے تو دنیا ہی میں جنت پالی تھی۔ جب سفینہ اپنے شوہر کے ساتھ ماموں کے گھر پہنچی تو ممانی کا انتقال ہو چکا تھا ماموں بڑے مضحل اور پریشان تھے، گھر میں جو انہوں نے گونگے اور معذور بچے رکھے تھے انہیں وہ بیوہ اور نوکر سنبھال رہے تھے۔ اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی گھر میں ہر طرف دیرانی پھیلی ہوئی تھی۔ ممانی کے مرتے ہی جیسے دنیا بھر کی اداسی گھر میں گھس آئی تھی۔

سفینہ کا دل گھبرانے لگا اسے ممانی کے مرنے کا کوئی غم نہیں تھا جب وہ زندہ تھیں تب بھی وہ ایک ضدی بیٹی کی طرح دنیا بھر کی فرمائشیں ان کے دامن میں ڈال دیتی تھی اور اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہنس کر اس کی فرمائش پوری کرنے کے لیے نوٹوں کی گڈی اس کے پرس میں رکھ دیتی تھیں۔ اور وہ ہنستی کھلکھلاتی باہر نکل جاتی تھی۔ جب کارا اشارت کرنے کی آواز آتی تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی تھی مگر اسی محبت کرنے والی مہربانی ہنستی کو وہ بستر مرگ پر چھوڑ کر فراز کے ساتھ تفریح گاہوں میں اڑتی پھرتی تھی اور پھر پاکستان چلی گئی۔ اس کے پروگرام کے متعلق تو وہ دونوں بھی کچھ نہیں جانتے تھے ماموں کو تو یہ معلوم تھا کہ سفینہ اپنی بہن کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے پاکستان گئی ہوئی ہے انہیں یہ پتا نہیں تھا کہ سفینہ کی شادی بھی ہو جائے گی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ واپس آئے گی۔ فون پر ایسی کوئی خبر نہ تھی ماموں چکرائے تو ضرور مگر انہوں نے کچھ پوچھا نہیں۔

سفینہ کو بھی اب کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ ایک معروف ڈاکٹر کی بیوی تھی جو اس کا شوہر بھی تھا اور محبوب بھی۔ یہ سوچ کر وہ مسکرا دی۔ اسے جلد ہی فلیٹ مل گیا۔ فراز نے اسے ضروری آسائشوں سے آراستہ کر دیا تھا۔

تب سفینہ نے ماموں کو گویا اطلاع دی۔ ”فراز نے اپنا فلیٹ لے لیا ہے میں جا رہی ہوں۔“

”مگر بیٹی یہ اتنا بڑا گھر ہوتے ہوئے تم لوگ الگ کیوں رہنا چاہتے ہو یہ بھی تو

تمہارا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ماموں مگر میں اب ایک علیحدہ زندگی گزارنا چاہتی ہوں آپ دو جا پے انگ گیسٹ رکھ لیں دل بہل جائے گا۔ آپ کا ویسے بھی میرا دل ان معذور گونجے بہرے لوگوں میں نہیں لگے گا یہاں کی فضا میں مجھے گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔“ اس کے لہجے میں بڑی رعوت تھی۔

ماموں کا دل اس کے اس انداز اور رویے سے بڑا دکھا تھا۔ وہ اور وہاں رہنے والے حسرت اور مایوسی سے اس کا منہ دیکھ رہے تھے۔ سفینہ اس لائق اور خود غرضی کا مظاہر کرے گی وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے مگر وہ کبھی کیا سکتے تھے۔ پرانی اولاد پرانی ہی ہوتی ہے۔ اپنی اولاد ہوتی تو شاید انہیں اس طرح تنہا نہ چھوڑتی کہیں مانگے کے اجالوں سے بھی زندگی کے اندھیرے دور ہوتے ہیں۔ اتنا تو وہ بیوی کے مرنے پر دل شکستہ نہیں ہوئے تھے۔ جتنا سفینہ کی لائق نہیں توڑ گئی تھی۔

اس نے اپنا فلیٹ اپنی مرضی اور خوشی سے سنوارا سجا یا تھا۔ نئی گاڑی بھی خرید لی۔ اب تو ہر دن عید کا دن اور ہر رات شب برات تھی ان کی۔ فراز نے اسپتال سے چھٹیاں لی تھیں وہ اب ختم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اب وہ باقاعدہ ڈیوٹی اینڈ کر رہا تھا۔ سفینہ اس ہو جاتی تھی۔

”اب آپ سارا دن اسپتال میں ہوتے ہیں اور میں یہاں بور ہوتی رہتی ہوں۔“
”ایسا کرو تم نرسنگ کا کورس کر لو تو پھر ہم دونوں ہی ساتھ کام کریں گے تم میری ہیلپ کرنا۔“ اس نے ہنستے ہنستے اس کی بوریت کا علاج بتایا۔

”اوں ہوں۔“ سفینہ نے کڑوا سا منہ بنایا مجھے ”یہ پیشہ بالکل پسند نہیں طرح طرح کے مریضوں کے درمیان بدبودار دواؤں کے اٹھتے ہوئے بھگے۔ تو بہ میرا تو جی متلانے لگتا ہے اسپرٹ کی بو سے تو میں پہلے ہی الرجک ہوں۔“

”پھر تو بڑی مشکل ہوگی سفینہ بیگم تمہارے شوہر کا تو ان بدبودار دواؤں کے درمیان طرح طرح کے مریضوں سے سابقہ پڑتا ہے میں تو ان کی بو سے مانوس ہو چکا ہوں مجھے تو بری نہیں لگتیں۔“ وہ مسکرایا۔

”خیر یہ تو مجبوری ہے کہ آپ کا پروفیشن ہی ڈاکٹری ہے۔“ وہ بھی ہنس پڑی۔
”ویسے گاڑی تمہارے پاس ہے اپنی دوستوں سے ملنے میں کوئی حرج نہیں۔“
”آپ کو برا تو نہیں لگے گا؟“ وہ ایک ادا سے لہرا کر بولی۔
”بالکل لگے گا برا اگر میں نے تمہیں دروازے پر اپنا منتظر نہ پایا۔“ دونوں نے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

جب وہ اسپتال چلا جاتا تو وہ صفائی ستھرائی کر کے کپڑے بدلتی۔ نوک پلک سنواریتی اور کارکی چابی انگلیوں میں گھماتی مسکراتی ہوئی کار میں بیٹھ جاتی۔ سارا دن وہ مختلف دوستوں، سہیلیوں کے ساتھ کلب یا کسی پینک اسپاٹ پر انجوائے کرتی۔ کبھی کسی دوست کے ساتھ ساحل یا ریسٹوران میں کھانا کھاتی۔ پھر وہ گھر آتے ہوئے اسٹور سے انڈے جام جیلی کھن ذبل روٹی، کبھی سالن کے بند ڈبے لاکر فریج میں رکھ دیتی۔ شام کی چائے دونوں ساتھ پیتے۔ کچھ دیر آرام کرتے، باتیں کرتے، ہنستے ہنساتے اور مستقبل کا پروگرام بناتے پھر تیار ہو کر باہر نکل جاتے۔ گھومتے پھرتے، کبھی کھانا باہر کھاتے اور کبھی وہ سالن نکال کر گرم کر لیتی اور میز پر کھانا لگا دیتی۔

شادی کے کئی مہینے تک یہ شغل چلتا رہا اور فراز نے کہا۔
”اب اپنا گھر سنبھالو میں تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی ڈشیں کھانا چاہتا ہوں تم کہتی تھیں نا کہ تمہیں کوکنگ کا بڑا شوق ہے بہت اچھا کھانا پکا لیتی ہو ذبھو تمہارا بچن کتنا خوبصورت ہے کیسی نازک اور قیمتی کراکری ہے کھانا پکانے کے برتن اور سامان کتنا نفیس ہے جسے دیکھ کر ہی کھانا پکانے کو جی چاہے اب کسی دن اپنا ہنر دکھاؤ میں بھی تو دیکھوں تمہاری گھر داری۔۔۔۔“

فراز یوں مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا جیسے وہ اسے کھانا پکانے کے لیے اکسار ہا ہوا سے گانڈ کر رہا ہو۔

”ٹھیک ہے میں نے کہا تھا۔ اور مجھے کوکنگ کا شوق بھی تھا مگر صرف شوق کی حد تک تب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب تو میں خانا ماں انورڈ کر سکتی ہوں پھر میں کیوں چولہے ہانڈی کے چکر میں پڑوں؟“

”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ شادی کے بعد دنیا کی لڑکیاں وہ غریب ہوں یا امیر جاہل ہوں یا تعلیم یافتہ اپنا گھر سنبھالتی اور ہنڈیا چولہا کرتی ہیں۔ بچوں اور شوہر کا خیال رکھتی ہیں تم کیا دنیا سے ماورا ہو میں تمہارا شوہر ہوں تمہیں میری پسند و ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں گھر کا پکا کھانا زیادہ پسند کرتا ہوں اور تم نے اپنی انگلیوں پر جانے لگتی ڈشیں گنوا دیں کہ یہ تم پکانا جانتی ہو تو پھر اب کیا بات ہوگئی۔“ وہ مسکرایا۔

”آپ تو ابھی سے مجھے چولہے ہانڈی میں پھنسا دینا چاہتے ہیں۔ ہماری نئی شادی ہے ابھی تو ہمارا نئی مون پیڑ باقی ہے اور آپ گھر کے کھانوں کی بات کرنے لگے۔“ وہ

روٹی روٹی سی بولی۔

”ارے بھئی سفینہ جان! یہ تمہارا ہنی مون پیرڈ کچھ لمبا نہیں ہو گیا۔ دو ماہ ہم سوئٹزر لینڈ گزار کر آئے ایک ماہ ہم نے نیویارک میں گزارا اور اب اسپتال جاتے ہوئے بھی مجھے ایک ماہ ہو گیا ہے آخر یہ ہولنگ کب تک چلے گی؟“ اس کے لہجے میں پہلی بار کچھ مٹی محسوس ہوئی۔

”آخر پہلے بھی تو ہوٹل ہی سے کھاتے تھے۔“ سفینہ کا موڈ خراب ہو گیا۔

”ہوٹل میں ہمارا کک الگ تھا وہ ہم دس پندرہ پاکستانی لوگوں کے لیے علیحدہ پاکستانی کھانے تیار کرتا تھا جو چیز ہمیں کھانا ہونی تھی مثلاً پائے، نہاری شب دیگ وغیرہ اس کی فرمائش دو دن پہلے سے کر دیتے تھے۔“

”تو کیا اب آپ اس کک کو نہیں بلا سکتے؟“

”کیسی باتیں کر رہی ہو وہ اتنے بڑے ہوٹل کا کک ہے ایک دو آدمیوں کا کھانا تھوڑی تیار کرتا ہے۔“

اس دن دونوں میاں بیوی میں خاصی تلخ کلامی ہوئی۔ سفینہ نے ذرا بھی شوہر کا لحاظ نہیں کیا فراز نے آج کی بحث اور گفتگو سے اندازہ لگالیا تھا کہ سفینہ کو گھر داری کا بالکل شوق نہیں، نہ اسے کھانے پکانے سے کوئی دلچسپی ہے۔ اسے پہلی بار اپنی ماں اور اپنا گھریا یاد آیا۔ اور وہ جانے کیوں اپنے اندر اس قدر بے چینی محسوس کرنے لگا کہ فوراً گھر سے باہر چلا گیا۔ سفینہ غصے میں اندر چلی گئی، اس نے کچھ نہیں کھایا پکایا۔ رات دیر سے گھر آیا تو سفینہ نے بات نہیں کی۔

فراز فطرتاً اچھا انسان تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ سفینہ جس ماحول میں پلی بڑھی اس کا تقاضا یہی کچھ تھا جس کا مظاہرہ آج ہوا تھا۔ ماموں بھی اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ کوئی اولاد بھی نہیں تھی جس پر خرچ کر کے اپنے ارمان پورے کرتے۔ سفینہ ہی ان کی امیدوں اور محبتوں کا مرکز تھی۔ آزادی کے ساتھ گھومتی پھرتی جو چاہتی کھاتی، پہنتی۔ دوستوں کے ساتھ عیش کرتی۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ اور جب ماموں نے اسے بے جا آزادیوں سے روکا تو وہ بہت آگے جا چکی تھی۔ یہ ساری باتیں دیکھنے سمجھنے کے باوجود فراز اس کی محبت کو امرت اور اس کی قربت کو راحت سمجھ کر پی گیا۔ پھر شکوہ کیا...؟ ناراضگی کیسی...؟

فراز نے اسے منالیا، پھر سفینہ نے فریج میں سے سالن نکال کر گرم کیا۔ اور دونوں نے ہنستے مسکراتے کھانا ختم کیا۔ اور کافی بنا کر اپنا اپنا کپ لے کر بالکنی میں آگئے کتنے ہی دن

ہنی خوشی گزر گئے اب اس نے اپنا کلینک کر لیا تھا۔ سفینہ بہت خوش تھی۔ ایک دن فراز کو اپنا اسکول کے زمانے کا ایک دوست ملا جو کسی ٹریننگ کے سلسلے میں امریکہ آیا تھا۔ اس نے بڑی لعن طعن کی اور بولا۔

”ماں باپ کی پسند کی شادی تم نے مسترد کر دی تھی۔ وہ شریف لڑکی خاموشی کے ساتھ تمہاری زندگی سے بن آہٹ نکل گئی، ماں باپ سسک کر چپ ہو گئے، تم نے فوراً ہی اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کر لی لوگوں میں ان کی تنہائی جگ ہنسائی ہوئی، مگر تمہیں اس کی پرواہ نہیں تھی تم سب کے دلوں پر پاؤں رکھ کر گزر گئے۔ پلٹ کر نہ تم نے ماں کی طرف دیکھا نہ باپ کی طرف چھ ماہ ہو گئے، تم نے ایک بار بھی فون کر کے نہ اپنی خیریت ماں باپ کو بتائی نہ ان کا حال پوچھا کہ وہ مر گئے یا زندہ ہیں خوب بہت سعید بیٹے اور بڑے باکمال ڈاکٹر نکلے تم یار...؟“

فراز بڑی دیر تک خاموش خلا میں دیکھتا رہا پھر وہ نوید کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو دوست، امی ابو کا خیال مجھے بہت آیا لیکن ان کی ناراضگی کے خیال سے میں ڈر جاتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے میری طرف دیکھنا، مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ انہیں واقعی میں نے دکھ دیا تھا مگر اس کا ازالہ میرے پاس نہیں۔“

”کیوں نہیں ہے فون کر کے ان سے بات تو کرنی تھی ناراض تھے تو منالیتے کچھ خوشامد کچھ وقت کا کچھ مجبوری، کچھ حالات وغیرہ کا حوالہ دے کر معافی مانگ لیتے۔ ماں کا دل ہی کتنا ہوتا ہے، مٹھی بھر گوشت کا یہ نرم و نازک پھر کتنا ہوا کلنڈر جس کے اندر ہلکورے لیتا ہوا پورا دریا بند ہوتا ہے جس میں اولاد کی ساری چھوٹی بڑی غلطیاں لمحہ بھر میں دریا برد ہو جاتی ہیں اسی لیے ماں کا دل دریا کہا جاتا ہے تم آگے تو بڑھو اعتراف تو کرو۔“

فراز نے پر امید نظروں سے نوید کی طرف دیکھا۔

”یار! تم نے حوصلہ دیا ہے تو کچھ ہمت بندھ گئی ہے۔ اب میں انہیں ضرور فون کروں گا کئی دنوں سے مجھے امی بہت یاد آ رہی ہیں۔“ یہ کہتے کہتے وہ اداس ہو گیا۔ اس نے اپنے سب راستے کھوٹے کر دیئے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے میں پھر آؤں گا۔“ نوید کھڑا ہو گیا۔

”گھر نہیں چلو گے؟“

”نہیں فراز! تم مائنڈ نہ کرنا، وہاں سفینہ بھالی ہوں گی۔“

”ارے تو کیا ہوا وہ تمہیں کھا تو نہیں جائے گی۔“ فراز ہنس پڑا۔

”اب کھانے کو رہ گیا ہے رشتے، ناتے، محبتیں، رفاقتیں سب تو وہ کھا گئیں، چھوڑا

کیا ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔
 ”بھئی کیا سوچنے لگے یار چلو۔“ فراز نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”کچھ نہیں فراز مجھے ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا۔“ وہ سر جھٹک کر بولا۔
 ”میں پھر آ جاؤں گا خدا حافظ۔“

نوید کی باتوں سے فراز کے اندر ہلچل سی مچ گئی اور کئی دروازے آپ ہی آپ کھلتے چلے گئے۔ ہر دروازے سے ایک چہرہ جھانکنے لگا۔ ماں کا باپ کا، بہن بھائیوں کا اور ان میں ایک دلہن کا معصوم شفاف اور مغموں چہرہ بھی تھا۔
 وہ تو بالکل بھول گیا تھا۔ اس کے ذہن پر پردے پڑ گئے تھے۔ اب وہ پردے آہستہ آہستہ سر کے توجہ عروسی کی وہ سوگوار دلہن اور وہ رات یاد آ گئی اور وہ دھندلا دھندلا چہرہ اس کی آنکھوں میں ساکت ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر وہ چہرہ اپنی جگہ موجود تھا اس نے گھبرا کر پھر آنکھیں کھول دیں۔ دل عجیب سے انداز میں دھڑکا۔
 یا اللہ وہ کون تھی؟

کیوں اسکی زندگی میں بن آہٹ داخل ہو گئی تھی۔ اور اسی خاموشی سے کیوں چلی گئی تھی۔ اس نے کوئی احتجاج کیوں نہ کیا؟
 روئی چیچی کیوں نہیں؟ یہ کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔
 ایک نئی نویلی دلہن کو اس کی پھولوں کی تیج سے اٹھا دیا جائے جس کا ہر پھول، پنکھڑی اس دلہن کی آرزوؤں، اربانوں، سچیلے خوابوں، محبتوں کی گواہ اور امانت دار تھی۔ اور اس جگہ کسی دوسری دلہن کو لا کر بٹھا دیا جائے تو کیا وہ اٹھ جائے گی۔ اپنی تیج اور سہاگ اس کے حوالے کر دے گی کیا یہ اتنا ہی آسان تھا؟ شاید نہیں.... مگر.....“
 جیسے کوئی ہوا کا معطر جھونکا اسے چھوٹا ہوا گزر گیا ہو وہ اپنے وجود کا مٹا مٹا سا احساس جاتے جاتے دل کے کسی کونے میں چھوڑ گئی تھی جو اسے کھوجنا نہیں بڑا تھا۔ نوید کے یاد دلانے پر اسے بہت کچھ یاد آتا جا رہا تھا تمام رات بے چینی کی نذر ہو گئی۔ صبح ہو گئی تھی وہ اٹھ کر سفینہ کی طرف دیکھنے لگا جو اپنی لمبی موم جیسی انگلیوں کے بڑھے ہوئے ناخنوں میں کیونٹیس کا شید برابر کر رہی تھی۔ وہ مسہری کی پشت سے ٹیک لگا کر سرگریٹ کے کش لینے لگا۔ اس کی نگاہوں میں ماں کا مغموں چہرہ گھوم رہا تھا اب یہ احساس اس کے لیے اذیت کا باعث بنتا جا رہا تھا کہ اس کے ماں باپ اس سے ناراض ہیں۔ اور یہ کہ اس کا نام حقوق سلب کرنے والے ظالموں میں لکھا گیا ہے۔ وہ تو ایک مسیحا تھا جس کا نام زندگی دینا ہوتا ہے زندگی چھیننا نہیں۔ جو مرہم رکھتا ہے زخم نہیں لگاتا۔

”اسی ناگن سے۔“
 ”ابھی تک تو میری زندگی میں کوئی ناگن آئی نہیں۔“ وہ ہنسا ”اگر آ بھی گئی تو.... میں ناگن کا سر کچلنا بھی جانتا ہوں رہ گئی بات پچھتاوے کی تو تم مجھے پچھتاتے کا موقع نہ دینا۔“
 بات مذاق کی تھی مگر سفینہ کے سینے میں گڑ کر رہ گئی تھی۔ جب وہ کلینک چلا جاتا تو وہ بڑی چالاکی سے اپنی پڑوسن کی بیٹی ثنا کو بلا لیتی جس نے کوئنگ کا کورس کیا ہوا تھا۔
 اس نے اس سے اچھی خاصی دوستی کر لی تھی۔ اس سے دو تین ڈشیں بنوا کر فریئر میں رکھ دیتی تھی۔ فراز کو نہاری پائے اور کوفتے بہت پسند تھے۔ بیٹھے میں وہ انڈوں کا حلوہ اور کریم کسٹرڈ پسند کرتا تھا سفینہ خود شاکہ کے ساتھ مارکیٹ سے ضرورت کی ساری چیزیں خرید لاتی۔
 ”ارے باجی! آپ خود ہی یہ ساری چیزیں کیوں نہیں بناتی ہیں میں سکھا دوں گی؟ جب میں چلی جاؤں گی پھر آپ کیا کریں گی فراز بھائی کو کیا پکا کر کھلائیں گی؟“
 ”ہوئل زندہ باد۔“ وہ مسکرا دیتی۔

”نہیں باجی، ہوئل اور گھر کے کھانوں میں بڑا فرق ہوتا ہے ہوئل کے مسالے بھی ریڈی میڈ ہوتے ہیں اور گوشت کے پارے چکن اور پائے وغیرہ بھی مہینوں کے فریز

کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں وہ ذات کہ نہیں ہوتا تو جو تازہ گوشت اور اپنے ہاتھ تیار کئے ہوئے مسالوں میں ہوتا ہے۔ پھر لوگ گھر کا کھانا کیوں پسند کریں۔“
 ”ارے ثناء ہم دو تو بندے ہیں پھر کون اتنی محنت کرے۔ دماغ کھپائے دو ڈشوں لیے، ہم نے ایک دو سال بنالیے تو ہفتہ گزر گیا۔ باقی مکھن ڈبل روٹی جام جیلی اور انڈ زندہ باد۔“

”یہ سب درست سہی پر باجی میری امی کہتی ہیں کہ شوہر کے دل کا راستہ معدے گزر کر جاتا ہے۔ جو شوہرا چھا کھانے پینے کے شوقین ہوتے ہیں ان کی بیویوں کو تو بڑے اچھے اچھے کھانوں اور ورائیٹرز کا خیال رکھنا چاہیے اس سے محبت بڑھتی ہے۔“
 ”افوہ ثناء تمہاری امی پرانے خیالات کی مالک ہیں آج ہر چیز بازار میں تیار مل رہی ہے پھر کون اپنا وقت اور اپنے ہاتھ خراب کرے کھانا پکانے میں۔“
 ”ٹھیک ہے باجی! اپنا اپنا خیال ہے۔ میں آپ کی بات سے قطعی متفق نہیں! اگلے م میں انڈیا جا رہی ہوں امی کے ساتھ میرے ماموں زاد کی شادی ہے تین مہینے تو لگا جائیں گے۔“

”خیر خیر اللہ مالک ہے۔“ سفینہ نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔
 کھانے پکانے کا یہ سلسلہ چلا تو فراز سب کچھ بھول کر مطمئن ہو گیا تھا سفینہ نے اب یہی بتایا تھا کہ یہ چیزیں وہ خود بناتی ہے۔

اس کے بعد پھر سفینہ کی دلچسپی گھر سے ختم ہوتی گئی اور پھر وہی ہونٹنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا اس کے بعد سفینہ کا وقت باہر سہیلیوں اور دوستوں میں گزرنے لگا اس کے دوستوں میں ایک نوجوان ضیاء بھی تھا جو امریکن نژاد مسلمان فیملی کا چشم و چراغ تھا۔ رنگین زندگیوں کے سنگ سنگ اڑنے والا سفید بھونزا انتہائی انگیز شخصیت تھی اس کی نیلی آنکھوں سرخ و سفید رنگ سنہرے بال اونچا لمبا قد کاٹھ مسکراتا تو لگتا بہاریں مسکرا رہی ہیں پھول کھل رہے ہیں لڑکیاں اس کے آگے پیچھے پھرتی تھیں۔

سفینہ تو اس سے دیکھ کر اس سے مل کر اپنی سدھ بدھ بھول گئی تھی جب سے وہ ضیاء سے ملی تھی فراز سے اس کی وابستگی واجبی رہ گئی تھی۔ گھر سے تو اس کو پہلے ہی دلچسپی نہ تھی شادی کو سال سے زیادہ ہو گیا تھا لیکن سفینہ کی گود سونی تھی۔ جب کہ فراز کو بچوں کی بڑ چاہی تھی۔ سفینہ ابھی اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ دو بار وہ امید سے ہوئی دونوں بار اس نے لیڈی ڈاکٹر سے سلسلہ ختم کروا لیا۔

دوسری بار فراز کو معلوم ہو گیا وہ ڈاکٹر اس کی ہیلپر تھی کلینک میں اس دن اسے بہت

غصہ آیا گھر پہنچا تو وہ موجود نہیں تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ سفینہ نے کلب جوائن کر لیا ہے۔ لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ وہ روز کلب جاتی ہے اور سارا دن گھر سے باہر رہتی ہے۔ وہ باہر ٹہل رہا تھا جب وہ ازائیل کی گاڑی میں آئی۔
 ”ارے آپ جلدی آگئے آج؟ آپ کو نہیں پتا کہ میں نے کلب جوائن کر لیا ہے؟“
 وہ اس سے باتیں کرتی اندر آ گئی۔

”میں نے تمہیں کلب جانے کی اجازت دی تھی۔ مگر یہ اجازت نہیں دی تھی کہ سارا دن تم گھر سے باہر رہو گی۔“

”یہ مجھے نوکروں کی طرح حکم چلانا پسند نہیں میں آپ کی بیوی ہوں ذرا سی دیر پر آپ پولیس افسر کی طرح پوچھ گچھ کرنے لگے۔“ سفینہ نے غصے میں اپنا پرس میز پر پھینکا جوتے اتار کر کونے میں ڈالے فراز آنکھوں میں چنگاریاں بھرے خاموشی سے اس کو دیکھ رہا تھا جب وہ بیٹھ گئی تو بولا۔

”بیوی ہونے کا دعویٰ ہے تمہیں تو بیوی بن کر رہو میں تمہارا ملازم نہیں شوہر ہوں اچھی بیویوں کی طرح چائے پر میرا انتظار کیا کرو میرے آرام کا خیال رکھا کرو میں کلینک کوئی گیمز کھیلنے نہیں جاتا۔“

”اومسٹر یہ پاکستان نہیں کینیڈا ہے یہاں زندگی گزارنے کے اصول دوسرے ہیں۔“
 ”دوسرے اصول یہاں کے مقامی باشندوں کے لیے ہوں گے ہمارے لیے نہیں ہم یہاں اپنے ملک اپنے اخلاقی بشری اقدار کے سفیر ہیں ملازمت کرتے ہیں یہاں اپنا لہجہ اور اپنا دماغ درست کر لو۔“

یہ کہہ کر وہ غصے میں ڈرینگ روم میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ فریش ہو کر نکلا تو سفینہ چائے پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن غصے میں نظر آ رہی تھی۔ فراز نے سرسری نظر سے اس کو دیکھا اور پلیٹ سے چپس اٹھا کر کھانے لگا۔

”چائے بناؤ میرے لئے۔“ اس نے گویا اسے حکم دیا۔
 وہ خاموشی سے چائے بنانے لگی اور کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔
 ”تم چائے نہیں پیو گی؟“

”نہیں میں نے ازائیل کے ساتھ پی لی تھی۔“
 فراز نے چائے پی کر اس کی طرف سخت نگاہوں سے دیکھا۔
 ”تم ڈاکٹر انورا دھار کے پاس کیوں گئی تھیں۔“
 ”میری اپنی کچھ پراہم تھیں۔“

”وہ پرالم میری بھی تھی کیا تم سمجھتی ہو کہ جو جی چاہے کرتی پھرو مجھے اس کی خبر نہ ہوگی تم قاتل ہو تم نے میرے اعتماد اور میری اولاد کا خون کیا ہے۔“ وہ غصے میں دھاڑا۔
 ”میں ابھی ان جھنجھٹوں میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔“ وہ بڑے سکون سے بولی۔
 ”ابھی مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔“
 ”تمہیں ضرورت نہیں تھی مگر مجھے تو تھی میری اجازت کے بغیر تمہیں اتنا بڑا قدم اٹھانے کی جرات کیسے ہوئی۔“ فراز سخت غصے میں تھا۔

”تم اس جھنجھٹ میں کیوں پڑتیں۔ تم نے ایک بیوی اور ماں کے مقام کو سمجھا کر تھا۔ تمہاری خوبصورتی میں فرق آجاتا تمہارا فکر خراب ہو جاتا، ذمے داریوں کا بوجھ پڑ جاتا تم پر پھر تم نے شادی کیوں کی تھی۔ مجھے کیوں بے وقوف بنایا یونہی الہز دو شیزہ جان محفل بن کر اپنے شیدائیوں کا دل بہلاتی رہتیں۔ میں جو ایک گھر ایک بیوی اور بچوں کا خواہش مند تھا وہ میرا گھر میری جنت تم نے مسمار کر دی۔ کیا دیا ہے تم نے مجھے نہ گھر کا سکون نہ دل کا چین نہ مستقبل کا فخر.....؟“

”اور تم نے مجھے کیا دیا ہے ڈاکٹر فراز احمد شادی تم نے مجھ سے کی اور دل میں تمہارے کوئی اور بی ہے۔ تم منافق نکلتے اگر تمہیں اس ناگن کا خیال نہیں تھا تو تم نے اسی وقت اسے طلاق کیوں نہیں دے دی دھوکا تو تم نے مجھے دیا ہے۔“

”نری بکواس کر رہی ہو سفینہ تم میں نے تو اس کی صورت بھی نگاہ بھر کر نہیں دیکھی تھی پھر مجھے اس کا خیال کیسے آتا؟..... رہ گئی طلاق کی بات تو اس نے تمہارے ساتھ میرے نکاح کی یہی شرط رکھی تھی کہ میں اسے طلاق نہیں دوں اور وہ خاموشی سے میری زندگی سے نکل گئی۔ میں نے اس کی شرط اسی لیے قبول کر لی تھی کہ مجھے تم سے محبت تھی میں فوری طور پر تم سے شادی کرنا چاہتا تھا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میرے اعتماد اور میری محبت کو اس طرح پامال کر ڈالو گی۔ بہر حال اب تم نے نکل جاؤ گی نہ سی سائڈ نہ کسی کلک اسپاٹ پر ایک اچھی بیوی کی طرح تم گھر پر ہوگی جہاں جانا ہو میرے ساتھ جانا ورنہ نتیجہ کی ذمہ دار تم ہوگی۔“

”تم مجھے ہسٹکی دے رہے ہو؟“ اس نے تیور بدل کر پوچھا۔

”نہیں ہدایات دے رہا ہوں۔“

اس کے بعد دونوں کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ سفینہ کو یقین تھا کہ فراز نے کوئل سے ضرور رابطہ قائم کر لیا ہے۔ اور اب وہ اس کے حقوق بحال کرنے کی سوچ رہا ہے۔ ”میں کبھی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“ کچھ دن نارمل گزرے فراز نے بہت سی باتیں

نظر انداز کر دی تھیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں پی جاتا۔ وہ شوہر کا ذرا بھی احترام نہیں کرتی۔ دو بدو جواب دیتی۔ اسے غصہ آ جاتا تو باہر نکل جاتا۔

سوچتا شاید اب سفینہ کو اس سے محبت نہیں رہی۔ یا شاید اس نے محبت کی ہی نہیں تھی۔ محبت کے نام پر محض ایک ڈراما کھیلا تھا صرف اس لیے کہ سوتیلی بہن سے اپنا حق چھین لے اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا البتہ وہ تو محبت کی راہ میں بے موت مارا گیا تھا۔ نہ گھر کا رہا نہ گھٹا کا.....

سفینہ کی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئی تھیں بلکہ وہ فراز کو ستانے پر نل گئی تھی۔ اگر وہ کچھ کہتا تو اس سے فوراً اپنا مطالبہ دہرا دیتی کہ کوئل کو طلاق نامہ بھیج دو میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔ اور وہ چڑ جاتا۔

ایک رات اس نے فون کر کے ماں سے بات کرنا چاہی تو بڑی مشکل سے لائن ملی ادھر ماں نے بیٹے کی آواز سنی تو بے قرار ہو گئیں۔

”کیوں فراز میاں! آج پورے دو سال بعد تمہیں ماں کیسے یاد آ گئی؟.....“ ان کی آواز زندہ گئی۔ صاف بتا چلتا تھا کہ ماں رورہی ہے وہ تڑپ گیا۔

”امی جان شرمندگی کی وجہ سے اب تک فون کرنے کی ہمت نہیں پڑی تھی مجھے معاف کر دیجئے امی! میں بہت پریشان ہوں آپ لوگ بہت یاد آ رہے ہیں سب کیسے ہیں امی؟“
 ”کیوں بیٹا تم نے اپنی مرضی کر لی تم اپنی دلہن کے ساتھ وہاں خوش ہو پھر کا ہے کی پریشانی ہے ماں باپ تو صرف دعائی دے سکتے ہیں سو تم نے وہ دروازہ ہی بند کر دیا۔“

”میں جانتا ہوں امی آپ مجھ سے ناراض ہیں خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔“

”نہیں بیٹا! تم نے تو میری خوشی پامال کی تھی جو ایک معمولی بات تھی۔ عام طور سے بچے ماں کو اسی طرح ستاتے ہیں لیکن تم نے ایک معصوم لڑکی کی حق تلفی کی۔ اور وہ تمہارے نام پرستی ہو گئی۔ بہت بڑی بات اور بہت بڑا قصور ہے تمہارا جس کی تلافی ممکن نہیں پہلے تم اس سے معافی مانگو اگر وہ تمہیں معاف کر دے گی تو میں بھی معاف کر دوں گی ورنہ تمام عمر تمہاری شکل نہیں دیکھوں گی۔ تمہارے دوست نوید سے بھی میں نے فون پر یہی بات کہی تھی۔“

”امی! اگر آپ حکم دیں تو میں اس لڑکی کو آزاد کر سکتا ہوں اس کے علاوہ میرے بس میں کچھ نہیں۔“

”نہیں۔ تم ایسی بات سوچنا بھی نہیں فراز! سمجھ لو کہ تمہاری زندگی میں سفینہ کے علاوہ کوئی دوسری لڑکی آئی نہیں تھی بھول جاؤ اس سانچے کو اور ماں باپ کو بھی مرده سمجھ لو وہ تو اسی دن مر گئے تھے جب تم نے سفینہ سے شادی کر کے ہم سے تمام رشتے توڑ لیے تھے۔“ فون

بند ہو گیا۔
رجوع نہیں کرو گے مجھ سے معافی کی امید نہ رکھنا۔ میری خوشی چاہتے ہو تو حقدا کرو اس کا حق دے دو۔“

ادھر سفینہ نے ضد پکڑ لی تھی کول کو طلاق دینے کی، دونوں طرف سے اس پر زبردست پریشر پڑ رہا تھا۔ وہ چکی کے دوپاٹوں کے درمیان پسے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔
کون سا راستہ اختیار کرے۔

کہاں جائے؟
کوئی راہ فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔
آخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا.....!

☆.....☆.....☆

افروز واپس چلی گئی تھی۔ بڑی تسلیاں، بڑا پیار، بڑی دعائیں دیں..... کول نے اسے گلے سے لگا کر بڑا اطمینان اور یقین دلایا تھا کہ میں بہت خوش ہوں، اپنی تقدیر پر صابر و شاکر، خدا کا وعدہ سچا ہے کہ وہ صبر کرنے والوں کو بہت عزیز رکھتا ہے میرا تو کل اللہ پر ہے کہ وہ منصف ہے اور میرے ساتھ ضرور انصاف ہوگا۔

اور افروز نے بڑے جذب سے آمین کہہ کر اسے پیار کر لیا تھا۔
کول کی وہی مصروفیت تھی۔ ادارے میں دنیا کی ستانی ہوئی اپنوں کی ڈی انڈھی، گوگی جھلسی ہوئی معذور لڑکیاں، عورتیں آتی تھیں۔ وہ ان کا علاج اور دیکھ بھال کرتی تھی۔ ان میں بہت سی زندگی کی قید سے آزاد ہو جاتی تھیں۔ اور بہت سی زندگی کی طرف لوٹ جاتی تھیں۔

اپنے لیے دوسروں کے لیے کول نے ان دکھی مظلوم ہستیوں میں زندگی کا اصل راز پالیا تھا۔

یہ زندگی جو انہوں نے قدرت سے مستعار لی تھی، اس کا محور بھی دکھی انسانیت تھی۔ اپنے لیے تو دنیا جیتی ہے۔ مگر دوسروں کے لیے زندہ رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے اور وہ اس مشکل سے نبرد آزما تھی اس سے جب کبھی بھی ارم ملنے آتی تھی۔ تو وہ اپنے بھائی کا ذکر ضرور کرتی تھی اور اب تو اس کے ہاتھوں میں بانہیں ڈال کر یہ کہنے لگی تھی۔

”لگتا ہے بھائی جان کو اپنی زیادتیوں کا احساس ہونے لگا ہے تب ہی اب ان کا فون بلاناغہ آنے لگا ہے۔ اور امی سے معافیاں تلافیاں کرنے لگے ہیں۔ سفینہ بھائی کا ذکر کبھی نہیں کرتے“ معلوم ہوتا ہے جیسے ان کی زندگی میں بھائی کا کوئی عمل دخل نہ ہو یا پھر بھائی

اور افروز فون پر سر رکھ کر سسک پڑا۔ اس بھری دنیا میں وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہا تھا جس کی خاطر اس نے ماں باپ کی بددعائیں لیں، ایک بے گناہ لڑکی کا دل توڑا اس کے حقوق پامال کئے وہ بھی اپنی نہ رہی۔

دن بہ دن وہ اس کی طرف سے لا پرواہ ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو اسے یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ فراز گھر آچکا ہوگا، وہ اس کا منتظر ہوگا۔ پہلے وہ اس کے لیے دو تین سالن اگر پکاتی نہیں تھی تو اسٹور سے لا کر رکھ دیتی تھی۔ اب وہ بھی نہیں، جب فراز کو زیادہ بھوک لگتی تو سلاٹس میں ابلے انڈے کے ٹکڑے رکھ کر سینڈوچ کی طرح کھا لیتا تھا اور چائے بنا کر پی لیتا۔

اسے پتا تھا کہ وہ ضیاء سے اپنے تعلقات بڑھا رہی ہے۔ وہ فطرتاً ٹھنڈی اور صلح جو طبیعت کا مالک تھا۔ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا..... لڑائی جھگڑا اسے پسند نہیں تھا۔ گھر سے آوازیں انھیں یہ اسے بالکل گوارا نہیں تھا۔ اس نے ایک حد تک بیوی کو آزادی دے رکھی تھی۔ مگر اس نے اس مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا جب کبھی فراز اسے سمجھانا چاہتا تھا اسے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلانا چاہتا۔ وہ ساری باتوں کے جواب میں اسے یہی کہتی تھی۔

”تم کول کو طلاق دے دو ہمارے درمیان پھر کوئی جھگڑا نہیں رہے گا ورنہ میں یہی سمجھوں گی کہ تم نے مجھ سے محبت کا محض ڈرامہ کیا تھا حقیقت میں تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے۔“

اور وہ زچ ہو جاتا ہر طرح اسے کئی بار یقین دلا چکا تھا کہ ”یہ محض تمہارا وہم ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں جس کی چاہو تم مجھ سے لے لو آخر تم کس طرح مطمئن ہو گی؟“

”نہیک ہے۔ میں یقین کر لوں گی..... سچ مان لوں گی اگر تم نے اسے طلاق دے دی۔“

اور وہ جلدیا کر چپ ہو جاتا۔

اب اس نے کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا تھا۔ فراز نے کبھی کبھار نہیں بلکہ اکثر سفینہ کو ضیاء کے ساتھ دیکھا تھا اب وہ کلینک سے سیدھا ہونٹ چلا جاتا، اور کھانا کھا کر آتا تھا چائے کی طلب ہوتی تو ایک کپ بنا لیتا۔ وہ ہمیشہ رات کو دیر سے گھر آتی۔ دونوں اجنبیوں کی طرح ملتے۔ گو نکلے بہروں کی مانند ایک دوسرے کو دیکھتے۔ سفینہ اپنی خوابگاہ میں چلی جاتی اور فراز ڈرائنگ روم میں دیوان پر سو جاتا۔ اس روٹین پر وہ دونوں سختی سے عمل پیرا تھے۔
اب وہ گھر پر روز فون کرنے لگا۔ مگر ماں کا وہی اصرار تھا۔ کہ ”جب تک تم کول سے

”تو پھر میں کیا کروں، ان کے آنے یا نہ آنے سے میرے لیے کیا فرق پڑ جائے گا۔“ وہ چیخ پڑی۔

”مت مجھ سے اس قسم کی بات کرو، کیوں مجھے دکھ دیتی ہو، میں نے تم سے کیا مانگا ہے کیا چاہا ہے پھر میرا سکون کیوں برباد کرتی ہو۔“ کوئل دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اور ارم شرمندہ سی حیران کھڑی شکلیہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔ انہوں نے ارم کو گلے لگا لیا۔

”بیٹی وہ بڑی حساس ہے، ایسی باتیں اسے کوئی خوشی نہیں دے سکتیں، وہ مایوسیوں کی دلدل میں دھستی چلی جاتی ہے۔ مجھے تمہارے خلوص پر کوئی شک نہیں لیکن تم ایسی باتوں سے احتیاط کرو تو یہ ہم سب کے لیے بہتر ہے۔“

”سوری آئی۔“ ارم خاموشی سے چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

فراز کی خاموشی، اس کی ڈھیل، اس کا نرم رویہ کوئی چیز بھی تو سفینہ پر اثر نہ کر سکی تھی۔ اس کی سرد مہری اور لاتعلقی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اور فراز آج کل کچھ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور خاموش ہو گیا تھا۔ ایک دن خلاف توقع فراز نے مسکرا کر سفینہ کی طرف نرم نگاہوں سے دیکھا۔

”تمہارا اصرار تھا کہ میں طلاق کے کاغذات تیار کر کے پاکستان بھیج دوں، میں نے تمہاری شرط پوری کر دی، اب تم کیا کہتی ہو سفینہ۔؟“

”ہائے کیا سچ۔“ سفینہ ایک دم ہلکھلا کر اس کے شانے سے لگ گئی۔ اور فراز کا دل کسی نے مٹھی میں پکڑ کر کھینچ دیا۔ ایک ٹیس نے اسے مضطرب کر دیا تھا.....

”کاش سفینہ! تم مجھ سے تخلص ہو تیں، میری محبت کا اعتبار نہ چھیننا ہوتا۔ میری زندگی کا سفینہ موجوں کے حوالے نہ کر دیا ہوتا۔ تو آج اس حقیقت کا رنگ ہی دوسرا ہوتا ہمارا مقدر سنور جاتا آج میں جو کرنے چلا ہوں یہ سب کچھ نہ ہوتا تمہاری محبت نے اندھا کر دیا تھا اور میں یہ بھول گیا تھا کہ اللہ رب کریم اپنے بندوں کے لمحے لمحے کا حساب رکھتا ہے اور مظلوم کی آہ فلک گیر ہو کر رہتی ہے.....“

”کیا سوچنے لگے فرازی؟“ سفینہ نے اسے ہنستے ہوئے جھنجھوڑ ڈالا۔

”اوہ کچھ نہیں۔“ وہ بوکھلا کر ہنس پڑا۔

”میں خوشی میں کھوسا گیا تھا۔“ اور وہ بے مقصد ہی قہقہے لگانے لگا۔ سفینہ بھی اس کے تہمتوں میں شریک ہو گئی اس کی آنکھوں میں ستارے ناچنے لگے۔ مدہوش لہجے میں بولی۔

جان ان سے خوش نہ ہوں، کوئی بات ہے ضرور..... وہ بڑے اداس لہجے میں بات کرتے ہیں پوچھنے کے باوجود وہ کچھ نہیں بتاتے بس اپنی پریشانیوں کا اظہار کرتے ہیں۔“

اور کوئل خاموشی کے ساتھ اسے دیکھنے لگتی اور پھر بڑی مدہم آواز میں اس سے کہتی۔

”نہیں ارم! تم مجھے اب کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ کرنا میں نے اپنی پلکوں سے وہ خواب نوج کر پھینک دیئے ہیں اپنے بھائی کی کوئی بات میرے سامنے نہ کیا کرو جو سانحہ میں بھول چکی ہوں اسے یاد دلا کر مجھے مزید بے چین نہ کرو بڑی مشکل سے میں اپنے آپ کو سمیٹ پائی ہوں، اب میں بکھرنے کے لیے قطعی تیار نہیں۔“

”خدا تمہیں ہر لمحہ خوش رکھے کوئل میں تو ہر سانس میں تمہارے لیے دعا کرتی ہوں آخر وہ میرے بڑے بھائی تھے۔ کتنا چاہتے تھے وہ مجھے، امی سے کتنا لاڈ کرتے تھے جانے کس منحوس گھڑی سفینہ بھائی ان کی زندگی میں آئیں کہ سب کچھ تس نہ ہو کر رہ گیا۔“

ارم رو ہانسی ہو گئی، کوئل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فراز کا تذکرہ ہمیشہ کوئل کے زخموں کا منہ کھول دیتا تھا۔ زبان سے کچھ نہیں کہتی تھی مگر اس کی کتنی ہی راتیں بے خواب گزر جاتی تھیں۔

اس نے اب اس ظالم کے لئے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس دل، ان آنکھوں کا کیا کرتی کہ اب بھی اس کا ذکر باعث راحت ہوتا اور اس کی یادیں پلکوں پر خواب سجانے لگتی تھیں۔ اس کا تو یہ عالم تھا۔

دن کو مسمار ہوئے رات کو تعمیر ہوئے

خواب ہی خواب فقط زندگی کی جاگیر ہوئے

☆.....☆.....☆

ارم کی امی اب بھی شکلیہ بیگم سے اسی خلوص اور محبت سے ملتی تھیں، کوئل کو گلے سے لگا کر پیار کرتی تھیں۔ شکلیہ بیگم کے ہر دکھ سکھ کی ساتھی تھیں۔ وہ ان کی محرومیوں کا ازالہ کرنے سے تو قاصر تھیں مگر شرمندگی اور دکھ کا اظہار اب بھی اکثر ان کی زبان پر ہوتا تھا۔

ایک دن اچانک فراز کا فون آیا اور اس نے بتایا۔

”امی! میں پاکستان آ رہا ہوں۔“ فون بند ہو گیا۔

سب لوگ اس کی اس ادھوری ناہم بات پر بے چین ہو گئے کہ وہ کب آ رہا ہے؟

”کتنے دن؟ کس تاریخ کو.....؟ اکیلا آ رہا ہے یا بیوی بھی ساتھ آ رہی ہے؟“

سب کے دلوں میں سوالات کے گھنور پڑنے لگے۔ اور یہ خبر ارم نے سب سے پہلے کوئل کو سنائی۔

”آخری کیوں.....؟“ وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
 ”اس لئے کہ اس کے بعد شاید تم اتنی خوش نظر نہ آؤ۔“ وہ مسکرا کر اس کی آنکھوں میں
 جھانکتے ہوئے بولا۔
 ”کیوں..... کیوں.....؟“ وہ بھی مسکرا دی۔

”بات کچھ ایسی ہی آپڑی ہے سفینہ.....“ اس نے غور سے سفینہ کو دیکھا۔
 ”آخرا آپ سسپنس کیوں پیدا کر رہے ہیں مجھے کیوں ترسارے ہیں دکھا دیجئے نا۔“
 وہ اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔ فراز نے ہاتھ بڑھا کر میز سے بریف کیس اٹھایا اور اسے
 کھول کر کاغذات نکالنے لگا۔ سفینہ بڑی مشتاق نظروں سے اس کی ایک ایک جنبش دیکھ
 رہی تھی۔ اس کے چہرے پر رنگ بکھرے تھے۔

یا خدا! یہ دنیا کتنی خود غرض ہے! دوسروں کے چہرے پر پھیلا ہوا کرب اسے نظر نہیں آتا
 لیکن اپنی خوشی کے لئے وہ چمن کا ایک ایک پھول چن کر اپنے چہرے اور آنکھوں کو سجالتی
 ہے۔ فراز نے کاغذات نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔
 ”میں نے تو دستخط کر دیئے ہیں صرف تمہارے دستخط باقی ہیں۔ تم بھی کر دو۔“ سفینہ
 نے کاغذات ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

”مگر میں کیوں دستخط کروں؟“
 ”ارے بھی کھول کر دیکھ لو! سمجھ میں آ جائے گا۔“
 سفینہ نے کاغذات کھول کر دیکھے، پڑھے اور پھر جیسے اس کو کرنٹ سا لگ گیا وہ ایک
 زبردست جھٹکے سے اٹھی۔

”یہ..... یہ کیا ہے فراز؟ یہ طلاق نامہ تو میرا ہے۔ کیا تم مجھے طلاق دے رہے ہو مگر
 کیوں.....؟“

کچھ توقف کے بعد وہ اپنی نشست سے اٹھا اور غم زدہ لہجے میں بولا۔
 ”ہاں سفینہ! بقول تمہارے یہ فیصلہ مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا میں نے بہت دیر
 کر دی اب تک کہے ہوئے تمام فیصلے میرے غلط ثابت ہوئے اس فیصلے کے علاوہ جو میں
 اب کر رہا ہوں تم سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی بھول تھی! مرد ہو یا عورت اپنی
 زندگی میں کسی دوسرے کی مداخلت پسند نہیں کرتی اور تم نے میری محبت، میری نرمی سے
 فائدہ اٹھا کر اس بھورے بندر ضاء کو میرے حقوق منتقل کرنا شروع کر دیئے تھے۔ تم
 آزادانہ اس کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں۔ نہ تمہیں میرا خیال آیا نہ گھر کا حالانکہ میں نے
 دوستوں کی طرح بھی تمہیں سمجھایا۔ شوہر کی زبان میں بھی تمہیں اپنے فرائض کا احساس

”آج سے زیادہ خوشی کا اور کون سا دن ہوگا فراز! آپ نے فیصلہ کرنے میں بڑی دیر
 لگادی ہمارے یہ ڈھائی سال جو پھولوں کی رہگذر پر ہنستے مسکراتے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
 گزرتے وہ انگاروں پر چلتے انگارے چپاتے ہوئے نہ گزرتے۔ ایک چھوٹی سی بات
 کے لئے آپ نے کتنا ستایا درمیان میں اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دیں! آپ بڑے
 ہیں.....“

سفینہ نے بڑے ناز سے روٹھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
 ”تم نے ٹھیک کہا! سفینہ! یہ فیصلہ بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا! خیر دیر آید! درست آید۔“
 وہ مسکرایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولا۔
 ”ارے ہاں کیوں نہیں میری تو آنکھیں ترس گئیں! کہاں ہے وہ مجھے دکھائیں؟“
 ”پہلے ناشتہ تو کر ادیں ورنہ مزہ کر کر اہو جائے گا۔“
 ”ٹھیک ہے“ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے آپ تو جانتے ہیں کہ جب زیادہ خوشی کی
 بات ہوتی ہے تو میرے بھرے ہوئے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے ہیں۔ ویسے بھی آج
 میں نے ناشتے میں بڑا اہتمام کیا ہے آپ کی پسند کی تمام چیزیں آپ کو میز پر نظر آئیں
 گی۔“

اس نے فخر سے ہاتھ لہرا کر کہا۔
 ”اکٹھا؟“ فراز مسکرایا۔
 ”کیا خیال ہے سفینہ! بیگم یہ آپ کے ساتھ کیا ہمارا آخری ناشتہ ہوگا؟“
 ”نہیں بھی! اس خوشی کے موقع پر پہلا ناشتہ۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔
 اور واقعی میز طرح طرح کی نعمتوں سے بھری ہوئی تھی۔ لیکن فراز کی بھوک ایک دم اڑ
 گئی تھی۔ اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا سفینہ کی شکل دیکھ کر اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔
 لیکن وہ اپنے اوپر جبر کر کے پلیٹوں میں سے ایک ایک چیز اٹھا کر کھانے لگا۔
 سفینہ نے پلیٹ میں سب چیزیں ڈال کر زبردستی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔
 ”ارے اتنی بہت سی! میں کب اتنا کھاتا ہوں؟“

”آپ کو میری قسم۔“ اس نے خود چند چیزیں اٹھا کر اس کے منہ میں ڈال دیں اور
 اس نے انکار نہیں کیا زندگی کا یہ کیسا موڑ آ گیا تھا! کہ وہ نہ اپنی مرضی سے ہنس سکتا تھا نہ
 رو سکتا تھا! ناشتا کر کے دونوں لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے اس نے بات چھیڑی۔
 ”واقعی سفینہ! آج کا ناشتہ بڑا منفرد تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ ہمارا ناشتہ پہلا بھی تھا اور
 آخری بھی۔“

دلایا۔ مگر محض تم نے اپنی بہن سے طلاق کا اصرار کر کے مجھے بلیک میل کیا یہ کہہ کر جب تک میں کوئل کو طلاق نہیں دوں گا ہمارے درمیان تعلقات بحال نہیں ہوں گے۔ اسی وقت میر نے تمہارا اصل چہرہ دیکھ لیا تھا مجھے کتنا شک پہنچا۔ میں بچھتاؤں کے کس پاتال میں کھڑ تھا کتنا چھوٹا آدمی ہو گیا تھا میں، محبت تو ایک غیر مشروط جذبہ ہے اس میں سودے بازی نہیں ہوتی۔ مگر تم نے شرطیں لگا کر میری بے ربا محبت کو مفاد پرستی سے آلودہ کر دیا۔ اس پر بھی میں تمہیں موقع فراہم کرتا رہا کہ تم سنبھل جاؤ مگر تمہارا رویہ نہ بدلا۔ حتیٰ کہ تم نے میرے فون کے تار کاٹ دیئے کہ میں پاکستان اپنے گھر فون نہ کر سکوں، تمہیں ڈر تھا کہ کہیں کوئل کے لئے میرے دل میں کوئی نرم گوشہ نہ پیدا ہو جائے۔

پھر میں نے کلینک سے فون کرنا شروع کر دیئے میرا شبہ حقیقت کا روپ دھار رہا تھا۔ تمہاری لائق نفرت اور فرض ناشناسی سے میرے راستے خود بخود ہموار ہوتے گئے۔ اور کوئل پر کی ہوئی زیادتیاں ایک ایک کر کے مجھے تڑپانے لگیں۔ میری آنکھوں سے تمہاری نام نہاد محبت کی پٹی اتر چکی تھی۔ معلوم نہیں میں نے تمہارے ساتھ یہ عرصہ کیسے گزار دیا۔ ہاں اگر ہماری کوئی اولاد ہوتی تو مجھے یہ فیصلہ کرتے وقت سوچنا پڑتا خدا جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ تمہیں آزادی چاہیے تھی، وہ تمہیں مل رہی ہے۔ یہ فلیٹ اس کا سامان اور گاڑی تمہارے مہر کے عوض تمہیں دے رہا ہوں، سیف میں کچھ رقم بھی ہے۔ اس کے علاوہ زیور اور کپڑا اس میں سے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔

میں نے تمہارے سارے حقوق ادا کر دیئے ہیں۔ ان کا غذات میں سب کچھ لکھ دیا ہے اور جو حقوق میرے تم پر تھے وہ میں نے معاف کئے اسی محبت کے حوالے سے جو مجھے تم سے تھی اب تمہیں جو کہنا ہے وہ تم کہہ سکتی ہو، فراز خاموش ہو گیا۔

”تم نے جو کیا ٹھیک کیا فرازیہ لو میں نے طلاق نامے پر دستخط کر دیئے ہیں۔ میں نے بھی یہ نہیں جانا تھا کہ شادی ہو جانے کے بعد عورت کے پاؤں میں زنجیریں پڑ جاتی ہیں۔ اس کی آزادی ختم ہو جاتی ہے میں نے ایسی زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا اس لئے کہ میں نے بڑی آزاد اور خود مختار فضا میں پرورش پائی تھی۔ اولاد کی محرومی کی وجہ سے میرے ماموں، ممانی نے میری ہر جائز اور ناجائز خواہش پوری کی جو میں نے چاہا، وہ پایا۔ اس طلاق کا مجھے قطعی افسوس نہیں ہے مغربی معاشرے میں طلاق اور شادی ایک عام سی بات ہے اور میں اسی معاشرے کا ایک حصہ ہوں۔“

فراز بے حد دکھ اور افسوس سے سفینہ کو دیکھ رہا تھا، اس کے خیالات سن کر اسے سخت دھچکا پہنچا، اس لئے نہیں کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا بلکہ اس لئے کہ ایک پاکستانی مشرقی

لڑکی تباہ ہو رہی تھی اور اس سے بڑھ کر یہ غم کہ اس کی آغوش میں پلنے والی نسل کا مستقبل کیا ہوگا؟

اس کا مسلک کیا ہوگا اور وہ کون سا راستہ اختیار کرے گی؟
اس کے پاس یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

نوید آ گیا تھا گاڑی لے کر اور برابر ہارن دے رہا تھا اس نے چونک کر بغیر کچھ بولے بغیر دیکھے سوٹ کیس اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ گاڑی فرائٹ بھرنی ایئر پورٹ کی طرف جا رہی تھی۔

☆....☆....☆

بہار کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ ہر طرف پھول مسکرا رہے تھے۔ ہرے بھرے سبزے پر شبنم کی بوندیں موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہار سنگھار اور چمپا کی شاخیں سفید اور سرخ پھولوں سے بھری ہوئی تھیں کوئل فجر کی نماز پڑھنے کے بعد کچھ دیر کے لئے اپنے لان میں ضرور آتی تھی۔ موتیا اور سفید گلاب اس کے پسندیدہ پھول تھے۔ کچھ لمحے ان کی نرم و نازک گداز پنکھڑیوں پر انگلی رکھ کر انہیں دس کرنی اور انہیں رنگ و خوشبو عطا کرنے والے کی تعریف کرتی دوسری طرف رجوع ہو جاتی۔ اپنے خوبصورت نرم چھوٹے چھوٹے پاؤں سے سبزے کو آہستہ آہستہ گد گداتی۔ دھیرے دھیرے مسکراتی لان کا پورا راؤنڈ لگا آتی۔ پھر ماربل کی بنچ پر بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگتی۔ جہاں روشنی سے ملگجاسا اندھیرا انگلیں ہو کر اجالوں میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ رات کے بعد صبح ہونا نظام فطرت ہے۔ اس میں امر و نہی کی کوئی گنجائش نہیں پھر میری زندگی کی یہ تاریکی کب چھٹے گی۔

”کب صبح طلوع ہوگی؟“

”کب دن نکلے گا....؟“

”ارے بیٹا تم یہاں بیٹھی ہو تمہاری ماں تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔“ احمد حسین نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”اوہ ابو جی واقعی آج دیر ہو گئی مجھے..... امی چائے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔

باپ نے غور سے دیکھا۔ اس کے توہنئے کھیلنے کے دن تھے اس کی وہ مسکراہٹ جس میں خوشیوں کی جھکاکر بر جستگی اور خوش فکری ہوتی تھی کہاں چلی گئی تھی۔

”خدا یا میری بچی کو بھی ان بہاروں میں حصے دار بنا دے۔“ انہوں نے دل میں کہا اور پیچھے پیچھے اندر چلے گئے۔

کول کو ارم پر غصہ آ رہا تھا۔ پورا ایک مہینہ ہو گیا وہ اس سے نہیں ملی تھی اور پھر وہ بھی حق بہ جانب تھی جب آئی تب ہی کسی نہ کسی بات پر ان کی لڑائی ہو جاتی۔ اور وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ جب نہ آتی تو اس کے لئے بے چین رہتی، درپردہ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی حوالے سے فراز کا ذکر آئے، کوئی اس کی باتیں کرے مگر پھر جانے کیا ہوتا کہ وہ بکھرے لگتی۔ غصہ آ جاتا چیخ پڑتی اور پھر رونے بیٹھ جاتی۔

شکیلہ بیگم سے ارم کی امی مہینے میں ایک دو بار ضرور آ کر ملتی تھیں۔ کبھی کبھی ارم بھی آ جاتی تھی کول سے ملنے، اس طرح دونوں خاندانوں میں رابطہ اور محبت قائم تھی۔ شکیلہ بیگم کو آج بھی کسی معجزے کے رونما ہونے کی اطلاع ہوئی تھی۔ ان کی اکلوتی پھول سی پڑ خزاں کی زد میں آ کر چل گئی تھی وہ آج بھی خاموش تھیں۔

پھر ایک دن اچانک فراز آ گیا۔ باپ سامنے تھے وہ سب سے پہلے باپ کے قدموں میں جھک گیا اور پھر سارے گھر میں خوشگوار سی ہلچل مچ گئی۔ بہنیں اس سے لپٹ کر رونے لگیں، ماں سکتے کے عالم میں اسے آتا دیکھ رہی تھیں، وہ دوڑ کر ماں کے قدموں سے لپٹ کر رو پڑا۔

”امی، مجھے معاف کر دیجئے۔“

ماں نے اٹھا کر اسے سینے سے لگا لیا۔ خود بھی رونے لگیں، سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں پھر اسے اپنے برابر بٹھا کر اس کے آنسو پونچھے اور کہا۔ ”تمہاری دلہن کہاں ہے تم اکیلے آئے ہو؟“

”ہاں امی اب میں ہمیشہ کے لئے آپ کے قدموں میں آ گیا ہوں کبھی نہ جانے کے لئے۔۔۔۔۔۔“

”مگر تمہاری بیوی کہاں ہے؟“ انہوں نے پھر پوچھا۔

”امی! میری بیوی تو یہاں ہے آپ کے پاس پھر آپ کس بیوی کی بات کر رہی ہیں؟“

اس نے ماں کی گود میں سر رکھ دیا۔ وہ پریشان ہو گئیں۔

”بیٹا تم نے تو مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ میں سفینہ کے متعلق پوچھ رہی ہوں اور تم جانے کیا بکے جا رہے ہو۔“

”امی! میرا سفینہ تو ڈوب گیا، میں تو آپ کی دعاؤں سے پار لگا ہوں اب میں ڈوبنے کے لئے تیار نہیں۔“

ارم کو اس نے پہلے ہی مختصر بتا دیا تھا۔ وہ بھائی کی باتوں سے محظوظ ہو کر ہنس پڑی۔

ماں اب بھی کچھ نہیں سمجھیں کبھی وہ بیٹی کا منہ دیکھتیں۔ کبھی بیٹے کا۔ ارم نے ماں کے ساتھ لگ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”امی بھائی جان شاید کسوٹی کسوٹی کھیل رہے ہیں۔“

”اچھا اٹھ جا۔“ انہوں نے مصنوعی غصے سے فراز کا سر اٹھا کر کہا۔

”اب مجھے صحیح بتا، بات کیا ہے اور تو چاہتا کیا ہے؟“

ارم کھلکھلا کر ہنس پڑی، سب بچے ماں بیٹے کے لاڈ اور باتوں سے خوش ہو کر مسکرا رہے تھے۔ اس گھر میں بڑے دنوں بعد خوشیوں سے کھلتے تھقبے گونج رہے تھے۔

”امی، آپ اپنی بہو کو کب رخصت کرا کر لارہی ہیں؟“

اب وہ سب کچھ سمجھ گئی تھیں۔

”میں نہیں جاؤں گی، اب تو خود جائے گا۔۔۔۔۔۔ مجھے تو نے کچھ کہنے سننے کے قابل چھوڑا

کہاں بیٹا۔“

وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ فراز نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا کر کہا۔

”امی، میں جاؤں گا سر کے بل جاؤں گا۔ ایک مجرم کی حیثیت سے اپنے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر جاؤں گا، آپ جس طرح کہیں گی ویسے ہی کروں گا۔ اپنی تمام زیادتیوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے میں نے کتنی راتیں سیاہ کیں، خدا کے حضور میں رویا۔ گزر گزایا ہوں اس سے میں نے ہدایت مانگی۔ حوصلہ مانگا، معافیاں مانگیں، مجھے یقین ہے وہ لوگ بھی مجھے معاف کر دیں گے۔“ ایسا کہتے کہتے وہ رو پڑا ماں نے اسے گلے سے لگا لیا۔

”ہاں بیٹے! بلاشبہ وہ بہت شریف لوگ ہیں مگر مجھے شکیلہ کو فون تو کرنے دو، کہیں میں تمہیں لے کر جاؤں اور وہ مجھے دھکے دے کر نکال دیں کہ یہ مواکون مرد ہے گھر میں گھستا چلا رہا ہے۔“

ارم پھر ہنس پڑی۔ اس نے ماں کو بڑی رازداری سے سب کچھ بتا دیا تھا، اس سے یہ خوشی سنھائی نہیں جا رہی تھی۔

”امی، اب وہ کتنے بھی دھکے دیں میں ان کی چوکھٹ نہیں چھوڑوں گا۔“ فراز نے کہا۔

اور اس حیران کن تبدیلی پر گھر کا ہر فرد اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دن ابھی چشم تصور سے اوجھل نہیں ہوئے تھے جب فراز میاں گھر میں پینترے بدل بدل کر غصے میں ہر ایک سے سوال کر رہے تھے کہ میرے ساتھ یہ زیادتی کیوں ہوئی اس اجنبی لڑکی کی جگہ سفینہ کو جگہ عروسی میں ہونا چاہیے تھا۔ اور سب اپنی جگہ دم بخود تھے کہ یہ کیا ہو گیا جب کہ وہ اجنبی

مسکراتے رہتے اس نے اپنی محبت کا ماتم نہیں کیا تھا۔ اسے لوریاں سنائی تھیں وہ ظالم دنیا کو کیسے بتاتی کہ۔

ہم شہر وفا کے لوگوں کا تم حال بھلا کیا جانو گے
ہم دل کی چوٹ چھپاتے ہیں اور آنسو تک پی جاتے ہیں

☆.....☆.....☆

شکیلہ کھلے دروازے سے کول کو تیار ہوتے دیکھتی رہیں اور پھر واپس چلی گئیں، ناشتے کی میز پر انہوں نے بڑے پیار سے پوچھا۔
”کیا آج تمہیں دیر نہیں ہوگئی؟“

”جی امی! آج سروے پر مجھے سلمہ اور جبیں کے ساتھ سائٹ پر جانا تھا، میں ان کا انتظار کر رہی تھی۔“ شکیلہ کے چہرے پر اطمینان بخش مسکراہٹ آگئی، وہ ناشتہ کر کے اخبار دیکھنے لگی اتنے میں گاڑی کا ہارن زور سے بجا اور کوئی اندر آ گیا۔ کول کمرے میں بھی اپنے۔
”اسلام علیکم، کیسی ہیں آپ؟“ یہ آواز کول کی ساس کی تھی۔

دوسری آواز اس کے خسر کی تھی۔ اور تیسری آواز ہنسی کھلکھلاتی ارم کی تھی۔ اور چوتھی آواز.....؟ بھاری اور خوبصورت مردانہ جو سب سے مختلف تھی۔ کول چکرا کر رہ گئی، دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ اتنے سویرے آنی، انکل ارم کیوں آئے ہیں اور یہ چوتھا شخص کون ہے؟

اس نے سوچا اور آہستہ سے اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکا کر دیکھنے لگی پھر وہ چونکی اس کا ہاتھ کاٹا اور وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے وہ پلٹی اور کرسی پر جیسے ڈھے سی گئی۔

وہ تو ہزار برس بعد بھی ہزاروں میں اسے پہچان سکتی تھی۔ وہ جس کی پرستش شاید وہ صدیوں سے کرتی آئی تھی۔ جو خدا نہیں پتھر کا صنم نکلا۔ اب کیوں آیا ہے؟ کس لیے؟

جب وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی ہے.....

کیا لینے آیا ہے۔

کیا یہ دیکھنے کے میں زندہ کیسے ہوں۔

مرکبوں نہیں گئی..... وہ بن آواز..... رور رہی تھی اس کے آنسو اندر ہی اندر گر رہے تھے آنکھیں بند کئے نڈھال سی کرسی پر بے جان پڑی تھی۔

فراز نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر ساس سر سے اپنے قصور معاف کرا لئے تھے۔ آنسو بہا کر ان کا دل موم کر لیا تھا۔ احمد حسین نے بڑی خاطر مدارات کی عزت دی اور پھر بولے۔

معصوم لڑکی ایک رات کی حرماں نصیب لہن اپنا سب کچھ سفینہ کے نام کر کے اس کی زندگی سے دور جا چکی تھی اس وعدے کے ساتھ کہ اب وہ کبھی اس کی راہوں میں نہیں آگی.....

اور اس کے نام پر پوری زندگی گزار دے گی۔

”اور آج.....؟“

وہی اجنبی لڑکی اسے اتنی عزیز ہوگئی تھی۔ اس کے لئے اتنی اہم ہوگئی تھی کہ اپنی زندگی اس پر وار دینے کے لئے تیار تھا۔ لاؤنج میں جا کر انہوں نے شکیلہ کے گھر کا فون ملایا۔
”ہیلو شکیلہ کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں آپا سب خیریت ہے نا؟“

”ہاں شکیلہ! میں تمہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتی تھی مگر میں نے سوچا پہلے تمہیں بتا کر لوں۔“ وہ مسکرائیں۔

”ارے آپا ہماری قسمت میں خوشخبریاں کہاں، ہم انہیں پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ہم سے دور بھاگتی ہیں۔“ ان کی آواز میں مایوسی تھی۔

”ارے نہیں شکیلہ! اب ایسا نہیں ہوگا اب دکھوں کے دن بیت گئے، خوشیا دروازے پر دستک دے رہی ہیں میری بات غور سے سنو.....“

اور تب انہوں نے بڑی سرشاری سے انہیں فراز کے آنے کے متعلق بتایا اور بولیں۔
”وہ تم سے ملنا چاہتا ہے کیا خیال ہے شکیلہ وقت کا دھارا اپنے محور پر آ کر رک گیا ہے سویرہ تھا رات کو اس کا حق ملتا ہی ملتا ہے۔ راستوں میں کتنے ہی بریکر کیوں نہ آئیں، کارواں حیات کو منزل پر پہنچنا ہی ہوتا ہے، راستوں کی رکاوٹیں دور ہوگئی ہیں میرا گھر سونا ہے، کے بغیر۔ میں کل فراز کو لے کر آ رہی ہوں“ یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

شکیلہ کو محسوس ہوا جیسے خزاں نے ایک دم سبز پیرہن زیب تن کر لیا ہو۔ خشک بادل جھہر برسنے لگے۔ اور پھولوں نے اپنے لب کھول دیئے ہر طرف خوشبو اڑنے لگی۔ باپ بھائی سب کے چہرے کھل گئے۔ اجڑی ہوئی بیٹی کی مانگ میں افشاں بھرنے والی تھی۔ اس کا گھر آباد ہو رہا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی کی خبر ہو سکتی تھی۔ وہ بے ساختہ کول کے کمرے کی طرف بڑھیں کہ جا کر اسے گلے سے لگا کر یہ خوشخبری سنا دیں مگر.....؟

ان کے قدم رک گئے وہ بیٹی کی طبیعت سے واقف تھیں کہ یہ خبر اسے بکھیر کر رکھ دے گی۔ ہزار اندیشے سو سے اس کے اندر سر اٹھانے لگیں گے۔ اسے یقین نہیں آئے گا۔ تو آہ بھی کرتی تھی تو کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ سینے میں آتش فشاں دھکتا ہوتا لیکن ہونٹ

”بیٹا! وہ تمہاری امانت کل بھی تھی اور آج بھی ہے میری طرف سے اجازت ہے لیکن آگے کے مرحلے تم دونوں مل کر طے کرو گے۔ میں کوئل کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔“ اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ مسکرائے اور فراز خاموشی سے اٹھ کر بن آواز اندر چلا گیا۔ کوئل کرسی پر بے سدھ پڑی تھی کھلے ہوئے بال اس کے چاندنی سے وجود پر بکھرے ہوئے تھے۔ آسمانی سوٹ میں وہ بڑی معصوم لگ رہی تھی۔ دوپٹہ کندھے سے ہوتے ہوئے گود میں آگرا تھا فراز نے اسے دیکھا اور آہستگی سے نیچے بیٹھ کر دونوں ہاتھ اس کے پاؤں پر رکھ دیئے۔ کوئل نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ بڑی شرمندگی اور بے چارگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے انھی دوپٹے اٹھا کر سر پر ڈالا اور رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

”نہیں کوئل! منہ نہ چھپاؤ رخ نہ پھیرو! میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں، چھو کر محسوس کرنا چاہتا ہوں خود کو یقین دلانے کے لئے کہ کیا ایک دہلی پتی کمزوری خوبصورت لڑکی کے سینے میں اتنا بڑا دل ہو سکتا ہے جو اسے عام لڑکیوں میں ممتاز کر سکے۔ اور کیا وہ لمحے اتنے امر تھے میرے نصیب کے جب تم نے میرے سامنے طلاق نہ لینے کی شرط رکھ دی تھی۔ معلوم نہیں زندگی کی کون سی ادا، کون سی نیکی خدا کو بھاگئی تھی۔ جو تم میرے نصیب میں لکھ دی گئی تھیں اور انہی گزرے خوش بخت لمحوں کی انگلی پکڑے پکڑے تمہاری دہلیز پر آ گیا ہوں اس اعتماد کے ساتھ کہ میری خطائیں معاف ہو جائیں گی اور اس در سے مجھے جینے کا نیا حوصلہ ملے گا۔“

وہ دونوں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ کوئل تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ فراز نے اس کا راستہ روک لیا۔

”نہیں کوئل اب تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں مجھ میں بڑے عذابوں سے گزر کر یہاں پہنچا ہوں جو جی چاہے سزا دے لو مگر اب یہ زندگی تمہارے بغیر قبول نہیں۔“

کوئل اپنے دل کو سمجھاتے خود گری جا رہی تھی اس نے اپنے آپچل کی آڑ کر لی وہ خاموش کھڑی تھی۔ اس کے اندر سخت کشمکش ہو رہی تھی۔ وہ پورے حالات کو سمجھ چکی تھی۔

ارم کی وہ بات اسے یاد آرہی تھی کہ اب تو بھائی جان امی کو روز فون کرتے اور معافیاں مانگتے ہیں وہ بہت پریشان نظر آتے ہیں۔ تب ہی وہ اس سے لڑ پڑی تھی کہ تم اپنے بھائی کے متعلق کوئی بات نہ کیا کرو۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ مہینوں سے چل رہا تھا۔ کوئی یقین

بات ضرور تھی تب ہی امی ابو کے چہروں اور باتوں سے اطمینان اور خوشیاں جھلک رہی تھیں اندر سے اٹھنے والے قہقہوں سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ سارے

گھر والے فراز کے آنے سے خوش تھے۔ اور یہ کہ والدین نے اسے معاف کر دیا ہے وہ اس رشتے کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں اسی لئے اس کی یہاں تک آنے کی ہمت پڑی یقیناً یہ اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

ماں باپ کا..... اپنی محبت..... اور..... شریعت کے ان بولوں کا بھرم رکھ لے جو ایک دوسرے کی شناخت بن گئے تھے یا پھر.....؟ یا پھر.....؟

”کچھ بولو کوئل..... کچھ کہو..... اچھا برا جو دل میں ہے۔ آج کہہ ڈالو میری طرف دیکھو پلیز..... میں گنہگار ہوں تمہارا قابل نفرت بھی ہوں اور قابل تعزیر بھی مجھے برا کہو..... ذلیل کرو..... مجھ سے نفرت کا اظہار کرو..... کچھ تو بولو..... جیب کی مار نہ دو

اسکے منہ سے گھٹی گھٹی سسکیاں نکل گئیں اور کوئل نے گھبرا کر اپنا چہرہ اس کی طرف کر لیا۔

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”ایک نظر کرم کی بھیک.....“

اتنے میں دروازہ کھول کر ارم اندر آ گئی۔ کوئل نے آگے بڑھ کر کہا۔

”ارم! اپنے بھائی کو باہر لے جاؤ! انہیں تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔“

ارم نے خاموشی سے کوئل کی طرف دیکھا۔

”آئیے بھائی جان۔“ اسے فراز سے کہا اور وہ سر جھکائے ارم کے ساتھ باہر نکل گیا۔

وہ بہت چپ چپ تھا..... ارم نے اسے چھیڑا۔

”آپ تو ایک دم ہی چاہتے ہیں کہ کوئل سب کچھ بھول کر آپ سے تجدید عہد کر لے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے تھوڑا سا صبر کیجئے زخم جتنا گہرا ہوتا ہے اتنی ہی دیر میں بھرتا ہے

”ارم پلیز اسے یقین دلا دو کہ اب میں بلا شرکت غیرے صرف اس کا ہوں۔ میں نے

اسے دکھ دیئے ہیں میں ہی اس کا درماں بنوں گا مجھے معاف کر دو۔“

”ٹھیک ہے بھائی جان جلدی نہ کریں اس کا غم اور غصہ اپنی جگہ غلط نہیں ہے۔ اسے

اپنے کوسمجھانے اور دل کو آمادہ کرنے کے لئے کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔“

جاتے ہوئے ارم اور ان کی امی نے کوئل کو گلے لگا کر پیار کیا اور بہت سی دعائیں دیتی

ہوئی چلی گئیں۔

فراز کو چپ اور اداس دیکھ کر احمد حسین نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔

”بیٹا! یہ ایک فطری عمل ہے کہ کوئل کے ذہن پر ابھی تک اس حادثے کا اثر باقی ہے۔

رفتہ رفتہ اسے یقین اور اعتماد کی منزل تک لانا پڑے گا۔“

ان کے جانے کے بعد کوئل کچھ ایسی بے چین ہوئی کہ اس نے ادارے میں فون کر دیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں آج میں سائٹ پر نہیں جاسکوں گی۔ پھر جا کر لیٹ گئی۔
شکیلہ کو اس کی ایک ایک جنبش کی خبر تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں چلی گئیں۔ کرسی کچھ کر اس کے قریب بیٹھ کر سر پر آہستہ آہستہ پیار سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”بیٹی، فراز بھٹک گیا تھا۔ اور بھٹکے ہوئے انسانوں کو کوئی ٹھوکر ہی راستہ دکھاتی ہے۔ سفینہ تم سے نفرت کرتی تھی۔ شادی کے بعد اس کا یہ اصرار تھا کہ فراز تمہیں طلاق دے دے لیکن اس نے انکار کر دیا اس کے علاوہ سفینہ اچھے کردار کی مالک نہیں تھی۔ اس کے بہت سے دوست تھے۔ اس کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اسے گھر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کلب، پارٹیاں، ٹینک اور نئے نئے دوست بنانا اس کی ہابی تھی۔ یہ تمام چیزیں فراز کے پہلے علم میں نہیں تھیں۔ اگر وہ احتجاج کرتا تو فوراً اپنا مطالبہ اس کے سامنے رکھ دیتی کہ آپ کوئل کو طلاق دے دیں میں بھی اپنی یہ سرگرمیاں چھوڑ دوں گی۔ اور فراز کو مشروط طور پر زندگی گزارنا سخت ناپسند تھا۔ آخر اس نے طلاق کا فیصلہ کر لیا اسے طلاق کا کوئی افسوس نہیں تھا وہ آزادی پا کر بہت خوش تھی فراز نے وہ فلیٹ گاڑی زریور اور سامان مہر کی صورت میں اسے دے دیا اور پاکستان آ گیا۔“

شکیلہ کی بات ختم ہوئی تو کوئل اٹھ کر بولی۔

”اس لئے کہ اس کی منکوحہ پاکستان میں موجود تھی۔ جسے اس نے سہاگ رات ہی ٹھکرا دیا تھا وہ اس کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ وہ تو میں نے اپنی عزت اور تحفظ کی خاطر طلاق لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس کی زندگی سے چپ چاپ نکل آئی تھی۔ کیا میں آپ لوگوں کو اتنی ہی بے وقوف اور احمق نظر آتی ہوں کہ ٹھکرائے جانے کے باوجود میں اسے قبول کر لوں گی کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟“

کوئل کے چہرے پر دکھ ہی دکھ تھا۔ شکیلہ نے اسے گلے سے لگالیا۔

”نہیں میری جان! نہ تم بے وقوف ہو نہ احمق۔ وہ فیصلہ بھی تمہارا بروقت اور درست تھا اور اب جو فیصلہ کرو گی وہ بھی ٹھیک ہوگا۔ سفینہ کے ساتھ شادی اس کی زندگی کی سب سے بڑی بھول تھی۔ اور طلاق ایک ٹھوکر جس نے اسے گرنے سے بچا لیا بیٹا ازدواجی زندگی میں بیوی کو صدمہ ہاتھ پھوٹے بڑے واقعات اور امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے یہی اس کی عظمت کی لپکت ہے۔“

”اوہ میری بچی! شاید میں غلط بول گئی، میرا مقصد شادی شدہ زندگی سے تھا۔ حالانکہ تم ابھی اس دور سے نہیں گزری ہو لیکن کہلائی تو جاؤ گی شادی شدہ۔“

”امی پلیز! یہ موضوع ختم کریں۔“ وہ اکتا کر بولی۔

شکیلہ بیگم مسکرائیں۔

”بیٹی اپنی ضد چھوڑ دو اس طرح دو گھر برباد ہو جائیں گے اس بڑھاپے میں کیوں ماں باپ کو غم دینا چاہتی ہو، ہمارا کیا قصور ہے ہمیں کس بات کی سزا دینا چاہتی ہو۔ زندگی بار بار کسی پر مہربان نہیں ہوتی۔ بہت پرانا مقولہ ہے کہ صبح کا بھولا ہوا اگر شام کو آ جائے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہا جاتا۔ دو سال تو سرسراتے لمحے تھے جو گزر گئے اللہ نے تمہارے دکھوں کا نعم البدل دے دیا خوش بختیاں منتظر ہیں کہ آگے بڑھو اور تمہارا دامن موتیوں..... پھولوں سے بھر دیں..... تمہارا شوہر تمہارا منتظر ہے۔“

”شوہر.....؟“ کوئل نے سسک کر سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا اور تڑپ کر ان کے سینے سے لگ کر رو پڑی ”امی کیا شوہر ایسے ہوتے ہیں؟“

”ہاں بیٹا شوہر پر بھی کبھی کبھی برا وقت آ جاتا ہے اور یہی وقت ہوتا ہے جب بیوی اپنا کردار ادا کرتی ہے۔“ انہوں نے اسے پیار کرتے ہوئے مسکرا کر سرگوشی کی۔
”اب اگر فراز کا فون آ جائے تو بند نہ کرنا۔“ وہ انھیں اور مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔

اور وہ سوچوں میں غلطاں ہو گئی.....

”اگر حالات اس کے خلاف نہ ہو جاتے..... سفینہ اس کے ساتھ اپنی وفاداریاں نہ بدلتی..... سب کچھ ٹھیک ہوتا تو کیا ڈاکٹر فراز احمد تم پھر بھی سفینہ کو طلاق دے کر اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے پاکستان آ جاتے۔ اپنے ماں باپ سے معافیاں مانگ کر مجھے راضی کرنے کی کوشش کرتے؟ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔“
کوئل کے آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔

”میری کشتی حیات کے مقدر میں کوئی کنارہ نہ ہوتا۔ میں کس سے فریاد کرتی۔ مجھے کون پار لگانے آتا اور اب سب لوگ مجھے کیوں گھیر رہے ہیں۔ میرے داغ داغ دل کے کرب کا احساس کیوں نہیں کرتے۔ کیا اتنی جلدی یہ زخم پھول بن جائیں گے۔؟ میں سب کچھ اتنی جلدی بھول جاؤں گی۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے..... ماں باپ اور شوہر سب لوگ اپنے اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

”اور میں کس سے اپنی حق تلفی کا گلہ کروں؟ کس سے اپنی زندگی کے یہ دو سال مانگوں جب میں مر مر کر جی ہوں جی جی کر مری ہوں۔“

ہر لمحہ نے مجھے سنگسار کیا ہے۔ اے کا تب تقدیر میں نے یہ تو نہیں چاہا تھا

اس لمحے اسے افروز ٹوٹ کر یاد آئی، کم سے کم اس کے سینے پر سر رکھ کر جی بھر کر روتو سکتی تھی وہ اپنی ڈائری نکال کر اس کا سنا پورا فون نمبر تلاش کرنے لگی جو وہ جاتے جاتے

اس کی ڈائری میں لکھ گئی تھی۔ نمبر مل گیا.....

”ہیلو افروز میں ہوں کوئل۔“ اس نے بھاری آواز میں کہا۔

”ہائے کوئل“ تم کتنی لگی ہو بس اڑنے والی ہوں دو گھنٹے بعد میری ہانگ کانگ کی فلائٹ ہے۔ بتا کیسی ہے میری سکھی۔“ اس کے ہر لفظ سے بے تحاشا پیارا منڈر ہاتھا۔

”مجھے تمہاری ضرورت ہے افروز کیا تم کراچی ہو کر نہیں جاسکتیں؟“

”نہیں“ تم بتاؤ کیا پرائیلم ہے ارے تمہاری آواز سے لگ رہا ہے تم رورہی ہو بے وقوف لڑکی بتاؤ کچھ خبر آئی اس کی؟“

”خبر نہیں وہ خود آ گیا ہے اور سب لوگ مجھے مصلوب کر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔“

”ہائے سچ“ یہ تو خوشی کی بات ہے چلی جا پھر چاہے گن گن کر بدلے لے لینا..... مگر..... بڑے پیار سے۔“ اس نے سرگوشی کی پھر قہقہہ لگایا۔

”مر جاؤ افروز تم میرے دل پر بنی ہوئی ہے اور تم قہقہے لگا رہی ہو کیسی دوست ہو۔“

”ابھی نہیں مروں گی ابھی تو ہنی مون منارہی ہوں“ وہ ہنسی.....

”ہائے ایک سال شادی کو ہو گا۔ اور تمہارا ہنی مون پیرنڈ ختم نہیں ہوا۔“ وہ جل کر بولی۔

”جب شوہر پیار کرنے والا بھی ہو اور دولت مند بھی تو پھر ہر دن عید اور ہر رات شب برات ہوتی ہے۔ اچھا خیر چھوڑو یہ تو محض مذاق تھا میں واقعی سیریس ہوں کوئل جان یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ میں تمہاری طرف سے بے خبر ہوں مجھے سب پتا ہے وہ تو میں ستا رہی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمہاری منزل یہی ہے کہ تمہارا اٹھنے والا ہر قدم اس کے ساتھ اٹھے۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو افروز جب کہ تم ہی اسے عدالت میں بھیج بلائے کا مشورہ دے رہی تھیں اور اب اس کی وکالت کر رہی ہو؟“

”ہاں کوئل! وہ وقت دوسرا تھا اور اب دوسرا ہر عورت کی خواہش ایک خوبصورت گھر اور شوہر کا پیار ہوتا ہے۔ اور یہ سب تمہیں مل رہا ہے مجھے یقین ہے فراز بھائی تمہارے تصور سے زیادہ تمہیں پیار دے گا۔ تم سے محبت کرے گا۔“ وہ غصے میں

”میرا جی چاہ رہا ہے افروز کہ یہ ریسور تمہارے سر پر دے ماروں۔“ وہ غصے میں بھنا کر بولی۔

”اوہ میرا جی چاہ رہا ہے کوئل کہ اپنے پرس میں سے بھرا ہوا پستول نکال کر اسی ریسور سے تمہارے سینے میں ساری گولیاں اتار دوں ڈشاؤں ڈشاؤں کر کے۔“

پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اور کوئل کو بھی ہنسی آ گئی۔

”بس میں اب خودکشی کرنے چلی ہوں۔“ وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

”بدتمیز اگر خودکشی کرنا تھی تو پہلے ہی کیوں نہ کر لی اس کے آنے کا انتظار کیوں کر رہی تھیں۔ بس یہ ڈراما ختم کرو اور مجھے جلدی سے بتاؤ۔ کب جا رہی ہو پیادیس واپسی میں تمہارے گھر تمہاری جنت میں آنا چاہتی ہوں دروازے کھلے رکھنا۔ جواب دو میں تین تک گنتی گن رہی ہوں اس کے بعد فون بند ہو جائے گا۔ میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔ تم اپنے شوہر کے ساتھ مجھے بھی کھو دینا۔“

”افو! خدا نہ کرے۔“ کوئل چیخ پڑی۔

”میں تمہارا سر توڑ دوں گی اب جو ایسی بات کہی۔“

”شاباش تم بہت اچھی لڑکی ہو ماشاء اللہ مجھدار ہوتی جا رہی ہو خدا حافظ۔“

فون بند ہو گیا۔

”شیطان کی خالہ.....“ کوئل دھیرے دھیرے مسکرا کر ریسور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر کریڈل میں رکھ کر زور سے ہنس پڑی۔

افروز کی باتوں نے اسے بڑی حد تک پرسکون کر دیا تھا اور اس کے سینے کا بوجھ آہستہ

آہستہ سرک رہا تھا۔ پھر مطمئن ہو کر پابندی سے آفس جانے لگی لیکن یہ کیا.....؟

دھیرے دھیرے ایک عشرہ بیت گیا تھا مگر ہر طرف خاموشی تھی۔ کسی طرف سے بھی

کوئی پیش رفت نہیں ہوئی فراز نے کئی بار اسے فون کیا مگر ہاں..... ہوں کے علاوہ کوئی

بات نہیں ہوئی نہ ارم آئی نہ ماں نے اس سے کچھ کہا اس کا دل گھبرانے لگا۔

یا اللہ یہ کیسی خاموشی ہے وہ پاگل سی ہونے لگی۔

کوئی کچھ کہتا کیوں نہیں بولتا کیوں نہیں ماحول میں یہ سناٹا کیسا ہے؟

یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ اگر کوئل آمادہ نہ ہوئی تو وہ کہیں بھی چلا جائے گا پھر کبھی اپنی

صورت نہیں دکھائے گا..... اور یہ بات ماں باپ کے دل پر بجلی گرا گئی تھی۔

آگئے۔ ”نہیں فراز! اب میں تمہارے بغیر جی نہیں سکوں گی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو

وہ چاہ رہی تھی چپ کی یہ مہر ٹوٹ جائے۔ گھر میں ہر سو قہقہے گونجیں شہنائیاں بجیں وہ

دلہن بنے اس کے ماتھے پر بندیا ہاتھوں میں پھولوں کے نگن تجیں بالوں کی ہرلٹ میں

ٹیلے کی کلیاں مسکرائیں اور کوئل محافظ ہاتھ پیار سے اس کی طرف بڑھے اور وہ.....؟

اچانک تصویر فریم سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی اس کی سسکیاں نکل گئیں اور وہ اپنا

چہرہ تکیے میں گھسا کر رونے لگی۔

یارب اب تو تعبیر بخش دے

تھک گئی ہیں آنکھیں خواب بنتے بنتے

پتہ نہیں رات کس وقت فون کی گھنٹی بجی اور اس نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔
”ہیلو.....!“ وہ آہستگی سے بولی۔

”کوئل! میں ہوں تمہارا فرائز پلیز فون بند نہ کرنا۔ معلوم نہیں اتنے دن میں نے کیے اپنے اوپر جبر کیا ہے اور تمہاری فحاشی کے خیال سے بات نہیں کی تو اپنی آواز ہی سناؤ بتاؤ تم کیسی ہو؟“

اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ ابھی اس نے دعا مانگی تھی کہ یہ خاموشی ٹوٹے اب قبولیت کی گھڑی آئی تو پھر اس نے خاموشی کی اوڑھنی اوڑھ لی۔
”میں ٹھیک ہوں مگر آپ نے اس وقت فون کیوں کیا ہے؟“ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ دھیرے سے بولی۔

”خدا کا شکر ہے، یہ کفر تو ٹوٹا، تمہاری آواز سن کر تم سے بات کر کے دل کو بڑی تسکین ملتی ہے۔ ہر طرف امیدوں کے دیئے جل اٹھتے ہیں، میں کچھ کہوں جواب دو گی؟“
”جی کہئے۔“ وہی دھیمالہجہ۔

”شکریہ اب بتاؤ تمہارے دل تک میں کیسے رسائی حاصل کروں؟“
”شہر دل پر تو آپ کی پہلے ہی حکمرانی ہے۔ اب آپ کیسی رسائی چاہتے ہیں آپ؟“
مگر وہ کچھ نہیں بولی۔ خاموشی سے دھیرے دھیرے مسکراتی رہی۔

”بولو نا کوئل، آخر تم مجھ سے کب تک ناراض رہو گی؟“ کچھ دیر بعد وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

”جی نہیں فرائز میں آپ سے بالکل ناراض نہیں۔“

فون بند ہو گیا۔

کتنا بیٹھا، کتنا سلجھا ہوا لہجہ تھا، اس کے اندر شہنائیاں سی گونجنے لگیں اور کوئل فون پر ہاتھ رکھے اس حقیقت کو گھونٹ گھونٹ اپنے اندر اتار رہی تھی۔

اجنبی راہوں میں ان جانے مسافر ملتے ہیں تو پھر کبھی جدا نہیں ہوتے

پیشہ ہم پیشہ

سہ پہر

ڈھل رہی تھی۔ موسم سرما کی چھٹیوں کے دن تھے۔ ماحول میں ملگجاسا اندھیرا اچھانے لگا تھا۔ افضل احمد سیٹی پر کوئی خوبصورت سی دھن بجاتا ٹریک سوٹ میں ملبوس ہانکی ہاتھ میں لیے مسکراتا اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے کھلنڈراپن اور لا پرواہی صاف ظاہر تھی لیکن پاؤں جیسے زمین نے تھام لیے۔ اندر کا ماحول ایک دم بدلا بدل نظر آ رہا تھا۔ ہال..... کا پورا منظر اس کے سامنے تھا۔ سرخ، دبیز قالین پر سینئر نیبل کے بڑے سے پیتل کے چمکتے ہوئے گلدان میں سرخ و سفید اور زرد گلابوں کا گلدستہ ماحول میں بھینی بھینی خوشبو بکھیر رہا تھا۔ ارد گرد تجلیں صوفوں پر دادی امی حمیدہ بیگم والدہ شکیلہ خاتون، پچھو حمیرا خاتون اور ان کے برابر دونوں چھوٹی بہنیں سدرہ اور مہروز اس بیٹھی ہوئی تھیں۔ دوسری پچھو سمیرا دروازے کے پٹ سے لگی کھڑی تھیں۔ ان سے لگا ہیں ہٹ کر چچا شرفین پر چارکیں وہ بظاہر میگ کا تازہ شمارہ دیکھ رہے تھے۔ لیکن چہرہ کی سوچ میں ڈوبا ہوا لگ رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کمرے کے وسط میں قالین پر دو بڑے تھال رکھے ہوئے تھے۔ ان پر سرخ و سبز گونے ٹھٹھے کے ریشمی جھلملاتے خوان پوش پڑے تھے۔ افضل کو ساری چوڑی بھول گئی تھی۔ دفعتاً اس کی نظر لان میں ٹہلتے ہوئے مضطرب سے نواب سبطین علی کی طرف اٹھ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے بڑے غیظ و غضب میں نظر آ رہے تھے۔ اس کا ذہن گھوم گیا۔ وہ آگے بڑھا تو ایک ساتھ سب کی آنکھیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ ان کی آنکھوں میں غصہ، برہمی، شکوہ کیا کچھ نہیں تھا۔

وہ آنکھیں تیر کی مانند اس کے سینے میں گزر کر رہ گئیں۔

”یا الٰہی۔ یہ کیا اسرار ہے.....؟“ وہ چلتا ہوا سب کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔
”یہ آپ لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کیا کیا ہے میں نے؟“ خاموش
گمبیر ہوئی جا رہی تھی۔ وہ چیخ پڑا۔

”آخر آپ لوگ بولتے کیوں نہیں۔ یہ سب کیا ہے؟“ اس نے قالین پر رکھے ہوئے
جھلملاتے تھالوں کی طرف اشارہ کیا۔ تب ہی باہر سے نواب صاحب گرجتے ہوئے اندر
آ گئے اور دادی امی سے بولے۔

”حمیدہ بیگم۔ آپ انہیں بتائیے کہ ان کی منگنی کا سامان واپس آیا ہے۔ گویا ہمارے
منہ پر طمانچہ مارا گیا ہے ہماری خاندانی شرافت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ صاحبزادے کا
بتا پئے کہ فدا حسین نے بڑی شان سے منگنی کی انگوٹھی اور جوڑا واپس کرتے ہوئے گھر
افشانی فرمائی ہے کہ ہم نجیب الطرفین لوگ اپنے خاندان میں کسی مشکوک طبقہ کا اشتراک
پسند نہیں کریں گے۔ گویا انہوں نے ہمیں واقعتاً کوئی جولا ہایا پتھار کنجڑا اور قصائی سمجھا ہو
ہے اور اس کا ادراک انہیں..... بیس سال بعد اچانک ہوا ہے۔ سبحان اللہ.....!“ انہوں
نے ایک ہیجانی قہقہہ لگایا۔ وہاں موجود ہر شخص خوفزدہ لگ رہا تھا۔

افضل احمد کی سنی گم ہو گئی تھی۔ اس نے دھم سے ایک صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں
میں گھومتا ہوا سر تھام لیا۔ اس کے سامنے اپنی خوبصورت معصوم منگیتر مہوین کا چہرہ آ گیا۔
وہ نازک سی جمیلی کی شان۔ اجلے اجلے چاندنی سے بدن، تیکھ نقش و نگار کی ہر دم مسکرانے
والی مہوین..... کتنے ارمانوں سے ان کی محبتوں نے منگنی کی آغوش میں پناہ لی تھی۔ زندگی
کو مقدس رشتوں میں باندھنے کے لیے۔ وہ تو سمجھا تھا اس نے مہوین کو فتح کر لیا ہے محبت
کی معراج پالی، مگر.....؟

اس کی نظریں قالین پر رکھے ہوئے خوان پوشوں سے ڈھکے ہوئے تھالوں پر جا کر ٹک
گئیں۔ اس کی آنکھوں میں بڑی بے چارگی تھی۔

یہ اچانک ہو کیسے گیا.....؟

حمیرا پھپھو اُنھیں اور افضل کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گئیں۔ وہ اُنھ
کران کے پیچھے چلا گیا۔ کمرے میں دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے..... تب حمیرا نے کہا۔
”افضل۔ مرزا اچھا کو کسی نے بھڑکا دیا کہ ہم لوگ اپنے آبائی پیشے کے لحاظ سے
”قصاب“ ہیں۔ اور اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو کہ ایسا کیوں ہوا۔ اسی لیے انہوں نے منگنی
کا سامان واپس کر کے اس رشتے کو مسترد کر دیا۔“

”واہ۔ آئی سی.....“ افضل کھلکھلا کر ہنس پڑا اور دیر تک ہنستا رہا۔

”یار پھپھو..... اتنی دیر میں جانے کتنا خون جل گیا میرا عجیب سسپنس۔ بھرپور
مانچل تھا۔ اور آج دادو کتنے خوفناک لگ رہے تھے۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔“
وہ پھر ہنسنے لگا۔

”کیا پاگل ہو گئے ہو۔“ حمیرا نے اسے ڈانٹا۔ ”اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔“
”تو پھپھو جانی، اس میں اس قدر غصے ملامت اور افسوس کی بھی کوئی بات نہ تھی۔ بعض
وقت ہمارے بزرگ اس قدر احقانہ حرکت کر جاتے ہیں کہ سر پھوڑنے کو جی چاہنے لگتا
ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی اتنا بڑا جرم تھا کہ رشتے ناتے توڑ دیے جائیں اور دادو کو میں کیا کہوں
کہ انہوں نے سارا کچھ میرے اوپر ڈال دیا، تردید کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اگر ہم
نے ”اپنی مدد آپ کرو۔“ کے اصولوں پر عمل کیا تو قیامت کیا آ پڑی۔ اس میں اس قدر
مرعوب ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میں خود جا کر مرزا اچھا سے بات کروں گا۔“ وہ جلدبلا کر
کھڑا ہو گیا۔

حمیرا اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”نہیں افضل۔ ایسا مت کرنا۔ تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں۔ چچا نے ہمارے کردار
ہماری ذات کو ہدف بنایا۔ یا تو وہ ثبوت پیش کریں کہ جو الزام انہوں نے ہم پر لگایا ہے وہ
درست ہے یا اپنے الفاظ واپس لیں۔ اس کے لیے بات چیت کا دروازہ انہیں خود کھولنا
پڑے گا۔“

”اور منگنی کی انگوٹھی کون واپس کرنے جائے گا۔“ افضل نے اپنی انگلی میں پڑی یا
قوت کی انگوٹھی کو گھما کر پوچھا۔

”کوئی نہیں جائے گا۔ مہوین کو ہم نے مسترد نہیں کیا ہے۔ وہ کرتے ہیں تو کریں۔“

”واہ میری پھپھو۔ جی خوش کر دیا۔“ وہ بچوں کی طرح حمیرا سے لپٹ کر بولا۔

”یہ بات ہوئی نا۔ کہ ہم نے منگنی نہیں توڑی۔ کر لیں کہیں اور شادی اپنی بیٹی کی۔ پھر
یہ مشکوک بندہ.....؟“ افضل نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”ناکوں چنے نہ چبوا دوں تو اپنا نام بدل دوں گا۔“ حمیرا بھی ہنس پڑی۔

”بندہ ہی رہنا بابا۔ خدا نہ بن جانا۔“ دونوں ہنسنے لگے۔ گھر کی فضا بدستور خراب تھی۔
سب روٹھے روٹھے رنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ مہوین سے سب لوگوں کی اس قدر وابستگی تھی
کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس گھر کے لیے شجر ممنوعہ بن جائے گی۔ افضل پر بھی
آج کل سنجیدگی کا دورہ پڑا تھا۔ حسب معمول کالج سے آتا تو ہاکی کھیلنے نکل جاتا۔ اس کے

والد تحسین علی بہت خاموش طبع تھے۔ کسی کے معاملے میں دخل نہ دیتے۔ دفتر سے آتے اور کمرے میں چلے جاتے۔ گھر کا پورا نظام نواب سبطین علی.... کی بڑی بہوشکیلہ خاتون نے سنبھالا ہوا تھا۔

کچھ دنوں بعد مرزا فدا حسین کے وکیل نقوی صاحب سبطین علی کے پاس آئے اور مطالبہ کیا کہ مرزا صاحب نے فرمایا ہے کہ منگنی کی انگوٹھی جو افضال میاں کو چڑھائی گئی تھی واپس کر دیں۔ نواب صاحب تو جیسے بھرے بیٹھے تھے ایک دم پھٹ پڑے۔ بولے.....
 ”کیسی انگوٹھی؟ میں نے کب منگنی توڑنے کا اعلان کیا ہے۔ وہ تو رہے گی۔ یہ کوئی گڑیا گڈے کا بیابہ تو نہیں۔ یہ مردوں کی زبان ہے۔ لیکن وکیل صاحب میں ان کے دماغ کا کیزا نکال کر رہوں گا۔ آخر انہیں میرے پوتے کو قصائی کی اولاد کہنے کی جرات کیسے ہوئی۔ میں تو عدالت میں ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔ انہوں نے سمجھا کیا ہے۔ وہ اتنی آسانی سے ہمارے بے داغ دامن پر کیچڑ اچھال کر نکل جائیں گے۔ ناممکن.... انہوں نے ہمیں مشکوک طبقے کا آدمی کہہ کر ہماری توہین کی ہے اس کا انہیں جواب دینا پڑے گا۔“

نواب صاحب کی آواز میں بڑی گھن گرج تھی۔ وکیل صاحب ان کا یہ روپ دیکھ کر پریشان ہو گئے اور انہیں ٹھنڈا کرنے کے لیے نہایت لجاجت سے بولے۔
 ”نواب صاحب آپ کا غصہ اپنی جگہ درست ہے۔ یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے آپ مرزا صاحب سے ایک بار بالمشافہ گفتگو کر لیں۔ بات صاف ہو جائے گی۔“

”ارے میاں گولی مارو۔ غلط فہمی کیسی؟“ ان کا پارہ ایک دم پڑھ گیا۔
 ”انہوں نے میرے بیٹے کو قصائی زادہ کہہ کر ہماری سراسر توہین کی ہے۔ اور آپ فرماتے ہیں کہ غلط فہمی ہو گئی.... منگنی کا سامان نادانستہ تو نہیں آ گیا از خود۔ واللہ کیا سادگی ہے۔“

”نواب صاحب۔ آخر بات کر لینے میں کیا حرج ہے“ ان کا لہجہ بدستور نرم تھا۔
 ”وکیل صاحب۔ بات کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر وہ ہم سے رشتہ نہیں چاہتے تو ہمیں بھی شوق نہیں ہے۔ میں ان کی انگوٹھی واپس کیے دیتا ہوں۔“ وہ غصے اور تیزی سے اٹھے۔
 وکیل صاحب نے بات بگڑتے دیکھی تو وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر لپکے اور جا کر ان کے سامنے کھڑے ہو کر بولے۔

”نواب صاحب پلیز۔ میری بات تو سنیں اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“ وہ ان کا ہاتھ پکڑ

کر صوفے تک لائے اور دوستانہ انداز میں کہا۔

”پلیز بیٹھ جائیے۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔ مگر میری صرف ایک بات مان لیجیے۔ مرزا صاحب سے ایک بار مل لیں۔ اس میں آپ کی عزت افزائی ہوگی۔ رہ گئی انگوٹھی تو وہ جیسے آپ کے پاس رہی دیے ان کے پاس۔ اگر بچوں کی خوشی کے لیے ہم اپنے رویے کو تھوڑا سا نرم کر لیں تو یہ بات نہایت مناسب رہے گی۔“

”یہ بات آپ فدا حسین سے بھی کہہ سکتے تھے؟“ نواب صاحب کچھ ٹھنڈے پڑے۔
 وکیل صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے کہا تھا“ مگر آپ جانیے وہ لڑکی والے ہیں ذرا جذباتی انداز میں سوچتے ہیں۔“ اتنے میں نوکر نے چائے کا سامان میز پر لگا دیا۔ دونوں چائے سے شغل کرتے رہے فضا معمول پر آ گئی تھی چائے ختم ہوئی تو نقوی صاحب نے جانے کی اجازت چاہی اور مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”پھر نواب صاحب۔ کس دن آپ تشریف لارہے ہیں۔؟“

”ٹھیک ہے میں سوچ کر جواب دوں گا۔“

”تو کیا پھر اس خاکسار کو زحمت کرنا پڑے گی۔؟“ وہ مسکرائے۔

”نہیں۔ میں فون کر دوں گا۔“

”شکریہ....“ کہہ کر وکیل صاحب چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

مرزا فدا حسین صاحب نواب سبطین علی کے قدر دانوں میں تھے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ قدر افزائی دوستی میں بدل گئی۔ ایک بار وہ دوا کے سلسلے میں میڈیکل اسٹور آئے تھے جہاں ایک ملازم کے ساتھ نواب صاحب اسٹور چلاتے تھے وہیں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی پھر وہ آنے لگے۔ گپ شپ ہوتی رہی۔

دراصل نواب صاحب۔ صرف نام کے نواب نہیں تھے ان کے بڑے دادا مرحوم ان کے باپ دادا جدی پشتی رئیس تھے۔ انڈیا میں ان کی بہت بڑی جاگیر تھی جو ان کی آباؤ اجداد کو انگریزوں کی طرف سے ملی تھی۔ اور نسل در نسل انہیں منتقل ہوتی رہی تھی۔ ان کے دادا۔ چچا والد۔ بھائی بذات خود ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے اور گورنمنٹ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے انہوں نے اپنی جاگیر کا کام اپنے پڑھے لکھے باشعور اور غریب رشتے داروں کے سپرد کر دیا تھا۔ ان کے دادا نواب عرفان علی.... والد فرقان علی اپنی نگرانی میں جائیداد باغ و زمینوں کی سالانہ آمدنی کو گاؤں کی ترقی اور بستی والوں کی تلاش و بہبود پر خرچ

کرتے تھے۔ ان کے گاؤں تعلیم اور زندگی کی سہولتوں سے مالا مال تھے، انہوں نے زمینوں کا ایک بیسہ بھی اپنے خاندان پر خرچ نہیں کیا۔

اور ان کی اس کارکردگی سے خوش ہو کر انگریز سرکار انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور ان کے ساتھ گاؤں کی ترقی میں بڑھ کر حصہ لیتی تھی، اسکول، اسپتال، فیکٹریاں، سڑکیں تعمیر کروائیں، کنویں کھدوائے، تالاب بنوائے، موسیقی خانے قائم کیے اس کے باوجود انہوں نے کبھی اپنے جاہ و چشم پر فخر نہیں کیا، ان کا نظریہ تھا یہ دولت، تمام سہولتیں غریبوں اور ضرورت مندوں کو ملنا چاہیے انہوں نے یہی نظریہ اپنی اگلی نسل کو دیا۔ انہیں اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ محنت اور اکل حلال کی روٹی تلقین کی ایسا بھی ہوا کہ وہ کبھی کبھی گدالیں پھاڑے ہاتھوں میں اٹھائے اپنے مزار کے ساتھ کام کرتے بھی نظر آئے۔ اولادوں کو اس تجربے سے بھی گذار کر دیکھو مزدور کے ساتھ محنت کر کے کتنا لطف آتا ہے۔ بے چارے گاؤں والے ان کے پاؤں پر لگتے ہاتھ جوڑتے رہ جاتے کہ مائی باپ، حکم کریں، ہم خادم ہیں ہر خدمت بجالائیں مگر کھیتوں، نہروں میں کدالیں پھاڑے چلا کر ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ نواب فرقان قبا لگا کر بولتے۔

”یار۔ آج ہمیں بھی تو اس لذت سے آشنا ہونے دو کہ جب سرکار سپینہ ایڑیوں پر بے تو محنت کرنے والے مزدوروں کو کیسا سرور ملتا ہے۔ جب وہ اپنی چلی ہوئی فصل آنکھوں کے سامنے لہلہاتے دیکھتا ہے تو اسے گویا دونوں جہاں مل جاتے ہیں، کیوں بہ تھوڑی سی خوشی سے محروم کرنا چاہتے ہو.....؟“ اور جب وہ فارغ ہو کر کدالوں پھاڑو کے ساتھ تہ بند چڑھائے بنیان پہنچے۔ سر پر رومال باندھے کیچڑ میں لت پت حویلی بنا تو گھر والوں کی چیخیں نکل جاتیں اور..... لڑکیاں بھاگ کر کیمروں میں اٹھلا تیں اور انہیں کہتیں ”پلیز بابا جان، ذرا یونہی کھڑے رہیں۔ تصویر اتار لوں۔“

پھر کھٹا کھٹ تصوریں اترنے لگتیں، خواتین منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنا شروع کر دیتیں بابا تماشا لگ جاتا اور وہ لوگ ہبہرا کر ہاتھ روم میں گھس جاتے۔ وہ لوگ ایسے جاگیردار تھے کھلا کر کھاتے تھے اور پہنا کر پہنتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بھوکے پیٹ، ننگے بدن اور ٹھنڈے چولہے انہیں دعائیں دیتے تھے ہر لمحہ ان کی سلامتی اور خوشی کے خواہاں تھے، نوابی بھی اُٹھان سے کی کہ نوابوں کو سپینہ آ گیا۔ پھر ملک تقسیم ہوا، اس کے ساتھ ہی لوگوں کے دامن و جان، خون اور وجود بھی تقسیم ہو گئے۔ ایسے کہ ان کی پہچان بھی مٹ گئی، کیسی جاگیریں کون جاگیردار۔

کہاں کے گاؤں..... گرامیں.....

کیسے کارخانے..... فیکٹریاں.....

سب ہی ختم ہو گئیں، نواب سبطین علی کا پورا خاندان، والد فرقان علی، دادا عرفان علی چاچا اور ان کی اولادیں، سب آزادی پر قربان ہو گئے۔ صرف سبطین علی، اپنی بیوی حمیدہ بیگم بیٹے شرفین، اکرم اور تحسین علی بیٹی سمیرا حمیرا کے ساتھ جانے کس طرح کراچی آ گئے ان کے ساتھ کوئی دولت، سونا چاندی نہیں تھی۔ صرف کچھ جائیداد کے کاغذات اور اپنے پرکھوں کی چند تصویریں پورٹریٹ، کلبجے سے لگا کر لے آئے تھے وہ ان کے اچھے دنوں کی نشانیاں تھیں، ان کا شاندار ماضی تھا۔ بعد میں ان کے ایک چچا اور ماموں بھی لٹے پٹے پہنچ گئے..... جیسے تیسے سر چھپانے کو جگہ ملی تھی تو انہوں نے جائیداد کے جو کاغذات ہاتھ لگے وہ لے آئے اب وہی..... کلیم کے لیے داخل کرادیے۔ اس کے عوض انہیں دو منزلہ مکان اور ایک میڈیکل اسٹور مل گیا۔ انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا، یہ اثاثہ ان کے اہل خاندان کے لیے کافی تھا، چچا اور ماموں لاہور چلے گئے تھے، وہاں انہوں نے زرعی فارم قائم کر لیا تھا۔ کراچی میں انہوں نے ایک شریف تعلیم یافتہ خاندان میں اپنے بیٹے تحسین علی کی شادی کر دی، شکیلہ خاتون بہت اچھی بیوی اور بہو ثابت ہوئیں تحسین نے انجینئرنگ کی تھی۔ اب وہ سروس کر رہا تھا..... حمیرا کی شادی بھی کر دی تھی مگر اس کا شوہر انگریز چلا گیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے وہاں شادی کر لی۔ بیٹی کا غم انہوں نے قہقہوں میں اڑا دیا تھا مگر حمیدہ بیگم بیٹی کی طرف سے دکھی رہتی تھی۔

اب ماشاء اللہ تحسین کا بیٹا بھی جوان تھا دوسرا بیٹا بلال تھا، تین بیٹیاں تحسین کی سدرہ، مہروز اور گڑیا، گھر میں ہر دم ہنگامے اور قہقہوں کے جلت رنگ بجا کرتے تھے، نواب سبطین علی اپنی اس چھوٹی سی جنت میں بہت خوش تھے۔ جس زمانے میں ان کا کلیم منظور ہوا انہی دنوں مرزا اندا حسین بھی کلیم کے کاغذات کی فائل بغل میں دبائے برے حالوں میں پھٹی ہوئی چپل سناکتے عدالت کے چکر لگاتے نظر آتے تھے تب ہی ان کے وکیل سے معلوم ہوا عدالت ان کے کلیم کو منظور نہیں کر رہی کیونکہ انہوں نے جائیداد کافی شوکی ہے جبکہ کاغذات پورے نہیں ہیں۔ وکیل ان سے سخت بیزار تھا، اس نے بتایا مرزا بڑا لالچی اور انتہائی چالاک ہے۔ کتنے ہی جعلی کاغذات بنا چکا ہے۔ میں نے زبردستی انہیں تلف کر دیے ہیں اور کلیم ان ہی کا داخل کرایا جو جائز کاغذات ہیں، اس پر فردا حسین نے بڑا شور مچایا، میں نے کہہ دیا ہے کہ میں آپ کے کیس سے دستبردار ہو جاؤں گا، ورنہ میرے مشورے پر عمل کریں، بولے۔

”میاں اس طرح ہمارے ہاتھ کیا آئے گا؟“

وکیل صاحب نے کہا۔ ”جو کچھ مل رہا ہے خدا کا شکر ادا کریں پوری کے پیچھے جاگیر کے تو آج ہی چلی جائے گی۔“

وہ چلے گئے۔ مرزا صاحب جانے کدھر سے نکل آئے نواب صاحب سے پوچھنے لگے۔ ”کیوں میاں یہ وکیل کیا بکواس کر رہا تھا؟“ انہوں نے بڑی بے تکلفی اور تیزی سے پوچھا۔

نواب صاحب ہنس دیے اس سے پہلے وہ نہیں ملے تھے ان سے انہوں نے جو کچھ وکیل نے کہا تھا من و عن سنا دیا۔ مرزا صاحب کھسیا کر چلے گئے رکے نہیں اس کے بعد ایک دن میڈیکل اسٹور آگئے۔ انہیں درد کی گولیوں کی ضرورت تھی وہاں انہوں نے سبٹین علی کو بیٹھے دیکھا۔ پہچان گئے۔ اور بڑی گرم جوشی سے سلام کر کے ہاتھ ملایا پوچھا۔ باتیں ہوتی رہیں ان کا کلیم منظور ہو گیا تھا۔ مگر کچھ زیادہ نہیں ملا تھا۔ ایک مکان ایک دکان ان کے حصے میں بھی آئی تھی پھر دوبارہ آئے مگر اب ان کا حلیہ پہلے سے بہتر تھا۔ معلوم ہوا کہ کچھ مالی مسئلہ درپیش تھا۔ جواب دور ہو گیا۔ حالات پہلے سے بہتر بلکہ اچھے ہو گئے تھے۔

پھر ایک ماہ تک ان کی صورت نظر نہ آئی پھر آئے تو دعوت دے گئے اور گھر کا پتا پھر آنے پر بے حد اصرار کیا تھا آخر نواب صاحب کو جانا پڑا۔ حمیدہ بیگم اور حمیرا کو لے کر جب وہ ان کے بنگلے پر پہنچے تو وہ منتظر تھے اندر لے گئے۔ بنگلہ کشادہ کشادہ چار کمروں پر مشتمل تھا۔ باہر لان اور ٹیرس بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا کمروں کی سجاوٹ باذوق ہاتھوں کی تھی۔ اور وہ باذوق ہاتھ ان کی پڑھی لکھی خوبصورت بیوی نیک خاتون کے تھے۔

مرزا صاحب تو کافی عمر رسیدہ تھے نواب صاحب سے شاید دو تین سال چھوٹے رہے ہوں سانولی رنگت دبلے پتلے درمیانہ قد۔ بسیار گوگر آدمی بذلہ سنج تھے۔

معلوم یہ ہوا کہ مرزا صاحب کی پہلی بیوی سے ان کی اولاد نہیں ہوئی تو انہوں نے اولاد کی خاطر دوسری شادی کی۔ مگر پہلی بیوی لڑ بھگڑ کر اپنے میکے چلی گئی پھر نہیں آئی اور طلاق لے لی۔ نیک خاتون سے ان کے دو بچے تھے..... ایک ناصر دوسری بیٹی مہوین دونوں بچوں نے ماں کا رنگ روپ اور ذوق سلیم لیا تھا۔ حمیدہ بیگم اور حمیرہ سے مل کر نیک خاتون بہت خوش ہوئیں۔ ذرا دیر میں ساری اجنبیت دور ہو گئی ادھر مردانے میں بھی مرزا فدا حسین اور نواب سبٹین علی کے فلک شگاف تہقہ سنے جا رہے تھے مجموعی طور پر فدا حسین سے زیادہ ان کی گھر والی ان کا جنت نشاں گھر حمیدہ بیگم کو بہت پسند آیا۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ دونوں خاندان حیرت انگیز طور پر قریب آ گئے۔ نوکر کے ہمراہ اکثر نیک خاتون حمیرا کے اصرار پر مہوین کو بھیج دیا کرتی تھیں۔ وہ بھی سی پری مہروز اور افضال کے ساتھ بڑے سے لان میں تیلیوں کے پیچھے بھاگتی اور تہقہ لگاتی پھرتی تھی پھر بچے جوان ہو گئے۔ اب وہ اسکول سے کالجوں میں پہنچ گئے۔

اور پھر اس محبت اور دوستی کو رشتہ داری میں بدلنے کے لیے دونوں گھرانوں کی مشترکہ کوششوں سے مہوین اور افضال کی منگنی کر دی گئی۔ اس میں دونوں خاندانوں کی خوشیوں کے علاوہ مہوین اور افضال کی آرزوئیں بھی شامل تھیں ان کے شفاف جذباتوں کی مہک بھی تھی ان ہی دنوں نواب صاحب نے اپنی نئی کوشش میں تعمیر کروائی تھی اور اپنا کپری والا مکان بیچ دیا تھا۔ ادھر فدا حسین نے بھی ایک خوبصورت لکڑی اپارٹمنٹ کلفٹن میں خرید لیا۔ پھر نئے گھروں کی خوشی میں کچھ عرصے دونوں طرف دعوتوں کا طویل سلسلہ چل پڑا۔ چونکہ نئی جگہ نئے لوگ تھے اس لیے انہیں قریب آنے میں دیر لگنا فطری عمل تھا اور وہاں اتنی سہولتیں بھی نہیں تھیں.....! اسپتال مارکیٹ اسکول کالج جانے میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ سابقہ مکان اور محلے جیسی کوئی آسانی نہ تھی۔ کہ گھر سے نکلے اور بازار پہنچ گئے۔ انہوں نے پہلی عید گلشن میں کی ایک بار پھر عزیزوں دوستوں اور مبارکباد دینے والوں کا اجتماع ہوا۔ کوٹھی کے بڑے سے پھولوں بھرے لان میں مہک پھیلی ہوئی تھی۔ مرزا فدا حسین کی فیملی پیش پیش تھی۔ مہوین کو سدرہ اور مہروز بے تحاشا تہقہبوں کے ترنم میں چھیڑ رہی تھیں۔ اسے ستار ہی تھیں۔

”ہو..... مایوں کب بیٹھو گی پینڈیاں کب کھلاؤ گی۔ رت جگا کب ہوگا...؟“ مہوین شرمائی۔ اتنے میں افضال اندر آ گیا۔ وہ سفید بھک کڑھے ہوئے آڑے گلے کا کرتا... تنگ موری کا پاجامہ اور سلیم شاہی پہنے ہوئے واقعی کوئی نواب زادہ لگ رہا تھا۔ سدرہ اور تمام لڑکیوں نے شور مچا دیا۔

”نوشہ میاں آ گئے۔“

”نوشہ میاں آ گئے۔“

مہوین اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور سب کا کھلتا تہقہ بلند ہوا۔ تو افضال کو بھی کمرے سے جانے میں ہی عافیت محسوس ہوئی۔ اس کے بعد عید الاضحیٰ کا مرحلہ پیش آ گیا۔ اور سب کو قربانی کے لیے قصاب کی ضرورت پڑ گئی۔ اُس کی تلاش ہوئی تو دور۔ دور کہیں اس کا پتہ نہ تھا۔ محلے کا ہر شخص سرگرداں تھا۔ مگر کامیابی کی اُمید نظر نہ آ رہی تھی۔ حمیدہ بیگم سخت سراسیمہ تھیں کہ آخر قربانی کیسے ہوگی۔ قصائی کہاں سے آئے گا۔ بار بار

بیٹیوں اور نواب صاحب سے پوچھ رہی تھیں کہ آخر کیا ہوگا؟
نواب صاحب نے مسکرا کر کہا۔

”ارے بیگم۔ نئی جگہ نئے لوگ۔ نئی آبادی ہے۔ اب یہاں شہر جیسی سہولت تو نہیں ملے گی۔ دیکھئے کچھ لوگوں کو بھیجا ہے۔ اللہ کوئی سبیل نکال دے گا۔“
”یار۔ یہ قر بانی کا مسئلہ تو عقدہ لاتعل بن گیا ہے۔ لگتا ہے پرانے محلے سے کسی کو پڑ کر لانا پڑے گا۔“ اکرم اور شرفین آپس میں مشورہ کر رہے تھے۔ اتنے میں باہر شور ہوا اور اکرام اندر آتے ہوئے ٹرے جوش میں بولے۔

”لیجئے قر بانی کا مسئلہ حل ہو گیا۔“ سب لوگ قصائی کو دیکھنے ایسے بھاگے جیسے بے بارات دیکھنے بھاگتے ہیں اور واقعی وہاں یہی صورت حال تھی۔ قصاب صاحب انتہائی ویل ڈریس اور پڑھے لکھے معلوم ہو رہے تھے۔ بڑی شان بے نیازی سے سوزوکی سے ٹیک لگائے اپنے چار ہیلپروں کے ساتھ کھڑے مجمع کا جائزہ لے رہے تھے۔ جو انہیں گھیرے ہوئے اپنی اپنی سٹار ہاتھا۔ ایک انارسو بیمار والی بات تھی۔ ہر شخص یہی چاہ رہا تھا کہ پہلے اس کی کبھی بولی بنائی جائے۔ اور قصاب صاحب بڑے تفاخر سے فرما رہے تھے۔
”آپ حضرات فیصلہ کر لیں کہ پہلے کس کے گلے پر چھری پھیری جائے۔ کیونکہ ہمارے پاس وقت کم ہے اور قر بانی دینے والے زیادہ اور جناب یہ بھی سن لیجئے کہ ہم ذبح کر کے آپ کی کھال کھینچیں گے اور کبھی نکال کر آپ کو دے دیں گے باقی ہڈی بولی آپ خود بنائیں گے۔ اس کی ذمہ داری ہماری نہیں۔ ہمارا حق خدمت فی بکرا ذنبہ تین سو روپے ہوگا اور اس کی کھال بری پائے ہمارے۔ اگر منظور ہو تو پھر ہم ”اللہ اکبر کرتے ہیں۔“

کچھ لوگوں کو قصاب کا یہ تحمانہ انداز پسند نہ آیا۔ معاوضہ جو تھا وہ اپنی جگہ مگر کھال بھی جاتی نظر آرہی تھی۔ اور بری پائے کا مزہ بھی۔ لیکن ”قہر درویش بر جان درویش“ کے بمصداق انہیں زہر کا یہ گھونٹ حلق سے اتارنا ہی پڑا۔ پھر تسلی سنیائیں قافیں اور تھیلے لیے لوگ دوڑ پڑے۔ ایک چبوترے پر عارضی مذبح خانہ بن گیا۔ سب اپنے بکروں، دنبوں کی رسی پکڑے لائن میں لگ گئے۔ قصاب صاحب اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھ میکانیکی انداز میں تیزی سے چلنے لگے۔ کسی کی کھال کھینچی۔ کسی کی کبھی نکالی اور برتنوں میں ڈالتے گئے۔ شرفین اور اکرام بھی اپنے دو بکروں کی کبھی لے کر اندر آ گئے۔ اور حمیدہ بیگم سے بولے۔

”اماں جان۔ بڑی بھوک لگی ہے.... روزہ طویل ہو گیا ہے بس اب پو لہے پڑ

چڑھا دیجئے اسے۔“

”اوئی اللہ....“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر بولیں۔

”لو کہ باؤلا ہوا ہے کیا اسی طرح چڑھا دوں اس کی بوٹیاں تو ہوئی نہیں۔؟“

شرقین ہنس کر بولے۔

”اب بوٹیاں آپ کاٹ لیں۔ قصاب تو ہماری کھال کھینچ کر کبھی نکال کر دے گیا۔

باقی کاٹ چھانٹ آپ کر لیں۔“ حمیدہ بیگم کو بھی ہنسی آ گئی۔

”اے نوج.... وہ قصاب تھا کہ موا تما شہ۔ کھال کھینچی، کبھی نکالی اور چلتا بنا۔“ ان کی

ہنسی قہقہے میں بدل گئی۔ لڑکیاں بھی آ گئیں۔ حمیرا اور سمیرا بھی تبصرے میں شریک ہو گئیں۔

مسکرا کر بولیں۔

”یہ تو واقعی مسئلہ ہو گیا۔“ اتنے میں نوکر سبجانی اور فیضی دونوں بکروں کا ڈھانچہ پکڑے

اندر آ گئے۔ حمیرا اور سمیرا چیخ مار کر دور ہٹ گئیں۔ اور خوفزدہ نظروں سے انہیں دیکھنے

لگیں۔ افضل نے ہنسا شروع کر دیا۔ اور حمیرا کی طرف دیکھ کر بولا۔

”ہائے پھپھو۔ جب یہ بے چارے حیات تھے اللہ انہیں بخت نصیب کرے تو ان

کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے جاتے تھے۔ انہیں ڈولہا بنایا جاتا تھا۔ دودھ جلیبی

کھلائی جاتی تھی۔ اور اب یہ عالم ہے کہ انہیں دیکھ کر چیخیں ماری جا رہی ہیں۔ سچ ہے

بڑے وقت کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔“

شکیلہ خاتون اور حمیدہ بیگم کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور پھر وہ نوکروں سے بولیں۔

”چلو فیضی سبجانی۔ پہلے کبھی کاٹو پھر گوشت بنانا۔“

خیر جیسے تیسے کبھی تیار ہوئی اور ڈونگوں میں میز پر پہنچ گئی.... شکیلہ خاتون گرم گرم پراٹھے

پکار کر بھیجتی جا رہی تھیں اور سارے لوگ میز کے گرد بیٹھے کھاتے ہوئے تبصرے کر رہے

تھے۔ ایک ایک بوٹی کا وزن کر رہے تھے۔ کوئی چھٹانک بھر کی تھی۔ کوئی تولہ بھر کی۔ کچھ

پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ پھیپھڑاں... ہے۔ کبھی کس طرف اور دل کہاں پھڑک رہا ہے ہنتے

قہقہے لگاتے کھانا ختم ہوا۔ صحن میں ایک طرف بڑے سے تخت پر تھالوں اور سینیوں میں

گوشت کی بوٹیاں کٹی رکھی تھیں۔ حمیدہ بیگم نے کہا۔

”ذہن گوشت کے حصے بنالو فورے بریانی کا الگ نکال لو۔ چائیں علیحدہ کر کے ان

میں گلاوٹ کا مصالحہ لگا کر رکھ دینا۔ شام کو افضل کی سسرال والے آئیں گے بھائی فدا

حسین کو بھی ہوئی چائیں بہت پسند ہیں نا۔“

”جی اچھا۔“ شکیلہ خاتون نے لڑکیوں کو بھی ساتھ لگا لیا۔ اب جو گوشت میں ہاتھ لگایا

تو حیران رہ گئیں۔

”اماں جان۔“ انہوں نے گہرا کراس کولہ واڑ دی۔

”دیکھئے گوشت کا تو ستیا ناس مار دیا ان منجھوں نے چانپیں، رانیں۔ گردن سب گچھو مر بنادیا۔ کوئی بوٹی تو ڈھنگ کی نہیں۔ کیا نکالوں نہ چانپوں کا پتہ نہ ران کی بوٹیوں کا۔“ وہ رو ہانسی ہو گئیں۔ سمیر اور حمیرا چلا پڑیں۔

”ارے بھائی جان، بوٹیاں تو دیکھئے، کیسی آرتھک کاٹی گئی ہیں، کوئی لمبی، کوئی چوکور، نوکیلی، ٹکنوں، گول، چپٹی ہائے ہم نے تو تکتوں کا مصالحہ بھی تیار کر لیا تھا۔ مہمانوں کو کیا کھلائیں گے۔ گوگی تو میری ہڈکا بولی کر ڈالے گی....“ سمیرا نے منہ بنا کر کہا۔

”صبر کرو بے بی۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ اکرام نے مسکرا کر کہا۔

”ہائے اکرام بھائی گوشت ملاحظہ ہو، کسی شریف آدمی کے سامنے رکھنے والا ہے۔“ اور گوشت کو دیکھ کر اکرام کی ہنسی چھوٹ گئی۔ حمیدہ بیگم کو غصہ آ گیا اور دونوں ملازموں کی طلبی ہوئی۔ وہ سر جھکائے کھڑے رہے۔ تب افضل نے پوچھا....

”کیوں سبانی... اس سے پہلے بھی تم نے کبھی بکرے کی بوٹیاں بنائی تھیں۔؟“ سبانی نے فیضی کی طرف دیکھا اور دانت نکال دیئے پھر بولا۔

”نہیں چھوٹے صاحب قسم اللہ پاک کی۔ بیگم صاحب کا حکم تھا اس لیے جیسی بنیں بوٹیاں بنالیں.... ورنہ ہمارے باپ دادا نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔“

سمیرا اور حمیرا ہنس پڑیں، افضل نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔

”یاری فیضی۔ تمہارا کیا خیال ہے جو کام باپ دادا نہ کریں تو وہ کام اولاد کو بھی نہ کرنا چاہیے۔ بھئی تمہارے باپ دادا نے کبھی وی سی آر ٹی وی نہیں دیکھا، پھر تم کیوں دیکھتے ہو ہر زمانے میں زندگی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، انہیں پورا کیا جاتا ہے آج تمہیں بوٹیاں بنانی پڑیں۔ ہو سکتا ہے کل تمہیں بکرے کے گلے پر چھری چلائی پڑیں۔ اُس کی کھال اتار لی پڑے تو؟“

سب لوگ اُن کی باتوں پر ہنس پڑے۔ سبانی اور فیضی خاموش ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اب شرفین نے کہا۔

”میرا خیال ہے سبانی، یہ کام ہے بڑا منافع بخش۔ اب دیکھو ناسوز وکی والا اپنڈیٹ قصاب چند گھنٹوں میں ہزاروں جیب میں ڈال کر چلا گیا۔“

”نُصُور۔ اگر میں نے ایسا کیا تو میرا باپ مجھے گھر سے نکال دے گا۔“ سبانی نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور گڑ گڑا کر بولا۔

”وہ دیکھو....؟“ افضل نے حیرت سے پوچھا۔

”صاحب جی.... وہ مجھے قصابی کی دوکان پر بٹھا دے گا۔ کہ کر یہی کام تیری اوقات یہی“

”تو اس میں بُرائی کیا ہے، پیشہ حبیب اللہ۔ اگر تمہارا باپ ایسا کرے گا تو بڑی دُور اندیشی کا ثبوت دے گا۔ بھئی میں تو اپنے متعلق سوچ رہا ہوں کہ پارٹ ٹائم جاب میں یہی کام کیوں نہ کر لوں....؟“ وہ مسکرایا۔ نواب بسطین علی بھی وہاں آ گئے۔ کچھ الفاظ اُن کے کان میں بھی پڑ گئے تھے بولے۔ ”کیوں میاں... کون سا کام کرنا چاہتے ہو پارٹ ٹائم میں؟“ انہیں آتا دیکھ کر لڑکیاں اور دونوں نوکر روفو چکر ہو گئے... اکرام اور افضل نے گہرا کر ایک دوسرے کو دیکھا، پھر شرفین نے بات سنبھالی....

”بابا جان.... وہ خالی وقت میں ہم کوئی کام سیکھنے کے لیے سوچ رہے تھے۔“

”بڑا نیک خیال ہے۔“ نواب صاحب مسکرائے۔

”اگر کوئی ہنر سیکھ لو تو تمہارے کام آ سکتا ہے، کوئی بھی ٹیکنیکل کام.... ریڈیو ٹی وی... فرق وغیرہ کا.... یا کوئی بھی.... فیزیکل کورس....؟“

”جی.... جی ہاں....“ افضل نے تائید میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”دادو۔ آپ نے صحیح مشورہ دیا.... ہم لوگ اس موضوع پر بات کر رہے تھے....“

پھر وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے اور انہوں نے اطمینان کی سانس لی.... آج ڈانٹ پڑتے پڑتے رہ گئی تھی

ہال.... میں قالمین پر دادی امی کے پاس سدرہ.... گڑیا اور مہروز بیٹی پاندان کی تھالی سے چھالیہ چُن چُن کر کھا رہی تھیں.... سمیرا صوفے پر خاموش بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ پان بناتے ہوئے حمیدہ بیگم نے چونک کر بیٹی کو دیکھا۔

”کیا بات ہے سنی چُپ کیوں ہو....؟“

وہ اُٹھ کر ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی.... اور بولی.... ”اماں جان اب کی قربانی میں کوئی مزہ نہیں آیا.... نہ چانپوں کا.... نہ روسٹ کا، نہ تنکے کبابوں کا اور سری پائے قصاب کو پیارے ہو گئے۔“

”ارے تو اس میں اتنا افسوس کیوں کر رہی ہو تنکے کبابوں کا جی چاہے تو بازار سے منگوالو۔ نہیں تو گھر میں بنالو۔ اتنی سی بات پر دل کیوں میلا کر رہی ہو۔“ وہ مسکرائیں....

”ارے نہیں دادی امی۔ پھپھو ٹھیک کہتی ہیں۔“ سدرہ بولی۔ ”اپنے پُرانے والے گھر میں بقر عید میں کیسی رونق لگتی تھی۔ تنکے اور بھنی ہوئی چانپوں کی خوشبو سے گھر مہک جاتا تھا

اور چاچو کے دوست، پھپھو کی سہیلیاں، قہقہوں، لطیفوں اور چٹخاروں سے ماحول کا حُسن بڑھ جاتا... تینوں دن میلہ سا لگا رہتا۔ ہر دن دو بکرے، کبھی گائے، پھر ڈھیر سارے مہمان تکتوں پر مصالحہ لگا ہوتا... انیکٹھیوں میں کونکے دیک رہے ہوتے... ان پر تکتے سینوں میں پرو کر بھونے جاتے، وہ چھینا جھٹی، ہلہ گلہ چٹا کر قربانی کا لطف دو بالا ہو جاتا۔ جو مزہ قربانی کے گوشت میں چھین چھٹ کر کھانے میں آتا وہ بازار سے منگوا کر کھانے میں کہاں؟“

حمیدہ بیگم نے قہقہہ لگا کر کہا....

”ہاں یہ تو ہے مگر بیٹی قربانی ایک فریضہ، ایک سنت ہے ابراہیم علیہ السلام کی اسے بہر صورت ادا کرنا ہوتا ہے اور نئی جگہ میں پہلے مشکلات تو اٹھانا پڑتی ہیں.... رفتہ رفتہ جان پہچان بڑھے گی.... تو آسانیاں خود بخود پیدا ہو جائیں گی۔ اب تمہارے لیے باوا جان کوئی قصاب تو امپورٹ کرنے سے رہے۔“ وہ مسکرائیں.... گڑیا نے چھالیہ کا پھنکار مارا تو انہوں نے کہا....

”اے بی بس بھی کرو.... لو یہ پان اپنی اتی کو دے آؤ۔“ انہوں نے پانوں کی کشتی اٹھا کر گڑیا کو تنہادی۔ اس طرح حمیدہ بیگم نے اُسے ٹالا۔ وہ چھالیہ پان کی دشمن تھی۔ اور دادی کی لاڈلی بھی.... لڑکیوں کی باتوں نے انہیں پریشان کر دیا تھا.... اور حقیقت یہ تھی کہ انہیں بھی افراتفری میں ادا کی ہوئی یہ قربانی اچھی نہ لگی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اپنے پرانے والے محلے سے اب کی وہ کریم کو بلوایں گی.... کریم بخش قصاب سے اُن کے گھرانے کا پرانا لین دین تھا... اور ہمیشہ اُس کی دکان سے گوشت پسندے اپنی مرضی سے آ جاتے تھے.... قربانی کے زمانے میں بھی کوئی دُشواری نہ ہوتی پھر اُسی دن رات میں شرفین... اکرام اور افضل نے لڑکیوں کو خوشخبری سنائی کہ آئندہ عید الاضحیٰ پر انشاء اللہ آپ لوگوں کو تکتے بھی پسند کے کھانے کو ملیں گے۔ چائیں بھی خوبصورت بنی ہوئی۔ بوٹیاں بھی ہم اور سلیقے سے کٹی ہوئی ملیں گی۔ اور ان بھی روسٹ کرنے کے لیے۔ غرضیکہ اب کی جیسی کوئی بد مزگی نہیں ہوگی، ہم نے ایک ماہر ”قصاب“ کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔

سہرہ خوشی سے چلا کر افضل سے بولی۔

”ہائے بھائی جان سچ....؟“

”سونی صد سچ.... چاہے چاچو سے پوچھ لو۔“ شرفین مسکرائے۔

”ہاں سہرہ.... ہمیں تم لوگوں کی مشکلات کا احساس تھا۔ تب ہی تو ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے۔“

☆.....☆.....☆

کچھ دنوں بعد لاہور سے نواب صاحب کے چچا کی فیملی آ گئی چچی کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بیٹا تھا حاتم جس کی شادی کر دی تھی۔ فارم پر دونوں باپ بیٹے کام کر رہے تھے اکھوتے بیٹے کی اولاد سے اُن کا گھر بھر گیا۔ خُدا نے بیٹے بھی دیئے اور بیٹیاں بھی، اور سب کو اعلیٰ تربیت، اعلیٰ تعلیم دی.... دو چار سال میں وہ لوگ ایک چکر ضرور کراچی کا لگا لیتے تھے.... اس طرح رشتے داری قائم رہی۔ اب حاتم علی اپنے بیٹے کا رشتہ سمیرا کے لیے تھے۔ جسے سب نے بہ جان و دل سے قبول کر لیا تھا۔ لڑکا ڈاکٹری کے آخری سال میں تھا مناسب معقول اور دیکھا بھالا۔

اُن کے ماموں ملتان میں تھے.... اُن کی فیملی پچیس سال میں دوبار آئی تھی... نواب صاحب سے ملنے۔ جن سے مل کر انہیں بڑی کوفت ہوئی تھی.... اچھے بھلے معقول آدمی تھے ماموں زمین کے لالچ میں ذکر زمیندار کی کم پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کر لی۔ پھر وہیں گاؤں کی حویلی میں رہنے لگے۔ گھر داماد بن کر ویسے بھی انہیں یہ زندگی پسند آ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے میٹرک پاس بیٹے کا رشتہ حمیرا کے لیے دیا تھا مگر وہ ایم ایس سی پاس تھی... پھر ایک شہری مہذب لڑکی اپنے رہن سہن، خیالات، مزاج اور پسند کو کہاں تک بدل سکتی تھی۔ جب کہ لڑکے کی عادات و اطوار اور اس کی سوچوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ تفریق کی اس خلیج کو کوئی بھی ہاتھ پائے پر قادر نہ تھا اور اس انکار سے وہ لوگ بد دل ہو کر چلے گئے۔ گویا تمام تعلقات توڑ کر کبھی نہ آنے کے لیے اور نواب صاحب نے اس چھٹکارے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ البتہ چچا نے اپنی اکھوتی اولاد کو خاصی اچھی تعلیم اور تربیت سے آراستہ کیا تھا۔ جسے نواب سبطین علی نے کافی سراہا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے خاندانی تشخص کو آج نہ آنے دی تھی۔ کچھ دن گھر میں بڑی رونق رہی پھر وہ لوگ سمیرا کے ہاتھ میں انوار علی کے نام کی انگوٹھی ڈال کر چلے گئے۔

وہ بھی پرانی ہو گئی.... ایک فرض اور ادا ہوا... حمیدہ بیگم نے اطمینان کی سانس لی.... ایک دن حمیدہ بیگم نہایت پریشانی میں بہو سے بولیں۔

”دہن... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اکرام، شرفین اور افضل تینوں گھر میں نظر نہیں آتے، نہ چائے کے وقت نہ کھانے کے وقت۔ تم نے اُن سے نہیں پوچھا کہ یہ وقت وہ کہاں گناتے ہیں۔ خدا.... نہ کرے جو غلط لوگوں میں ان کا اٹھنا بیٹھنا ہو... اللہ بچوں کو محفوظ رکھے۔“

شکلیہ خاتون نے انہیں پان بنا کر دیتے ہوئے کہا۔

”اتنا جان۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ ان کی سوسائٹی غلط نہیں۔ بڑے سو براور ذہین

لوگوں میں اُن کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ میں نے کچھ سُنا تھا کہ وہ سیکھنے سکھانے کی بات کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے ٹیوشن وغیرہ پڑھ رہے ہوں۔ بہر حال میں اُن سے معلوم کروں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔“

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا اور مبینہ سالوں پر آ کر ٹھہر گئے۔ بقرعید پھر آ گئی تھی۔ کچھ دن باقی رہ گئے تھے۔ اُنہوں نے نواب صاحب کو ابھی سے یاد دلانا شروع کر دیا کہ وہ کسی اچھے قصائی کا انتظام کریں۔ چونکہ اگر ہو سکے تو پھر اپنے پرانی محلے سے کریم بخش کو بلا لیں۔ ”آپ نے کیا سوچا ہے کیا اب کی بھی وہی مواسوزوکی والا محلے میں طوفان کی طرح دھڑ دھڑاتا آئے گا۔ کسی کے گلے پر چھری چلائے گا۔ کسی کی کھال کھینچے گا۔ کسی کا دل گردہ نکال کر ہاتھ میں پکڑا دے گا۔ پھر کھال سری پائے اور پیسے لے کر غائب۔“

”نہیں نواب صاحب اب کی میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

”آپ نے ٹھیک فرمایا اماں جان۔ اب کی ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔“ اکرام نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اکرام شرفین اور افضل کا مثلث حاضری کی اجازت لے کر اندر آ گیا تھا۔ نواب صاحب نے تیز ہو کر کہا۔

”یہ آپ لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ نہ میں چائے کے وقت آپ کو دیکھتا ہوں نہ کھانے کے وقت گھر کے تمام کام میں پنپاتا پھروں اور آپ لوگ عیش کریں۔ یہ کیا قصہ ہے برخواستہ؟“ اکرام اور شرفین کی توسی گم ہو گئی۔ مگر افضل دادا کا چہیتا لاڈلا آگے بڑھ کر بولا۔

”دادو۔۔۔ آپ ہی نے تو فرمایا تھا کہ کوئی کام وغیرہ سیکھ کر اپنے وقت کا بہترین مصرف کرو۔ آج کل چھٹیاں تھیں۔ ہم نے سوچا کیوں نہ کوئی کام سیکھ لیا جائے۔“ حمیدہ بیگم ان تینوں کی شکل دیکھنے لگیں۔ تحسین علی ابھی آفس سے آئے تھے۔ باپ کو سلام کرنے اندر آ گئے۔

”پھر تم نے اپنے وقت کو کس طرح استعمال کیا؟“

”بابا جان۔“ اکرام نے ڈرتے ڈرتے زبان کھولی ”ہم تینوں نے ایک ”ماہر قصاب“ کی شاگردی کر لی تھی۔“ وہ چپ ہو گیا۔ تحسین جاتے جاتے پلٹ آئے تھے۔ بسطین علی اور حمیدہ بیگم نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”ہائے۔۔۔ قصاب کی شاگردی سے تمہاری مراد کیا ہے؟“ نواب صاحب نے پوچھا۔

”دادا نے پچھلے سال کے سچ تجربے سے ”اپنی مدد آپ کرو“ کے اصول پر ہمیں سختی سے کاربند کر دیا تھا۔“ افضل نے مُسکراتے ہوئے گویا تیر مارا۔۔۔

”اور ہم نے اپنے پُرانے محلے کے قصاب کریم بخش جس کی دکان سے ہمیشہ ہمارے

گھر گوشت آیا کرتا تھا اُس کو اپنی مشکل بتائی تو وہ بولا۔۔۔

”باہوجی۔۔۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔۔۔ چھری چا پڑ خرید لیجئے۔ ہم آپ کو چند خاص خاص باتیں بتا دیں گے۔ بلکہ دو چار بکرے بھی ذبح کریں گے آپ کے سامنے۔ بس طریقہ سمجھ میں آ جائے گا آپ کی۔۔۔ اس میں برائی کیا ہے۔۔۔ آج کل لوگ عموماً اپنا ذبیحہ خود کرتے ہیں۔“ افضل نے کہا۔

”بس دادو جان۔۔۔ چند ملاقاتیں چند لیکچر اور ایک دو پریکٹیکل ہمارے لیے کافی تھے۔ ہم نے خاص خاص باتیں نوٹ کر لیں۔ مثلاً چھری گردن پر پھیرنے سے پہلے یاد رکھنا کہ صرف ”بسم اللہ۔۔۔ اللہ اکبر“ کہنا ہے پوری بسم اللہ نہیں پڑھنی۔۔۔ اور یہ کہ گردن بالکل الگ نہ ہونے پائے۔ اور یہ کہ جسم ٹھنڈا پڑنے سے پہلے جانور کی کھال اُتار لینی چاہیے ایسے کہ چھری کی ضرب کھال پر نہ لگے۔ پھر ہم نے چھوٹی چھوٹی پھریاں، بُگدا، چا پڑ وغیرہ وغیرہ خرید لیا۔ اب کی انشاء اللہ ہم تینوں مل کر اپنا ذبیحہ خود کریں گے۔“

اب اُن کا خوف دور ہو چکا تھا۔ وہ بڑے فخر سے اپنا کارنامہ گھر والوں کو سنارہے تھے۔ اس سے قطع نظر کہ باپ اور دادا۔ دادی پر کیا گزر گئی۔ انہوں نے دادا کی آنکھوں میں خون اترتے دیکھا تو اُن کی خورگوں میں جیسے خون جننے سالگ۔۔۔ تحسین میاں خاموش بیٹھے تھے۔ اور لڑکیاں الگ کھڑی منہ میں دوپٹہ ٹھونے کھل کھل ہنس رہی تھیں۔ گویا یہ کوئی لطیفہ انہوں نے سنایا ہو۔ لیکن نواب صاحب کا غصہ بام عروج پر پہنچ چکا تھا۔ دفعتاً انہوں نے دھاڑ کر پوچھا۔۔۔

”یہ کیا تم لوگوں نے بکواس لگا رکھی ہے۔ کریم بخش کو جرات کیسے ہوئی تم لوگوں کو یہ مشورہ دینے کی اور تم لوگوں نے یہ سب کچھ کیسے سوچ لیا۔ کہ اتنی آسانی سے تم اس پر عمل درآمد کر لو گے اور تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ یعنی کہ اب تم بکرا ذبح کرو گے۔ ہڈی بوٹی بناؤ گے۔؟۔“

دونوں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ لیکن افضل نے ہمت نہ ہاری۔ آج وہ گھر والوں اور خصوصاً اپنے دادا پر اپنا مؤقف واضح کر دینا چاہتا تھا۔۔۔ سنبھل کر بولا۔

”دادو۔۔۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ بکرا ذبح کرنے، اس کی کھال کھینچنے میں برائی کیا ہے۔ لوگ تو منڈیوں، کھلے بازاروں اور دکانوں پر چیزوں کے عوض ہمارے گلوں پر چھری چلاتے اور ہماری زندہ کھال کھینچتے رہتے ہیں۔ اس کا حکم کسی شریعت نے دیا ہے؟۔۔۔“

نواب صاحب نے گھور کر افضل کو دیکھا۔ جو اپنے دونوں ساتھیوں کی بڑھ چڑھ کر نمائندگی کر رہا تھا۔ اور ایک انج اپنے مؤقف سے نہیں ہٹا تھا۔ یہ درست تھا کہ افضل جو

چاہتا دادو سے منوالیتا تھا۔ مگر آج بات کچھ مختلف ہو گئی تھی۔ مارے غیرت کے ان کا نوابی خون اُن کے اندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اُن کی غصے میں گونج دار آواز آئی۔

”افضل! تم ہمیشہ موضوع سے ہٹ کر بات کرتے ہو۔“ اُس نے دادا کے غصے کی بالکل پروا نہ کی اور بات صرف گردن اور کھال تک آئی ہے۔ ہڈی بوٹی تو ابھی باقی ہے۔“ اس کی یہ معصومیت اور بے نیازی دادا کو بوکھلا گئی۔ پوتے کی باتوں میں وزن تھا۔ انہیں اپنا لہجہ نرم کرنا پڑا۔

”بات کو مختصر کرو۔ اب بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے۔؟“

”دادا جان پلیز۔“ وہ اُن کے کندھے سے لگ کر دلار سے بولا۔

”ہم اپنے گھر کا ذبیحہ خود کریں گے۔“

سبطین علی کو بے اختیار وہ ضدی۔ لاڈلا اپنی بات منوانے والا شریچہ یاد آ گیا جو اُن سے بڑی سے بڑی بات منوالیتا تھا۔ اپنی پسند کی ہر چیز اُٹھا لیتا۔ چھین لیتا۔ کوئی اگر اس سے احتجاج کرتا تو گھنٹوں وہ رُوٹھا پھرتا۔ اور اسے منانے کے لیے دادو کو کیا کیا جتن نہ کرنا پڑتے تھے۔

دفعۃً انہوں نے افضل کی طرف دیکھا۔ آج بھی اس کے وہی تصور تھے۔ بلکہ ضدیں جوان ہو گئی تھیں۔ بے ساختہ اُن کے ہونٹ ہنسی کے لیے پھڑپھڑائے لیکن انہوں نے اپنی مسکراہٹ ہونٹوں تلے دبا لی۔ اور اپنی رفقاء حیات کی طرف دیکھنے لگے۔ حمیدہ بیگم اُن کا مطلب سمجھ گئیں اور افضل کی طرف دیکھ کر نرمی سے بولیں۔۔۔

”اے بیٹے کچھ دیوانے ہوئے تھے کہ اتنا بڑا قدم تم نے بغیر پوچھے اُٹھا لیا۔ اور اکرام تم تو بڑے تھے تمہیں سمجھانا چاہیے تھا۔“ انہوں نے اب کی چھوٹے بیٹے اکرام کو لتاڑا۔

”اماں جان۔“ پہلی بار اکرام نے سکوت توڑا۔

”ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ ہم نے بھی اپنی ضرورت کے تحت یہ حل ڈھونڈ لیا۔“

”اور شرفین بیٹا۔ تم نے کیا سوچا تھا۔؟“ وہ اب دوسرے بیٹے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”اماں جان۔ ایک نیک کام میں ہم نے ان کی مدد کر کے یقیناً کوئی بُرائی نہیں کی۔“

”ہاں میاں۔ ابھی تو یقیناً تمہیں کوئی بُرائی نظر نہیں آئے گی۔“ تحسین نے مسکرا کر کہا۔

”مگر جب لوگ تمہارا رشتہ ”بکری اور چھری“ سے جوڑ دیں گے۔ تب پوچھیں گے سے۔“ باپ کی اس بات پر افضل نے تڑپ کر کہا۔۔۔

”لا حول ولا قوۃ۔ بابا جان۔ آپ بھی فرسودہ اور قدیم زمانے کے لوگوں کی طرح پیش گوئیاں کرنے لگے۔ یہ دور علم و تمدن کا دور ہے۔ ہر کام مشینری انداز میں ہو رہا ہے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے والوں کو آج قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور دنیا انہیں ایک عملی انسان کہتی ہے۔ پیسے اور وقت کا زیاں بھی نہیں ہوتا۔۔۔“

”اور یہ بھی تو کہو کہ جو کام جس نے کیا وہ اس کا ”ٹریڈ مارک“ بن گیا۔“ باپ نے کہا۔۔۔

”لوگ تمہاری ذات پر شک کرنے لگیں گے۔“

”افوہ بھائی جان۔“ شرفین نے اکتا کر کہا۔۔۔

”آپ لوگوں نے تو بلاوجہ بات کا بتکنگر بنا دیا۔ چلئے دُنیا کو کہنے دیجئے۔ اس کا ہماری صحت پر کوئی اثر و اثر نہیں پڑے گا۔ میں نے بڑے بڑے تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں کو یہ کام کرتے دیکھا ہے۔ وہ اپنے اعران صاحب منیجر صاحب، ناظر اور باسط صاحب انہوں نے ہمیں پچھلے سال ہی کہا تھا۔

”بیٹے۔ میری مائتو تو خود ہی سارے بھائی، چچا مل کر قُر بانی کر لیا کرو۔ کہاں قصاب کے پیچھے خوار ہو گے۔ بھی ہم لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔۔۔“

اتنے بڑے بڑے لوگوں کا حوالہ کام آ گیا۔۔۔ سبطین علی نے مطمئن ہو کر حمیدہ بیگم سے پان کی فرمائش کر دی۔ وہ بان بنانے لگیں۔ تحسین صاحب ان کی باتوں میں اس قدر مضبوطی دیکھی تو خاموشی سے محفل کا رنگ دیکھتے رہے۔۔۔ نواب صاحب بھی بظاہر پاندان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔۔۔ لڑکیاں بھی کھسک گئی تھیں۔ سب کی اپنی اپنی رائے کا آزادانہ اظہار۔۔۔ وقت کی ضرورت کے تحت ”اپنی مدد آپ کرو“ پر سختی سے پابندی کا یہ شیدول دیکھ کر نواب صاحب نے مُنہ میں پانوں کی گلوری رکھتے ہوئے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ۔۔۔

”میاں ٹھیک ہے۔ ہم تو بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اب تمہارا زمانہ ہے، یہ حسرت بھی نکال لو۔۔۔“ وہ چلے گئے، ان کے پیچھے تحسین علی بھی اُٹھے۔ اب صرف حمیدہ بیگم رہ گئی تھیں۔ تینوں نے رسمی صورت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور دوڑ کر اُن سے لپٹ گئے۔۔۔

”اماں جان۔۔۔“

”دادی جان۔۔۔“

”پلیز ہماری سفارش کر دیجئے۔ دادو اور بابا جان شاید ناراض ہو گئے ہیں ہم سے۔۔۔؟“ وہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے تینوں کو پیار سے کہا۔۔۔

”تم لوگوں دانستہ اُن کے اختیارات کو چیلنج کیا ہے۔ جو مناسب نہیں تھا۔ اب جب

کہ تمہاری بات معصومیت کی حد تک درست نکلی تو وہ اب تمہیں کچھ نہیں کہیں گے.... میرا سفارش کی ضرورت نہیں پڑے گی... مگر آئندہ محتاط رہنا....“ وہ لوگ ہنستے مسکراتے مطمئن سے چلے آئے۔ کہ اُن کی کوششیں کامیاب رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

مہوین نے افضال کے ساتھ ہی گریجویشن کیا تھا اور پھر تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن افضال آگے پڑھتا رہا۔ وہ سی۔ اے کر رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور اُن کے والدین بھی اپنے بچوں کی پسند سے واقف تھے۔ انہیں کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ سبیلین علی اس قدر شفیق انسان تھے کہ بچے اُن کے گرد پروانوں کی طرح منڈلاتے رہتے اتنی محبت انہوں نے دی تھی کہ وہ انہیں اپنا بزرگ اور دوست سمجھتے تھے۔ خصوصاً افضال اُن کے دل کا قرار تھا اور اس کے حوالے سے مہوین بھی انہیں کم عزیز نہ تھی۔ وہ بچوں کی طرح اُن سے آکر لپٹ جاتی اور وہ اس کے ریشمی بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے رہتے۔ آخر ایک دن....؟

نواب صاحب نے فدا حسین سے عرض مدعا کر دیا.... فدا حسین مسکرا کر چپ ہو گئے۔ مگر نیک خاتون چپک کر بولیں....
”واہ بھائی جان... مہوین آپ ہی کی تو بیٹی ہے جب چاہیں آکر لے جائیں۔“
نواب صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے....

”شکریہ بھائی.... آپ نے میرا مان رکھ لیا۔ بات ہو تو ایسی۔ میں نے آپ جیہ صاف گو اور سچی خاتون بہت کم دیکھی کہ جودل میں ہو فوراً ظہار کر دو۔“
فدا حسین بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

”نیک بی بی... تم نے تو سارا کریڈٹ اپنے نام لکھوا لیا۔ اب میں کیا کہوں۔ خیر کوئی فرق نہیں پڑتا میں محقق ہوں.... اب مہوین آپ کی امانت ہے۔“
”شکریہ... دوست....“ دونوں نے اُٹھ کر پھر پورا انداز میں ہاتھ ملایا....

پھر دو ماہ بعد ایک شاندار تقریب میں دونوں کو انگوٹھیاں پہنا دی گئیں... منگنی کا خوشگوار جشن اُن کے کپیری والے پرانے مکان میں منایا گیا تھا۔ ان دنوں گلشن کی کٹھن تعمیر ہو رہی تھی.... سب کا خیال تھا کہ افضال کی شادی کٹھن میں ہوگی۔ اس بندھن۔ دونوں گھرانے بہت خوش تھے۔ خصوصاً مہوین اور افضال نے تو خدا کی اس عطا پر گنت سجدے گزارے تھے۔ اب اُن کا آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ کچھ مصروفیت؟ دستورِ زمانہ۔ اس کے بعد یہ اپنے گلشن کے مکان میں آ گئے۔ پہلی میٹھی عید نے جس قدر

سرور و چاشنی انہیں بخشی تھی.... اسی قدر تلخی اور بے سکونی انہیں بقرعید میں ملی تھی.... جس کی کڑواہٹ نے انہیں اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر دوسرے سال کی عید قربان بڑی شاندار آئی تھی۔ سب دنوں سے زیادہ خوبصورت اور خوشگوار....

اب کی وہ سوز و گداز اب بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا شاید لوگوں نے بھی کوئی متبادل انتظام کر لیا تھا۔ نہ وہ افراتفری تھی نہ وہ بیزاری۔ شرفین، اکرام اور افضال تینوں نے کمریں کس لی تھیں۔ بزرگ تو مارے شرم کے باہر ہی نہ نکلے۔ مگر افضال اور اکرام نے قابو کیا ہوا تھا اور وہ حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ بچوں کو اس اکھاڑ پچھاڑ میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ آخر شرفین نے اس کے گلے پر ”اللہ اکبر“ کہہ کر چھری پھیر دی۔ خون کا فوارہ نکلا اور سب کی ہنسی میں بریک لگ گیا۔ منظر بڑا خوفناک تھا۔ وہ سب ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ فیضی اور سبحانی دوڑ دوڑ کر اُن کی مدد کر رہے تھے۔ کوئی چھری اٹھا کر دے رہا تھا کوئی چاڑ۔ کوئی ٹانگیں پکڑے ہوئے تھا۔ کوئی گندگی صاف کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ نیا اور اچھا لگ رہا تھا۔ جب بوٹیاں بنانے کا وقت آیا تو حمیرا اور سمیرا بھی ساتھ لگ گئیں۔ اور بریانی، روٹ، تنکوں اور گھروں میں بھیجنے کے لیے گوشت الگ کر لیا۔ اُن کی حسب پسند بوٹیاں بنوائیں۔ اس کے بعد چائیں الگ نکال کر رکھ دیں۔ اکرام نے ہانک لگائی۔

”ارے یار فیضی کہاں ہو۔ لویجی کی بوٹیاں تم بناؤ....؟“ وہ بھاگتا ہوا آیا اور دانت نکال کر بولا....

”صاحب جی.... پھر کہیں لمبی اور تنکوں نہ ہو جائیں۔“
”ارے نہیں۔ کیسے ہو جائیں گی۔ ہم جو پاس بیٹھے ہیں۔“ اکرام نے ڈانٹ پلائی۔ دو بکروں کا گوشت سلیقے، صفائی کے ساتھ الگ الگ برتنوں میں رکھا تھا۔ دادی امی اور شکیلہ خاتون نے آکر دیکھا۔ اور مسکرا کر بولیں....

”واہ بچو... لگتا ہے واقعی ماہرین“ کے ہاتھوں نے بنایا ہو۔ چلو تمہاری یہ ”امداد باہمی“ ہمیں پسند آئی۔“

”شکریہ۔ شکریہ۔“ تینوں کھڑے ہو کر شاہانہ سلام کرتے ہوئے ہنس دیے۔
بڑا خوبصورت اور خوش گن منظر تھا....

.... انگیٹھیوں میں کونسلے دہک رہے تھے۔ ارد گرد مہمان دوست اور گھر کے افراد بیٹھے سینوں میں مصالہ لگی بوٹیاں پرو کر انگیٹھی میں الٹ پلٹ رہے تھے۔ فضا میں سوندھی۔ پوندگی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی.... ہنسی، قہقہے، شور ہنگامہ اور جھین جھپٹ مچی ہوئی تھی۔ پہلے جیسی رونق اور خوشیوں نے پھر ذریعہ ڈال لیا تھا۔

”یا رسدانی.... لو ذرا کھا کر تو بتاؤ۔ ہماری پلاننگ کیسی رہی؟“ افضال نے فیضی اور سبحانی کو ایک ایک بھنی ہوئی تکیے کی سیخ پکڑادی اور وہ لوگ سوس سوس کر کے کھاتے ہوئے چٹخارے لینے لگے.....

”واہ صاحب جی... مزہ آ گیا۔ ایسے تکیے تو ہم نے تمام عمر نہیں کھائے۔“
”اچھا... لو یہاں بیٹھ کر یہ تیخیں آہستہ آہستہ پلٹتے رہو... جل نہ جائیں“ میں ابھی آتا ہوں۔“

شرقیں یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اکرام اور افضال اس سے پہلے دوستوں کی تلاش میں باہر جا چکے تھے.... تب ہی مہروز اور حمیرا لپکتی جھپکتی ادھر آ گئیں اور کونکوں پر کھی تیار سخنیں انہوں نے اٹھا کر آہستگی سے پلٹیوں میں ڈالیں.... اوپر سے مزید مصلحت اور لیموں چھڑکا اور دے پاؤں تیزی چلی گئیں اور جاتے جاتے تاکید کر گئیں....

”جلدی سے سینچوں میں بوٹیاں لگا کر کونکوں پر رکھ دو نہیں تو شامت آ جائے گی...“ وہ ہنستی ہوئی چلی گئیں۔ اور یہی ہوا دونوں گھبرا کر جلدی جلدی بوٹیاں پرونے میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ لوگ ہنستے قہقہے لگاتے اپنے دوستوں کے ساتھ اندر آئے تو سبحانی اور فیضی کے چہرے فق تھے۔ افضال اور اکرام نے فوراً تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ شرقین نے آنکھیں پھاڑ کر سینچوں کی طرف دیکھا۔

”ارے بھائی۔ ساری تیخیں چٹ کر گئے۔ اتنی جلدی؟“
”چھوٹے سرکار۔ حمیرا بی بی کی سہیلیاں آئی تھیں۔ وہ سارے تکیے اٹھا لگئیں۔ وہ گھبرا کر بولا۔

”ہائیں۔ لو بھئی۔ ارشد اور نعیم یہاں چھاپے پڑ گیا۔ سیکورٹی فورس کا۔ اب تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔“ وہ لوگ میز کے گرد بیٹھ کر گپ شپ لگانے لگے۔

”اپنی مدد آپ کرو۔“ کا یہ سلسلہ بڑا کامیاب رہا تھا۔ رفتہ رفتہ گھر کے علاوہ دوستوں میں بھی یہ تینوں جا کر اس کارِ خیر میں حصہ لینے لگے۔ اور ان کی شہرت خوشبو کی طرح پھیل گئی۔ اس کے بعد ہی کچھ حاسد اور شر پسند خوشامدی دوستوں نے فدا حسین کو بھڑکانا شروع کر دیا اور کہا۔

”مرزا صاحب۔ آپ نے کن لوگوں میں اپنی بیٹی کا رشتہ کیا ہے وہ لوگ خاندانی نہیں معلوم ہوتے، ہماری گنگنا کر آنکھوں نے خود انہیں بڑے ماہرانہ انداز میں بکرا کاٹتے دیکھے ہیں جناب مسلم بکرا مجھے تو وہ لوگ ذات کے قصائی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کہاں پھن گئے، تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں تو کیا ہوا کسی انسان کی اصلیت بھی چھپی رہتی ہے۔“

”جی ہاں جی ہاں۔“ دوسرے نے گرہ لگائی۔

”اگر یہ بات غلط نکلے تو آپ کا جوتا ہمارا سر۔ ابھی گذشتہ سال بقرعید میں اپنے گھر کے دو بکرے کاٹے پھر حملوں والوں کو بھی اپنی خدمات پیش کیں۔“

فدا حسین کی پیشانی پر سینکڑوں بل پڑ گئے تھے آنکھوں سے غصہ جھلکنے لگا۔ وہ ایک دم کھڑے ہو گئے۔

”میں شکر گزار ہوں آپ کا اب تشریف لے جائیں، میں خود پتا لگا لوں گا۔“ ان کی آواز میں سختی تھی۔

وہ لوگ خاموشی سے چلے گئے اور فدا حسین پشت پر ہاتھ باندھے کمرے میں بے چینی سے ٹھنلے لگے۔ ان کی آنکھوں میں وہ زمانہ گھوم گیا۔ جب فدا حسین کی نواب سبطین علی سے پہلی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اور ان کی باتوں، ان کے انداز و شائستگی سے وہ مرعوب ہو گئے تھے۔ نواب صاحب کی شخصیت میں جانے کیا تھا کہ مرزا صاحب ان کی کسی بات کو رد کرنے کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ اور غیر محسوس طور پر دونوں گھرانے قریب ہوتے چلے گئے پہلے انہوں نے ایسی بات نہ دیکھی نہ سنی.... بعض وقت وہ خود حیران رہ جاتے اتنے اتنے بڑے فیصلوں کو مسترد کرنے پر.... اگر خدا نخواستہ وہ اس الزام یا حقیقت کو ثابت نہ کر سکے تو....؟

جہاں تک نواب صاحب کے خاندانی بیک گراؤنڈ اور ان کے اپنے تشخص کا سوال تھا تو انہوں نے اچھی طرح چھان پھٹ کر لی تھی۔ نسبت طے کرتے وقت انہوں نے نیک خاتون سے مشورہ مانگا کہ ”نواب صاحب نے مہوین کو افضال بیٹے کے لیے مانگا ہے تمہاری کیا رائے ہے؟“ نیک خاتون مارے خوشی کے پھڑک اٹھیں۔

”ہائے میری تو دیرینہ آرزو پوری ہو گئی مرزا جی۔ میری بیٹی کے بھاگ جاگ جائیں گے۔ افضال بیٹا مجھے بہت پسند ہے۔ آپ ہاں کر دیں۔“ مرزا صاحب نے اپنی بیوی کا جگمگا تا چہرہ دیکھا اور مسکرا کر بولے۔

”نیک بخت۔ ابھی اتنی جلدی بھی نہیں آ خر ہم لڑکی والے ہیں۔ دراصل میں نواب صاحب کا خاندانی شجرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں...؟“ نیک خاتون نے تعجب سے پوچھا۔

”یہ ایک دستور ہے جو ہمارے بزرگوں سے چلا آ رہا ہے۔ آخر شجرہ دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے؟“

”اگر انہوں نے ہمارا شجرہ مانگ لیا تو۔؟“

”اُول تو وہ ایسا کریں گے نہیں اور مانگ بھی لیا تو ہم دکھادیں گے۔ کوئی ہم نے کچی گولیاں تھوڑی کھیلی ہیں۔“

”میرا خیال ہے۔“ نیک خاتون سنجیدگی سے بولیں۔

”آپ شجرہ دیکھنے کی بات ہی نہ کریں۔ آج کل کون کسی کا شجرہ دیکھتا ہے؟ آپ کی بیس سالہ دوستی کیا کسی شجرے سے کم ہے۔“

”خیر... خیر... یہ ہمارا اور دوسرے۔ آپ فکر نہ کریں....“ اور جب انہوں نے برسبیل تذکرہ نواب صاحب سے اُن کا شجرہ دیکھنا چاہا تو وہ نہایت فراخ دلی سے مسکرا کر بولے۔

”ارے مرزا جی.... یہ آپ کو شجرے کا کیسے خیال آ گیا۔ کیا ہمارے گھرانے میں آپ نے کچھ گڑ بڑ دیکھی....؟“

”حاشا! کلا نواب صاحب۔“ انہوں نے انکساری سے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔

”میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔ بس ایک خاندانی روایت یاد آگئی۔“

”دیکھئے جناب۔“ نواب صاحب نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”میں خاندانی نواب اور ذات کا کھرا پٹھان ہوں۔ آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ ہم ساتھ چائے بھی پیئیں گے اور گپ شپ بھی لڑائیں گے، تب ہی شجرہ بھی دیکھ لیجئے گا۔“ وہ مسکرائے۔

فدا حسین کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ انہوں نے سوچا، میدان مار لیا.... مگر....؟

نواب صاحب نے چائے پر خاصا تکلف کیا تھا پہلے تو وہ محض اُن کے دوست تھے مگر اب مہوین کے حوالے سے فدا حسین اُن کے سمدھی اور افضال کے سُسر بننے جا رہے تھے۔ رشتے داری پکی ہو گئی تھی.... اس لیے بھی اہتمام جائز تھا مرزا صاحب نے بھی آج چائے پر بڑا لطف محسوس کیا.... وہ بھی اِس وقت سبطین علی کو اپنا دوست نہیں بیٹے کا باپ سمجھ رہے تھے۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد نواب صاحب انہیں اپنی اسٹڈی میں لے گئے جو دوسری منزل پر تھی۔ ہال.... کافی کشادہ، روشن اور ہوادار تھا۔ بڑی بڑی کھڑکیوں پر ریشمی پردے سرسرا رہے تھے۔ ماربل کا فرش دبیز نرم اور خوبصورت قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک طرف لمبی سی شیشے کی میز پر مختلف کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ اس دیوار میں اوپر سے نیچے تک بک شیلف فٹ تھا جس میں رنگین سنہری جلدوں کی نایاب کتابیں جی ہوئی شفاف شیشوں کے اندر سے جھانک کر دعوتِ مطالعہ دے رہی تھیں۔ میز کے قریب خوبصورت کرسیاں پڑی ہوئی تھیں.... باقی تین دیواروں پر قد آدم تصویریں

سنہرے فریموں میں آویزاں تھیں۔ جن کے نیچے صاحب تصویر کا مختصر اور جامع تعارف کے ساتھ اُن کی کارکردگی، عہدہ اور تمنغے درج تھے.... ہر تصویر کے سامنے نواب صاحب کھڑے ہو کر بتا رہے تھے۔

”یہ میرے والد جناب نواب مدثر زمان خان، بیرسٹر تھے یہ میری والدہ جنت مکانی شہزادی ارجمند بانو۔“

”یہ میرے تایا جان جناب حاتم علی خان ہیں جو برٹش فوج میں لیفٹیننٹ تھے۔“

”یہ دادا مرحوم نواب خان بہادر قائم علی خان ڈپٹی کمشنر لگے ہوئے تھے۔“

”یہ چچا مرحوم نواب رستم خان، رسالدار تھے۔ اُن کی اعلیٰ کارکردگی پر انہیں برٹش سرکار نے انعام و اکرام اور تمنغہ دیا۔“

”یہ ماموں جناب نواب غفصفر علی خان ہیں۔ ان کی پوتی آج کل لندن میں ڈاکٹریٹ کر رہی ہے اور ان کی فیملی.... امریکہ میں رہتی ہے۔ یہ میرے چھوٹے بھائی عارفین جو.... فسادات میں شہید ہو گئے۔ اور میری چھوٹی بہن کینیڈا میں پیکچرار لگی ہوئی ہے۔“ اِس کے علاوہ ان کے وہ خاندان کے ہونہار بزرگ و جوان جو تحریک آزادی پر قربان ہو گئے۔“ ان کی تصاویر دکھاتے اور ان کے متعلق بتاتے ہوئے.... نواب صاحب کی آواز گلوگیر ہو گئی.... فدا حسین بھی کافی متاثر نظر آ رہے تھے.... پھر وہ دونوں گریسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور کچھ توقف کے بعد نواب صاحب بولے۔

”مرزا صاحب کیا اب بھی آپ کو کسی شجرے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے؟“

”جی ہاں نواب صاحب۔“ انہوں نے کچھ رکتے جھجکتے کہا۔ ”میں شجرے پر یقین رکھتا ہوں۔ کیونکہ شجرہ ایک کھلی ہوئی کتاب ہوتا ہے آپ نے شاید خاندانی شجرے دیکھے نہیں۔“

نواب صاحب کے چہرے پر بڑی ہر وقار مسکراہٹ آ گئی۔

”بہت دیکھے ہیں۔ گستاخی معاف۔ میں کاغذ کے اُن بے جان ٹکڑوں سے زیادہ زندہ چہروں اور زندہ کرداروں پر یقین رکھتا ہوں۔“ فدا حسین گہری گہری نظروں سے اُنہیں دیکھتے رہے۔ اُن کی پیشانی پر ناگواری کی لکیریں ابھرتی گئیں۔

”گویا سلسلہ جہنبائی کے لیے شجرہ آپ کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔؟“ مرزا صاحب نے پھر زور دے کر پوچھا.... اور انہوں نے جھنجلا کر کہا۔

”گذشتہ صدی اور رواں صدی کے اوائل میں، شجرہ خاندانی تعارفات کا ایک مضبوط زینہ تھا۔ شجرہ سازی کی.... تاریخ بہت پرانی ہے نواب صاحب.... آپ اس کی صحت سے

مسلل منکر ہو رہے ہیں۔“

”اس سے مجھے کب انکار ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”میں اس کی شان نزول پر کب اعتراض کر رہا ہوں۔ مگر یہ تو سوچئے کہ ہمارے بچے آج کے قاری، فلاسفہ، ڈاکٹر سائنس دان اور موجد ہیں۔ کوئی نیا فارمولہ لایئے، طرز احساسات کی بات کیجئے۔ پچھلی تمام باتیں فرسودہ ہو گئیں۔ جہاں نئی قدروں نے قدم رکھا۔ وہیں پرانی روایات نے نئے محرکات کو جنم دیا ہے۔ اب ہم انسان کی نئی شرافت کو اس کے اخلاقی و اطوار رہن سہن اس کے کردار اور تعلیم کی کسوٹی پر رکھتے ہیں۔ شجرے سے نہیں۔“

”عجیب فلسفہ ہے آپ کا...؟“ فدا حسین جزبہ ہو کر بولے۔

”چھوڑیے۔ درمیان سے شجرہ ہٹا دیجئے۔ اب ہمارے پاس آپ کو مطمئن کرنے کے لیے کون سی دلیل رہ جاتی ہے...؟“ نواب صاحب نے قہقہہ لگایا۔

”ہاں اب آپ نے ایک ترقی یافتہ بات کی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ میں زندہ چہروں اور زندہ کرداروں پر یقین رکھتا ہوں۔ اسی کے حوالے سے میں ناصر بیٹے۔ مہوین بیٹی کی مثال دوں گا۔ اُن کا چہرہ اُن کا کردار ایک مکمل کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ ہماری بیس سالہ دوستی کے سفر کی یہ محبتیں، چاہتیں، ڈھکسہ، میل مروت کیا ہمیں مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ جس گھر میں ایسے فرشتے ہوں وہاں بے اعتباری کا کیا دخل۔ بولے...؟“ نواب صاحب کی دلیل کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اُن کی شکل دیکھتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کون سا تہ پ کا پتہ پھینکیں اور انہیں میدان سے بھاگنے پر مجبور کر دیں۔

منظر بدل گیا تھا اور فدا حسین کی آنکھوں میں اُن کی بیس سالہ دوستی کی پوری فلم تمام ہو چکی تھی... اور ڈراپ سین ایسے نازک مرحلے پر ہوا تھا کہ ٹرپ کا وہ پتہ اب نواب صاحب کے ہاتھ سے نکل کر فدا حسین کے ہاتھ میں آ گیا تھا، بلکہ پوری بازی اُلٹ گئی تھی۔ مرزا صاحب خوش تھے کہ اب زندہ چہرے اور زندہ کردار گونگے بہرے بن گئے تھے۔ نواب صاحب انہیں زبان دینے سے قاصر تھے... اور اُن کا شاہانہ و بدبہ خاندانی تشخص سخت آزمائش سے دوچار تھا... اب مرزا صاحب کو یقین آ گیا تھا کہ نواب صاحب نے انہیں اپنا خاندانی شجرہ کیوں نہیں دکھایا... یقیناً کوئی نہ کوئی سقم ضرور ہوگا جی ہی وہ نال گئے۔

وہ بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرائے... اور خود کلامی کے انداز میں بولے۔

”نواب صاحب۔ یہی تو موقع ہے ”شہ اور مات“ کا... اب پوچھوں گا کہ وہ زندہ چہرے اور زندہ کردار کہاں گئے؟“

پھر اس کے بعد منگنی ٹوٹنے کا دھماکہ سنا گیا... اور سامان جوں کا توں واپس آ گیا۔ ہر شخص اپنی جگہ سوالی بنا کھڑا تھا اور ہر کوئی اس تکلیف و حماقت کو شرفین، اکرام اور افضال کے کھاتے میں ڈال رہا تھا... انہیں قصور وار ٹھہرا رہا تھا۔ وہ تینوں حیران تھے کہ ایسی کیا قیامت ٹوٹ پڑی اگر ہم نے اپنا کام اپنے ہاتھ سے کر لیا... اور دوسروں کی بھی جزوقتی مدد کر دی۔ بجائے اس کے کہ بزرگوں کی طرف سے انہیں کوئی انعام کوئی شیلڈ دی جانی... انہیں سزا سنائی گئی وہ یہ کوئی انصاف ہوا...؟

ہر چند کہ لڑکوں نے ”اپنی مدد آپ کرو“ کے تحت ایک اچھی مثال قائم کی تھی۔ جس پر انہیں ڈانٹ پھٹکار بھی ملی، اب وہ ایسا ناپسندیدہ کام بھی نہ تھا۔ جس کی وجہ سے منگنی توڑ دی جاتی... یا اُن کی خاندانی شرافت کا مذاق اڑایا جاتا۔ بہر حال مرزا صاحب کے اس بچکانہ فیصلے سے سب کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی۔ جس کا ازالہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

نواب صاحب اس چیز کو سمجھ رہے تھے کہ شاید انہیں شجرہ نہ دکھا کر ان کی توہین کی گئی تھی۔ جس کا بدلہ انہوں نے اس طرح لیا۔ ایسے دنوں میں جب کہ افضال کی شادی کی گھر میں تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اب انہیں پوتے کی شادی سے زیادہ یہ فکرا دامن گیر تھی کہ وہ کس طرح مرزا صاحب کے اس الزام کو مسترد کر کے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کریں۔ انہوں نے بھی کچی گولیاں کھیلی نہیں تھیں۔ زمانے کے سرد و گرم اور حالات کی کٹھنائیوں کا ذائقہ چکھا تھا۔ وہ اکھاڑے میں تو نہیں اُترتے تھے مگر داؤد و تیج وہ بھی جانتے تھے۔ انہوں نے اپنے بچاؤ کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ ابھی منشی ذکاوت اللہ حیات تھے۔ گویا وہ بہت ضعیف ہو گئے تھے لیکن دماغ اور آنکھوں نے اُن کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ کبھی بہت اچھے کھاتے پیتے خاندانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اُن کی خوشنویسی اور شجرہ سازی کا شہرہ دُور دور پھیلا ہوا تھا۔ قلم کے ساتھ ساتھ انہوں نے ذہن بھی خوب پایا تھا۔ اُن کا خاندانی ذریعہ معاش اصل میں شجرہ سازی تھا۔ اُس دور میں لوگ عموماً اور خصوصاً اپنے خاندانی شجروں سے پہچانے جاتے تھے۔ شادی بیاہ کے سلسلے میں رقعوں کے ساتھ سُرخ چمکی تیلی میں شجرے کی ایک کاپی بھی ہوتی تھی شرفین کی طرف سے تاکہ لڑکی والے اپنے طور پر تحقیق کر سکیں۔ لیکن تقسیم کے بعد آسمان اور زمین ایسے گڈمڈ ہوئے کہ نچلا طبقہ اوپر آ گیا... شرفاء اور خاندانی لوگ پس منظر میں چلے گئے۔ خاندان اور کنبے ایسے اُڑے کہ پتہ ہی نہ چلا کہ کون شہزادہ تھا، کون فقیر زادہ، کس کی ڈیوڑھی پر ہاتھی جھومتا تھا اور کس کے

آنگن میں بہاروں کے قافلے اُترتے تھے۔ سب کے ساتھ..... ”پدر ماسلطان بود“ کا معاملہ تھا۔ لیکن جو حقیقت میں صاحب جاہ و چشم تھے۔ انہیں اب بھی کسی شناخت اور کسی شجرے کی ضرورت نہ تھی۔ جیسے نواب سبطین علی اور ان کا خاندان.....

منشی ذکوات اللہ کافن یہی تھا کہ وہ گمنام اور نچلے خاندانوں کو شناخت اور برتری یا شرفاء میں برابر کا درجہ فراہم کرتے تھے۔ ایک معمولی فخر کو انجینئر اور پرچی بنانے... شیشوں میں رنگین دوا بھرنے والے کمپاؤڈر کو ڈاکٹر کا روپ دے دیتے۔ کسی کا حجرہ نسب پوتروں کے رئیسوں سے ملا دیتے۔ کسی کو مغلیہ دور کے آخری بادشاہ ظفر کے خاندان سے ملا کر انہیں اور معتبر بنا دیتے تھے۔ غرض کہ ہوشیار اور کم پڑھا لکھا طبقہ منشی ذکوات اللہ کو اپنا ماضی دے کر اُن سے اپنا حال اور مستقبل بھاری معاوضے پر خریدتا تھا۔ یہی منشی جی کا کسب وکمال تھا۔ منشی جی کے نواب سبطین علی کے گھرانے سے کافی اچھے تعلقات تھے.....

پاکستان آنے کے بعد بھی ایک دوبار ان سے ملاقات ہوئی، یہاں شجرہ سازی کا کام تو تھا نہیں، البتہ انہوں نے کتابت کا کام شروع کر دیا تھا، جس سے ان کا گزارہ ہو جاتا لڑکے سب الگ رہتے تھے بیوی کا انتقال ہو گیا تھا کسی کے ساتھ رہنا انہیں گوارا نہیں تھا اس لیے اس عمر میں خود ہی اپنا رزق پیدا کرتے تھے۔ نوے سال کی عمر میں بھی تن کر چلتے تھے آنکھیں اب بھی روشن تھیں اس لیے لکھنے پڑھنے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی، ایک پوتے کو انہوں نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا، ملازمہ گھر سنبھالتی تھی۔ نواب صاحب ان سے ایک ہوٹل میں ملے۔ دیر تک ان کا مزاج اور خیریت پوچھتے رہے پھر نفس مدعا کی طرف آئے اور انہوں نے مختصراً مرزا فدا حسین کی دوستی۔ گھروں میں میل ملاپ کی پوری داستان سنادی اور یہ بھی کہ ان کی بیٹی سے میرے پوتے کی منگنی بھی ہو گئی اور یہ دونوں خاندانوں کی مشترکہ محبتوں اور رضا مندی سے ہوا تھا جس میں لڑکا اور لڑکی کی پسند بھی شامل تھی، پھر اچانک ایسا موڑ آ گیا کہ فدا حسین نے ہمیں سچ خاندان، سچ طبقہ کا کہہ کر بچوں کی منگنی توڑ دی، اسی لیے میں نے آپ کو زحمت دی ہے، مجھے معلوم ہے کہ آپ نے فدا حسین کا خاندانی شجرہ بنایا تھا، آپ میرے باپ۔ دادا اور پورے خاندان سے بھی واقف ہیں، اس سلسلے میں آپ ہی مجھے کوئی ثبوت مہیا کر سکتے ہیں جس سے میں اپنے دامن پر لگے ہوئے اس داغ کو دھو سکوں۔“ وہ چپ ہو گئے۔

منشی ذکوات اللہ نے غور سے نواب صاحب کی باتیں سنیں مسکرائے اور کچھ توقف کے بعد بولے۔

”نواب صاحب، آپ نے بہت اچھا کیا جو میرے پاس چلے آئے۔ میں آپ کے

والد کا نمک خوار ہوں اور مجھ حقیر فقیر پر آپ کے خاندان کے بڑے احسانات ہیں، شجرہ لکھتے وقت ہر چیز کی رازداری شرط ہوتی ہے..... لیکن چونکہ یہاں پر دو معصوم بچوں کی زندگیوں اور ان کی خوشیوں کا سوال ہے۔ اس لیے نہ میں آپ پر احسان کروں گا۔ نہ مرزا جی پر..... بلکہ جو کروں گا صاحبزادہ افضال اور بیٹی مہوین کے لیے۔ اب آئیے اصلیت کی طرف.....؟“

وہ سنبھل کر بولے۔

”فدا حسین آبائی پیشے کے لحاظ سے حجام ہیں۔ یعنی ذات کے نائی۔ ان کے دادا گھر گھر جا کر لوگوں کی حجامت بنایا کرتے تھے والد نے تھوڑا بہت پڑھ لیا تھا۔ اس لیے دکان کر لی۔ جو شبیر حسین بار برشاپ کے نام سے مشہور تھی، مگر پھر اچانک جانے ان کے انداز بدل گئے۔ اولاد کو اچھے اسکولوں میں پڑھایا۔ جائیداد بنائی۔ اور شرفاء کی محفلوں میں بیٹھ کر ان کے جیسے اطوار سیکھتے وقت یہ بھی نہ سوچا کہ وہ ماضی میں کیا تھے۔ پھر وہ حجام سے بزنس مین بن گئے۔ اور جب شادیوں کا مرحلہ آیا تو انہوں نے اپنی برادری کی جاہل اور بیک ورڈ لڑکیاں لینے سے انکار کر دیا۔ اس وقت فدا حسین اپنے والد کو لے کر خود میرے پاس آئے اور نہایت رازداری سے انہوں نے شجرہ سازی کے جو لوازمات تھے یعنی جعلی ناموں، فرضی مقامات کے وہ مجھے فراہم کر دیے اور فرمایا۔

”جس قدر خوبصورت، معیاری اور خاندانی شجرہ آپ بنائیں گے۔ اسی قدر آپ کو خوش کر دیا جائے گا۔“

”میں نے ان سے پانچ ہزار کی رقم طلب کی جو انہوں نے آدھی اسی وقت ادا کر دی۔ اور آدھی شجرہ لینے کے بعد ادا کرنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ اس طرح وہ خلیفہ جی سے مرزا صاحب بن گئے۔ اس کے بعد پھر ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ہاں میں نے ایک بار صدر میں انہیں ضرور دیکھا تھا۔“

”منشی جی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔“ نواب صاحب ان کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھ کر بولے۔

”ذہن میں کاٹنا سا گڑ گیا تھا جو آپ کی باتوں سے نکل گیا، لیکن کھٹک باقی رہے گی جب تک وہ اعتراف نہیں کر لیتے۔ ایک عرض اور کروں گا۔“

”فرمائیے نواب صاحب۔ ہم تو آپ کے خادم ہیں۔“ منشی جی نے ہنس کر کہا۔

”ارے نہیں منشی جی۔ آپ میرے بزرگ ہیں، کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ اگر مجھے آپ کی خدمات کی ضرورت پڑی تو کیا آپ زحمت فرمائیں گے۔؟“

”کیوں نہیں نواب صاحب۔ بشرط زندگی بخیر ہو میں فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔“
 ”بہت بہت شکریہ نشی جی۔“ نواب صاحب نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔
 اور انہیں خود اپنی کار پر لیاقت آباد ان کی رہائش گاہ پر پہنچانے گئے چلتے وقت
 انہوں نے کچھ نذرانہ نشی جی کو بعد اصرار پیش کرنا چاہا مگر انہوں نے نہیں لیا اور مسکرا کر کہا۔
 ”یہ میرے بیٹے اور بیٹی کا معاملہ ہے اگر بھی آپ کے کام آیا تو پھر انکار نہیں
 کروں گا۔“

☆.....☆.....☆

اسی کو کہتے ہیں چوری اور سیدہ زوری۔ وہاں سے آ کر نواب صاحب خوب ہنسے۔ اور
 پورے دن پوری رات اس کٹھنی کو سلجھاتے رہے کہ اب اس کا رد عمل کب ہونا چاہیے۔
 جب کہ یہ بات ان کے علم میں آ چکی تھی کہ ان کے ہونے والے دادا نام نہاد سہمی ذات
 کے نائی تھے۔ ان کا خاندانی پیشہ لوگوں کی جیسوں اور سر کی حجامت بنانا تھا جبکہ فدا حسین
 نے جانتے بوجھتے ہٹ دھرمی سے کام لیا تھا اور ایک بے بنیاد بات کو مسئلہ بنا کر مگنی توڑ
 دی تھی چاہئے تو یہ تھا کہ تم روٹھے۔ ہم چھوٹے پھر بھی وہ مرزا صاحب کی طرف رخ بھی
 نہ کرتے لیکن مسئلے کا حل یہ نہیں تھا۔ اس الزام تراشی کی تردید ضروری تھی اس کے علاوہ
 نواب صاحب کسی طرح مہوین سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے وہ ان کے
 لاڈلے پوتے کی محبت تھی۔ وہ اسے دکھی کرنا نہیں چاہتے تھے انہیں مہوین اسی طرح عزیز
 تھی جیسے انہیں مہروز اور سدرہ۔ نہ وہ مہوین کے مستقبل سے کھیل سکتے تھے نہ ناصر کے۔
 آخر ان کا کیا قصور تھا.....؟ انہوں نے سوچا۔

یہ انتہائی گری ہوئی حرکت تھی کہ وہ فدا حسین کی انتقامی کارروائی کو مزید انتقام میں
 بدل کر ان سے سارے رشتے ناتے توڑ لیتے۔ جبکہ اللہ پاک نے بھی بندوں کو ہدایت کی
 ہے کہ وہ کبھی برائی کو برائی سے شکست دینے کی کوشش نہ کریں۔ آگ کبھی آگ کو نہیں
 بجھا سکتی اس کی ہلاکت کو پانی کے چند چھینٹے ہی بقا میں بدل سکتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا
 میں نیکیوں کا بول بالا نہ ہوتا ہم سب باد آدم کی اولاد ہیں۔ ایک خدا کے بندے ایک
 رسول کا کلمہ حق پڑھنے اور ایک کتاب ہدایت پر چلنے والے۔ اس کے نزدیک نہ کوئی چھوٹا
 ہے نہ بڑا۔ ہمارا ظرف اتنا بڑا ہے کہ ہم انہیں معاف کر دیں گے اپنے بچوں کی خوشیوں کی
 خاطر۔ اگر انہوں نے اعتراف کر لیا تو.....؟

موسم اچھا تھا..... بھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں گو برسات کے بھیگے بھیگے دن تھے۔ مگر
 بارش کے کوئی آثار نہیں تھے۔ سرمئی سیاہ بادل آسمان پر چلتے پھرتے تو نظر آتے مگر پانی

کی ایک بوند ٹپکائے بغیر ہوا میں تحلیل ہو جاتے۔ البتہ فضا میں خنکی اتر آئی تھی اس تپا دینے
 والی گرمی میں ہوا کے ٹھنڈے جھونکے بدن میں یوں محسوس ہوتے جیسے سمندر سے نہا کر
 آئے ہوں۔ مہوین اور افضل راجہ عزیز بھٹی پارک میں ہرے بھرے ٹھنڈے سبزے پر
 بیٹھے خاموشی سے تھیل میں لمبی لمبی سفید گردنیں اٹھائے بطخوں کو چھلیں کرتے دیکھ رہے
 تھے۔ پہر ڈھل رہی تھی اور ماحول نے رنگ برنگے پھولوں اور درختوں کا رنگ اوڑھ
 لیا تھا۔ افضل نے مہوین کی طرف دیکھ کر افسوسناک لہجے میں کہا.....

”ماہی..... تمہارے ابو نے بڑی جلد بازی سے کام لیا۔ انہیں ایسا سنگین فیصلہ نہیں کرنا
 چاہئے تھا۔“

”آپ کو بھی قصائی بننے کی کیا تک تھی بھلا.....“ وہ دھیرے سے مسکرائی.....
 ”واہ بقول انکل کے یہ ہمارا آبائی پیشہ جو ہوا.....“ دونوں ہنس پڑے۔ فضا میں کچھ نفٹے
 بکھر گئے۔ مہوین کچھ روٹھی روٹھی سی لگ رہی تھی۔ ہنسنے کے بعد چہرے پر سایہ سالہرا گیا
 افضل نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اپنی انگلیوں پر گنتا شروع کیا پھر بولا۔
 ”دیکھو مہوین۔ میں خدا نخواستہ کوئی چور نہیں بنایا۔ ڈاکہ نہیں ڈالا۔ کسی کی جیب نہیں
 کتری۔ بس ایک معزز پیشے سے وقتی طور پر دوستی کر لی تھی۔“
 ”معزز پیشہ.....؟“ مہوین نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”ہاں ہاں.....“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”پیشہ کوئی بھی ہو معزز ہوتا ہے چاہے وہ قصاب کا ہو۔ موچی..... کا ہو یا جولا ہے اور
 شہ کا۔ محنت اور اکل حلال سے کمایا ہوا پیسہ اللہ کے نزدیک بے حد محترم ہوتا ہے۔ اب
 اگر یہ ”قصاب“ تمہیں پسند ہو تو تمہاری امانت کی حفاظت کی جائے ورنہ جس طرح چچا
 نے میری کوئل شیتل سی محبت کو غصے اور نفرت میں لپیٹ کر منہ پر مار دیا میں بھی تمہاری
 انگوٹھی واپس کر دوں.....“ مہوین نے نگاہ اٹھائی تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں لبریز تھیں۔
 ”اور کیا کیا چیز واپس کر دوں گے افضل۔ میری تو پوری زندگی تمہارے پاس امانت رکھی
 ہوئی ہے۔ انگوٹھی تو ایک رسمی اور ثانوی چیز ہے۔“ اس کے چہرے پر بڑا کرب تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ اس کی سسکی نکل گئی۔ اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگنے لگا
 افضل دکھ اور خاموشی سے سنگ مرمر کی اس صورتی کو آہستہ آہستہ پکھلتے دیکھتا رہا پھر اس
 کے منہ پر رکھا ہوا ہاتھ ہٹا کر آہستگی سے بولا۔

”میں جانتا ہوں ماہی۔ ہم دونوں تمام زندگی ایک دوسرے کو ڈھونڈتے رہیں گے اور
 چین نہیں پائیں گے۔ لیکن اب اتنی بھی مایوسی ٹھیک نہیں ہمیں تو ابھی اپنے حقوق کی جنگ

لڑنی ہے کیا اس موڑ پر تم مجھے تنہا چھوڑ دو گی؟“
”نہیں افضل....“ مہوین نے گیلی گیلی پلکیں اٹھا کر جواب دیا۔

”تم تنہا نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“
”شکریہ مائی۔ میں تمہارے منہ سے یہی سننا چاہتا تھا۔“

”افضل میں ایک بار دادو سے ملنا چاہتی ہوں“ میراجی چاہتا ہے ان کے مہربان سینے سے لگ کر آنکھیں بند کر لوں۔“
”تو آؤ چلیں۔؟“

”ابھی نہیں افضل۔ کافی دیر ہو گئی ہے پھر آؤں گی۔“ دونوں ساتھ ساتھ اٹھے۔
افضل نے کہا۔

”وعدہ کرو مہوین تم چچا کے کسی فیصلے کی توثیق نہیں کرو گی....؟“
”کیا مطلب مجھے اتنا کمزور سمجھ لیا ہے اطمینان رکھیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”اگر نصیب میں قصائی زادہ نہیں تو پھر کوئی شہزادہ بھی نہیں ہوگا۔“
دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلکھلا پڑے۔ ان کے چہروں کی طرح فضا کا رنگ بھی خوبصورت ہو گیا تھا....

☆.....☆.....☆

یہ مشہور تھا کہ شیطانوں کے گھروں پیدا ہوتے ہیں۔ تو غلط نہیں تھا نیک شریف صاف ستھری سوچوں کے ذہین اور محبت کرنے والے بچے۔ جنہوں نے باپ کے کردار اور اونچے بچ کو اپنے اعلیٰ ظرف اور اعلیٰ تشخص سے چھپا لیا تھا۔

جب منگنی کا سامان واپس ہوا تو جو مہوین کے دل پر گزری سو گزری لیکن ناصر کو بھی کم دکھ نہ ہوا۔ وہ بہن کے جذبات کو سمجھتا تھا اور افضل کی کیفیت بھی محسوس کر سکتا تھا اس نے نواب صاحب (دادو) اور تحسین انکل کی شفقت بھی دیکھی تھی اور گھر کے لوگوں کا پیار بھی۔ حیرت یہ بھی تھی کہ باپ کی بیس سالہ دوستی کے سفر میں اب تک کہیں کوئی کھائی، خراج، نشیب و فراز نہیں آئے تھے۔ اور اب اچانک انہیں نواب بسطین علی کی ذات میں ابھرا ہوا پھوڑا نظر آ گیا تھا۔ اس کا ناصر کو بڑا ملال تھا۔ اس نے باپ سے صرف اتنا کہا۔

”بابا جان۔ جب آپ نے اپنی دوستی کو ایک مستحکم رشتے میں بدلنے کا عزم کر لیا تھا اور بیٹی کی زندگی اس گھر سے وابستہ کر دی تھی پھر آپ نے عہد شکنی کیوں کی.... انسان اپنی زبان اور قول سے پہچانا جاتا ہے۔“

فدا حسین نے غور سے بیٹی کی طرف دیکھا، مسکرائے ماشاء اللہ اس نے خاصا قد نکال

لیا تھا اور باپ کے برابر آ گیا تھا۔ باپ نے زیادہ ذہانت اور سوجھ بوجھ کی باتیں کر رہا تھا آخری تہذیب کا نمائندہ تھا انہوں نے پیار سے بیٹے سے کہا۔

”تم ابھی بچے ہو۔ خاندانی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے نہ میں نے عہد شکنی کی ہے نہ اپنی زبان اور قول ہارا ہے اگر نواب صاحب نے اعتراف کر لیا تو ہمارے درمیان کوئی تنازعہ نہیں۔“

انہوں نے چند جملوں میں بات ہی ختم کر دی.... باپ سے بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے وہ خاموشی سے چلا گیا۔ ناصر اب بھی افضل سے ملتا تھا باتیں بھی ہوتی تھیں مگر اپنی ذات سے ہٹ کر۔ البتہ مہوین مجھ کر رہ گئی تھی حالات کے اس اچانک موڑ نے اسے سراسیمہ کر دیا تھا ایک دن وہ ماں سے اجازت لے کر گشتن چلی گئی۔ نیک خاتون کو اس معاملے میں شوہر سے شدید اختلاف تھا کہ انہوں نے بغیر سوچے سمجھے دونوں گھروں کا سکون دار پر چڑھا دیا تھا۔ انہوں نے بیٹی کو گلے سے لگا کر تسلی دی اور کہا۔

”بیٹی.... تمہارا باپ باضدی بھی ہے اور کم عقل بھی مجھے یقین ہے کہ نواب صاحب کی طرف سے کوئی مثبت قدم ضرور اٹھایا جائے گا.... اس وقت کا انتظار کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

اب اسے کسی کی پروا نہیں تھی اتنے لوگوں میں سارے ووٹ اس کے ساتھ ایک کے علاوہ آج وہ پچھلے بہت دنوں سے زیادہ خوش اور مطمئن تھی کئی دنوں سے دادو اسے بہت یاد آ رہے تھے۔ گھر کے مہربان لوگوں سے ملنے کے لیے وہ بے قرار تھی۔ اس لیے آج وہ ارادنا گھر سے نکل گئی گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی ڈھیروں چنبیلی کے ٹوٹے ہوئے پھول اس کے قدموں سے لپٹ گئے گلاب کی ڈالیوں نے جھوم کر اسے خوش آمدید کہا افضل کا سفید بالوں کا چھوٹا سا پیارا کتا پوپ۔ کون کون کر کے اس کے گرد گھومنے لگا۔ اس نے جھک کر اس کے نرم نرم ریشمی پھول جیسے بالوں پر مسکرا کر ہاتھ پھیرا وہ مہوین کے آگے پیچھے دوڑنے لگا۔ حمیدہ بیگم کی نگاہوں میں پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا وہ دوڑ کر ان کے سینے سے لگ گئی انہوں نے پیار کیا، گھر کی خیریت پوچھی نام بہ نام اتنی شفقتیں پا کر اس کی پلکیں بھیگ گئیں پھر سارے گھر میں اس کی خوشبو پھیل گئی، شکیلہ خاتون نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا پیار سے پوچھا۔

”کیسی ہو بیٹی....؟“

”ٹھیک ہوں....“ وہ مڑی تو حمیرا اور سمیرا مہر و زہنتی ہوئی آئیں اور اسے پٹا لیا۔
”کیسی ہو جانم....؟“ حمیرا نے افضل کے لہجے میں کہا تو وہ شرمائی....

”باجی آگئیں.... باجی آگئیں....“ گڑیا چینی ہنستی ہوئی آئی اور بے تحاشا مہوین سے

سے ہاتھ پھیرتے رہے اور ان کی آنکھوں میں وہ ننھی بچی آگئی جو سرخ و سبز پھولی پھولی فراک پہنہتی ہوئی آکر ان کے کندھے پر سوار ہو جاتی، کبھی گھوڑا بنا کر دادو کی پشت پر بیٹھ کر رخ کرنے لگتی۔ ان سے ٹائیوں کی ضد کرتی تھی، ان کے ساتھ آنکھ پھولی کھیلتی سب بچے دور کھڑے تالیاں بجاتے رہتے، اور وہ ان کا دامن پکڑ کر خوشی سے چلانے لگتی۔
 ”دادو چور.... دادو چور....“

پھر مجبوراً انہیں اپنی آنکھوں پر رومال باندھنا پڑتا، وہ جو ننھے منے قدموں سے لان میں دوڑتی پھرتی ان سے تلی پکڑنے کا اصرار کرتی۔ اکثر تلی کے لیے افضال اور مہوین میں لڑائی ہو جاتی، افضال بڑا تھا مگر مہوین کو ستانے کے لیے اسی تلی کی ضد کرتا جو دادو مہوین کو پکڑ کر دیتے تھے، نتیجے میں دونوں تلیاں اڑ جاتیں اور بے چارے دادو کو پھر تلی کے پیچھے بھاگنا پڑتا، دونوں بچے دادو کی آنکھوں کا نور تھے۔ پھر وہ لڑکی جوان ہو گئی۔ مگر اب بھی وہ اپنے دادو کو اسی طرح تنگ کرتی تھی، اسی طرح انہیں چاہتی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر سینے سے لگی آنسو بہاتی مہوین کو دیکھا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ خود بھی سامنے بیٹھ گئے۔ مسکرا کر بولے۔

”بیٹی.... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تمہارے بابا اور میرے درمیان مذاکرات کا پہلا اور آخری دور ابھی باقی ہے۔“ وہ ہنس پڑے۔

”تم تو اس گھر میں ہماری امانت ہو۔ جب چاہوں گا ہاتھ پکڑ کر لے آؤں گا۔ یہ منگنی دہائی کوئی چیز نہیں ہوتی اصل معاملات دل کے ہوتے ہیں۔ میں کبھی بھی اپنے بچوں کی حق تلفی نہیں ہونے دوں گا....“

ماہی کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا، وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ نواب صاحب نے کہا۔

”بیٹی۔ اپنے ذہن کا سارا بوجھ مجھے دے دو۔ تمہارے دادا کے کندھے بہت مضبوط ہیں اور اپنی پریشان سوچوں کو جھٹک دو۔ ہلکی پھلکی ہو کر وقت کا انتظار کرو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔ مہوین نے شکر گزار نظروں سے اپنے مہربان دادو کو دیکھا اور آسودہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلنے لگی۔

”میں جاؤں دادو....؟“

”ہاں بیٹی.... آؤ میں تمہیں نیچے تک چھوڑ آؤں۔“

☆.....☆.....☆

لیٹ گئی۔ مہوین نے اس کو چوم لیا۔ پھر سب لوگ ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگے گھر میں ایک دم خوشگوار سی ہانچل مچ گئی تھی۔ سب کی باتوں میں گرم جوشی اور محبت کی تڑپ تھی۔ کچھ بھی تو نہ بدلا تھا، وہی انداز.... وہی ہنسی مذاق۔ شوخیاں چائے کے لوازمات۔ محبت بھرے اصرار، اگر بدلا تھا تو دل کا موسم بدل گیا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود وہ باتیں کرتی کرتی کہیں کھو جاتی، اگر خیال آ جاتا کہ یہ پیار کرنے والی۔ بالکل اپنی اپنی ہستیاں اگر دور ہو گئیں دنیا نے ان سے جدا کر دیا تو کیا ہوگا....؟

اس کے اندر طوفان امنڈنے لگتے۔ جھک چلے لگتے ہر چیز تہیں نہیں ہو جائے گی۔ چہرے کا رنگ بدلتا تو وہ جلدی سے حمیرا کی بانہوں میں منہ چھپا لیتی۔ ایسی ہی کیفیت میں اس نے سر اٹھا کر کہا۔

”پھپھو۔ دادو ہیں گھر میں....؟“

”ہاں ہاں۔ ملو گئی کیا۔ چلی جاؤ۔ وہ اوپر اسٹڈی میں ہیں۔“ حمیرا نے اس کی پیشانی پر آئی لٹوں کو پیار سے چھو کر کہا۔ نواب صاحب شلیف سے کوئی کتاب نکال رہے تھے۔

جب سے وہ گورنمنٹ سروس کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ کتابوں سے ان کا شغف بڑھ گیا تھا۔ خالی بیٹھنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ مطالعہ کرنا۔ یا میڈیکل اسٹور میں جا کر نگرانی کرنا، یہی مشغلے رہ گئے تھے ان کے، سیاسیات اور تاریخ کی کتابوں سے ان کی الماریاں بھری پڑی تھیں۔ یہ ان کی صحبت کا ہی اثر تھا کہ فدا حسین ہر موضوع پر بے تحاشہ بولتے تھے، گفتگو کا شعور انہیں نواب صاحب سے ہی ملتا تھا۔ جب منگنی ٹوٹی اور فدا حسین نے اپنے چھوٹے ظرف کا مظاہرہ کیا.... وہ ان سے سخت ناراض تھے انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ منگنی کی انگوٹھی ہرگز واپس نہیں کریں گے۔ مرزا صاحب کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑے گا۔ وہ ان لمحوں کے منتظر تھے۔ انہوں نے کتاب ہاتھوں میں لی، مڑے، تھے کہ دروازے پر آسمانی آ پھل لہرایا۔

”دادو.... میں آ جاؤں....؟“ اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ آسمانی حور اندر آ گئی۔
 ”آؤ.... آؤ بیٹی۔“ انہوں نے اپنی بانہیں پھیلا دیں اور مہوین ان کی شفیق بانہوں میں سمٹ گئی۔

”دادو.... دادو....“ وہ سسکنے لگی اس نے اپنے رکے ہوئے تمام آنسوؤں سے دادو! گریبان بھگو دیا....

”میں آپ کی شفقتوں اور رحمتوں کی چھاؤں سے دور نہیں رہ سکتی.... اگر اس پناہ سے نکلی تو مر جاؤں گی....“ اس نے سسکیوں کے درمیان کہا، وہ اس کے ریشمی نرم بالوں پر پیار

اس دن فدا حسین صاحب کے فیملی وکیل نقوی صاحب نے انہیں فون پر یاد دلایا۔
”حضور... ہم تو پکلیں بچھائے بیٹھے ہیں... کب تشریف لارہے ہیں...؟“ نواب
صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا۔

”یار وکیل صاحب۔ اصل میں۔ ایک کیس میں الجھ گیا تھا، اب نکلا ہوں تو آپ ہی کی
طرف آرہا ہوں۔“

”تو کیا آپ نے وہ کیس جس کا ذکر فرما رہے ہیں جیت لیا ہے۔؟“ انہوں نے ازراہ
تمسخر پوچھا۔

”انشاء اللہ جیت ہی لوں گا۔ ایسا نکتہ تلاش کر لیا ہے کہ ایک ہی وار میں چاروں شانے
چت گرا لوں گا۔“

”ماشاء اللہ... ماشاء اللہ... میری طرف سے پیشگی مبارکباد قبول کیجئے۔“ ادھر سے بھی
قہقہہ بلند ہوا۔

”شکریہ وکیل صاحب۔“ نواب صاحب ہنس کر بولے۔

”باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔“ یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

نواب صاحب۔ ان دنوں بہت خوش تھے۔ بات بات پر قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ وہ
بچوں کی ایکٹیویٹیز کو سمجھ چکے تھے۔ بات کوئی خاص نہ تھی مگر کچھ لوگ ہنگامہ بنانے میں ماہر
ہوتے ہیں اور فدا حسین جیسے نو دہائیوں کے جوان کو نجیب الطرفین کہلانے اور ثابت کرنے
کے لیے اچھے ہتھکنڈے پر اتر آتے ہیں حتیٰ کہ اپنی اصلیت کو بھی بھول جاتے ہیں۔ ان
کے خیال میں اب مرزا صاحب کو اپنے صدیوں سے مدفون ماضی پر کم سے کم دو آنسو تو
ضرور بہا لینا چاہیے!...

آج افضل بہت دنوں بعد ہاکی میچ کھیلنے گیا تھا۔ جب سے اس کی زندگی میں یہ سانحہ
رو نما ہوا... اس نے کھیل کود اور تمام مشاغل ترک کر دیے تھے۔ بس آفس۔ کتابیں اور
پڑھائی۔ وہ تو بھلا ہو دوستوں کا انہوں نے اسے گھر گھر کر بڑی مشکل سے آنے والے
ہاکی میچ کے لیے تیار کیا تھا، خود ہی اسے پریکٹس کے لیے لے جاتے اور اس کے ساتھ مل
کر کھیلتے تھے۔ اور اسے جبراً ہی بھرنی پڑی تھی۔ یہ پُر خلوص دوستوں کی محبت اور پکڑ دھکڑ
تھی جس کی وجہ سے وہ میچ جیت گیا تھا۔ اور وقت بھی اچھا گزر گیا تھا اس وقت وہ خالی
خالی آنکھوں سے اپنے کمرے میں لیٹا دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے چھت کو گھور رہا تھا
مہوین اس کے سامنے ہنسنے لگی تھیں۔ وہ اس کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔

تب ہی دروازہ کھلا اور حمیرا۔ سمیرا ہنستی ہوئی اندر آ گئیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ گیا۔

”خیریت تو ہے۔“ وہ حیران ہو کر ان کے شوخ شوخ دھمکتے چہروں کو دیکھنے لگا۔
حمیرا بولیں۔

”افضل میاں۔ اب کی ہمارا پروگرام ہے کہ آنے والی عید سعید میں سب کو بیٹھے
چاول کھلا دیے جائیں۔“

”کیا مطلب...؟“ وہ مسہری سے اتر کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔

”اب تم اتنے کوڑھ مغز بھی نہیں کہ ہماری بات کا مطلب نہ سمجھ سکو۔“ سمیرا نے کہا۔

”ارے بھئی میں بتاتی ہوں۔“ حمیرا نے مسکرا کر افضل کی ہونق صورت کو دیکھا۔

”تمہاری شادی کا پلاؤ زردہ۔ لوگ تو جیسے ادھا رکھائے بیٹھے ہیں۔“ حمیرا ہنس پڑیں۔

”افضل وہ شیر بہادر کی مثال کیسی رہے گی...“ سمیرا بولی۔

”ہائے! ہن بن کر تو وہ گڑیا سی سچی بنی مثال اور بھی غضب کی لگے گی۔ کیا خیال ہے
تمہارا...؟“ افضل نے گھور کر دونوں کی طرف دیکھا۔ حمیرا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اور وہ
دھم سے صوفے پر گر پڑا۔ حمیرا اور سمیرا دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں... اور سنجیدگی
سے بولیں.....

”افضل... اب چھوڑ دیں یہ ضد۔ آخر مگنی ٹوٹنے کا سوگ کب تک۔؟“ سمیرا بولی۔

”کچھ ہمارے ارمانوں کا خیال تو کرو۔ اماں جان بھابھی جان۔ بابا جان سب نے
کیسے پلان بنائے تھے...“ افضل ایک جھٹکے سے اٹھا۔ اور شاکی نظروں سے دیکھتے
ہوئے بولا۔

”آج کل لوگ کتنے بے رحم ہو گئے ہیں۔ سب کو اپنے ارمانوں، اپنی پلاننگ فیمل
ہونے کا غم ہے۔ کوئی میرے اندر جھانک کر نہیں دیکھتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میری دنیا
زیورہ بر ہے۔ آرزوئیں کفن پوش ہیں۔ اور آپ لوگوں کو میرے سر پر سہرا سجانے کی فکر
ہے۔ مجھے نہیں کرنی شادی۔ پھپھو۔ اچھی دوست اچھے اپنے ہیں آپ ہی ہنس ہنس کر
کلیجے پر چھری چلا رہے ہیں۔ جائے آج سے ہماری بول چال بند۔“ وہ رُخ پھیر کر کھڑکی
میں کھڑا ہو گیا۔ حمیرا اس کے پیچھے آ کر بولیں۔

”ناراض نہ ہو افضل ہم تو یونہی چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ اصل میں ہم تمہیں خوشخبری
سنائے آئے تھے۔“ وہ سیدھا ہو گیا اور دونوں کی مسکرائی آنکھوں کو تکتا رہا...۔

”ہاں ہاں۔ افضل بابا جان۔ تمہاری سسرال جارہے ہیں۔ یقیناً خوش آئندہ نتیجہ بر
آمد ہوگا۔“

”دادو جارہے ہیں...؟“ افضل کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”مگر کیوں....؟“

”بھی تمہارے خسر صاحب کو سمجھانے۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس دلانے اور کیوں۔؟“

”دیکھ لینا وہ شادی کی تاریخ لے کر آئیں گے...“ سمیرا چپکتی آواز میں ہنس کر بولی۔
افضال کا سارا غصہ۔ ملال۔ اداسی لمحہ بھر میں بھک سے اڑ گئی۔ اور تینوں کے قہقہے
کمرے میں گونجنے لگے۔ جب سے گھر میں نواب صاحب کے فدا حسین سے مذاکرات
کی خبر پھیلی۔ سب کے دلوں سے دھڑ کے اندیشے دور ہو گئے تھے اور مہوین کا حصول مشکل
نہیں رہا تھا۔

سب کی شرارتیں، شوخیاں پھر واپس آ گئی تھیں۔ اس وقت بھی سدرہ اور گڑیا نے
شرارت کا پروگرام بنایا تھا اکرام، شارقین اور افضال کمرے میں تھے یہ دونوں اندر
آ گئیں.....

”اسلام علیکم بزرگو۔ ہم آپ کا انٹرو لینے آئے ہیں۔“ سدرہ نے کہا۔

سدرہ نے کرسی پر بیٹھ کر کاغذ قلم سنبھالا۔ افضال اور اکرام بھی شرارت کے موڈ میں
مسکرا کر انہیں دیکھ رہے تھے۔

”سدرہ گڑیا۔ یہ آپ نے انٹرویو کب سے لینا شروع کر دیا...؟“ اکرام نے پوچھا۔

”جب سے ہم نے صحافت میں قدم رنجہ فرمایا...“ وہ کچھ فخر سے گردن اٹھا کر بولی۔

”اوہو۔ تو یہ ٹھاٹ ہیں۔ بڑی اونچی پرواز ہے ماشاء اللہ۔“ شارقین ہنسنے لگا۔

”اچھا اب شروع ہو جائیے افضال صاحب جب آپ نے اپنی مدد آپ کرو کا یہ عملی
قدم اٹھایا تو آپ کے بابا جان کے کیا تاثرات تھے....؟“

”نہ پوچھیے صاحب۔“ افضال نے ایک ٹھنڈی سانس بھری....

”جب اس امر کا انکشاف ہوا۔ ہمارے بزرگ حضرات جہاں پرانا کا مسئلہ پیدا
ہو جائے تو وہ انگارے چبانے لگتے ہیں۔ اور جب بولتے ہیں تو لگتا ہے آتش فشاں پھٹ
رہا ہے میرے سامنے بھی یہی صورت حال تھی ہر لمحہ ایک آگ کا دریا عبور کرنا پڑ رہا تھا۔“
”اور جب یہ خبر وحشت اثر آپ کی سرال پہنچی تو....؟“

”تو پھر قیامت ہی آ گئی۔“ اکرام بڑے ضبط سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ”

دھاڑا۔

”اب کیا سارا انٹرویو ان کا ہی لوگی.... ہم بھی تو تھے اس قیامت میں ان کے ساتھ۔“
اکرام نے لپک کر سدرہ کی چوٹی کھینچ لی۔ وہ چیخی تو شارقین نے کاپی چھین کر پھاڑ دی۔“

بجل گئی.....

”جائیے ہم کچھ نہیں لکھتے۔ آپ لوگ انتہائی بد ذوق ہیں۔ ذرا بھی صحافیوں سے
بات کرنے کی تمیز نہیں....“

وہ پاؤں پختی چلی گئی پیچھے اونچے اونچے قہقہے سن کر سدرہ بھی ہنسنے لگی۔ اس نے انہیں
بے وقوف بنانا تو چاہا تھا مگر وہ خود بن گئی تھی۔ اس قسم کی شرارتوں میں دونوں بہت تیز
تھیں۔ خصوصاً آج کل سب کے موڈ بڑے باغ و بہار تھے سب کو یقین تھا کہ داد و افضال
کی سرال جا رہے ہیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا اور پھر اس گھر میں ڈھولک بجے گی
مبارکبادیاں گائی جائیں گی۔ شہنائی کا کانوں میں رس گھولنے لگی۔ خوب ہلاکٹا ہوگا۔
ہائے کتنا اچھا لگے گا۔ آخر وہ دن آ گیا جب نواب سبطین علی کو مرزا فدا حسین کے آستانے
پر جانا تھا۔ صبح ہی سے انہوں نے تیاریاں شروع کر دی تھیں الماری کے تمام کپڑے قالین
برڈھیر تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس موقع پر کیا پہن کر جائیں.... حمیدہ بیگم
بچھلائی ہوئی پھر رہی تھیں۔

”نواب صاحب۔ آپ نے بھی حد کر دی۔ کھلنڈرے نوجوانوں کی طرح لباس کا
انتخاب کر رہے ہیں۔ جیسے کسی شادی میں جا رہے ہوں۔ ساری الماری قالین پر ڈھیر
کردی ہے۔“ پھر انہوں نے حمیرا کو آواز دی۔ اس نے آ کر کمرے کا جوتا زہ ترین منظر
دیکھا تو بے ساختہ ہنس پڑی۔ ماں سے بولی۔

”اماں جان۔ آپ جائے میں تیار کرادوں گی بابا جان کو....“

حمیدہ بیگم مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔ جب نواب صاحب غسل فرما کر نکلے تو حمیرا نے ان
کی پسند کا جوڑا استری کر کے بیگم میں لٹکادیا تھا۔ اور اسی مناسبت سے سیاہ ملکشین پالش
کر کے رکھ دیے اور چلی گئی....

جب نواب صاحب سفید بھک شلوار، سفید سلک کا کرتا اور سیاہ واسکٹ پہنے۔ جوتے
میں چمر کرتے باہر آئے تو بے حد پریشان لگ رہے تھے۔ پھر وہ قدر آدم آئینے کے
سامنے کھڑے بال سنوارنے لگے۔ ستر کے باوجود وہ بیٹھک کے لگ رہے تھے۔ ان کی
پرسنائی اور ان کا رنگ روپ اب بھی قابل رشک تھا۔ بالوں میں دو چالیں ہی سفید ہوئی
ہوں گی۔ اس بڑھاپے میں وہ جوانوں کی طرح اکڑ کر چلتے تھے اور بچوں کی محفل میں بچوں
کی طرح قہقہے گا کر۔ لطفیہ سنا کر انہیں محفوظ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر چھوٹا بڑا ان سے
مُبت کرتا تھا۔

میکماں کی صحت اور خوشی کا راز تھا۔ وہ بن سنور کر حمیدہ بیگم کے سامنے مسکرا کر بولے۔

”بیگم! ذرا نظر اٹھا کر دیکھیے کیسا لگ رہا ہوں؟“ انہوں نے شپٹا کر دوپٹے کا آنچل ہر پر ڈال لیا اور جھینپ کر بولیں ”نواب صاحب۔ کچھ بھنک کھا گئے ہیں آپ۔ پوتے کی شادی کرنے جا رہے ہیں۔ ذرا تو لحاظ کیجئے۔ ابھی تک جوانی کے دن نہیں بھولے۔“ وہ ہونٹ بھیچ کر مسکرائیں۔

”حمیدہ بیگم! آپ کیا بوڑھی ہو گئی ہیں کہ آپ کو زمانہ بوڑھا نظر آنے لگا ہے۔ خیرے اٹھ کر صدقہ اتاریے۔ آج معرکہ سر کرنے جا رہا ہوں۔“ انہوں نے ہنس کر بیوی سے کہا۔ ”اللہ..... یہ عمر آگئی۔ آپ کے چونچلے نہ گئے۔“ وہ بدستور میاں کو جھپٹی جھپٹی نظروں سے دیکھ کر بولیں۔

”تھہریے بابا جان۔ میں اتارتی ہوں صدقہ۔“ حمیرا نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”اے نظر لگنے کا گمان ہے تو بیٹی ان کی پیشانی پر ٹیکہ لگا دو۔“ حمیدہ بیگم نے ہنس کر کہا۔ حمیرا اور نواب صاحب بھی ہنس پڑے۔ حمیرا نے سواروپیہ باپ پر سے اتار کر آیت الکرسی پڑھ کر پھونک دی۔ سب جانتے تھے کہ آج کا دن بڑا اہم ہے۔ دادو واقعی میدان مارنے جا رہے تھے۔ یا آر..... یا پار.....

☆.....☆.....☆

مرزا فدا حسین کا ڈیرنگ روم بڑی نفاست سے سجا ہوا تھا۔ ہر چیز میں مہوین کا ذوقی کمال بول رہا تھا۔ اس وقت وہ کمرے میں بڑی بے چینی سے کھل لگا رہے تھے۔ جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو۔ اتنے میں نوکر نے نواب صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ مرزا صاحب سنبھل کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ پردہ ہٹا اور نواب سبطین علی بڑے وقار سے اندر داخل ہوئے اور گونج دار آواز میں بولے۔

”السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔“ ان کے چہرے پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ ”وعلیکم السلام نواب صاحب۔ زبے نصیب تشریف لائیے۔“ مرزا صاحب نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور انہوں نے ہاتھ پکڑ کر صفوفے پر لا کر بڑے پیار سے بٹھا دیا۔ کچھ مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ مزاج پرسی کی رسم ادا کی گئی۔ گھر میں سب کی خیریت پوچھی گئی۔ اس اثنا میں ملازم چاندی کی ٹرے میں چینی کی خوبصورت پلیٹوں میں کچھ خشک میوہ اور کالج کے نفیس نازک گلاسوں میں صندل کا سرخ ٹھنڈا خوشبودار شربت لے کر آ گیا اور ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔ نواب صاحب نے خاموشی سے فدا حسین کی طرف دیکھا اور بولے۔

”فدا حسین یہ تکلف کیسا؟ میز بیٹی کہاں ہے ہمیشہ تو وہ میرے لیے شربت لاتی

تھی۔ اب کیا نئی بات ہو گئی۔ نہ میں بدلا ہوں نہ میری دوستی۔ پھر آپ کی روایت کیوں بدل گئی۔ کچھ ہو مرزا صاحب۔ وضعدار لوگ اپنی وضعداری نہیں چھوڑتے۔ میری بیٹی کو بلائیے۔“

مرزا صاحب کے ہونٹوں پر فخر مند مسکراہٹ آ گئی انہوں نے اثبات میں گردن ہلا کر نوکر سے کہا۔ ”بشیر یہ ٹرے اٹھا کر لے جاؤ۔ بی بی کے ہاتھ بھیججو۔“ ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ مہوین کو دادو کے آنے کا پتا تھا۔ وہ جیسے تیار بیٹھی تھی۔ جھٹ بشیر کے ہاتھ سے ٹرے لی اور دوپٹہ درست کر کے اندر چلی گئی۔ اس نے نیچی نظروں سے ٹرے میز پر رکھ دی اور کھڑی ہو کر آہستہ سے سرخم کر کے آداب بجالائی۔ نواب صاحب مسکرائے اور اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”جیتی رہو بیٹی۔ خوش رہو۔“

پھر مہوین نے ٹرے سے شربت کا گلاس اٹھا کر پہلے اپنے معزز مہمان کو ادب سے پیش کیا۔ پھر گلاس اپنے باپ کی طرف بڑھا دیا اور میوے کی پلیٹ آگے کھسکا کر ہوا کی طرح سرسراتی چلی گئی۔ نواب صاحب کا چہرہ چمک اٹھا۔ ہونٹوں پر وقار تبسم لرز نے لگا۔ آج وہ سننے نہیں سنانے آئے تھے۔ اپنی منوانے آئے تھے۔ اب تک جو ہوا ایک طرف تھا۔ مگر اب دوبدو تھا۔

دونوں شربت کے سپ لیتے رہے۔ ایک آدھ بات بھی کر لیتے تھے برسبیل تذکرہ..... فدا حسین کے اصرار پر نواب صاحب پلیٹ سے اٹھا کر میوے کا دانہ بھی منہ میں ڈال لیتے تھے۔ پھر خالی گلاس نوکر آ کر ٹرے میں لے گیا اور خاصدان رکھ گیا۔ مرزا صاحب نے چاندی کے ورق میں لپیٹی ہوئی گلوڑی اٹھا کر نواب صاحب کو پیش کی۔ انہوں نے مسکرا کر شکر یہ ادا کیا اور گلوڑی منہ میں رکھ لی۔ دونوں طرف پھر سکوت چھا گیا۔ ماحول میٹھ سا ہو گیا تھا۔ خاموشی طویل ہوتی جا رہی تھی۔ فدا حسین پہلو بد لئے لگے۔ ان کے چہرے سے اضطراب نمایاں تھا۔

”ہاں تو فدا حسین۔“ خاموش فضا میں نواب صاحب کی آواز ایک گرج بن کر مرزا صاحب کو چونکا گئی۔

”میرے یہاں آنے کا مقصد تو آپ پر واضح ہو گیا ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی اپنے بچوں کی ایکٹوٹیز سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ ان کا مقصد نیک اور تعمیری تھا۔ اس کے پیچھے کوئی برائی نہ تھی۔ اسی لیے آج میں آپ کے پاس تجدید عہد کے لیے حاضر ہوا

ہوں۔“ وہ اپنی بات ختم کر کے مرزا صاحب کی طرف دیکھنے لگے۔

”بس نواب صاحب۔ جتنی سکی میری ہونا تھی ہو چکی۔ اب زیادہ سہنے کی مجھ میں سر نہیں۔ یہ بات اسی جگہ دفن کر دیجئے۔ ہماری آپ کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ انہوں نے گویا احسان کا رد ان کے کاندھے پر رکھ دیا۔ نواب صاحب تمل گئے۔ ان آواز اونچی ہو گئی۔

”یعنی یہ کیا فرما رہے ہیں مرزا صاحب۔“ ان کے جلال نے ماحول کو تباہ کر رکھا تھا۔ ”ذلت و رسوائی کا باب تو آپ نے کھولا ہے۔ آج یوم حساب ہے فدا حسین مردہ کفر پھاڑ کر بولے گا لمحے لمحے کا حساب دے گا کہ کون کہاں تک نجیب الطرفین ہے۔ کس کا رشتہ بکری اور چھری سے ملتا ہے اور کس کا حسب نسب اُستری اور بالوں پر ختم ہوتا ہے۔“

سببطن علی آج واقعی حساب برابر کرنے آئے تھے۔ اس وقت سرتاپا بدلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ فدا حسین کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ ان کی آنکھوں میں حیرت بگولے اڑ رہے تھے۔ اور دماغ زلزلوں کی زد میں تھا۔ وہ ایک دم گڑبڑا کر بولے۔

”نواب صاحب۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ گھبراہٹ میں کھڑے ہو گئے۔

”وہی جو آپ نے سنا ہے۔ تشریف رکھیے۔ آپ کھڑے کیوں ہو گئے۔ مہربان مگر

ابھی تو بڑے بڑے انکشافات ہونا باقی ہیں۔ کبھی کبھی چاند پر تھوکا ہوا بھی اپنے منہ پر آکر

گرتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ منشی ذکاوت اللہ شجرہ نویس کو نہیں بھولے ہوں گے۔

ان کے آپ کے خاندان پر بڑے احسانات ہیں۔“ فدا حسین کا چہرہ بجھ گیا۔ آنکھوں میں وحشت اتر آئی وہ پھر کھڑے ہو گئے اور ہکلا کر بولے۔

”تو کیا وہ.... وہ منشی ابھی تک زن۔ زندہ ہے؟“

”جی ہاں۔ وہ منشی ابھی تک زن.... زندہ ہے۔“

نواب صاحب ان ہی کے لہجے میں ہکلائے اور پھر مسکرا کر کہا۔

”اماں یار.... یہ تم بار بار کھڑے کیوں ہو جاتے ہو چابی کے گڈے کی طرح؛ بیچہ کر آرام سے بات کرو۔“ نواب صاحب کی تنبیہ پر فدا حسین نے مسمی صورت سے انہیں

دیکھا اور بیٹھ گئے اب وہ چھری کے نیچے آچلے تھے۔ سارے دم خرم جواب دے گئے۔

نواب صاحب کے اندر پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں اور وہ سنجیدہ صورت بنائے انہیں

گھور رہے تھے۔ دفعتاً وہ غصے میں دھاڑے۔

”فدا حسین۔ میں آپ پر ہتک عزت کا مقدمہ دائر کرنے والا ہوں۔ اپنے بچوں کے حق

کے لیے کورٹ تک جاؤں گا اور گواہی کے لیے منشی ذکاوت اللہ کو بلاؤں گا وہ بتائیں گے کہ

آپ کا شجرہ جعلی ہے، فراڈ ہے۔“ کو اس ہے۔“ نواب صاحب کے تیور بڑے سخت تھے۔ فدا حسین کو کچھ کہنے کا یارا نہ تھا، ہاتھوں پیروں میں تھر تھری پیدا ہو گئی تھی۔ ہونٹ مرتعش تھے آنکھوں میں اجازت قبروں کی ویرانی بھر گئی تھی۔ نواب صاحب کا پر جلال انداز ان کے کڑے تیور ہی مرزا صاحب کو مار دینے کے لیے کافی تھا۔ اور انہیں مزا آ رہا تھا اندر قہقہوں کا شور مچانے میں نہ آ رہا تھا۔ وہ بمشکل اپنے اوپر قابو پار ہے تھے جلدبلا کر کھڑے ہو گئے۔

”یہ کیا بچوں جیسی حرکتیں کر رہے ہیں آپ..... بیٹھ جائیے ورنہ آپ کو کرسی سے باندھ دوں گا۔“

فدا حسین خاموشی سے بیٹھ گئے اور نواب صاحب بھی بیٹھتے ہوئے رسان سے کہنے لگے۔

”وہ تو اللہ نے بڑی خیر کردی مرزا کہ منشی ذکاوت اللہ سے بروقت ملاقات ہو گئی۔

ورنہ آپ نے تو ہمیں زن بچوں سمیت پلودیا تھا کہ کولہو میں، مگر اب آپ کی باری ہے قطعی نہیں چھوڑوں گا آپ کا جب تک اعتراف نامہ، معافی نامہ اخبار میں نہیں

چھپوا دیتے۔ ورنہ تیار ہو جائیے عدالت میں جانے کے لیے۔“ مرزا صاحب پر منشی

ذکاوت اللہ کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ پھر گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے پاؤں میں جیسے پھر کیاں بندھ گئیں وہ جلد جلد راؤنڈ لینے لگے۔ اب کی نواب صاحب اپنا قہقہہ نہ

روک سکے۔ ان کی حالت دیکھ کر انہیں ترس بھی آ رہا تھا اور غصہ بھی، اس شخص نے ایک

شریف آدمی کی پگڑی اتارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی.... براہو اس دولت اور سستی

شہرت کا۔ جس نے دوستی کا بھرم بھی نہ رہنے دیا۔ یہ تو نواب صاحب کی کوئی نیکی.... بچوں

کا ٹھہرا ستھرا کرداران کی معصومیت کام آگئی۔ ورنہ اس مکروفریب کی دنیا میں کس کس کو وہ

اپنی سچائی کا گواہ بناتے...؟

نواب صاحب بھی فدا حسین کے ساتھ پریڈ کر رہے تھے۔ ان کی بیجانی کیفیت سے

مرزا صاحب کے اندر کے طوفان کا پتا چل رہا تھا کہ وہ شرمندگی کی کس اذیت سے

دچار ہیں۔ آخر وہ جھنجھلا پڑے۔

”اجی حضرت۔ بس ہو چکی پریڈ.... مجھے بھی تھکا مارا چلو بیٹھو۔“ انہوں نے زبردستی ان

کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا۔ کچھ دیر انہیں سنبھلنے میں لگی۔ تب پھر نواب صاحب بولے۔

”فدا حسین کچھ تو بولے۔ اپنی صفائی میں کچھ کہیے مجھے مشکوک بندہ۔ افضال کو قصائی کی اولاد کہیے.... ہمارے کردار۔ ہماری ذات کو نشانہ بنائیے۔ بُرا بھلا کچھ تو کہیے...؟“

اب کی فدا حسین نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور ان کی طرف دیکھ کر مدھم آواز میں بولے۔

”نواب صاحب میں بہت شرمندہ ہوں مجھے معاف کر دیجیے۔“ ان کی آنکھوں میں

نمی تھی۔

وہ تہقہ لگا کر ہنس پڑے۔

”فدا حسین۔ میں یہی تو دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔ کہاں تک پہنچے آپ کی....؟“ وہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ نواب صاحب نے باغ و بہار لہجے میں کہا ان کی شوخی واپس آ گئی تھی۔

”اب شرمندہ بعد میں ہوں پہلے میری بات کا جواب دیں۔“

”نواب صاحب۔ اب کہنے سننے کو کیا باقی رہ گیا ہے۔ آپ نے تو مجھے ایک ہی وار میں پچھا دیا۔“ مرزا صاحب مجرموں کی طرح سر جھکا کر بولے۔

”خیر خیر.... اب اتنا اور عرض کر دیجیے کہ افضال بیٹے کی بارات لے کر کب حاضر ہو جاؤں....؟“

”جی جی۔؟“ فدا حسین بے ہوش ہوتے ہوتے بچے اور بے یقینی سے نواب صاحب کی طرف دیکھنے لگے۔

”ہاں ہاں... بارات لے کر کب آ جاؤں۔ تاریخ کا تعین تو آپ ہی کرنا ہے نا....؟“ وہ مسکرائے۔

”تو“ نواب صاحب آپ نے مجھ گنہگار کو معاف کر دیا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی۔؟“ وہ ایک دم سبطین علی سے لپٹ گئے اور مارے شرمندگی کے رو پڑے۔ دیر تک وہ ان کے سینے سے لگے روتے رہے نواب صاحب نے انہیں ہٹاتے ہوئے کہا۔

”یار.... یہ کیا عورتوں کی طرح رو رہے ہو۔ چلو آنسو پونچھ لو۔“

”مجھے مہوین اور ناصر کا مستقبل عزیز ہے۔ اور اپنی دوستی ان سب سے زیادہ مقدس اور محترم ہے اب اگر کوئی آپ سے کہے کہ مرزا صاحب کو آپ کا کان لیے جارہا ہے تو بجائے کوئے کے پیچھے بھاگنے کے اپنا کان دکھ لیجیے گا۔“ اب کی نواب صاحب کے ساتھ فدا حسین بھی ہنس پڑے۔ رخصت کرتے وقت مرزا صاحب آبدیدہ ہو کر بولے۔

”آپ بہت عظیم ہیں نواب صاحب۔“

”نہیں یار۔ عظیم وہ ہے جس نے ہمیں اچھا برا سمجھنے کا شعور دیا۔“ وہ مسکرائے۔

پھر دونوں دوست زندگی کو نئے رنگ نئے ڈھنگ نئے انداز سے سنوارنے اور اس کی چمن بندی میں مصروف ہو گئے۔

☆....☆....☆

کس نے کربیل کربلا لھے

ہمیشہ سے ضدی، کینہ توڑ، مغرور اور حاسد لڑکی تھی، صورت میں بھی وہ پری حسن بانو نہیں تھی، نہ اسے حور شامل کہا جاسکتا تھا بس وہ ایک عام سی لڑکی تھی،

کھلتا ہوا گندمی رنگ، مناسب خدوخال، لمبا چہرہ، بدن البتہ اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا شہر کی پڑھی لکھی، جدید سوسائٹی کی لڑکیوں بھی اپنے بناؤ سنگھار پر زیادہ توجہ دیتی ہے نئے فیشن کے ملبوسات، نئے اسٹائل کے بال، اور حسین مہ جین بننے کے گر اور لبھانے کے انداز سے وہ واقف ہوتی ہے۔ اس طرح وہ ایک خوش شکل لڑکی کہی جاسکتی تھی۔

تمکنت اتی تھی کہ کوئی اس کی طرف بڑھنے کی کوشش نہ کرتا۔ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات اسے گوارا نہ تھی۔ لحوں میں بے عزت کر کے رکھ دیتی تھی۔ اسی لئے کالج میں اس کی دوستوں کی تعداد بہت کم تھی اور اس کی طبیعت دیکھتے ہوئے وہ بھی رخصت ہو رہی تھیں بس ایک تنہا سہیلی یا دوست جو بھی تھی وہ ذکیہ تھی۔ خوبصورت اور تیکھے نقش و نگار کی سلونی موٹی سی لڑکی۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک غریب اسکول ماسٹر کی ذہین بیٹی تھی۔ جو نو میدہ کے ماتھ کالج میں بڑھ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ اس کے اتنے قریب آ گئی تھی کہ اپنی کم حیثیت اور کم روٹی کا طعنہ سننے کے باوجود ہنستی رہتی تھی۔ شاید اس کی بیوقوفی پر کہ حسن بات آتی جانی چیزیں ہیں۔ اس یرو تو کبھی اکر کر نہیں چلنا جاسیے، غرور تو خدا کو بھی پسند نہیں آیا کبھی مگر کچھ کہتے ڈرتی تھی کہ اپنی سرکشی، اور غرور کے باوجود وہ اسے اچھی لگتی تھی۔ وہ اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

نو میدہ بچپن سے اپنے کزن کو پسند کرتی تھی۔ اور ایک دن وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لان میں کھینچ لائی اور اسے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

”میں سچ کہتی ہوں قسم، جب سے میں نے ہوش سنبھالا میں نے آپ ہی کو اپنا مائاں سمجھا ہے۔ یہ دل آپ ہی کے لئے دھڑکتا ہے دماغ صرف آپ کو سوچتا ہے اور زندگی کے تمام چھوٹے بڑے راستے صرف ایک سمت کی طرف جاتے ہیں جہاں آپ

کے قدم اٹھتے ہیں، کیا آپ کو میری آنکھوں اور چہرے پر کچھ نظر نہیں آتا۔؟“
 قسیم بڑی حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کیا اس نے اب تک صرف محبت کا فلسفہ ہی پڑھا ہے کتابوں میں..... وہ سوچتے ہوئے اس کا ہاتھ چھڑا کرنری سے بولا۔
 ”نہیں، مجھے تو تمہاری آنکھوں اور چہرے پر ایک احمق لڑکی کا پرتو نظر آتا ہے جو اپنے قد سے بڑھ کر ماتیں کرتی ہے۔ خانا، مجہادہ سہابوں کے پیچھے مت بھاگو نادان لڑکی۔“
 ”میری نظر میں تمہارے لئے صرف ایک بہن کا احترام ہے، میں تمہارا چچا زاد بڑا بھائی ہوں۔ اس سے بڑھ کر مقدس رشتہ ہمارے درمیان اور کوئی نہیں آئندہ احتیاط کرنا۔“
 یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ وہ تمل کر رہ گئی۔
 ”اونسہ۔ بڑا آلا کہیں سے بہن بنانے والا۔“ اس نے کڑوا سامنہ بنا کر زمین پر تھوک دیا.....

ہنس کھ، قسیم کا جھکاؤ حدیقہ کی طرف تھا، جب کہ نومیدہ قسیم میں شروع سے دلچسپی رکھتی تھی۔ اور سرکشی کی حد تک اسے اپنانے کے چکر میں لگی رہتی تھی۔ مگر دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نومیدہ انتہائی چرب زبان، تلخ لہجہ رکھنے والی مغرور لڑکی تھی۔ خود نہائی کا چلتا پھرتا اشتہار اور قسیم نہایت سبور، شیریں اور نرم لہجے والا ایک خورونو جوان تھا اسے حدیقہ کی طرح اپنی چھوٹی چچی جان، زیبا بھی بہت پسند تھیں۔ محبت اور شفقت کا سہل اس کا جی چاہتا کاش، ہم سب لوگ حویلی میں رہتے یا پھر دادا۔ چچی، چچا لوگ شہر میں ہوتے، ایک ساتھ کتنا اچھا لگتا، اور کبھی کبھی زیبا بھی یہی سوچنے لگتیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ اپنی دونوں جھٹانیوں کو اپنی بانہوں میں لے کر چلتیں سب کے سکھ دکھ ساٹھے ہوتے۔ ہم اتنی دور دورہ نہ ہوتے۔ مگر ٹھیلین صاحب نے کبھی بچوں پر اپنی مرضی نہیں چلائی، جسے شہر پسند آیا وہاں رہ گیا۔ جسے گاؤں اچھا لگا، گاؤں میں رہا۔

شہر میں بڑے سے دو منزلہ مکان میں دونوں بھائی ابراہیم اور افرامیم رہتے تھے اوپر بڑے بھائی افرامیم اور نیچے چھوٹے یعنی بھائی ابراہیم اپنے بیوی بچوں سمیت رہتے تھے۔ نومیدہ کی ایک بہن تھی۔ اور دو بھائی وہ سب سے بڑی تھی، بھائی دونوں چھوٹے تھے مگر اس کی طبیعت سب سے جدا تھی۔ بھائی بہن اس سے خائف رہتے تھے۔ وہ نہ صرف بھائی بہن پر بلکہ ماں باپ پر بھی حاوی تھی۔

پھر چھٹیوں میں اچانک ابراہیم اور افرامیم نے بچوں کے ساتھ گاؤں جانے کا پروگرام بنالیا۔ اس وقت نومیدہ اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ لیکن چھوٹی سی عمر میں اس کی بڑی بڑی سوچیں تھیں۔ دنیا کو فتح کر لینے والی۔ اس نے سن تو رکھا تھا کہ چھوٹے چچا کی بیٹی حدیقہ بڑی خوبصورت اور محبت کی لڑکی ہے۔ وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ جس کی سب تعریف کرتے تھے خصوصاً قسیم کی آنکھوں کی چمک اس کے ذکر سے بڑھ جاتی تھی۔ چنانچہ اپنے ہوش میں وہ پہلی بار سب کے ساتھ گاؤں جا رہی تھی۔

سب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بچوں کو دیکھ کر دادا دادی، چچا چچی کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ آنکھوں کی جوت بڑھ گئی، سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا پیار کیا مگر نومیدہ ایک ایک چیز کو بڑی تحقیر سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بڑی نخوت تھی، تب اچانک محسوس ہوا جیسے کمرے میں روشنی ہو گئی سواٹ کا بلب ہزار واٹ کا ہو گیا۔ چھوٹی چچی اور دادی کے ساتھ حدیقہ اندر داخل ہوئی۔ سادہ شلوار سوٹ میں میک اپ سے مبرا اس کا معصوم حسن قیامت ڈھار ہا تھا۔ لمحہ بھر کے لئے تو وہ خود بھی مبہوت ہو گئی، تب چچی نے کہا۔
 ”بیٹی حدیقہ! یہ تمہاری کزن اور بہن نومیدہ ابراہیم ہیں، انہیں سلام کرو عزت سے بٹھاؤ خاطر داری کرو، یہ تمہاری مہمان ہیں۔“

”قسیم، میں تمہاری زندگی میں انگارے بھر دوں گی تمہارے پورے خاندان میں اپنی نفرتوں کا زہر پھیلا دوں گی، دیکھتی ہوں مجھے ٹھکرانے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔“
 افرامیم اور ابراہیم دو بھائی گاؤں سے تعلیم کے سلسلے میں آئے پھر وہیں انہوں نے نوکریاں کر لیں اور شادیاں بھی ان کے والد ثقلین گاؤں کے بااثر محنتی اور نیک آدمی تھے۔ انہوں نے تھوڑی سی زمین کو اپنی محنت سے خون اور پسینہ بہا کر گلزار بنا دیا تھا۔ پھر وہ اراضی آگے بڑھتی رہی۔ اس سے انہوں نے مالے کا ایک باغ لگالیا۔ حویلی بنائی اور بال بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزارنے لگے۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹی کو انہوں نے گاؤں کے ایک عزت دار خاندان میں بیاہ دیا۔ ان کا اپنا گاؤں میں فارم تھا۔ دو بیٹوں کو انہوں نے ان کی خواہش پر کراچی بھیج دیا۔

انہیں شہر کی ہوا لگ گئی، پھر انہوں نے وہیں اپنی پسند کی شادیاں کر لیں۔ باپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور ان کی خوشیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

چھوٹے بیٹے صاحبین نے باپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اسے گاؤں اور ہرے بھرے کھیتوں سے بہت پیار تھا۔ وہ انہیں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر باپ نے گاؤں کے منشی حمید الحسن کی شریف اور میٹرک پاس بیٹی زیبا سے اس کی شادی کر دی، اس نے آکر سارا گھر سنبھال لیا۔ بڑی سکھڑ اور خدمت گزار بہو تھی۔ بڑی دونوں بہوؤں کی طرف سے انہیں جو محرومی ملی تھی وہ چھوٹی نے آکر مسرتوں میں بدل دی تھی۔ خوبصورت اور سیدی سادی لڑکی تھی۔ ابراہیم اور افرامیم کبھی کبھی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں آکر ماں باپ سے مل جایا کرتے تھے۔ سب خوش ہو جاتے تھے۔ بچے خوب انجوائے کرتے۔
 حدیقہ صاحبین کی بیٹی تھی، ماں کی طرح میدے اور شہاب سے گندھی ہوئی۔ کم گو اور

”آداب۔“ کہہ کر حدیقہ نے مسکرا کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ مگر اس نے بڑی خشونت سے دیکھا۔

”میں اپنے برابر والوں سے ہاتھ ملائی ہوں۔“ اس نے بڑے غرور سے کہا۔
”مگر حدیقہ! یہ تمہارے چھوٹے بچے کی بیٹی ہے تمہاری ہی عمر کی تمہارے برابر کی ہے صاف ظاہر تھا کہ انہیں یہ بات شرمندہ لگ گئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں بھائی ابھی بچی ہے اور نئے ماحول میں آئی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ حدیقہ کے ساتھ مسکراتی ہوئی چلی گئیں تب ماں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا بولیں۔

”تم نے تو بد اخلاقی کی انتہا کر دی۔ کیا سوچیں گے یہ لوگ؟“

”ارے امی! گاؤں اور شہر والوں میں کوئی فرق ہونا چاہیے۔“

”فضول باتیں نہ کرو تم کس ماورائی دنیا سے آئی ہو انسانی تہذیب کے تقاضے ہر جگہ یکساں ہوتے ہیں۔“

مگر ماں کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر چلی گئی آج اس نے حدیقہ کو دیکھ لیا تھا تب سے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے مکھن ملائی جیسے بے داغ رخساروں پر اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں سے گڑھے ڈال دے۔ نوج نوج کر انہیں لہو لہان کر ڈالے.....

نفرت کی ایک لہر اس کے باوجود میں تیر گئی۔

اس دن حدیقہ اسے تنہا نظر آئی سب لوگ شاید کھیتوں کی سیر کو گئے تھے۔ اس نے حدیقہ کو دیکھا بڑے طنز سے مسکرائی اور آقا زادی کے انداز میں اسے حکم دیا۔

”اولڑکی مجھے پانی پلاؤ۔“ اس کا لہجہ حدیقہ کو سہا گیا۔ یہ طرز تخاطب اسے اچھا نہ لگا۔ مگر وہ بہر حال اس کی مہمان تھی۔

”جی ابھی لائی۔“ یہ کہہ کر وہ جھپاک سے کولر کے پاس گئی اس نے شیشے کا شفاف گلاس نکالا اسے دھویا کولر سے پانی بھرا گلاس کے نیچے پرچ رکھی اور سلیقے سے جا کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

”یہ لیجئے۔“ ابھی اس نے پانی کا گلاس آگے بڑھایا تھا کہ کوئی بچہ باہر سے دوڑتا ہوا آیا اور حدیقہ سے ٹکرا گیا۔ گلاس مع پرچ کے حدیقہ کے ہاتھوں سے گرا اور ایک چھٹانے کی آواز کے ساتھ نومیدہ کی چیخ بھی سنائی دی۔ کچھ پانی اس کے کپڑوں پر بھی گرا۔ اچھل کر چیخی۔

”بدتمیز گنوار۔“ اور اس نے لپک کر اس کے بال پکڑ لئے۔

حدیقہ بوکھلا گئی۔ بال اس نے اتنی زور سے پکڑے کہ حدیقہ بھی چیخ پڑی۔

”چھوڑیں میرے بال ہائے اللہ ہائے امی۔“

دونوں گتھم گتھا تھیں۔ ٹکرانے والا بچہ خود نومیدہ کا چھوٹا بھائی آصف تھا۔ بہن کی یہ حرکت اسے اچھی نہ لگی۔ اس نے دوڑ کر نومیدہ کے بال پکڑ لئے بولا۔

”چھوڑیں آپ! باجی کے بال۔ انہوں نے گلاس تھوڑی پھینکا تھا۔ وہ تو ان سے میں ٹکرا گیا تھا۔ غلطی میری تھی ان کی نہیں۔“

مگر نومیدہ کو اتنا غصہ آیا کہ زور سے بھائی کو دھکا دیا۔ زور کے دھماکے کی آواز کے ساتھ قسیم اور اس کی امی بھاگ کر اندر آ گئے اور جو منظر انہوں نے دیکھا تو وہ سناٹے میں آ گئیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے نومی۔“ تائی اماں نے لپک کر حدیقہ کو چھڑایا۔ اور وہ ہچکیاں لیتی ہوئی تائی اماں کے سینے سے لگ کر تھر تھر کا پنے لگی۔

”کیوں تم اسے مار رہی تھیں نومی؟“ بڑی اماں نے غصے میں اس کی طرف دیکھا۔

”میں نہیں چچی جان! یہ مجھے مارنے آئی تھی۔“ اس نے صریحاً جھوٹ بولا۔

”نہیں تائی جان! میں تو اپنے بال چھڑا رہی تھی انہوں نے میرے کتنے بال نوج ڈالے۔“

”باجی ٹھیک کہہ رہی ہیں تائی اماں۔“ آصف زمین سے اٹھ کر بولا۔ ”آبی نے جھوٹ کہا انہوں نے پانی مانگا ہوگا باجی سے.... وہ گلاس دینے لگیں میں بھاگ کر آ رہا تھا میری ٹکر سے گلاس ٹکر کر ٹوٹ گیا۔ بس آپ کو غصہ آ گیا انہوں نے کہا۔“ بدتمیز گنوار! اور انہوں نے باجی کے کس کر مال پکڑ لئے یہ دیکھئے ان کی تمٹھی میں کتنے بال ہیں۔“

معلوم نہیں بچے نے کب کا بدلہ لیا تھا۔

”ٹھہر جا کمینے ابھی بتائی ہوں تجھے۔“

بہن اس کی طرف لپکی اور قسیم نے خونخوار نظروں سے اس کو دیکھا۔ پھر تائی اماں حدیقہ کو اپنے سینے سے لگائے لگائے باہر آ گئیں۔ ان کے پیچھے قسیم بھی تھا۔ اسے اس وقت کے واقعے سے بے حد صدمہ ہوا تھا۔ اور حدیقہ اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ کئی دن تک باہر نہیں نکلی تائی اماں نے کہا۔

”بیٹی! میں تم سے بڑی شرمندہ ہوں وہ وحشی پگل لڑکی ہے ادب و آداب اور تہذیب سے بالکل نا آشنا بھول جاؤ اس واقعے کو درگزر کر دو ماں باپ کے لاڈ نے اسے خراب کر دیا ہے اپنے سے اچھی جو چیز دیکھتی ہے اسے اسی طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہے میں نے تو سوچا تھا کچھ دن اور یہاں رہ لوں گی مگر معلوم ہوتا ہے اس سر پھری لڑکی کی وجہ سے مجھے جلدی جانا پڑے گا بیٹی! تم خیال نہ کرنا۔“ انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔

”نہیں تائی جان ابھی آپ نہ جائیے میں نومی سے کچھ نہیں کہوں گی بلکہ کسی کو بھی نہیں

”ارے نہیں بھئی تمہیں کس نے بتایا؟“ وہ مزید حیرانی سے پوچھنے لگیں۔
 ”وہ آپ کی لاڈلی چیپٹی نومی ہنستے تھکھکھلاتے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی
 گنگنارہی تھی۔“

آئینے میں اس کا چہرہ ابھرا، وہ گھبرا کر مڑا، اس کی آنکھوں میں سخت غصہ تھا۔

”کیا بات ہے کیوں میرے کمرے میں آئیں؟“ بڑا تپا تپا سا لہجہ تھا۔
 ”آپ کو دیکھنے آئی تھی۔“ وہ بڑی ادا سے مسکرائی۔

”یہ اپنی تیاریاں کس لئے کہاں جارے ہیں آپ؟“ اس نے پھر یہ جھجھا۔
 ”کیوں میں کہیں جارہا ہوں مطلب؟“

”مطلب نہ ہوتا تو میں کیوں وقت بے وقت آپ کے راستے میں یوں آ کر کہو جاتی۔“ وہ مسکرائی۔

”بولو بولو کیا بات ہے؟“ وہ ہمہ تن گوش بھی تھا اور غصہ بھی آ رہا تھا۔

”آپ جانتے ہیں۔ آپ کو سب کچھ پتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ پھر چھلاوہ کی طرح غا بونگی۔

”اس کا دوست گاؤں جانے کے لئے گاڑی لے کر آیا تھا۔ ہارن کی آواز پر وہ اتر ا۔“ ارے ارے ذرا ٹھہریے تو۔“ وہ کمرے سے نکل کر اس کی طرف دوڑی۔

”یا اللہ خیر۔“ وہ چپ چاپ جہاں تھا وہیں کھڑا ہو گیا۔ اور وہ سامنے آ کر بولی۔
 ”ایک شعر سن لیجئے۔“

اس کا جی چاہا اپنا سر پیٹے لئے مگر خون کا سا گھونٹ پی کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”جی ارشاد۔“

”عرض کیا ہے۔“

ہمیں نہ چھیڑ کہ ہم سوز غم کے مارے لوگ
 سجائے پھرتے ہیں آنکھوں میں کرچیاں دل کی
 ”کیسا ہے؟“

”بہت اچھا ماشاء اللہ بڑی ترقی کر رہی ہو۔“ اور وہ جلدی سے جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

پھر بہت سے دن آگے سرک گئے۔ نو امیدہ فائل کا امتحان دے رہی تھی۔ اور قسم ایس سی کر رہا تھا۔ پھر اس کی خواہش پر بڑی اماں نے گاؤں جا کر حدیقہ کو قسم کے نام انگوٹھی پہنا دی۔ انہوں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔ چپ چپاتے یہ کام ہو گیا۔ دیکھا گیا ہے کہ کوئی بات اگر چھپانے کی کوشش کرو کسی مصلحت سے سہی وہ خوشبو کی طرح سب سے پہلے ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ یہ خبر بھی نو امیدہ کو سب سے پہلے ملی۔ وہ جو قسم پل پل کی خبر رکھتی تھی کہ کہاں گیا۔ کس سے ملا، کیا کیا، سو یہ خبر اسے ذکیہ نے سنائی تھی اس کے بھی کچھ رشتے دار گاؤں میں رہتے تھے اس حوالے سے اس کا وہاں آنا جانا تھا اور نو امیدہ نے اپنے متعلق اسے سب کچھ بتایا ہوا تھا۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ بچپل:

جائی جان گاؤں جا کر حدیقہ سے قسم کی متغنی کر آئی ہیں تو اس نے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بھائی بھاونے بھی اچھا خاصا محاذ قائم کر لیا تھا۔

بھائی نے بھائی سے جواب طلب کر لیا انہوں نے بھائی سے پوچھا۔

”آپ نے ہمیں کیوں نہ بتایا ہمیشہ ساتھ رہنے والے دو بھائیوں کی اولادوں میں یہ فرق یہ غیریت کیوں برتی ہمارے دکھ سکھ تو سناجھے تھے۔ تو پھر آپ نے گھر سے باہر کیوں خوشی کے راستے تلاش کر لئے جب کہ ہماری بیٹی تعلیم تہذیب اور حسن و خوبصورتی ذوق میں حدیقہ سے کہیں بہتر تھی۔“

پھر ان کی بیگم نے منہ میڑھا کر کے اپنے جینٹھ جھانی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ارے اس گنوارن سے بھلا میری نو امیدہ کا کیا مقابلہ۔“

اب بڑے بھائی کا خاموش رہنا مشکل تھا۔ انہوں نے انتہائی نرمی اور سمجھ داری سے بھائی بھاونے کو مخاطب کر کے کہا۔

”رشیدہ بھابی آپ نے جو کچھ کہا اس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں میں جانتا ہوں نو می ایک پڑھی لکھی اور اچھی لڑکی ہے، مگر اب اسے کیا کہا جائے کہ وہ میرے بیٹے کے معیار مزاج اور زندگی گزارنے کے لائحہ عمل پر پوری نہیں اترتی، اسے ایک سیدھی سادی نرم خو خدمت گزار گھریلو اور مزاج آشنا بیوی چاہیے تھی اور حدیقہ میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں بھابی زندگی کی قسم کو گزارنی ہے ہم اپنی اولاد سے اپنے ماں باپ اور سرپرست ہونے کا تاوان نہیں لے سکتے، انہیں پرورش کرنا تعلیم و تربیت دے کر اچھا انسان بنانا تو ہر ماں باپ فرض ہوتا ہے، لیکن اس کے بدلے میں ان پر اپنی مرضی مسلط کرنا، بچوں کے جذبات سے کھیلنا سراسر انا انصافی ہے، ہم اپنی اولاد کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہاں اگر وہ کوئی غلط راستہ اختیار کرنے کی کوشش کریں گے تو ہم انہیں ضرور روکیں گے، منع کریں گے، مگر قسم نے کسی غلط راستے کا انتخاب نہیں کیا ہے حدیقہ بھی تو ہمارا ہی خون ہے بھابی ہمارے چھوٹے بھائی کی نیک اور معصوم بیٹی حدیقہ اور نو امیدہ ایک ہی شاخ کے دو پھول ہیں پھر ہم پر تفریق کا الزام کیوں؟“

ایک چیز تقدیر بھی تو ہوتی ہے بھابی، ہو سکتا ہے اس کی تقدیر میں قسم سے بہتر کوئی شوہر لکھا ہو اعلیٰ صلاحیتوں اور خوبیوں کا مالک۔“

چھوٹے بھائی بھاونے تو بڑے بھائی کی باتوں سے لا جواب ہو کر چپ ہو گئے، مگر نو امیدہ کے سینے کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ یہ اس کی سراسر توہین تھی۔ اس دو ٹوکے کی کم رو کم پڑھی لکھی، کمزور اور دیہاتی لڑکی نے اس کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا اسے شکست دی تھی۔

”میں بھی اسے تمام زندگی چین نہیں لینے دوں گی۔ دیکھوں گی یہ کب تک سہاگن رہتی ہے میری آپس اس کی زندگی کی ہر خواہش ہر خوشی کو تاراج کر ڈالیں گی۔“

”قسیم تم نے مجھے ٹھکرا کر اپنی موت کو آواز دی ہے میں تمہیں جینے نہیں دوں گی۔“

نومیدہ اس دن تڑپ تڑپ کر روئی اس نے دامن پھیلا پھیلا کر کوسا خوب خوب بددعائیں دیں۔ اور ماں باپ اندر ہی اندر لرزتے رہے۔ وہ اپنی بیٹی کی شعلہ فشاں سے بے حد خوفزدہ تھے۔

☆.....☆.....☆

پھر اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ جلد ہی اس کا رشتہ آ گیا۔ لڑکے کا لندن میں ذاتی بزنس تھا والدین بھی اس کے وہیں تھے۔ بیابھی بہنیں یہاں تھیں اور وہی نومیدہ کا رشتہ لائی تھیں۔ ابراہیم صاحب نے ضروری تحقیقات کے بعد رشتہ منظور کر لیا۔ اور دو ماہ کے اندر اس کی شادی کر کے رخصت کر دیا۔ گاؤں سے بھی سب لوگ شادی میں شرکت کے لئے آئے تھے مگر حدیقہ دادی کے پاس رہی تھی۔ کیونکہ ان دنوں ان کی طبیعت خراب تھی۔ حدیقہ خود بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نومیدہ کی نفرتوں کو بھولی نہیں تھی۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ سب بہت خوش تھے۔

اس کی بعد پھر حدیقہ کی بھی شادی ہو گئی اور وہ رخصت ہو کر قصر ابراہیم میں آ گئی اس کی یہاں بڑی پذیرائی ہوئی ابراہیم اور ان کی بیگم رشیدہ خانم نے بھی اسے بہت پیار دیا کیونکہ قسیم سے کہیں اچھا داماد انہیں مل گیا تھا۔ اس لئے پچھلی تمام رنجشیں انہوں نے بھلا دی تھیں۔ مگر نومیدہ کے لئے یہ مزید عذاب ناک تصور تھا کہ حدیقہ بیاہ کر اسی گھر کے ایک حصے میں آئی ہے۔ جہاں بل پیل اس کا قسیم کے ساتھ گزرا تھا۔ وہ اپنی شکست کو بھولی نہیں تھی۔ جب بھی ماں کو فون کرتی تو حدیقہ کے لئے اس کی زبان سے کوئی اچھا جملہ نہ نکلتا۔ وہ بیٹی کی باتوں سے اندازہ لگالیتی تھیں کہ نومیدہ ابھی تک اپنی ہار کو نہیں بھولی تھی۔ وہ اسے سمجھانے لگتیں۔

”بیٹی! جو انسان کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہی پورا ہوتا ہے یہ شادی بیاہ سب قسمت کے کھیل ہیں بیٹی تمہیں شکر کرنا چاہیے کہ تمہیں قسیم سے کہیں اچھا شوہر ملا ہے پھر کیوں دل برا کرتی ہو بھول جاؤ سب۔“

”نہیں ماما میں اپنی اس بے عزتی کو کبھی نہیں بھول سکتی کہ اس بڑے باپ کے بیٹے نے ایک ایجوکیٹڈ حسین لڑکی کے مقابلے میں ایک جاہل گوار لڑکی کو فوقیت دی۔“

”بری بات ہے بیٹا تم اپنے شوہر اپنے گھر اور بچوں کو دیکھو اللہ نے تمہیں وہ سب

کچھ دیا ہے دولت عزت محبت جو تمہیں قسیم نہیں دے سکتا تھا تمہیں تو ہر لمحہ شکر گزار رہنا چاہیے اپنے خدا کا اس نے تمہیں ہر طرح نوازا ہے۔“

”اوہہ! شکر.....“ اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

جب ابراہیم اور ابراہیم شہر میں سیٹ ہوئے تھے اس وقت ساتھ میں رشتے کے ایک ماموں زاد بھائی مکرم علی بھی تھے۔ ان کے پاس پلاسٹک کے برتنوں کی ایجنسی تھی اور انہوں نے صدر میں ایک دکان بھی لے لی تھی۔ مگر ہائش کے لئے بہت پریشان تھے جس کا حل اس طرح ابراہیم نے نکالا کہ تیسری منزل تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔ مکرم علی نے تیسری منزل پر تین کمرے کچن وغیرہ بنوایا۔ اور ہائش اختیار کر لی۔

ان کی بیوی بڑی محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ رحمت بی بی کو خدا نے سراپا رحمت بنایا تھا مکرم کو سب بڑے بھائی اور ان کی بیوی کو بڑی بھابی کہتے تھے۔ ابراہیم کی بیوی سے ان کا بڑا بہنہ پاتا تھا۔ رحمت بی بی اگر دال بھی پکاتیں تو وہ ابراہیم کے دسترخوان پر ضرور نظر آتی اسی طرح ابراہیم کی بیگم کوئی ڈش بناتیں تو وہ رحمت بی بی کو ضرور بھیجتیں آنا جانا تو ان کا ابراہیم کے گھر بھی تھا مگر پوشیدہ بھابی ذرا لئے دیئے رہنے والی مختلط قسم کی خاتون تھیں۔ زیادہ بے لطفی پسند کرتی تھیں اس لئے وہ بھی ان سے کم کم ملتی تھیں۔

حدیقہ اور قسیم کی ازدواجی زندگی قابل رشک تھی۔ ساس سسر اس پر مہربان تھے۔ دود پور تھے اس کے ایک تو لاہور چلا گیا۔ وہاں اس نے ایک بنگلہ سے شادی کر لی۔ دوسرے کی بیوی ایک صنعت کار کی بیٹی تھی پڑھی لکھی۔ خوش مزاج اور محبت کرنے والی زریں حدیقہ کی اس سے بڑی ہوتی تھی۔ حدیقہ کے دو بیٹے دو بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی بھی عروسہ اس کے بعد انیقہ پھر دو بیٹے زریں کی صرف دو بیٹیاں تھیں گھر میں بڑی رونق رہتی تھی۔

عروسہ بڑی حساس ماں کی طرح خوبصورت تھی پہلے وہ پلان بناتی تھی۔ پھر ان پر عمل درآمد کرتی تھی۔ رشیدہ بھابی سے معلوم ہوا تھا کہ نومیدہ کے بھی چار بچے تھے۔ جس میں تین بیٹیاں تھیں اور صرف ایک بیٹا جو پہلو بھی کا تھا۔

”اب تو اسے عرصہ ہو گیا۔ ایک آدھ پھیرا تو لگانا تھا اسے پاکستان کا۔“

تائی نے کہا تو رشیدہ مسکرا کر بولیں۔

”وہ کہتی ہے جب میرا بیٹا جوان ہو جائے گا تب پاکستان آؤں گی۔“

”کیوں کیا اس نے کوئی منت مانی تھی؟“ رحمت بی بی نے ہنس کر پوچھا۔

”نہیں بلکہ اس کی تعلیم مکمل کر کے آئے گی۔“
”پھر تو ٹھیک ہی کہا اس نے۔“

☆.....☆.....☆

ایک دن ابراہیم کی بڑی سالی یعنی رشیدہ خانم کی بڑی بہن رہنے کے لئے آگئیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جو بیوی بچوں کے ساتھ باہر تھا۔ اور وہ اکیلے گھر میں گھبراتے تھیں۔ کبھی ایک عزیز کے گھر، کبھی دوسرے کے گھر، کبھی کسی ملنے والی اور کبھی کسی سہیلی کے گھر ان کے دن گزرتے تھے۔ زبان کی بڑی تیز تھیں۔ باتوں میں انہیں ید طولی حاصل تھا۔ تمام محلے اور سارے خاندان والوں کی انہیں خبر رہتی تھی۔ ہر ایک سے آگاہی ان کی بابی تھی۔ رشیدہ نے کہا۔

”اے آپا! آپ خواجواہ گھر گھر جھانکتی پھرتی ہیں، میرا اتنا بڑا گھر پڑا ہے اپنا گھر کرائے پر اٹھا دیں اور یہاں آ جائیں، ہمیں دوسرا ہٹ ہو جائے گی۔ جب سے نومیدہ گئی ہے میرا دل اڑا اڑا رہتا ہے۔ دونوں بیٹوں کو بھی ابراہیم نے باہر پڑھنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ میں تو بالکل تنہا رہ گئی ہوں۔“

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، بڑی آپا کو تو جیسے پیغمبری مل گئی، جھٹ انہوں نے سامان باندھا، چابی پڑوس میں دی اور رکشا کر کے گھر آگئیں، تب سے وہ خالہ اماں کے منصب پر فائز ہو گئیں زبان کچھ اور ان کی تیز ہو گئی تھی، انہوں نے آتے ہی تینوں منزلوں کا سروے کر ڈالا، کچھ حالات دیکھے۔ کچھ سنے، کچھ چھوٹی بہن سے معلوم ہو گئے۔ باقی رہی سہی کسر نومیدہ نے فون پر اپنی خالہ کو اپنا دکھ بتا کر پوری کر دی۔ اب خالہ اماں کی نگاہ خاص حدیقہ پر تھی۔ کبھی مہربان، کبھی نامہربان.....

☆.....☆.....☆

نومیدہ کی چرب زبانی اور منتقمانہ ذہنیت کے باوجود اس کی خالہ اسے بہت چاہتی تھیں جب سے وہ یہاں آئی تھیں رات بارہ بجے کے بعد فون پر جو باتیں خالہ بھانجی میں ہوتی تھیں اس کا محور صرف حدیقہ تھی۔ آج چندہ سال گزرنے کے بعد بھی اس کے کلیجے کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ سو خالہ اماں اس کے لئے وہ کام کرنے کو تیار ہو گئیں۔ جو وہ کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ چنانچہ اب وہ لمحہ شاید آ گیا تھا جب کبھی مانگی ہوئی دعائیں اور بددعائیں قبولیت کے دامن میں پناہ لے رہی تھیں، سلگتے دلوں کو تسکین کا سامان مل رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ انتقام تھا یا تقدیر..... کہ عمر کی نقدی ایک دم ختم ہو گئی، معصوم حدیقہ بے قصور ماری گئی۔

رات اچانک قسم کی طبیعت خراب ہو گئی، اس پر وحشت طاری تھی۔ اور وہ بستر سے اٹھ کر بھاگ رہا تھا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا تو اس نے نیند کی گولی کھلا کر سلا دیا اور دو امیں دے کر چلا گیا۔ مگر جب اسے ہوش آتا اس پر اسی طرح وحشت ماری ہو جاتی اور وہ اپنے ہاتھ پاؤں پٹکنے لگتا۔ حدیقہ روتے روتے پاگل ہوئی جارہی تھی۔ ماں باپ، گھر والے سب ہی جیسے سولی پر چڑھ گئے تھے۔ یہ کیا ہو گیا تھا اسے؟

پھر ڈاکٹر آیا تو اس نے بتایا کہ کوئی چیز کھانے میں دی گئی ہے بہر حال اس نے دوا دی تو اس سے وہ تھوڑا سا پرسکون ضرور ہو گیا مگر تیسرے دن اسے خون کی ایک بڑی سی تے آئی اور اس نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر کے سر ڈال دیا۔ گھر میں کھرام برپا ہو گیا۔ باپ سکتے میں آ گیا۔ ماں نے اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔ حدیقہ پر غشی طاری ہو گئی۔

جو دیکھتا اس کا کلیجہ منہ کو آئے لگتا۔ ہائے جوان بیوہ، چھوٹے چھوٹے یتیم بچے..... جوان موتیں خدا کسی کو نہ دکھائے۔ ماں باپ تو زندہ درگور ہو گئے تھے اور بیوی کے پاؤں کے نیچے سے کسی نے زمین کھینچ لی تھی۔

☆.....☆.....☆

خالہ اماں سے جو کام نومیدہ لینا چاہتی تھی، وہ لے چکی تھی، اس واقعے سے خالہ اماں اس قدر خوفزدہ تھیں کہ انہیں بخارا آ گیا۔ گھر والے قسم کے جنازے میں گئے ہوئے تھے۔ رات دیر سے آئے اور وہ کسی سے فون پر چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں۔

”ہائے خالہ اماں آج میرے سینے میں ٹھنڈک پڑی، میں آ کر آپ کا منہ موتیوں سے بھر دوں گی۔“

نومیدہ فون پر خوب چپک رہی تھی، اور خالہ اماں روتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھیں۔

”نہ بچی! مجھے تمہارے موتی مونگے نہیں چاہئیں، مجھ سے اس بڑھاپے میں بہت بڑا گناہ ہو گیا ہے ہائے میرے رب اس کی بیوی جو نوخیزی سے اب شباب پر آئی تھی کہیں سے چار بچوں کی ماں نہیں لگتی تھی، ارے کجخت، یہ تو نے مجھ سے کیسا ظلم کروادیا۔ میں اپنے خدا کو کیا جواب دوں گی۔“

وہ ہر تھر کا نپ رہی تھیں۔

”ارے خالہ اماں! آپ تو خواجواہ ڈر رہی ہیں اچھا میں اللہ تعالیٰ سے کہوں گی کہ اگر یہ گناہ ہے تو اسے میرے اعمال نامے میں لکھ دے۔“ (تہقہہ)

”وہ تو تیرے حساب میں جائے گا ہی مگر مواخذہ تو مجھ سے بھی ہوگا تیرے ساتھ میں کئی بچی جاؤں گی۔ ہائے یہ میں نے کیا کیا؟“ اور انہوں نے غصے میں فون پٹ دیا۔

گاؤں سے سب لوگ آ گئے تھے۔ حدیقہ تو طوفان میں گھری کھڑی تھی، کہیں سے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ افرابیم صاحب تو پہلے ہی دل کے مریض تھے۔ جوان بیٹے کی موت کے دو ماہ بعد وہ بھی بیٹے کے پاس چلے گئے۔ موت نے جیسے یہ گھر دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد بڑی تائی، چچی، دیور اور دیورائی کی نگاہیں ایک دم بدل گئیں۔ انہوں نے حدیقہ کو ایک زبان ہو کر منحوس قرار دے دیا۔ اور اسے منحوس کا ٹائٹل بخشے میں رشیدہ چچی پیش پیش تھیں۔

پھر ایک دن بڑی آپا نے اپنا مختصر سامان باندھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بہن سے بولیں۔

”میں تمہیں اتنا ظالم نہیں سمجھتی تھی۔ ایک تو اس بدنصیب کا شوہر فوت ہو گیا وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی اور بجائے ہمدردی کے تم نے اسے منحوس قرار دینے کی تحریک چلا دی وہ بے چاری کیا کرے گی۔ کس دامن میں منہ چھپائے گی۔ میں اب یہاں ہرگز نہیں رہوں گی۔“

”ارے واہ آپا، تمہیں یہ اچانک حدیقہ سے کیسی ہمدردی ہو گئی۔“

”بس ہو گئی، جو غلط ہے، سو غلط ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اندراپنا سوٹ کیس لینے گئیں تو خود اپنے ہی الفاظ انہیں کھوکھلے اور بے معنی نظر آئے، ضمیر نے ان پر کوڑوں کی بارش کر دی کہ پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر بتا اس ہنتے بے گھر کو اجاڑا کس نے، اس معصوم کے سر سے چادر کس نے پھینچی؟ آج پارسا بن کر بہن کو نصیحت کر رہی ہے، نفرتوں کا یہ بیج ڈالا کس نے؟ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

حمیدہ خانم کتنی بھی بری اور تیز کیوں نہ سہی مگر ان کے دل میں کچھ خوف خدا ضرور تھا بھانجی کی محبت نے ان سے یہ گناہ کروا تو لیا تھا مگر اب ان کا ضمیر چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ یا خدا یہ میں نے کیا کیا۔ اس واقعے نے انہیں سرتاپا بدل دیا تھا۔ بہن کے پاس سے جانے کے بعد نہ اب وہ کسی کے گھر جھانکتی تھیں نہ کسی کے معاملے میں دخل دیتی تھیں۔ بس وہ تھیں اور گوشہ تنہائی انہوں نے اپنے اللہ سے لو لگائی تھی۔

اس واقعے سے سب سے زیادہ صدمہ رحمت بی بی کو ہوا تھا، اس پرستم یہ کہ اس معصوم حدیقہ کو سب نے منحوس کہہ کر اس کے دکھوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ تھا انہوں نے تقسیم کی امی کو سمجھایا کہ ”موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بھلا اس حقیر انسان کی کیا مجال کہ کسی کو چند سانسیں ادھار دے سکے۔ یا اس کا اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ بگاڑ سکے۔ وہ تو خود بے بال و پر ہو گئی، لٹی تو وہ، جڑی تو وہ، تخت و تاج اس کا چھنا پھرونی منحوس، یہ کیسا انصاف ہے۔ یہ کیسی محبت ہے تمہاری، بیٹے کے حوالے سے اب تمہیں اس کا

زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ آخر وہ تقسیم کے بچوں کی ماں بھی تو ہے۔“

رحمت بی بی انہیں سمجھاتی رہیں اور وہ چپکے چپکے اپنے آنسو آنچل میں سمیٹتی رہیں، بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ خلوص، وہ محبت، وہ جذبے سرد پڑ گئے تھے اب صرف دنیا داری باقی رہ گئی تھی۔ ہائے کیسے لوگ تھے کہ انہیں اللہ کی حقانیت اور اس کی حاکمیت پر یقین نہیں تھا۔

حدیقہ نے گاؤں سے صرف میٹرک کیا تھا۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی مگر وسائل محدود تھے۔ ماں نے کہا۔ شادی کے بعد اپنا شوق پورا کر لینا۔

پھر جب وہ رخصت ہو کر کراچی آئی تو اس کی ایک دوست نے کہا، ”تمہارے لئے ایک چانس ہے اگر چاہو تو سی ٹی کرلو، میں تمہاری مدد کروں گی۔ اگر کہو گی تو اسکول میں تمہیں پیچھے بھی لگوا دوں گی۔“ وہ ہنسی تقسیم نے کہا۔

”پہلے تم سی ٹی کرلو، بعد میں دیکھا جائے گا۔ میں تمہیں پرائیویٹ بی اے کرا دوں گا۔“

حدیقہ اس دن بہت خوش تھی۔ اس نے اپنی سہیلی کی مدد سے بڑی امتگوں کے ساتھ سی ٹی کر لیا، پھر اسے اتنا موقع ہی نہ ملا وہ بچوں میں گھر گئی، پھر اس کے بعد تقسیم ہی نہ رہے۔ نہ گھر کے حالات پہلے جیسے رہے تھے نہ گھر والوں کے دلوں میں گنجائش رہی تھی۔ اس لئے اپنی دوست کے کہنے پر اس نے بچنگ اختیار کر لی، آج وہ ٹریننگ اس کے کام آ گئی تھی۔ بچوں کے مستقل کے لئے اس کو ہی ہاتھ پاؤں مارنے تھے تقسیم کی زندگی میں اسے کبھی کوئی کمی نہیں ہوتی، نہ خرچ کی تنگی تھی، کھانا سب کا ایک ہی جگہ پکنا تھا۔ سب ایک ہی میز پر بیٹھ کے کھاتے تھے، مگر تقسیم کے مرتے ہی ساس نے کہا۔

”بہو! اپنا ہانڈی چولہا الگ کرلو۔“

اور وہ چکر اکر رہ گئی، لیکن اسے جو کہا گیا وہ کر لیا۔ شوہر کے آفس سے کیا ملا، کیا نہیں دیور نے کچھ نہیں بتایا مگر وہ اسے دو ہزار روپے ماہانہ دینے لگے۔ ”یہ کہہ کر کہ یہ تقسیم بھائی کے واجبات میں سے آپ کو دے رہا ہوں تاکہ اٹھا خرچ نہ ہو،“ تب بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔ کچھ چیزیں گاؤں سے آ جاتی تھیں۔ اس طرح اس نے ایک علیحدہ زندگی کا شیڈول بنالیا تھا۔

وہ نوکری کرنے لگی تھی۔ صبح ناشتا کر کے وہ بچوں کو اسکول چھوڑتی ہوئی خود اپنے اسکول چلی جاتی تھی۔ عروسہ سمجھدار تھی ماں کے ساتھ ان زیادتیوں کا بدلہ ہیگامہ اور شور شرابا کر کے لیتی تھی۔ وہ سب کی نظریں پچانتی تھی۔ ماں جتنی خاموش اور نرم خوشی اتنی ہی منہ پھٹ اور تیز وہ تھی۔ وہ اپنے سب بھائی بہن میں بڑی تھی۔ جب باپ کا انتقال ہوا اسے

شعور تھا اسے یقین تھا کہ اس کا باپ قتل ہوا ہے۔ اپنی موت نہیں مرا، صرف اس بنا پر کہ اس کے باپ نے اپنی مرضی سے حدیقہ سے شادی کر لی تھی۔ اور وہ زیرِ عتاب آ گیا تھا۔ بڑی چچی اور ان کی چچی بیٹی اس دشمنی میں پیش پیش تھیں۔ اور یہ باتیں عروسہ کو دوسروں سے معلوم ہوئی تھیں۔ ماں نے تو کبھی منہ سے بھاپ بھی نہ نکالی تھی۔ اگر وہ کچھ اور نہیں کر سکتی تو ان کا چین و آرام تو حرام کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے زریں کی دونوں بیٹیوں کو اپنا دوست بنالیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک دم سے جیسے فضا میں تیز قسم کی تڑاڑ اٹھ اور دھماکے کی آواز گونجی، اور رشیدہ چچی گھبرا کر صحن میں نکل آئیں۔

”یا اللہ خیر“ اور جب انہوں نے عروسہ کو اونچی ہیل کے سینڈل میں کھٹ کھٹ، دم دم اور تڑاڑ کر کے سیڑھیوں سے لہراتے اترتے دیکھا تو ان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”اللہ کی مار سیڑھیوں سے اترنے کا بھلا یہ کون سا انداز ہے، میں تو ڈر گئی کہ خدا نخواستہ گلی میں بمباری اور فائرنگ شروع ہوگئی اے بچی تیرے تو ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔“

انہوں نے ناک پر انگلی رکھ کر تاسف سے اس کی طرف دیکھا اور اندر چلی گئیں اور عروسہ نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ منی اور سیفی منہ پر ہاتھ رکھ کر کھی کھی کرنے لگیں۔

”ہائے عروسہ آپ! یہ چھوٹی دادی، چچی جان سے ایک ایک کی دس دس لگائیں گی اپنے سر پر تو اباندہ لپیٹے گا۔“

”اونہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تم بتاؤ منی یہ میرا نیا اسٹائل کیسا لگا سیڑھیاں اترنے کا؟“

”وائی آپ! چھوٹی دادی کا خوف سے اتنا سامنے نکل آیا تھا۔“

سیفی نے اشارے سے بتایا۔ اور پھر تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور جب حدیقہ تھکی ہاری بچوں کو لے کر اسکول سے آئی تو بے چاری نے چادر بھی نہیں اتاری تھی کہ رشیدہ چچی آدھمکیں۔

”اے بہو! تمہاری بیٹی نے تو ہمارا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ جانتی ہے ناکہ میں دو پہر میں ذرا کمر لگالیتی ہوں، بھلا اسے کب گوارا ہے کہ میں سکھ کی ایک نیند لے لوں وہ تاشے باجے بجاتی۔ پٹانے چھوڑتی دھم دھم کرنی اوپر سے اترتی ہے کہ دن میں تارے نظر آجاتے ہیں۔ اور دل کا حال خراب ہو جاتا ہے۔ جیسے پوری فوج گولہ بارود سمیت گھر میں گھس آئی ہے۔ اے بی ذرا بیٹی کو لگام ڈالو۔“

چچی رشیدہ تو بات سے بات نکالنے میں سدا کی ماہر تھیں۔ ذرا سی بات کو فسانہ بنا کر

چھوڑتی تھیں، اوپر سے سیفی اور منی نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی تو حدیقہ کے پتنگے لگ جئے اس نے خونخوار نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

”نا مراد! کیوں میرے دکھوں میں اضافہ کرتی ہے کیوں مجھے سب کے سامنے شرمندہ کرتی ہے۔ اللہ جانتا ہے میں اسکول جاتی ہوں تو میرا سارا دھیان تیری ہی طرف لگا رہتا ہے آخر بجھتی کیوں نہیں بول۔“

وہ اسے مارنے اٹھی تو رحمت بی بی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اب رہنے بھی دو، بچی ہی تو ہے۔ کوئی اس کا مشغلہ نہیں مصروفیت نہیں آخر وہ کیا کرے کوئی تو اسے منہ نہیں لگا تا کس سے ہنسی مذاق کرے۔“

”اماں! آپ اپنا کام کر لیا کریں اس سے، جا کر دادی کے ہاتھ پاؤں دبایا کرے کرنے کو کام بہت ہیں سلائی کرائیں اس سے، پڑھنے میں تو اس کا جی نہیں لگتا آٹھویں پڑھ کر سمجھ لیا ہے اس نے کہ پی ایچ ڈی کر لیا ہے، ذرا میرے کان تو ٹھنڈے رہیں گے ان کے لیے میں پیٹ کا ایندھن کمانے جاتی ہوں کوئی تفریح کرنے نہیں جاتی، اوپر سے آؤ تو ان کی من بھر شکایتیں سنو۔“

حدیقہ نے چادر اور پرس اٹھا کر رکھا اور ہاتھ روم میں چلی گئی۔ بڑی اماں نے آ کر خاموش بیٹھی عروسہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔

”میری بچی، مت ستایا کر ماں کو دیکھتی نہیں کہ وہ صبح صرف ایک پیالی چائے کی پی کر جاتی ہے اور دو بجے گھر آتی ہے۔ اس کا چہرہ دیکھا ہے تو نے، باپ تو رہا نہیں ماں کی سلامتی کی خیر من! ان کا خیال رکھا کر بچی۔“

”بڑی اماں میں امی کو کب ستاتی ہوں، میں تو..... میں تو.....؟۔“

اس نے چھوٹی دادی کے کمرے کی طرف غصے میں دیکھا، رحمت بی بی کو ہنسی آگئی، انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے بیٹی! رشیدہ کا تو مشن ہی یہی ہے کہ وہ تیری ماں کو سکھ کی سانس نہ لینے دے اور اس کے بچے رل جائیں۔ تیری ان شرارتوں سے اس کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے اچھا جا، ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے منالے اور کھانا گرم کر کے میز پر لگا دے۔“

وہ چلی گئیں۔ تو عروسہ اٹھی چوہا جلا کر ہانڈی رکھی، میز پر برتن لگائے اور بھائی بہن سے کہا چل کر کھانا کھا لیں پھر ماں کے پاس گئی، وہ منہ پر ہاتھ رکھے لیٹی تھیں۔

”امی اٹھیے کھانا کھا لیجئے“

”میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔“ انہوں نے ہاتھ ہٹا کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

شروع نہیں کیا تھا اتنے میں عروسہ بھی آگئی اور سب نے ہنستے مسکراتے کھانا کھایا۔

☆.....☆.....☆

پھر نومیدہ نے فون پر اپنے آنے کی اطلاع دی ماں سے کہا۔

”امی! دلشاد پاکستان میں بزنس کرنا چاہتے ہیں۔ اور میرا بیٹا شہزاد بھی تعلیم سے فارغ ہو چکا ہے وہ باپ کے ساتھ مل کر وہاں بزنس کرے گا۔ بائی بیچے بھی وہیں کسی اچھے اسکول میں پڑھیں گے اصل میں میں یہاں رہتے رہتے اکتا گئی ہوں امی مجھے اپنا شہر اپنی گلیاں اپنا گھر یاد آتا ہے۔“

”جم جم آؤ بیٹی سر آنکھوں پر آؤ تمہارا شہر گلیاں تمہارا گھر تمہارا منتظر ہے۔“

پھر رشیدہ چچی نے سب کو خبر کر دی۔ کہ میری بیٹی نومیدہ آرہی ہے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اور اب وہ یہاں ہی رہے گی۔ اس کے بعد انہوں نے سب سے پہلے سارے گھر کی خصوصی صفائی ستھرائی کرائی پھر دو کمرے مہمانوں کے لئے درست کروائے۔ اور انہیں ضروریات کی تمام چیزوں سے آراستہ کر دیا۔

نومیدہ کی آمد سے کسی کو بھی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ بعض لوگوں سے مل کر آنکھیں روشن اور دل میں ٹھنڈک اتر آتی ہے۔ اور بعض افراد سے مل کر کوفت اور گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ تو نومیدہ کا شمار ایسے لوگوں میں تھا جنہیں دیکھ کر اپنا آپ بچانے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ سب سے زیادہ پریشانی حدیقہ کو تھی۔ وہ نومیدہ کو جانتی تھی کہ اس نے اپنا حساب کسی پر نہیں رکھا تھا۔ جب کہ وہ تو نومیدہ کی ڈسی ہوئی تھی۔ ابھی تو صرف ماں اگلی تھی۔ اور اب بیٹی بھی آرہی تھی۔ معلوم نہیں دونوں مل کر اس کا کیا حشر کریں گی۔ جب کہ حدیقہ کو یقین تھا کہ نومیدہ کی بددعاؤں نے اس کی ہنسی کھیلی زندگی کو تاراج کیا ہے۔ کون جانے اس نے اور کیا کچھ کیا ہوگا تقسیم کو اس کی بد نظر کھا گئی۔ آخر وہ آگئی، ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ دلشاد ایک سنجیدہ سوہرا اور حقیقت پسند انسان تھا۔ بڑا بیٹا شہزاد بڑا ہنس مکھ اور خوبصورت اور منسا تھا اس سے چھوٹی دولڑکیاں تھیں ناز اور ملکہ سب سے چھوٹا بیٹا بولی تھا۔ نومیدہ کے غرور، تمکنت اور اس کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پہلے سے زیادہ وہ بھاری بھر کم ہو گئی تھی۔ رنگ صاف ہو گیا تھا۔ شانوں تک ترشے ہوئے بال اور ہر وقت فل میک اپ میں رہتی تھی، کیونیکس سے رنگین بڑھے ہوئے ناخن غرضیکہ اس کا زیادہ وقت میک اپ میں صرف ہوتا تھا۔

شوہر کا رویہ برا محتاط تھا۔ وہ بہت مختصر بولتے تھے کسی نے بیوی سے ہنستے بولتے نہیں دیکھا تھا۔ زیادہ تر وہ مطالعے میں مصروف ہوتے۔ بچے سب اچھے تھے اور باپ سے قریب۔

عروسہ کے سینے میں پھانس سی انک گئی اتنے میں دونوں بیٹے آکر ماں سے لپٹ گئے۔ ”امی آپ لپٹی کیوں ہیں؟“

”کچھ نہیں بیٹھک گئی ہوں۔“

”امی کھانا نہیں کھائیں گی؟“ دونوں نے پوچھا۔

”نہیں تم لوگ جا کر کھاؤ۔“ وہ دونوں چلے گئے تو عروسہ آہستگی سے ماں کے پہلو میں بیٹھ گئی اور ان کی پیشانی سے سر ٹکا کر بولی۔

”امی پلیز ناراض نہ ہوں چل کر کھانا کھالیں، چھوٹی دادی تو بس بونہی پھانس کا بانس بنالیتی ہیں، انہیں ہماری ذرا سی خوشی گوارا نہیں، یہ گھر ہے کوئی شہر خوشاں نہیں آپ مجھے نانو کے پاس گاؤں بھیج دیں۔“ وہ ماں کو پیار کرتے ہوئے لاڈ سے بولی۔

”ہاں“ تاکہ تو وہاں نانو کا ناطقہ بند کر دے۔ کھیتوں اور باغوں میں چھلانگیں لگاتی پھرے اور وہاں سے فون پر مجھے شکایتیں ملیں، کہیں مجھے سراٹھا کر چلنے دے گی؟“ حدیقہ اسے ہٹا کر اٹھ بیٹھی اور عروسہ منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

”میں اتنی بری ہوں تو مجھے اپنے ہاتھ سے مار ڈالئے، میرا لگہ گھونٹ دیجئے مجھے زندہ دفن کر دیجئے۔“ اور حدیقہ کا غصہ جھاگ بن کر اڑ گیا اس نے تڑپ کر بیٹی کو کلیجے سے لگا لیا۔

”کیا کہہ رہی ہے میری جان! اللہ میری عمر بھی تجھے لگا دے۔ میں نے جن ہاتھوں سے تجھے پالا تیرے ناز اٹھائے، پھولوں کی طرح بوجھ اٹھائے اٹھائے پھری، تو میں اپنے ہاتھوں سے تجھے مار دوں، کیا اتنا ظالم سمجھا ہے مجھے۔“

”نہیں امی! آپ نہیں یہ لوگ ہیں ظالم مجھے ہنستا بسنا نہیں دیکھ سکتے۔ جب ابو کی طرح میں بھی مر جاؤں گی تو ان کے کلیجے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ پھر کوئی کچھ نہیں کہے گا۔“

وہ ہچکیاں لیتی ہوئی رونے لگی۔ آج باپ پھر اسے یاد آ گیا تھا وہ مہربان آغوش جس میں سر رکھ کر وہ سو جاتی تھی۔ حدیقہ کو دھچکا سا لگا۔ وہ بیٹی کی شکل دیکھنے لگی۔ آہ اس کی بیٹی کتنی معصوم، کتنی حساس ہے۔ باپ کا غم بھولی نہیں تھی۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ وہ محض کھلندری ہے مگر شاید بس کھیل کر وہ اپنا غم بھلاتی ہے۔ اس نے اسے پھر گلے سے لگا لیا۔

”اچھا بس اپنے آنسو پونچھ لو میں تمہیں کچھ دنوں کے لئے گاؤں بھیج دوں گی نانو کے پاس۔“

”ہائے امی آپ کتنی اچھی ہیں۔“ وہ روتے روتے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”اچھا چلو ہاتھ دھو کر آ جاؤ۔“ وہ جا کر کھانے کی میز پر بیٹھ گئی بچوں نے ابھی کھانا

متعلق ہمیشہ نومیدہ نے نفرت کا اظہار کیا تھا کیا یہ چہرہ نفرت کے لائق ہے..... ہرگز نہیں!
دل نے چپکے سے گواہی دی۔

”انکل! یہ میری امی ہیں۔“ عروسہ نے مسلسل انہیں پاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”اودہ تو آپ ہیں حدیقہ ماشاء اللہ۔“ لہجے میں وارفتگی تھی وہ کچھ اور آگے بڑھے۔
”آپ کا تو ہم نے بڑا ذکر سنا تھا بلکہ ہمارے گھر میں آپ کے ذکر کے بغیر صبح ہی نہیں ہوتی تھی۔“

”جی.....!“ حدیقہ نے بڑی معصومیت سے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا ”کیسا ذکر؟“
”مگر تعریف کے زمرے میں نہیں اسی لئے آپ کو دیکھنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا۔“ وہ
اپنی رو میں کہتے رہے۔ ”اور آج آپ کو دیکھ لیا۔ معلوم ہوا کہ کانوں سے سننے اور آنکھوں
سے دیکھنے میں کتنا فرق ہوتا ہے اسی لئے سنی سنائی ہر بات کو دل نے مسترد کر دیا۔ وہی سچ
ہے جو آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔“

وہ مسکرائے حدیقہ نے نظریں جھکا لیں وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا ذکر کن لفظوں میں کیا جاتا
رہا ہوگا۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نومیدہ اٹھلاتی ہوئی اپنے ترشے اور سلیقے سے بنے
ہوئے بالوں پر بار بار ہاتھ پھیرتی ساڑھے کا بھاری آنچل سنبھالتی ہوئی پاس آ کر کھڑی
ہوئی اور حدیقہ کی طرف میزھی نظر کر کے بولی۔

”تو تم ہو حدیقہ گاؤں کی ایک معمولی لڑکی جس پر قسم فدا تھے۔“

”نہیں نومیدہ جی۔“ حدیقہ نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ بھول رہی
ہیں جسے اس کا محبوب چاہے وہ لڑکی کبھی معمولی نہیں ہوتی۔“
”اودہ آئی سی تو تمہارے منہ میں بھی زبان ہے۔“ وہ تلملا گئی۔

”الحمد للہ خدا نے مجھے ہر نعمت سے نوازا ہے زبان بھی ہے اور عقل بھی! میں ہوا کا
رخ بھی پہچانتی ہوں اور مجھے گاؤں میں آپ کی وہ پہلی ملاقات بھی یاد ہے جب آپ
نے میرے بالوں سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ اور میں یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ
آپ مجھ سے شدید نفرت کرتی ہیں مگر جس نے محبت کا امرت پیا ہوا اس کا نفرتیں کچھ نہیں
بگاڑ سکتیں۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹی اور جس راستے سے آئی تھی اسی راستے سے واپس چلی گئی۔ عروسہ کی
آنکھوں میں سخت حیرانی تھی۔ وہ بھی اپنے بہن بھائیوں کا ہاتھ پکڑے ماں کے پیچھے چلی گئی
اور ان کے پیچھے رحمت بی بی تھیں۔ ہر شخص اپنی جگہ دم بخود کھڑا تھا۔ دلشاد کی آنکھوں میں
انگلی بوی کے لئے اس قدر نفرت تھی کہ وہ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

آنے کے بعد دلشاد نے ایک تعارفی پارٹی اریج کی تاکہ سارے خاندان والے ایک
دوسرے سے ملیں۔ باتیں کریں حالانکہ نومیدہ نے اس کی مخالفت کی تھی کہ اس کی کیا
ضرورت ہے جسے دیکھنا اور ملنا ہوگا۔ خود ہی آجائے گا۔ بہر حال پارٹی کا بڑی خوبصورتی
سے انتظام کیا گیا تھا۔ رشیدہ چچی نے خود جا کر سب کو دعوت دی تھی خصوصاً اپنی جھٹانی اور
ان کی دو بہوؤں کو بڑے اصرار سے کہا تھا اور رحمت بی بی کو بھی۔
”کیوں اماں! کیا مجھے جانا چاہیے؟“

حدیقہ تذبذب میں تھی۔

”کیوں بھی نہ جانے کی کوئی وجہ؟“ رحمت بی بی نے دیکھا۔

”اماں! کوئی ناخوشگوار بات ہوگئی تو؟“

”تم اپنی طرف سے کچھ نہ کہنا باقی وہ جانے اور اس کا کام جانے“ وہ مسکرائیں۔

”ارے بھی! میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔“ انہوں نے
حدیقہ کو گلے لگا لیا۔

حدیقہ سفید جھک جا رہی تھی اور سادہ سے جوڑے میں بہت خوبصورت اور
کوئی مقدس روح لگ رہی تھی۔ ہاتھ گلے میں کچھ نہیں تھا صرف سیدھے ہاتھ کی انگلی میں
ایک ڈائمنڈ کی انگوٹھی پڑی تھی جو شاید مرنے والی کی نشانی تھی۔ عروسہ نے سادہ ریشمی گلابی
سوٹ پہنا تھا گلابی ٹکینے کا بریسیلیٹ اور ٹاپس تھے ریشمی لمبے بال کھلے ہوئے شانے پر
پڑے ہوئے تھے۔ باقی بچے بھی اسی سادگی کا مظہر تھے۔

آج دلشاد نے پہلی بار اپنی کسی محفل میں حدیقہ اور عروسہ جیسے حسین میک اپ سے بے
نیاز معصوم چہرے دیکھے تھے۔ ورنہ تھوڑے بہت سب نے میک اپ اور فیشن کے تقاضے
پورے کیے تھے اور نومیدہ تو ہمیشہ کی طرح آج بھی خود نمائی اور ملمع سازی کی چلتی پھرتی
نقشہ نظر آ رہی تھی۔ جھلملاتی قیمتی شوخ کلر کی ساڑھی اس نے باندھی ہوئی تھی جو اس کے
بھاری بدن پر بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔ سب سے پہلے رشیدہ چچی نے اپنے
داماد سے اپنی دونوں جھٹانیوں اور ان کی چھوٹی بہو کا تعارف کرایا پھر حدیقہ اور عروسہ کا۔
”کیا ماما یہ دونوں بہنیں ہیں؟“ دلشاد کچھ کنفیوز سے ہو گئے۔

”ارے نہیں یہ حدیقہ ہے مرحوم قسیم کی بیوی اور یہ عروسہ ہے اس کی بیٹی۔“

”آداب انکل۔“ عروسہ نے مسکرا کر ان کے قریب جا کر سر جھکا دیا تو انہوں اس کے
سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ”جیتی رہو خوش رہو“ مگر ان کی نظریں حدیقہ کے معصوم چہرے کا
طواف کر رہی تھیں۔ چاندی میں دھلا ہوا نیلے کی شفاف کلیوں کی مانند پاکیزہ چہرہ جس کے

بڑی ماں، چچی اور بھی مہمانوں نے اس بات کو محسوس کیا تھا جو جانتے تھے کہ وہ حدیقہ کو پسند نہیں کرتی تھی۔ تو پھر اسے بلایا کیوں تھا۔ اور بلایا تھا تو پھر اس نے اپنی نفرتوں کے اظہار میں اتنی جلدی کیوں کی۔ اس بات کا سب کو افسوس تھا کہ بھری محفل میں نومیدہ نے حدیقہ کی بے عزتی کی تھی۔ اور حدیقہ نے بڑے پروقار سلجھ میں اپنا دفاع کیا تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو بڑی اماں نے اسے تھام لیا۔ وہ لڑکھرائی جا رہی تھی۔ انہوں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔

وہ برف کا تودہ بن گئی تھی۔ عروسہ اور انیقہ رو رہی تھیں۔ اس کا بی پی ایک دم ہی ڈاؤن ہو گیا تھا۔ رحمت بی بی نے جلدی سے نمک اور چینی کا پانی بنا کر اسے پلایا اور اس کا سر سہلاتی رہیں۔ پھر وہ رحمت بی بی کی ہانہوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ انہوں نے اسے رونے دیا۔ اس کا علاج یہی تھا۔ وہ تپ تپ کر روتی رہی۔ سسکتی ہوئی کہتی رہی۔

”اماں، قسم مجھے کیوں تنہا چھوڑ کر چلے گئے انہوں نے تو ساتھ مرنے جینے کی قسم کھائی تھی پھر کیوں اکیلے چلے گئے کیوں چلے گئے؟“

”بیٹی اپنے آپ کو سنبھالو انسان کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔ موت و زندگی خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور کوئی کسی کے ساتھ نہیں جاتا سب اپنی اپنی قبر میں جاتے ہیں ہمت سے کام لو دوسروں کی باتوں پر اپنا دل جلانا چھوڑ دو یہ دنیا کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتی۔“

اس واقعے کا نومیدہ کے شوہر دلشاد پر بڑا اثر ہوا اور انہوں نے بیوی پر اعتراضات کے دفتر کھول دیے اور انتہائی سخت الفاظ میں کہا۔

”نومیدہ بیگم! شادی کی پہلی رات دنیا کے شوہر اپنے اپنے معاشقے کی جھوٹی سچی کہانیاں اپنی نئی نویلی بیویوں کو مرعوب کرنے کے لئے سناتے ہیں، مگر میری ایسی کوئی کہانی نہیں تھی نہ مجھے پسند تھا لیکن توقع کے خلاف تم نے اپنے کزن قسیم کے عشق کی داستان مجھے سناتے وقت ذرا بھی شرم و حیا اور جھجک کا مظاہرہ نہ کیا۔ بلکہ اپنے والدین کو برا بھلا کہا کہ ”انہوں نے زبردستی میری شادی کر دی ورنہ میں دیکھتی کہ وہ کس طرح حدیقہ سے عشق کر کے شادی کرتا ہے اور اب بھی میں اس کا زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ اور اس کی جاہل گنوار محبوبہ کو ناگوں چنے چواؤں گی۔“

”یہ کہہ کر تم کس طرح سسک رہی تھیں۔ تم نے میرا بھی کوئی خیال نہ کیا اس وقت میرے دل نے پیشن گوئی کی تھی یہ عورت تمہارے بچوں کی ماں تو بن سکتی ہے مگر وہ بیوی نہیں بن سکتی جو اپنے گھر اور شوہر کی وفادار ہوتی ہے اور یہ سچ نکلا میرا دل تو اسی رات کھٹا

ہو گیا تھا جی تو یہی چاہا تھا کہ تمام عمر کی محرومیاں خریدنے سے اچھا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ میں کاغذ تھا کر تمہیں چلتا کر دوں، لیکن مجھے اپنی مرحومہ جنت مکانی ولادہ کی آخری نصیحت یاد آگئی۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا کر کہا تھا۔

”بیٹا اگر تمہاری بیوی تمہاری مرضی اور خواہش پر نہ چلے تو بے شک اسے سخت سزا دینا اس کا اخلاقی بائیکاٹ کر دینا مگر کبھی طلاق نہ دینا۔ اس سے بڑھ کر عورت کے لئے کوئی بھی عذاب نہیں ہوتا۔ تمہارے سامنے میری پوری زندگی ہے۔ ایک ذرا سی بات پر تمہارے باپ نے مجھے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا تھا۔ اور میں تمام زندگی کانٹوں پر چلتی رہی۔ کسی طرح میں نے تنہا زندگی کا بوجھ اٹھا کر تمہیں پالا۔ پڑھایا لکھایا۔ اور پروان چڑھایا۔ اس قابل کیا کہ تم خود فلیل ہو۔ کسی کے شرمندہ احسان نہ ہو۔ ارے بیٹا، عورت سے کیا بدلہ لینا، وہ زبان کی جتنی بہادر اور تیز ہوتی ہے اندر سے اتنی ہی کمزور ہوتی ہے۔“

”بس نومیدہ بیگم، میں نے اپنی ماں کی نصیحتوں کی لاج رکھی تھی۔ ورنہ تم اس لائق ہرگز نہیں تھیں کہ تمہیں بیوی کے اعلیٰ منصب پر فائز کیا جاتا۔ آج تم نے جس ذلالت کا ثبوت دیا ہے اس نے شرم سے میرا سر جھکا دیا۔ قسیم کے اعمال کی ذمہ دار وہ نہیں تھی۔ پھر تم نے اسے گھر بلا کر کیوں ذلیل کیا بولو؟“

وہ بہت غصے میں تھے۔ نومیدہ ایک دم بھڑک اٹھی۔

”اوہو! آپ کو اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہوگئی یہ میرا اپنا معاملہ ہے آپ کو ہمارے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔“

”بات ہمدردی کی نہیں، شرافت کی ہے نومیدہ بیگم! آخر انسان کی اخلاقی حیثیت بھی تو کچھ ہوتی ہے۔ وہ اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی کہ ہم اتنے ایجوکیٹڈ فارن کنٹری کے سند یافتہ مہذب لوگ اتنی پست اور گھٹیا ذہنیت رکھتے ہیں۔“

”یہ آپ کی سوچ ہوگی۔ اس کی پرواز اتنی بلند نہیں۔“ وہ بڑی بے نیازی سے بولی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن شہزادے نے ماں کی کلاس لی۔

”مئی! اس دن آپ نے پارٹی میں آنٹی کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ ہمیں اپنی پارٹی میں انہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہیے تھا کچھ بھی ہو ہم پڑھے لکھے لوگوں کا انداز دوسروں سے مختلف ہونا چاہیے جس سے ہم پہچانے جاتے ہیں۔“ شہزاد کے چہرے پر دکھ کے سائے لڑاں تھے۔

نومیدہ نے اپنے جوان بیٹے کی طرف دُزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے زیادہ کچھ

نہیں کہا تھا لیکن اس کی آنکھیں چہرہ اور اس کی زبان دبا دبا احتجاج ضرور کر رہی تھیں نومیدہ نے کچھ نہیں کہا۔ ایک جھٹکے سے انھی اور اندر چلی گئی۔

اس رات بھی دلشاد سے نومیدہ کی اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی وہ ہمیشہ شوہر پر حاوی رہی تھی۔ اس نے ہر بات میں اپنی منوائی تھی۔ وہ شریف آدمی زیادہ تر خاموش رہتا مگر جب اسے غصہ آتا تو پھر پورا حساب بیباق کر لیتا تھا۔ اب حدیقہ والے کے واقعے کے دن اس نے اس پر اعتراضات کی بارش کر دی تو وہ بوکھلا اٹھی۔ اسے ڈر ہوا کہ کہیں دلشاد کا جھکاؤ حدیقہ کی طرف تو نہیں ہو گیا۔ پھر اچانک اس کے تصور میں بیٹے کی کلیاں مہک اٹھیں اور گلابوں جیسی رنگت اور نازک خدوخال کی مالک معصوم عروسہ آ گئی۔ ایک تیر تھا جو سنسناتا ہوا اس کے اندر پیوست ہو گیا۔ ایک خوف ایک اندیشہ تھا جس نے نومیدہ کو بن جل مچھلی کی طرح تڑپا کر نیم جان کر دیا۔

”نہیں نہیں میرا بیٹا ایسا نہیں ہے شہزاد ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اسے قتل کر دوں گی مگر اپنے جیتے جی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

وہ انتہائی نفرت سے سوچنے لگی۔ لیکن جس طرح چڑھتے سورج کو ابھرنے اور اس کی روشنی کو بام و در پر پھیلانے سے کوئی نہیں روک سکا اسی طرح شہزاد کو عروسہ کے خیال سے کوئی نہ باز رکھ سکا تھا۔ نامعلوم احساسات ان جانے جذبوں سے اس کے قدم اٹھتے تو اٹھتے ہی چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

اس دن عروسہ پھر آندھی اور طوفان کی طرح کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتی اندر آ گئی۔ سب لوگ بیٹھنے دی دیکھ رہے تھے۔ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”پھپھو جی، ملکہ اور ناز کو بھیج دیجئے۔“

”کیوں.....؟“ نومیدہ کی آنکھوں سے ناگواری جھلکنے لگی۔

دلشاد اور شہزاد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا ”آؤ بیٹھو.....“

”پھپھو جی، ہم گڑیا کھیل رہے ہیں۔“ اس نے انکل اور شہزاد کو مسکرا کر دیکھا۔

”اول تو میں تمہاری پھپھو نہیں دوسرے ملکہ اور ناز کے پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے۔“

”امی جان کہتی ہیں کہ آپ ہمارے ابو کی چچا زاد ہیں اس لئے ہماری پھپھو ہوئیں اور پڑھنے کا وقت تو ہمارا بھی ہو رہا ہے بس گڑیاں سجا کر بس میں رکھ دیں گے۔“

”اے لڑکی بڑی باتیں کرتی ہو اتنی بڑی ہو کر گڑیا کھیلتی ہو شرم نہیں آتی۔“

”جی پھپھو میں تو ابھی بہت چھوٹی ہوں امی کہتی ہیں یہی عمر تو کھیلنے، شرارتیں کرنے“

کی ہوتی ہے۔“

وہ آچل کا کونا دانتوں میں لے کر مسکرائی تو شہزاد کی جان پر بن آئی۔

”جاؤ ملکہ اور ناز۔“ شہزاد نے بہنوں کو اشارہ کیا اور کہا۔

”بابی کے ساتھ گڑیاں سجا کر آ جانا تمہارے ٹیوٹر آنے والے ہیں۔“ دلشاد نے کہا۔

وہ دونوں اٹھیں تو عروسہ نے دلشاد کی طرف دیکھ کر کہا۔

”شکریہ انکل“ اور تینوں لمحوں میں چھلاوا ہو گئیں۔ اور شہزاد مسکرا دیا۔

نومیدہ کو بہت برا لگا۔

”یہ تم لوگوں نے میرے خلاف کیسی سازش کی ہے؟“

”کیسی سازش؟“ خواخوہش نے بچوں پر پابندی لگا دی ہے کہ وہ عروسہ کے ساتھ نہ کھلیں

آخر عروسہ بھی تو بچی ہے وہ کس کے ساتھ کھیلے؟“ دلشاد نے کہا۔

”میں دیکھ رہی ہوں کہ تم باپ بیٹے میرے خلاف باتیں کرتے ہو مجھے ذلیل کرنا

چاہتے ہو؟“ انہوں نے قہر بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

”نہیں نومیدہ بیگم اپنے ذہن کو اتنا محدود نہ کرو، یہ محض تمہارا کامپلکس ہے اور کچھ

نہیں۔“

”کوئی کامپلکس نہیں ہے میرا، میں صحیح کہہ رہی ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ غصے میں اٹھ کر

چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

اب رشیدہ چچی اور ان کے شوہر اپنے کمروں تک محدود ہو گئے تھے۔ ابراہیم نے بیوی

کو سمجھا دیا تھا کہ نومیدہ آ گئی ہے۔ وہ خود ہی جو کہنا ہوگا کہہ سن لے گی تمہیں اوپر سے آنے

والے بچوں سے کچھ نہیں کہنا سننا یہ خواخوہش کی برائی کیوں مول لوگی۔

ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی۔ ویسے بھی جب عروسہ آتی تو وہ اپنا کمرہ بند کر لیتی

تھیں اور وہ مسکرا کر رہ جاتی پھر اس دن اچانک دھما دھم پھٹا پھٹ کڑا کڑ کی آوازیں آنے

لگیں۔ نومیدہ اور شہزاد گھبرا کر دیکھنے لگے۔ ان آوازوں کے بیچ عروسہ کا مسکراتا ہوا چہرہ

ابھرا تو شہزاد مسکرا دیا اور نومیدہ تملکا کر بولیں۔

”لڑکی یہ کیا حرکت ہے بیڑھیوں سے اس طرح اتر جاتا ہے پٹاٹے چھوڑتے ہوئے

جوابے سوزنی ہے تمہیں کسی نے چلنے پھرنے کی تمیز نہیں سکھائی۔“

”سکھائی تھی مگر میں نے سیکھی نہیں اصل میں پھپھو میرے چاروں طرف اتنا سناتا ہے

اُنی خاموشی ہے کہ اسے توڑنے کے لئے مجھے شور مچانا پڑتا ہے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

شہزاد اماں کے پاس آ کر سرگوشی میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”ممی..... مجھے تو یہ کوئی سائیکلو جیکل کیس معلوم ہوتا ہے۔“ شہزاد نے معنی خیز انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے سن لیا جھٹ سے بولی۔

”سائیکلو جیکل نہیں، مینزکل کیس کہیے۔“ عروسہ نے انگلی اپنے کان کے اوپر گھما کر کہا۔ اور ایک دم اونچے اونچے تہمتے لگانے لگی۔ پھر ہنسنے ہنسنے مڑی اور اسی دھماکہ خیز آوازوں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ نومیدہ نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور شہزاد مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کے کانوں میں عروسہ کے یہ الفاظ گھونجنے لگے.....

”میرے چاروں طرف اتنا سناٹا اور خاموشی ہے کہ اسے توڑنے کے لئے مجھے شور مچانا پڑتا ہے۔“

تو کیا یہ چھوٹی سی لڑکی اپنے اندر کسی بڑے طوفان کو چھپائے پھر رہی ہے۔ کیسی بے چینی اور بے قراری ہے اس کے انداز و کلام میں، جیسے وہ شور اور ہنگامہ میں پناہ لینا چاہتی ہے۔ وہ کیوں ایسا کرتی ہے..... بڑے دنوں تک شہزاد کو اس کی یہ بات ڈسٹرب کرتی رہی۔ پارٹی والے دن کا واقعہ ایسا نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جائے۔

☆.....☆.....☆

حدیقہ نے اپنے ٹرانسفر کی درخواست دے دی۔ پہلے بھی اسے گاؤں جا کر پڑھانے کی آفر ہوئی تھی۔ مگر اس نے محض بچوں کی تعلیم، ان کی سہولتوں کے پیش نظر انکار کر دیا تھا۔ مگر اب وہ خود یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ کس طرح وہ ان نفرتوں بھرے ماحول میں سانس لے سکے گی۔ اتنی بہت نفرتوں میں کیسے جی سکے گی۔ سب سے پہلے وہ ماں سے ملنے گاؤں بچوں کو لے کر چلی گئی، بڑے دنوں سے کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ بھائی بھاء وچ نہال ہو گئے۔ بچے آ کر لیٹ گئے۔

”پھوپھو آ گئیں، پھوپھو آ گئیں۔“ کیسا پیار، کتنی بیٹائی تھی ان کی باتوں میں، اس نے ماں کو بتایا۔

”امی! اب وہاں کے حالات اجازت نہیں دیتے کہ میں وہاں رہوں، نومیدہ واپس آ گئی ہے اور اس کے شوہر نے یہاں بزنس جمالیا ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ وہ میرا وجود ہمیشہ سے ناپسند کرتی ہے اور میں بھی کوئی پتھر کی بنی ہوئی نہیں کہ اس کے وار خاموشی سے جھیلی رہوں اور مجھے کچھ نہ ہو پھر عروسہ کی طرف سے میں بہت پریشان ہوں، جو ان بچی پر کل کلاں وہ فتنہ عورت کوئی طوفان کھڑا کر دے تو میں کیا کروں گی۔ اس لئے میں نے یہاں پر اپنا ٹرانسفر کروالیا ہے کہ میں آپ سب کے ساتھ رہوں گی۔“

”تم نے بہت اچھا کیا بیٹی! میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ تم میرے پاس آ جاؤ چلو خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب دیر نہ لگانا۔“

پھر باپ نے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

”بیٹی! یہ اتنا بڑا گھر خالی پڑا ہے جہاں جی چاہے رہو بسو تمہارے دونوں بھائی اوپر رہتے ہیں کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تم میری آنکھوں کے سامنے رہو گی تو میں بھی سکھ کی نیند سو سکوں گا۔ لاکھ وہ تمہارے چچا کا گھر ہے لیکن بہو کی قدر و منزلت اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس کا شوہر زندہ ہو جب وہ نہیں ہوتی کیسی عزت، کیسی قدر۔“

ماں نے آنسو بھر کر کہا ”میری نازوں پل کی حالت تو دیکھو کیا ہو گئی ہے۔ نومیدہ اپنے کو سمجھتی کیا ہے، کیا تم کوئی لاوارث ہو، ابھی تو تمہارے ماں باپ زندہ ہیں۔“ پھر نانوں نے عروسہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو بنی بنائی اپنی ماں کی تصویر ہے دوسری حدیقہ، بس ذرا مزاجوں میں فرق ہے میری حدیقہ تو سدا کی خاموش، سنجیدہ اور یہ ماشاء اللہ شوخ چلبلی، کھنڈری اور ہر دم ہنگامہ اٹھانے والی۔“

”امی! اب آپ ہی اسے سنبھالنے کا میں نے اسے پڑھانے کی بہت کوشش کی مگر اس نے آٹھویں پڑھ کر چھوڑ دیا بولی میرا جی نہیں لگتا، اس کا جی تو بس لڑکے لڑکیوں کے ساتھ چھلانگیں لگانے، درختوں پر چڑھنے، گڑبایاں کھینے، اور شادی بیاہ کے گیت گانے میں لگتا ہے۔“

”خیر، تو کوئی بری عادت نہیں، یہ ہنگامے شور، تہمتے تو زندگی کی علامت ہوتے ہیں مگر میری جان، تمہیں پڑھنا ضرور چاہیے تم اپنی امی کے اسکول سے میٹرک کر لو، اب تو یہاں بھی کالج بن گیا ہے میں پڑھنے کے لئے شہر نہیں جانا پڑے گا۔“ انہوں نے عروسہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بڑی پیاری بچی ہے اسے کچھ مت کہنا، جیسا ہم چاہیں گے وہی کرے گی۔ ہیں نا بیٹی؟“

”جی نانوں، مجھے گاؤں بہت اچھا لگتا ہے۔ میں یہاں پڑھوں گی بھی اور کھیلوں گی بھی۔“

”شاباش میری بیٹی۔“ انہوں نے اسے گلے سے لگالیا۔

پھر حدیقہ کی دونوں بھادجیں اور ان کے بچے آ گئے دونوں بھادجیں بڑی محبت کی تھیں حدیقہ کو لپٹا لیا اور ہنس کر بولیں۔

ایک ساتھ پڑھیں گے ایک ساتھ کھیلیں گے۔“ عروسہ اور حنا بہت خوش تھیں۔

☆.....☆.....☆

چار پانچ دن گاؤں میں رہ کر وہ سب پھر واپس کراچی آ گئے۔ ٹرانسفر کے کاغذات آ گئے تھے۔ حدیقہ نے سامان سمینا شروع کر دیا۔ دیور دیورانی ساس اور بڑی اماں نے حیرانی سے دیکھ کر پوچھا۔

”یہ سامان کیوں باندھا جا رہا ہے؟“

”اب ہمارا آب و دانہ یہاں سے اٹھ گیا ہے اماں کہیں اور جا کر آشیانہ بنائیں گے۔“ وہ مسکرائی۔

”خیر تو ہے کیا آسمان سے وحی اتری ہے۔“ اب کے ساس نے جل کر کہا۔

”یونہی سمجھ لیں تا ئی جان۔“

”کیوں پہلیاں بھجوا رہی ہو بھابی۔“ دیورانی بولی۔

”اصل میں زریں میرا تبادلہ گاؤں کے اسکول میں ہو گیا ہے۔ اب وہیں ہمارا مسکن ہوگا۔“

یہ بات سب نے سنی زریں نے کہا۔

”ٹرانسفر تو رکوا یا بھی جاسکتا ہے بھابی، یہ تو کوئی عقلمندی نہیں ہوئی کہ یہاں کے اچھے معیاری اسکولوں سے بچوں کو اٹھا کر گاؤں کے پسماندہ اسکولوں میں ڈال دیا جائے پھر ان کا مستقبل کیا ہوگا؟“

”ہاں زریں تم نے ٹھیک کہا۔ اسی عقلمندی سے کام لے کر پچھلے دو سال قبل میں نے اپنے ٹرانسفر کو رکوا دیا تھا مگر اب میں خود یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“

”کیوں...؟“

”زریں جہاں انسان کی عزت نہ ہو جہاں اسے ہر لمحہ چھوٹے پن اور معمولی ہونے کا احساس دلایا جائے جہاں چلتے پھرتے نفرتوں کا مظاہرہ ہو وہاں تو اسے سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ میں نے کب کسی کا کچھ بگاڑا تھا پھر لوگ خواہ مخواہ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ کیوں میری عزت نفس مجروح کرتے ہیں۔“ حدیقہ کی آواز بھرا گئی۔

زریں نے اس کے پاس بیٹھ کر اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ ”ارے بھابی آپ پارٹی والے دن نومیدہ آپا کی باتوں سے دل برداشتہ ہیں اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں تو خاندان میں ہوتی رہتی ہیں۔“

”تمہارے نزدیک یہ چھوٹی سی بات تھی زریں اس نے میرے جنتی شوہر کو قبر سے نکال کر سامنے کھڑا کر دیا۔ مجھے ایک معمولی کٹر لڑکی کا طعنہ دیتے وقت یہ بھی بھول گئی کہ وہ

”بڑے دنوں بعد پھیرا لگا ہے تمہارا؟“

”ہاں بھابی! کچھ پرالم تھے۔ آپ ہی حال احوال کو آ جاتیں۔“ حدیقہ نے پیار بھرا شکوہ کیا۔

”بھئی اصل میں وہ تمہاری لندن پلٹ کزن سے ڈر لگتا تھا کہ ہم ٹہرے بقول ان کے گاؤں کے پینڈو معلوم نہیں ہم کیا کہتے اور وہ کیا سمجھتے۔“ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

”ہم نے سنا تھا تمہارا ٹرانسفر گاؤں میں ہو رہا ہے۔ اس خبر میں کتنی صداقت ہے؟“ وہ مسکرائیں۔

”سو فی صد صداقت ہے اور ٹرانسفر ہو تمہیں رہا بلکہ ہو چکا ہے اور مابدولت اپنی ریاست میں اب قدم رنج فرمانے والے ہیں۔“ حدیقہ نے بھی اسی طرح ہنس کر شوخی سے جواب دیا۔

”ماشاء اللہ کب؟“

”انشاء اللہ بہت جلد۔“

پھر تینوں نند بھاد جوں کے قہقہوں سے فضا جھنجھناٹھی۔

بچوں نے الگ اپنی محفل سجائی تھی۔ بڑے بھائی کی بیٹی حنا نے فوراً عروسہ سے دوستی کر لی۔ چھوٹے بھائی کی ناجوا گر چہ چھوٹی تھی مگر بڑی پیاری باتیں کرتی تھی عروسہ کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”باجی میرے پاس بہت سی گڑیاں ہیں ان کے گھر ہیں آپ دیکھیں گی؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں بے بی ہم تمہاری گڑیاں ضرور دیکھیں گے۔ آؤ چلو دکھاؤ۔“ وہ عروسہ کو اوپر لے گئی۔

اس کے ساتھ سارے بچے تھے۔ واقعی گڑیاں کا ایک بہت خوبصورت گھر بڑی سی بالکنی کے ایک طرف بنا ہوا تھا۔ وہیں سب بچے بیٹھ کر گڑیاں کھیلتے اور سجاتے تھے۔ عروسہ گڑیاں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

”بے بی! تمہاری گڑیاں بھی بہت پیاری ہیں اور گڑیا گھر کا تو جواب نہیں۔“ عروسہ نے اسے لپٹا لیا۔ اور وہ خوش ہو گئی، پھر حنا نے پوچھا۔

”عروسہ اب تو تم دادو کے پاس رہو گی نا؟“

”نہیں، ابھی تو ہم صرف نانو سے ملنے آئے تھے پھر ہم ہمیشہ کے لئے یہاں آ جائیں گے امی کا گاؤں کے اسکول میں ٹرانسفر ہو گیا ہے نا، میں بھی یہاں پڑھوں گی۔“

”ارے واہ یہ تو بڑی فائناسک خبر سنائی تم نے، ہم سب لوگ ایک ساتھ رہیں گے۔“

بڑے زور کا دھماکہ ہوا اور کھٹ کھٹ کرتی عروسہ کمرے میں داخل ہو گئی۔
 ”السلام علیکم پھپھو جانی، کیسی ہیں آپ؟“ وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کرسی بھی ڈول گئی تھی۔

”اومائی گاڈ! لڑکی ہو یا کوئی طوفان، ارے طوفان بھی تو دبے پاؤں آتے ہیں۔ مگر تم تو عرجتی برستی آتی ہو ایسے میں کون ٹھیک رہ سکتا ہے، کس کا بی پی نارٹل رہے گا۔“
 نومیدہ نے اسے سخت ناگواری سے دیکھ کر اپنی پیشانی دبا لی۔

”ارے پھپھو جانی، جو طوفان دبے پاؤں آتے ہیں۔ وہ بڑے خطرناک ہوتے ہیں
 شکر کیجئے کہ طوفان اپنے آنے کی خبر کر دیتے ہیں۔“ عروسہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
 اتنے میں اور بچے بھی آگئے ان کے پیچھے شہزاد بھی تھا۔ ہمیشہ کی طرح مسکراہٹیں
 سجائے ہوئے۔

”ہلو! باجی! اکیلے گئی نہیں۔“ ملکہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ناز و دوسری طرف اس سے
 لگ کر کھڑی ہو گئی۔

نومیدہ کے چہرے کا بگڑا ہوا زاویہ نہ درست ہوا، انہوں نے گھور کر اپنی بچیوں کی
 طرف دیکھا اور عروسہ ہاتھ چھڑا کر بولی۔

”نہیں ملکہ! میں تو اتنی پیاری پھپھو جانی سے ملنے آئی تھی۔ ہم لوگ یہاں سے جا رہے
 ہیں، اپنی نانوں کے گاؤں۔“ وہ مسکرا کر کن اکھیوں سے نومیدہ اور شہزادی کی طرف دیکھنے
 لگی۔ شہزاد کچھ بے چین نظر آ رہا تھا۔

”کیوں باجی! آپ اپنی نانوں کے گھر کیوں جا رہی ہیں؟“ نازو نے پوچھا۔
 ”بھئی وہ صرف ہماری نانوں کا گاؤں نہیں ہے بلکہ تمہارا دادا کا بھی گاؤں ہے، ہمارے

نانا تمہارے دادا بھی تو ہیں۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟“ اس نے نومیدہ کی طرف دیکھا۔
 ”اے لڑکی تمہیں رشتے داری جوڑنے کے لئے کس نے کہا ہے چلو یہاں سے نہ کوئی

تمہارا دادا ہے نہ تمہاری کوئی پھپھو۔“ نومیدہ نے منہ پھیر کر غصے سے کہا تو عروسہ ہنس پڑی۔
 ”ایک تو پھپھو آپ ہمیشہ میرا نام بھول جاتی ہیں میرا نام عروسہ قسیم ہے اے لڑکی نہیں

دوسرے یہ کہ رشتے ناتے جوڑے نہیں جاتے یہ تو قدرتی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود بنا کے
 پیدا کرتا ہے جس طرح بھائی بہن ماں باپ ان کی اولاد میں ایک دوسرے کا خون ہوتی ہیں

جیسے میں اور ناز و ملکہ جیسے آپ اور امی جیسے شہزاد بھائی اور انکل۔“ نومیدہ چیخ پڑی۔
 ”شہزاد! یہ کھڑا کھڑا کیا منہ دیکھ رہا ہے جلدی سے گولی اور پانی لا میرا بی بی ہائی ہو گیا“

بھی اسی چچا کی اولاد تھی جس کی بیٹی میں تھی۔ آخر میرا قصور کیا تھا میں نے کب کسی کی محبت
 پر ڈاکہ ڈالا تھا مجھے تو شادی کے بعد معلوم ہوا تھا کہ نومیدہ قسیم کو پسند کرتی تھی۔ اگر مجھے
 پہلے معلوم ہو جاتا تو اللہ گواہ ہے میں اس کے راستے سے ہٹ جاتی۔ پھر اتنا عرصہ گزر
 جانے کے بعد جب وہ بھی جوان اولاد کی ماں اور ایک اچھے محبت کرنے والے شوہر کی
 بیوی ہے کیوں اس نے مجھے اپنی محرومیوں کی سزا دینی چاہی تھی۔ اور اس کے لئے کتنا گھٹیا
 راستہ اختیار کیا تھا۔“ حدیقہ رو ہانسی ہو گئی۔

”ہاں بھائی! یہ تو حقیقت ہے کہ اس دن سب ہی نومیدہ آپا کی اس بد تمیزی پر ناراض
 نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے واقعی انتہائی پست ذہنی کا ثبوت دیا تھا تو اس کے یہ بھی معنی
 نہیں کہ آپ اپنے مرحوم شوہر کا گھر ہی چھوڑ دیں، یہاں تو قدم قدم پر ان کی یادیں بکھری
 ہوئی ہیں۔“

”زریں میرا شوہر میرے دل میں رہتا ہے۔ میرا سینہ اس کی یادوں سے آباد ہے سچ
 پوچھو تو زریں! حدیقہ نے ادھر ادھر دیکھ کر ہولے سے کہا۔

”میں صرف عروسہ کی وجہ سے یہ جگہ چھوڑ رہی ہوں، میں نہیں چاہتی کہ وہ نیچے چچی
 جان کی طرف جائے، شہزاد کا رجحان میں اس کی طرف دیکھ رہی ہوں، بلاشبہ وہ اپنی ماں کی
 سرتاپائی اور نہایت محبت کا لڑکا ہے۔ مگر کل کلاں میری معصوم بچی پر نومیدہ کوئی الزام
 لگادے تو میں کیا کر لوں گی۔ جوان بیٹی کی عزت موسم بہار کی تلتلی کی مانند ہوتی ہے کہ ہاتھ
 لگانے سے اس کے رنگ اتر جاتے ہیں۔ میں تو جیتے جی مرجاؤں گی زریں اس لئے میں
 یہ موقع ضائع کرنا نہیں چاہتی۔ شوہر کے بعد صرف ماں باپ کا گھر ہی لڑکی کے لئے
 عافیت کا گھر ہوتا ہے اب مجھے وہیں پرسکون مل سکتا ہے۔“

”حدیقہ ٹھیک کہتی ہے دلہن۔“ بڑی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔
 ”نومیدہ کبھی اسے نہیں بخشے گی۔ وہ تو سدا کی کینہ پرور ہے اپنی ذات کی نفی کرنے
 والے کو اس کا بس چلے تو سولی پر چڑھا دے۔ چنانچہ ایسے لوگوں سے دور رہنا زیادہ
 مناسب ہے۔“

ساس کی اس ڈھکی چھپی حمایت پر رحمت بی بی نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔
 ”بیٹی! تم نے جو فیصلہ کیا ہے بالکل صحیح ہے۔ جب اولاد جوان ہو جاتی ہے تو ماں باپ

اپنے لئے نہیں اس کے لئے جیتے اور مرتے ہیں۔ خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔“
 وہ آنکھوں میں آنسو بھرے وہاں سے چلی گئیں۔ کہنے کو تو انہوں نے یہ سچی بات کہہ دی
 تھی مگر اس کے جانے کے خیال سے ان کا کلیجہ کٹنے لگا تھا۔ وہ بیٹی کی طرح اسے چاہتی تھیں۔

ہری اپ“ اور وہ بستر پر لیٹ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں شہزاد گھبرا کر واپس مڑا اور نازو عروسہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی دلشاد نے اسے دیکھا اور عروسہ کو پاس بلا کر سر پر ہاتھ رکھا اور پیار سے پوچھنے لگے۔

”بیٹی! تمہاری پھوپھو تمہیں ڈانٹتی ہیں غصہ کرتی ہیں تمہیں برا تو نہیں لگتا؟“

”نہیں انکل امی نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ پھوپھو دل کی بہت اچھی ہیں بس ذرا مزاج تیز ہے۔“

”آہ کاش! نومیدہ تم واقعی دل کی اچھی ہوتیں“ انہوں نے سوچا اور حدیقہ کی شخصیت کا یہ پہلو اسے اور بلند کر گیا۔

”تو تم لوگ گاؤں جا رہی ہو؟“ دلشاد نے وضاحت چاہی۔

”جی انکل“ وہاں میرے نانا ہیں، نانو ہیں ماموں جان اور ممانی ہیں ان کے پیارے پیارے بچے ہیں میری کزن حنا ہے وہ میری بہت اچھی دوست ہے بڑی سی حویلی میں بہت سے نوکر ہیں کھیت ہیں باغ ہیں، مویشی خانے ہیں ہر طرف ہرے بھرے درخت اور سبزہ ہے پھولوں کی بہار ہے۔ انکل مجھے گاؤں بہت اچھا لگتا ہے میں امی کے اسکول سے میٹرک کروں گی پھر وہاں کالج ہے آگے بھی پڑھوں گی۔“

وہ بچوں جیسی معصومیت سے ہر بات تفصیل سے بتا رہی تھی۔ اور دلشاد مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔

”ہاں بیٹا! آگے ضرور پڑھنا تم بہت اچھی لڑکی ہو کبھی کبھی تو یہاں آؤ گی نا؟“

”پتہ نہیں انکل اگر امی آئیں تو پھر میں بھی آؤں گی۔“

اتنے میں شہزاد آ گیا۔

”کہاں تھے تم؟“ باپ نے پوچھا۔

”ڈیڈی! ماما کا پی پی ہائی ہو گیا تھا۔ میں انہیں دوا دے کر آ رہا ہوں۔“

”ہاں“ مجھے اندازہ ہے کہ ان کا پی پی کیوں ہائی ہو جاتا ہے۔“ ان کا موڈ آف تھا۔

”ڈیڈی! آپ ان لوگوں کو روک لیجئے پلیز جانے سے۔“ شہزاد نے عجیب سی بات

کہہ دی انہوں نے تیز نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا بولے۔

”کیوں“ کیا جواز ہے انہیں روکنے کا اور کیا کہہ کر روکوں؟“ وہ غصے میں بولے۔

شہزاد گڑ بڑا گیا۔

”وہ وہ یہ تو مجھے نہیں معلوم ڈیڈی! بس ان کے جانے کو دل قبول نہیں کرتا۔“

”تمہارے قبول کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے“ تمہاری ممانے تو سارے

دروازے بند کر دیئے ہیں کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی، تم بھی اپنی آنکھیں اور کان بند کر لو اور اپنی تعلیم کی طرف توجہ دو“ یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔

عروسہ نے مسکرا کر شہزاد کی طرف دیکھا۔

”انکل ٹھیک کہتے ہیں۔“ پھر جاتے جاتے اس کی طرف مسکرا کر پلٹی۔

”امی سے نہیں ملیں گے؟“

”ہاں ہاں چلو۔“ وہ مجھے مجھے دل کے ساتھ اس کے پیچھے چلنے لگا۔

”اسلام علیکم آنتی۔“

”جیتے رہو خوش رہو بیٹا! آؤ بیٹھو۔“ حدیقہ نے مسکرا کر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”آنتی! آپ گاؤں جا رہی ہیں عروسہ نے بتایا تھا۔“

حدیقہ نے ہنس کر عروسہ کی طرف دیکھا۔

”یہ پیسہ اخبار سب کو خبر کر آئی۔“

”ہاں امی! جب میں نے انکل کو بتایا تو وہ بہت افسوس کر رہے تھے مجھ سے کہا تم بہت

اچھی لڑکی ہو اپنی بڑھائی نہ چھوڑنا اور امی جان پھوپھو جی کا تو پی پی ہائی ہو گیا وہ لمبی لمبی

سانسیں لینے لگیں۔ تب شہزاد بھائی نے انہیں گولی کھلائی۔“ عروسہ اپنی رو میں کہہ گئی۔

حدیقہ نے گھبرا کر شہزاد کی طرف دیکھا۔

”بیٹا! ٹھیک تو ہیں تمہاری امی اس نے کوئی شرارت تو نہیں کی تھی۔ میں اسے اچھی

طرح جانتی ہوں“ انہوں نے شاکی نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

”نہیں آنتی! عروسہ تو جب ہمارے گھر آئی ہے تو ساری اداسی اور خاموشی کو نوں

کھدروں میں گھس جاتی ہے۔ بس ماما کی طبیعت ہی سب سے جدا ہے اچھا آنتی! اگر میں

وہاں آؤں تو آپ ناراض تو نہیں ہوں گی۔“

”نہیں بیٹا“ وہ گھر بھی تمہارا ہے ہاں ایک بات ہے اپنی ماما اور ڈیڈی سے پوچھ

کر آنا۔“

”افوہ آنتی اب آپ مجھے پابند کر رہی ہیں۔ ماما سے تو نہیں ہاں ڈیڈی سے پوچھ کر

آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا جیسی تمہاری مرضی۔“ وہ مسکرا دیں۔

دوسرے دن حدیقہ اپنے بچوں اور سامان کے ساتھ اسٹیشن روانہ ہوئی۔ دیور اور

دیورانی ساتھ گئے تھے اسے گاؤں تک چھوڑنے، سب نے چشم پر غم اسے رخصت کیا تھا۔

گاؤں میں سب نے ان کا خیر مقدم کیا چھوٹے بیٹے بہو کو دیکھ کر سب کی خوشیاں دو چند

جگہ تھیں۔ سب نے اپنی پھپھو اور چچا چچی کے آنے سے بہت خوش تھے۔ عرصے کے بعد چچا چچی بہو بیٹے سے مل رہے تھے۔ برائے ذمہ ہرے ہو گئے تھے اور قسم کو یاد کر کے سب کی پگلیں بھیک گئی تھیں۔ جنتیں، جاتیں کچھ اور بڑھ گئی تھیں۔

پھر دن تیزی سے گزرنے لگے۔ عروسہ نے میٹرک کر لیا تھا۔ گاؤں کی صاف ستھری اور کھلی فضا نے اسے اور نکھار دیا تھا۔ حدیقہ کو اب اس کی شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔ اس عرصے میں شہزاد کا آنا جانا شروع ہو گیا تھا کم سے کم مہینے میں دو چکر تو ضرور لگاتا تھا۔ اور اس کی بے تابیوں، کچھ ہمتی بولتی، آنکھوں اور چہرے نے حدیقہ کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ اس کے برعکس عروسہ کی وہی شوخیاں، شرارتیں ہنسی مذاق اور جملے بازیاں تھیں جو اس کے آنے پر بھی جاری رہتی تھیں۔ بات بات پر قہقہے ادھر ادھر کی باتیں، لطیفے، وہ سناٹی اور شہزاد بڑی محویت سے مسکرا مسکرا کر سنتا اور پھر چلا جاتا کھانے پر وہ بھی نہیں رکا۔ چائے یا شربت پی کر چلا جاتا عروسہ اسے باہر تک چھوڑنے جاتی، ایک دن درختوں کے جھنڈ میں پہنچ کر اس نے عروسہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔

”عروسہ تم جانتی ہو میں یہاں کس کے لئے آتا ہوں، کس کو دیکھنے، کس سے ملنے؟“

اس نے اطمینان کی سانس لی اور مسکرا کر کن اکھیوں سے دیکھ کر گردن نفی میں ہلا دی۔

”نہیں۔“

”جھوٹ نہ بولو میری طرف دیکھ کر کہو کہ ہاں میں جانتی ہوں آپ میرے لئے آتے ہیں۔“

”تو اس سے کیا ہوگا؟“ عروسہ نے اسی طرح شرارت سے مسکرا کر پوچھا۔

”میری تسکین ہو جائے گی۔“

”تو پھر اپنی تسلی کر لیجئے اور خوش ہو جائیے کہ مجھے معلوم ہے میں سمجھتی ہوں۔“

”اس کے باوجود تمہیں مجھ پر یقین نہیں میرے جذبول پر اعتبار نہیں؟“

”نہیں شہزاد! مجھے یقین ہے مگر میں یقین کرنا نہیں چاہتی اور اعتبار کر بھی لوں تب بھی

بات نہیں بنے گی۔ میرا اور آپ کا بنوگ نہیں ہو سکتا۔ نو میدہ آنٹی نے ہمارے درمیان خط

فہنیخ کھینچ رکھی ہے ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ بھی سہی مگر شرعاً ممنوع ضرور بن چکے

ہیں۔ یہ چھاؤں ہمارے مقدر میں نہیں اور ممانی جان نے اپنے بھتیجے نعمان سے ہماری

شادی طے کر دی ہے وہ واپڈا میں انجینئر ہے۔“ عروسہ نے بڑی صاف گوئی سے اس کی

امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

شہزاد کا چہرہ تاریک ہو گیا اس نے سنبھل کر کہا۔

”اور تم کیا چاہتی ہو، میرا مطلب ہے نعمان تمہیں پسند ہے؟“

”میری پسند و ناپسند کی بات نہ کریں شہزاد مجھے اپنی ماں کی عزت اور وقار سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں وہ جو میرے لئے فیصلہ کریں گی میں سر جھکا دوں گا ان کی خوشی میری خوشی ہے۔“

”تمہیں دوسروں کو جاننے کا تو بڑا دعویٰ ہے، دلوں میں جھانکنے کا فن بھی تمہیں آتا ہے اس کے باوجود کہ میرے دل، میرے خیالوں، میری سوچوں ہر جگہ تمہاری عمل داری ہے پھر بھی تم نے میرے لئے کچھ نہیں سوچا۔“

”جس نگر، جس ڈگر جانا ہی نہیں اس کے لئے کیا سوچنا شہزاد! آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ آنٹی نو میدہ نے میری امی کی کس قدر تذلیل کی تھی۔ بھری محفل میں انہوں نے گواراں اور معمولی لڑکی کہہ کر انہیں تضحیک کا نشانہ بنایا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اس ذلت کو بھول جاؤں گی۔ نہیں آپ کا واپس جانا ہی ہمارے اور آپ کے لئے بہتر ہے آپ اپنی ماں کا دل نہ توڑیے عروسہ آپ کو بہت مل جائیں گی مگر ماں تمہیں نہیں ملے گی۔“

”تم ماں کی سزا بیٹے کو کیوں دینا چاہتی ہو؟“

”میں سزا دینے والی کون ہوتی ہوں شہزاد مگر یہ قانون فطرت ہے کہ ماں باپ کی غلطیوں کی سزا کسی نہ کسی حوالے سے اولاد کو ضرور ملتی ہے۔“

”کیا تمہارے دل میں میرے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں؟“

”میرا دل دریا ہے شہزاد! مگر ان کے لئے جو شستی کو کھینا اور پار لگانا جانتے ہیں۔“

”تم نے حالات کو سنوارنے اور مجھے آزمانے کا کوئی موقع تو دیا ہوتا عروسہ؟“ اس کی آواز میں بڑی شکستگی تھی۔

”نہیں شہزاد حالات کی چٹانوں سے سر پھوڑنا سراسر دیوانگی ہے۔ اور میں اپنی زندگی کو کسی آزمائش میں ڈالنا نہیں چاہتی۔“ دو ٹوک جواب تھا۔ شہزاد کانپ گیا۔ اتنے میں دور سے ہارن کی آواز آئی۔ اور ایک جیپ کچھ دور آ کر ٹھہر گئی۔

عروسہ جلدی سے درخت کی آڑ میں ہو گئی، شہزاد نے عروسہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دل ٹوٹنے کا منظر اسے دہلا گیا۔ شہزاد کے لبوں پر ایک ٹوٹا ہوا تبسم ابھرا۔

تو بھی بھرم نہ رکھ سکا اپنے خلوص کا

ہم کو تو تجھ پہ خود سے بھی بڑھ کر غرور تھا

”خدا حافظ۔“ وہ مڑا

”آپ میری شادی میں آئیں گے؟“

اچانک بہت سے تیر ایک ساتھ اس کے سینے میں پیوست ہو گئے، وہ لڑکھڑایا۔ سنبھلا اور بغیر مڑے جواب دیا۔

”شاید۔“ پھر تیزی سے چلتا ہوا جیپ پر چڑھ گیا۔ جیپ نے ٹرن لیا اور روڈ پر دوڑنے لگی۔ وہ کچھ دور اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم اس کا دل گھبرا یا۔

☆.....☆.....☆

شادی کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ طویل عرصے کے بعد اس حویلی میں خوشیوں کی جھکار اور تہنہوں کی جلتنگ سنا کی دے رہی تھی۔ شادی بیاہ کے مدھر گیتوں میں امنگوں کی تحفیلیں سج رہی تھیں۔ ایک بار حدیقہ نے عروسہ کو خاموش اور اداس دیکھا تو پاس آ کر اسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے پوچھنے لگی۔

”میری جان، سچ بتانا کہ نعمان کے ساتھ شادی کر کے میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نا انصافی تو نہیں کر رہی؟“

”آپ کو یہ خیال کیسے آیا امی؟“ اس نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا۔

”صرف اس لئے کہ دو ماہ سے شہزاد نہیں آیا شاید تمہاری طرف سے مایوس ہو گیا ہو یا تم نے کچھ کہہ دیا ہو، میں جانتی ہوں بیٹی شہزاد کو یہاں صرف تمہاری طلب لانی تھی وہ اچھا لڑکا تھا اس کے باوجود اگر میں اس کی خواہش پوری کر دیتی تو دونوں خاندانوں میں قیامت آ جاتی۔ ایک اکیلی نومیدہ ہمیں تباہ کر دینے کے لئے کافی تھی۔ اس سے اچھا یہی تھا کہ اپنے دل پر تھوڑا سا جبر کر کے وقت سے سمجھوتا کر لیا جائے۔“

حدیقہ چپ ہو کر بیٹی کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”امی، آپ تو بڑی دور تک سوچ آئیں؟“ عروسہ ہنس پڑی۔

”ہم کسی کی طلب اور چاہت پر پابندی تو نہیں لگا سکتے۔ امی یہ زندگی جتنی میری ہے اتنی ہی آپ کی بھی ہے۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے، شہزاد تو بے وقوف ہے امی، اگر وہ ماں کی طرح عقلمند ہو تو کیوں سایوں کے تعاقب میں یہاں تک چلا آتا آپ پریشان نہ ہوں میں نے اسے شادی میں بلایا ہے وہ ضرور آئے گا۔“

اور حدیقہ حیرانی سے بیٹی کے کھلکھلاتے چہرے کو دیکھ رہی تھی کہ اسے اپنے آپ کو چھپانے میں کتنا ملکہ حاصل تھا۔ بیوقوف تو ماں بھی نہیں تھی۔ مگر مجبور ضرور تھی اپنی ممتا اور حالات کی شکرگزی کے ہاتھوں، یہ دل کے سودے تھے جن کا کوئی موسم، کوئی سہانگ نہیں ہوتی۔ جہاں خریدار ہر نفع و نقصان سے بالاتر ہو کر اپنی زندگی کی قیمت لگا تا ہے۔

شہزاد بھی انہی احساسات کے تحت اپنی نقد جاں کا نذرانہ لے کر عروسہ کی طرف بڑھا تھا کہ وہ چھوٹی سی بظاہر لا پرواہ کھلندری اور خوبصورت لڑکی یقیناً اس کے مہلتے

جذبات کو شرف قبولیت بخش کر اس کا ہاتھ تھام لے گی۔ لیکن وہ اندر سے بڑی بولڈ زیرک اور حساس نکلی۔ اس نے اپنے دلائل اپنی کھری سچی باتوں سے شہزاد کے حوصلے پست کر دیئے۔ اور اسے قائل ہونا پڑا کہ ہم جن راستوں کو بہت آسان بہت مختصر سمجھتے ہیں وہ تو بل صراط کا راستہ ہوتا ہے۔ اتنا طویل کہ ہزاروں سال کی مسافت کے بعد بھی منزل کا دور دور پتا نہیں ہوتا۔ اور زندگی ہزار بار بھی اگر ملے تو بھی سفر ختم نہ ہو۔

اس لئے شہزاد نے نہایت دلگرفتہ ہو کر خاموشی سے اپنے قدم موڑ لئے تھے دل پر کتنی قیامتیں گزر گئیں اس کا احساس اب عروسہ کو ہوا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر خود راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کی تھیں۔ اپنے ہاتھوں سے ان دروازوں کو بند کیا تھا۔ نومیدہ پھپھو سے ماں کی بے عزتی اور آنسوؤں کا بدلہ لیتے لیتے وہ خود اس آگ سے اپنا دامن جلا بیٹھی تھی۔ اور اس پیش نے اس کے دل کا احاطہ کر لیا تھا۔ پتھر اور آہن کی بنی ہوئی وہ بولڈ لڑکی.... موم کی طرح پکھلنے لگی تھی۔ باہر شہنائیاں گونج رہی تھیں۔ اور اس کے اندر سنائے پھیل رہے تھے بھرا گھر ہونے کے بعد بھی کتنی خاموشی، کتنی تنہائی تھی اس کے چاروں طرف، شہزاد نے اس سے صرف ایک بات کہی تھی بار بار پوچھا تھا۔

”عروسہ اپنے دل کو ٹٹو لو تمہیں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی گوشے میں میرا عکس میرا ہیولا ضرور نظر آئے گا۔ اگر یہ بھی نہیں تو مجھے یقین ہے تم میرے لئے ضرور سوچتی ہوگی تمہیں میرا خیال ضرور آتا ہوگا رات کی تنہائیوں میں میری یاد تمہیں ضرور ڈسٹرب کرتی ہوگی۔ کچھ تو کہو عروسہ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں شہزاد! آپ نے کچھ غلط نہیں کہا تھا میں نے ہی اسے سیریس نہیں لیا تھا۔ نومیدہ پھپھو کی باتوں اور آنکھوں میں اس قدر نفرت میں نے دیکھی اور محسوس کی تھی کہ اگر وہ نفرتیں دریا میں گھول دی جاتیں تو اس کا پانی بھی زہر پیلا ہو جاتا پھر تو یہ محبت اتنی نازک اور لطیف شے تھی کہ اس ماحول میں کیسے پروان چڑھ سکتی تھی لیکن اب.... اب.....“

جانے محسوسات کی کس منزل پر آ گئی تھی وہ کہ جدھر دیکھتی شہزاد کی گلہ آمیز نظریں اسے مگراں نظر آتی تھیں۔ آنکھیں بند کرتی تب بھی وہ نظریں اس کے اندرونی کی طرح کھٹکتی لگتیں۔

بیٹھے بیٹھے اس کا دل کیوں گھبرانے لگتا ہے۔ یہ مسرتوں سے پھلکتے ہوئے گیت نغمے، یہ قہقہے کیوں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتے اس کے دل میں کوئی غنجہ کیوں نہیں چمکتا وہ اپنے دل میں سخت حیران تھی۔ اس نے تکیے پر سر ڈال لیا تھا۔ آنکھیں بند تھیں تب ہی شوراٹھا۔

”بارات آ گئی۔“

”بارات آ گئی۔“

”رات بھر تیند نہیں آئی ہوگی مارے خوشی کے۔“
 ”نعمان بھائی کا تصور جو سونے نہیں دے رہا تھا۔“ سب ہنس بول رہے تھے۔
 ”اچھا چلو جلدی کرو۔“

نکاح کے رجسٹر پر دستخط کرتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور بار بار آنسوؤں کی چادر آنکھوں کے سامنے تن جاتی تھی۔ دل دھڑک دھڑک کر نڈھال ہوا جا رہا تھا۔

نعمان بہت اچھا انسان تھا۔ وجہہ پرکشش پر مذاق اور محبت کرنے والا نوجوان وہ تو اپنی تقدیر پر نازاں بھی۔ شہزاد اکثر اس کی سوچوں اس کے خیالوں میں آتا تھا، مگر اس نے کبھی اسے ایک دوست اور کزن سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ اسے اچھا لگتا تھا۔

اگر واقعات اس کے خلاف نہ جاتے تو آج نکاح کے رجسٹر میں بجائے نعمان کے شہزاد کا نام لکھا ہوتا۔ وہ تو محض اسے ترپانا، جلانا چاہتی تھی۔ ماں کے حوالے سے مگر اپنا پہلو بچا کر، وہ جانتی تھی کہ اتنی مغرور بد مزاج بے رحم اور سرکشی کی حد تک بے خوف عورت نو میدہ

وہ خوش تھی کہ اس نے اپنی ماں کی بے عزتی کا بدلہ لے لیا شہزاد کا دل توڑ کر..... اور وہ اسی سرشاری میں شاد ماں شاد ماں گیتوں کے ساتھ جہیز کے جوڑے لڑکیوں کے ساتھ مل کر ہنستے مسکراتے ٹانگتی رہی، جہیز کی لسٹ بنائی، شادی میں، کھانوں کی تیاری میں بڑھ چڑھ کر مشورے دیے، مہندی، شادی اور ویسے میں پہننے کے لئے، بہن بھائیوں کے جوڑوں کا انتخاب کیا۔ اور جب اسے مایوں بٹھایا جانے لگا تو اچانک اس کے حواسوں پر برف جمنے لگی۔ جیسے سارا جوش یکھٹ ٹھنڈا ہو گیا ہو سارے جذبے ولو لے لمبی تان کر سونگئے ہوں یہ کیا ہو رہا تھا؟

اب تو شہزاد کا خیال بھی گناہ تھا۔
جس مشن کی تکمیل اور جن نا آسودہ جذبوں کی تسکین کے لئے وہ اپنا دامن جھٹک کر
نعمان کی پناہ میں آئی تھی۔ آج وہی پناہ گاہ ٹوٹ رہی تھی۔ اس کی دیواریں اوپر آ رہی
تھیں۔ ایک شور برپا تھا۔

یا اللہ مجھے حوصلہ دے میں بار بار نہیں ٹوٹنا چاہتی۔
شہزاد میری منزل نہیں، مگر پھر میرے قدم کیوں مجھے ادھر کھینچ رہے ہیں؟
دل کیوں اس کے نام پر بہک رہا ہے۔
عروسہ کے اندر شدید جنگ چھڑی تھی۔ اس کے پاؤں اکھڑے جا رہے تھے..... میں
اس کی خوبیوں کی بھی معترف ہوں۔

مگر میں اپنے مرحوم و مظلوم باپ اور زندہ ماں کی تضحیک کو کیسے برداشت کر لوں؟۔
نومیدہ پھپھو جنہیں اب پھپھو کہتے یا کوئی نام نہاد رشتہ جوڑتے بھی شرم آتی ہے میں
ان کے سامنے اپنی ماں کو مزید شرمندہ اور ذلیل کرنے کا موقع ہرگز فراہم نہیں کر سکتی۔
تم بہت اچھے ہوشنہاد

روشن روشن دل کے.....

نکھری نکھری سوچوں۔

اور نرم ولطیف جذبوں کے مالک۔

لیکن اس کے باوجود۔

تم ایک بڑی قابل نفرت اور ہٹ دھرم ظالم ماں کے بیٹے بھی ہو۔

اور یہ حوالہ تمہارا میری زندگی کے لئے کسی طرح خوش آئندہ نہیں۔

مجھے معاف کر دینا شہزاد۔

ساتھ ساتھ چل کے بھی منزلیں مخالف ہیں

جسم کا سفر تنہا، روح کا سفر تنہا

شادی میں شہزاد اور انکل دلدادہ آئے تھے۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا بہت سی دعائیں دیں۔ مگر شہزاد نے صرف اس نئی زندگی کی مبارکبادی تھی۔ ایک نظر عروسہ نے اس پر ڈالی تھی۔ بڑی نکھری نکھری مسکراہٹ تھی اس کے چہرے پر وہ ڈمگا کر رہ گئی آہ وقت نے یہ کیسا خراج مانگا تھا مجھ سے کاش شہزاد یہ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ تم نے اپنی محبت کا تھوڑا بہت خراج وصول کر لیا ہے تو شاید تمہارے قدم زمین سے اٹھ جاتے اور تم ہوا میں اڑنے لگتے۔ اور شاید تمام زندگی تم چاہے جانے کے اسی احساس میں بتا دیتے کہ تمہارے جذبے رائیگاں نہیں گئے۔

اور یہ سچ ہے شہزاد تمہارے جذبے رائیگاں نہیں گئے تھے۔ نعمان کی رفاقت کے ساتھ ساتھ تمہاری یادوں کی خوشبو بھی پھولوں اور گجروں کے ساتھ میرے ہاتھوں گلے میں لپٹی چلی آئی ہے۔ جو میں نے کبھی نہیں چاہا وہ ہو گیا ہے۔

انتقام لیتے لیتے میں خود انتقام کی بھینٹ چڑھ گئی ہوں۔ اب کچھ کہنے سننے کو باقی کیا رہ گیا تھا۔

کس نے کھیل کھیلا یہ کس نے ہجر جھیلا ہے
اب گزر گیا جاناں اس سوال کا موسم

☆.....☆.....☆

بھول بھلیاں

”آج تم نے پھر دیر لگا دی۔؟“ شجرہ نے کھانا میز پر لگاتے ہوئے اشفاق سے کہا۔

”یار... تم ابھی بیوی نہیں بنیں۔ مگر ریہرسل ابھی سے شروع کر دی۔ زبان میں وہی کاٹ۔ لہجے میں وہی دبدبہ دیر سے کیوں آئے۔ فلاں جگہ کیوں گئے تھے؟ اس سے کیوں ملے؟ وغیرہ وغیرہ.....“ وہ مسکرا دیا۔

”تم سمجھتے ہو میں تمہارے رعب میں آ کر اصل موضوع سے ہٹ جاؤں گی؟“ شجرہ نے آنکھیں دکھائیں۔

توبہ کر دیجی... مورچے پر آخری وقت تک ڈٹے رہنا تمہاری ہالی ہے آخر سب انسپکٹر عبدالرزاق صاحب کی ہونے والی بہو ہو۔“ اشفاق نے مسکرا کر لقمہ توڑتے ہوئے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کرچکے کو اس یا ابھی کچھ باقی ہے؟“ شجرہ نے بڑی مٹھاس بڑے پیار سے پوچھا۔
”اللہ اللہ..... آج تو بیگم صاحبہ بڑے موڈ میں نظر آ رہی ہیں۔“ اور وہ ہمتے سے اکھڑ گئی۔

”پھر تم نے مجھے بیگم صاحبہ کہا۔ دیکھو اشفی لڑائی ہو جائے گی۔!“

”اب کون سی صلح کی باتیں کر رہی ہو۔ ویسے بھی مستقبل قریب میں بیگم صاحبہ ہی کہلاؤ گی۔؟“
”ہرگز نہیں، تب بھی تم مجھے بیگم نہیں کہو گے لگتا ہے کوئی خانساں، مالی یا دودھ والا مخاطب کر رہا ہو۔“

”اچھا پھر خود ہی بتا دو کیا کہہ کر بلاؤں۔ ابھی سے فیصلہ ہو جائے۔!“ وہ ایک آنکھ دبا کر شونئی سے ہنس دیا۔

”نینا..... نینا..... نکلی..... نکلی..... شیریں..... میری..... تیری۔“ شجرہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
”کچھ نہیں..... بس میرا نام کافی ہے۔“ وہ اُسے لقمے بنا بنا کر کھلانے لگی۔ یہ اس کی

اٹھائے جب وہ قریب آئی تو کھڑا ہو گیا۔ اس کی طرف دیکھ کر تھوڑا سا مسکرایا۔

”سوری..... آؤ چلیں۔“

”کہاں.....؟“

”اے جان کے کمرے میں.....؟“

”نہیں تم جاؤ.....!“ وہ روٹھی روٹھی بولی۔

”پلیز.....؟“ اشفاق کے لہجے میں ندامت تھی۔

☆.....☆.....☆

سب انسپکٹر عبدالرزاق صاحب اپنے دور کے انتہائی دیانت دار باصلاحیت اور ذمے دار آفیسر تھے۔ پولیس فورس میں آنے سے پہلے ہی وہ بڑی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت شروع ہی سے مشکل پسند تھی۔ انہوں نے کبھی رشوت اور سفارش جیسی غیر اخلاقی اور غیر قانونی چیزوں کو پسند نہ کیا۔ ان کے دل کی طرح ان کے ہاتھ بھی صاف تھے۔ جرم و گناہ کے سلسلے میں ان کا مزاج بڑا جارحانہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی فرض شناسی اور دیانت داری کی ان کا محکمہ ان کی بڑی قدر کرتا تھا۔

لیکن جہاں ان کے ان گنت دوست تھے وہیں ان کے کچھ دشمن بھی در پردہ ان کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی فکر میں لگے رہتے۔ ان کے چار بیٹے تھے... بیٹی کی کمی شجرہ نے پوری کر دی۔

شجرہ الدرد... رزاق صاحب کے مرحوم بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی جسے انہوں نے اولاد سے بڑھ کر چاہا۔ ان کی بیوی عمارہ بے حد شفیق، مخلص اور ایثار پسند خاتون تھیں بچوں پر والدہ شیدا۔ سب سے بڑا... اشفاق تھا جو کچھ تو ماں کے بیجا لاڈ و پیار اور کچھ اپنی ضدی طبیعت کی وجہ سے تھوڑا بھٹک گیا تھا۔ اپنا زیادہ وقت دوستوں میں گزارتا تھا، تعلیم کی طرف سے بھی وہ زیادہ پُر جوش نہ تھا جیسے تیسے گریجویشن کر لیا تھا۔ رزاق صاحب اُسے ڈی۔ ایس۔ پی بنانا چاہتے تھے۔ وسائل بھی تھے اور وقت بھی لیکن اُسے تو باہر کی ہوا لگ گئی تھی گھر میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ دوستوں کی محفلیں اس کے لیے خوشیوں کا اہتمام کرتی تھیں اور باپ کی۔ افسری اُسے ذرا بھی مرعوب نہ کرتی۔

شجرہ اور اشفاق ایک ہی گھر میں پلے بڑھے۔ آپس میں دھول دھپا کرتے، لڑتے جھگڑتے جوان ہوئے، دونوں ایک دوسرے کے پیچھے اُس وقت سے دیوانے تھے۔ جب ان کے ننھے ذہن محبت کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے... دوستی اور قربت کے معنی نہ جانتے تھے۔ شجرہ چھوٹی تھی۔ تب ہی سے وہ اشفاق کے ایک ایک کام کی نگرانی بن گئی تھی۔ اس کی کتابیں، کپڑے، جوتے، اس کی ضرورت کی ہر چیز کا خیال رکھتی۔ عمارہ اس عمر میں اس کی

محبت کی انتہا تھی۔ غصہ بھی کرتی تھی اور ہنس دیتی تھی۔ اور لڑائی کر کے فوراً منالیتی۔ اس کا لقمہ کھا کر جب اشفاق نے اپنا لقمہ اس کی طرف بڑھایا تو وہ سر ہلا کر بولی۔

”نہیں..... میں تم سے ناراض ہوں۔“

”ارے واہ۔ ابھی تو ٹھیک ٹھاک تھیں۔“ اس نے وہ اکڑ گیا اور وہ لقمہ ہنس کر اپنے

منہ میں رکھ لیا۔ اور اچانک پوچھا۔

”کیا اے جان آگئے.....؟“

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ کمرے میں آپ کا انتظار فرما رہے ہیں۔“

”ہائے.....!“ وہ گڑبڑا گیا۔ ”مارے گئے۔“

اس نے گھبرا کر نوالہ پلیٹ میں چھوڑا اور کھڑا ہو گیا۔ شجرہ نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اُسے گھورتے ہوئے بولا۔

”پہلے کیوں نہ بتایا.....؟“

”کیوں.....؟ تمہیں ان کے آنے کا وقت نہیں معلوم۔ پھر کیوں پہلے نہیں آ جاتے۔“

گھر کے اصول صرف ایک فرد کے لیے نہیں ہوتے ان کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔ پھر ایک تم ہی سے سب کو کیوں شکایت رہتی ہے۔ میں اور چچی جان کہاں تک تمہارے عیبوں پر پردہ ڈالتے رہیں گے۔ اشی تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ ہمیں اپنے ضمیر سے کس قدر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ پھر رات گئے تک آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومنا پھرنا کوئی اچھی بات تو نہیں.....!“

”وہ آوارہ لڑکے نہیں ہوتے شجہ.... خاندانی اور.... شریف لوگوں کی اولاد ہیں۔ اگر ہم ہنس بول کر تھوڑا سا وقت گزار لیتے ہیں۔ تو کیا بُرا کرتے ہیں؟“

”وہ خاندانی اور شریف لوگوں کی اولادیں ضرور ہوں گی۔ اشی مگر وہ خود اچھے اور شریف لڑکے نہیں ہوتے جو بارہ بارہ بجے رات کو سڑکوں پر اسکوٹر دھڑ... دھڑاتے پھریں۔ گلی کی کنڈلیاں اسٹاپ پر کھڑے ہو کر آوازے کیں۔ یا کسی معمولی کیفے میں بیٹھ کر سرگرمی نوش کریں۔ سمجھنے کی کوشش کرو اشی....! سوچو تمہاری نگاہوں میں شرافت کا معیار کیا ہے.....؟“ اشفاق گڑبڑا کر شجرہ کو دیکھنے لگا۔ اور دم سے صوفے پر بیٹھ کر بیزاری سے بولا۔

”تم لوگوں نے میرے خلاف محاذ قائم کر لیا ہے مجھ سے گھر میں بیٹھا جاتا، اور اے

جی سے کہہ دو کہ ان کی تھانے داری یہاں نہیں چلے گی۔“

شجرہ کچھ نہیں بولی۔ بڑے دکھ سے اس کی طرف دیکھتی رہی..... پھر خاموشی سے برتن

احساسِ ذنے داری سے بہت خوش تھیں۔ جب سے اشفاق نے پردے نکلے اور دوستوں کا دائرہ بڑھا شجرہ سخت آزمائش میں گھر گئی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اشفاق کو کیسے سمجھائے۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ بھڑک اٹھتا۔ پھر بھی وہ اسے رساں رساں... سمجھانی رہی ایک اچھے دوست اور ناصح کی طرح... کہ ”اشفی وقت دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہوتی ہے۔ اس کا کوئی مول نہیں، جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں اور جنہوں نے وقت کے لمحے لمحے سے استفادہ حاصل کیا وہ ثریا گیر ہوئے۔ مورخ بنے۔ سائنس دان اور موجد بنے۔ میں ایک چھوٹی سی مثال چچا جان کی دوں گی کہ انہوں نے اپنی محنت، جدوجہد سے اپنا مقام بنایا۔ تمہیں تو ان سے بڑھ کر کرنا ہے انجام دینے ہیں۔ تم ان کا خواب ہو، آرزو ہو، خدا کے لیے اشفی سمجھو اور اپنی سوچیں اپنا راستہ بدل دو.....!“

اشفاق چڑ جاتا خالی گھونسا ہوا میں لہرا کر کہتا۔

”ختمو.....! تم دوست اچھی لگتی ہو۔ ناصح بننے کی کوشش نہ کرو۔ اس منصب پر امی ابو کا کافی ہیں۔“ وہ تلملا کر رہ جاتا۔

اس دن بھی وہ بڑی دیر تک تیار ہوتا رہا..... ویل ڈریس تو وہ تھا ہی مگر اس دن کچھ زیادہ اہتمام ہو رہا تھا۔ گہرے رنگ کے سفاری سوٹ میں وہ بے حد دل کش لگ رہا تھا، سلیقے سے بال بنا کر اس نے چارلی کی پوری شیشی اسپرے کر لی، شجرہ بڑی دیر سے اس کو بڑے سے آئینے میں ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ آخر دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اور لمبی لمبی سانسیں لے کر بولی۔

”معلوم ہوتا ہے سینٹ کا پور اکنستر توڑ دیا۔ تم نے.....!“ اشفاق اس کی بات کو نظر انداز کر کے۔ اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”ایک دوست کی برتھ ڈے پارٹی ہے۔“

”گویا آج پھر انتظار کا کرب سہنا پڑے گا۔“

”نہیں..... میں جلدی آ جاؤں گا۔“ وہ پُپ ہو گئی۔

”پلیز مسکراؤ..... تم سیریس اچھی نہیں لگتیں۔“ وہ اس کے قریب جا کر بولا۔ تو وہ ہنس پڑی، اور ہاتھ بڑھا کر اس کے اتنے سلیقے سے بنائے ہوئے بال پچھ مار کر بگاڑ دیے۔ اور ٹھٹھکیلائی ہوئی بھاگ گئی۔ اشفاق نے آئینے میں دیکھا تو خود مسکرا دیا۔ لگتا تھا جیسے چڑیوں نے سر پر گھونسلہ بنا لیا ہو غصہ تو بہت آیا۔ مگر پُپ چاپ ہاتھ میں برش لیے بال سنوارتا رہا۔

☆.....☆.....☆

اشفاق سے چھوٹے بھائی آفاق نے بھی رنگ بدلنا شروع کر دیا تھا۔ ابھی تک تو

صرف ایک کے پیچھے جان کھپانی پڑتی تھی اب دوسرے نے بھی دوستوں کی پوری ٹیم تیار کر لی تھی۔ جس کی وجہ سے نہ تو اسٹڈی ہوتی، نہ کام، جب وہ کالج سے گھر آتا تو اس کے دوست دروازے پر منتظر ملتے شجرہ نے ایک دن اس کے کان کیچھے..... کہا۔

”آفاق سدھر جاؤ..... ان دوستوں کو فوراً رخصت کرو۔ اور پھر کبھی دوست بنانے کی غلطی نہ کرنا، پچھا جان کو دیکھو۔ ایک آئیڈیل انسان ہیں۔ کیا تم ان کی اعلا مثال قائم نہیں کر سکتے.....؟ دیکھو چندا اگر اب میں نے ان فضول سے دوستوں کو دروازے پر دیکھا تو اچھی طرح خبر لوں گی۔“

وہ گھبرا گیا۔

”نہیں پلیز باجی، میں تو ان کے ساتھ ہیلتھ کلب جاتا ہوں ایک سرسبز کرنے۔“

”کیوں.....؟“

”وہ ذرا باڈی شاڈی بنانے.....!“ اس نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

”کیا باڈی بلڈر بننے کا خیال ہے؟“

”نہیں باجی..... بس یونہی.....!“ اس نے سر کھجاتے ہوئے..... دھیمی آواز میں کہا۔

”بس یونہی نہیں.....! باڈی تمہاری ٹھیک ٹھاک ہے۔ اب اپنا ذہن بناؤ۔ کتابیں پڑھو اور عقل سلیم سے کام لو۔“

سب بچے شجرہ سے بہت ڈرتے تھے علاوہ..... اشفاق کے وہ محبت بھی بے حد کرتی تھی اور فہمائش بھی بروقت جس کا خوشگوار نتیجہ نکلتا۔ آفاق سے چھوٹے..... دونوں بیٹے فطری طور پر نیک اور تابعدار تھے۔ اگر انہیں کتابوں کا کیڑا کہا جاتا تو غلط نہ تھا، کوئی فضول شوق بابا ہر گھونے کی ان میں بیماری نہ تھی۔ رزاق صاحب کو گھر پر زیادہ توجہ دینے کی فرصت نہ تھی، لیکن اشفاق کی..... بے راہ روی ان کی نظروں میں تھی۔ انہوں نے ایک دن بڑے سخت الفاظ میں عمارہ کو ان کے فرائض کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

”تم ماں ہو.....! تمہاری آنکھیں دور تک دیکھتی ہیں۔ بہ حیثیت ہوم منسٹر کے تم اپنے دائرہ اختیار میں رہ کر حالات کا رخ اپنی طرف آسانی سے موڑ سکتی ہو، جو ابھی وقت میرے لیے مشکل امر ہے۔ آنکھیں کھلی رکھو بچوں پر اگر تمہاری گرفت نرم ہوئی تو یہ ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ یاد رکھو میرے چاروں بیٹے میرے خاندان کے چار ستون ہیں۔ جن پر ان کے مستقبل اور ہماری نیک نامی کی عمارت قائم ہے۔ معاشرتی، اخلاقی اور انسانی حیثیت سے اگر یہ کمزور ہوئے تو اس کی تمام تر ذن داری تم پر عائد ہوگی جس کے لیے میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گا۔ شام نو بجے کے بعد سے کوئی بچہ گھر سے نہیں نکلے گا۔ اور کسی کا کوئی..... دوست دروازے پر نہیں آئے گا۔ یہ دوستی یاری حض وقت کا زیاں ہے۔ میں

بالکل پسند نہیں کروں گا۔ کہ بچے اپنا وقت ضائع کریں.....!“ وہ شجرہ کی طرف پلٹے۔

”بیٹی.....! تم مجھے رپورٹ دو گی کہ میری ہدایات پر کہاں تک عمل ہوا۔؟“

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئے اور عمارہ کا دل لرز اٹھا۔ ان کی باتوں کی گھن گرج ابھی تک ماحول میں موجود تھی۔ تمام لڑکے کنوئیں کھدروں سے نکل آئے۔ اور کتابیں اٹھائیں، اشفاق نے کڑی نظروں سے شجرہ دیکھا پھر ماں سے بولا۔

”امی جان..... یہ ابو جی..... گھر میں بھی تھانے داری جھاڑنے لگے۔ اب وہ مجھے لڑکیوں کی طرح گھر میں قید کرنے کے احکامات جاری کر رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھ سے گھر میں نہیں بیٹھا جاتا، نہ میں کتابیں گھول کر پی سکتا ہوں۔ کیوں کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیل کود اور تفریح بھی ضروری ہے۔ ابو جی کا زمانہ دوسرا تھا۔ یہ دوسرا..... متحرک اور مشینی دور ہے۔“ عمارہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے اس کو دیکھا۔

”اب تم گستاخ بھی ہوتے جا رہے ہو، اشفاق تمہارے ابو نے یہ دفعہ محض تمہاری کوتاہ اندیشی کی بنا پر لگائی ہے۔ آخر اخلاقی پاسداری بھی کوئی چیز ہے۔ رہ گئی تفریح اور کھیل کود اس سے تو انہوں نے کبھی نہیں روکا۔ انہوں نے خود تم لوگوں کی دلچسپی کے لیے ٹینس کورٹ۔ کرکٹ لان کا اہتمام کیا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ سڑکوں پر مزگشت کرنے والے یا کافی ہاؤس میں رات گئے گیمیں لگانے اور لچر قسم کی فلمیں دیکھنے والے لوگ کسی طرح مہذب شہری نہیں کہلاتے۔ اور وقت کی پامالی انسان کی اپنی پامالی ہوتی ہے۔ تم زمانے کی بات کرتے ہو۔ تو تمہارے ابو جی اسی صدی کے انسان ہیں جس میں تم سب سانس لے رہے ہو۔ نہ وہ پتھروں کے زمانے کے ہیں اور نہ تم شیشے کے کسی دور سے تعلق رکھتے ہو۔ فرق صرف فکر و عمل کا ہے ذہنی ارتقا کا ہے۔ جو جتنی محنت کاوش کرے گا۔ خوشیاں اور کامیابی اتنی ہی اس کے حصے میں آئیں گی۔ بیٹا سورج بنو، چاند بنو، کیوں کہ سورج اور چاند کی روشنی بلا تخصیص دنیا کے ہر گوشے کو متور کرتی ہے۔ کوشش کرو ایک عملی انسان بننے کی تاکہ تمہارے بھائی بھی تمہاری تقلید کریں۔

”ایک تو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ لوگ مجھے بچہ کیوں سمجھتے ہیں۔؟ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہم جوان ہیں۔ اپنے متعلق رائے کا حق رکھتے ہیں۔ ہم بھی جانتے ہیں کیا اچھا ہے کیا بُرا۔؟“

”یہی تو دکھ ہے بیٹے۔“ عمارہ کی آواز میں..... کرب تھا۔

”تم اپنے متعلق بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہو، ماں باپ کے تجربوں کو صدیوں پرانی چیز سمجھتے ہو۔ حالانکہ آج ذہنی پسماندگی اور اخلاقی پستی کا مظاہرہ نئی جہزیشن کی طرف سے کھلم کھلا

ہو رہا ہے۔ اس سے پیدا ہونے والے نتائج کس قدر عبرت انگیز ہیں۔ یہ تم بھی دیکھ رہے ہو۔ مفتی راستے بڑے پرکشش ہوتے ہیں بیٹا۔ مگر وہ سیدھے پاتال پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ عمر میں اگر تم جوان ہو گئے ہو تو تمہاری سوچوں، تمہاری باتوں میں ابھی تک وہی تکرار۔ اپنی بات منوانے کی ضد موجود ہے۔ پھر تم کیسے اپنے کو صاحب رائے کہہ سکتے ہو.....؟“

اشفاق نے ماں کی طرف دیکھ کر سر جھکا دیا۔ اور کچھ توقف کے بعد ضدی بچوں کی طرح بولا۔

”وہ ٹھیک ہے امی جان..... مگر ابو جی سے کیسے۔ اپنی لگائی ہوئی دفعہ میں نظر ثانی کریں۔ ایک ڈنڈے سے سب کو نہ ہانگیں۔ آخر میری بھی کچھ پوزیشن ہے۔ میری عزت ہے میرا اپنا حلقہ ہے۔ میں کس طرح ان سے کنارہ کش ہو جاؤں۔؟“ عمارہ چکر اکر رہ گئیں۔ اس کی باتوں میں بڑی لچکی تھی۔ لہجے میں صاف بناوٹ کی بو آ رہی تھی۔ اس کی نظریں بر ملا کہہ رہی تھیں کہ ہمیں یہ پابندی منظور نہیں۔

وہ بیوی تھیں، شوہر کے مزاج کو خوب جانتی تھیں۔ ایک تو عبدالرزاق صاحب خود ایک با اصول انسان تھے۔ دوسرے پولیس میں آنے کے بعد ان کی باتوں میں نمایاں گھن گرج اور سختی آ گئی تھی۔ جرم و سزا..... کے سلسلے میں مجرموں کو کفر کردار تک پہنچاتے ہوئے وہ ایک مختلف انسان بن چکے تھے۔ ان کے مزاج میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوئی تھی۔ ان کا بس نہیں تھا کہ معاشرے کو ان مجرموں اور شرانگیز عناصر سے یلکھت پاک کر دیتے، ان کا نظریہ تھا کہ کوئی شخص پیدائشی مجرم نہیں ہوتا۔ والدین کی کوتاہیاں گھر کا فرسودہ نظام اور جہالت اُسے اس منزل تک لاتی ہے اور اس وقت وہ اپنے گھر میں تطہیر کا عمل سخت کر دیتے عمارہ سے سختی کے ساتھ جواب طلب کرتے ہوئے انہیں اپنی ذمے داریوں کا احساس دلاتے۔ ایک ایک بچے کی نشست و برخاست کا جائزہ لیتے، ان کے دوستوں اور ملنے والوں کا بالا بالا سروے کر کے یہ اندازہ لگانا چاہتے کہ ان میں کوئی غلط عنصر تو نہیں چھپا بیٹھا ہے۔ پھر خود ہی کاٹ۔ چھانٹ کر کے احکامات جاری کر دیتے۔ ان کی کسی بات میں ”ہنسی“..... کی کوئی گنجائش نہ تھی بچوں پر کوئی روک ٹوک نہ تھی جو چاہتے کھاتے، پیتے، اپنے لیے جو چیز پسند... کرتے بلا جھجک خرید لیتے، اپنے کمروں کی جس طرح چاہتے سینک بدل لیتے، جیب خرچ بھی معقول ملنا۔ محبت بھی وافر تھی۔ لیکن اس کے عوض چند نہری اصول وضع کر دیے تھے۔

”زیادہ دیر باہر مت رہو۔“

”زیادہ دوست مت بناؤ۔!“

”دوست بناتے وقت ان کے خاندانی پس منظر اور ان کے کردار پر نگاہ رکھو۔“

”اپنے باپ کے منصب سے غلط فائدہ نہ اٹھاؤ۔!“

”جھوٹ مت بولو چاہے گردن ہی نہ مار دی جائے۔“

”تمہارے سامنے سب سے اہم چیز تمہارا مستقبل ہونا چاہئے۔“

”وقت کا زیاں خدا کو پسند نہیں۔“

یہ چیزیں یہ باتیں گھر کے ہر بچے کے لیے لازمی تھیں۔ جس کا احترام سب کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ زریں اصول ان کی زندگی کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اسے کیا کہیے کہ جب میر کارواں ہی منزل کی اہمیت سے آشنا نہ ہو تو کارواں کا خدا حافظ۔۔۔ عمارہ بڑے صبر آزما دور سے گزر رہی تھیں وہ اشفاق کو حتی الامکان راہ راست پر لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن سرکش..... گھوڑے کو لگام دینا آسان نہیں ہوتا۔

گھر کا ماحول اچانک دھواں دھار ہو گیا۔ آفاق کمرے میں ایک طرف بیٹھا سبک رہا تھا۔ خیر گزری کہ اس دن اشفاق گھر جلدی آ گیا تھا۔ کیوں کہ اسے تیار ہو کر نوبے اسٹیج ڈرامے میں شرکت کرنی تھی۔ رزاق صاحب نے آج آفاق کی اچھی طرح مرمت کر دی تھی۔ کیوں کہ وہ پچھلے دنوں بغیر کہے سنے دوستوں کے ساتھ نیلم پوائنٹ چلا گیا تھا، جہاں ایک بچہ نہاتے ہوئے ڈوب گیا تھا۔ آفاق اپنے دوستوں کے ساتھ اس وقت وہاں سے آ گیا تھا۔ جب کہ بچے کے لواحقین پولیس کو لے کر وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ایک لڑکے نے نشاندہی کی تھی۔ کہ اس کے ساتھ یہ لڑکے تھے۔ ان میں آفاق کا نام بھی شامل تھا۔ پولیس والے آفاق کو جانتے تھے۔ رپورٹ میں اس کا نام حذف کر لیا گیا۔ لیکن رزاق صاحب کو پورا واقعہ سنا دیا گیا۔ وہ اس دن جلدی گھر آ گئے۔ فوراً آفاق کو طلب کیا۔ وہ گھبرایا ہوا باپ کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

”کل تم سارا دن کہاں غائب رہے؟“

”کہیں نہیں ابو جی، میں..... میں.....“ وہ ہکلا گیا۔

”سچ بتاؤ..... جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا۔“

”ابو جی..... ابو جی..... میں نیلم پوائنٹ پر نہا۔“

”کس سے پوچھ کر گئے تھے؟“

”کسی سے نہیں۔“

”وہاں کیا واقعہ گزرا تھا؟“ انہوں نے اپنی بید کی پکلی چھڑی اٹھالی۔ آفاق کی سٹیگم ہو گئی۔ عمارہ اور شجرہ دروازے پر دم سادھے کھڑی تھیں، رزاق صاحب کا غصہ نقطہ عروج

پر پہنچ چکا تھا..... آفاق نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کا ایک ساتھی نہاتے ہوئے ڈوب گیا۔ مگر اس نے اسے ڈوبتے نہیں دیکھا۔

”تم اب اتنے خود مختار ہو گئے کہ اب تمہیں گھر میں کسی سے اجازت لے کر جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ بولو کیوں؟“

باپ کی چھڑی حرکت میں آ گئی۔ سڑاک، سڑاک، سڑاک، ہر وار پر چیخیں۔

”ابو جی۔ ابو جی۔“ وہ تڑپا۔

”اب کبھی نہیں جاؤں گا۔ معاف کر دیجئے میری تو بہ اب گھر سے قدم نہیں نکالوں گا۔“ عمارہ اپنی چیخیں دبا کر کمرے میں بھاگیں اور شجرہ تڑپ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر چچا کے سامنے آ گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

”چچا جان..... بس کریں پلیز..... کافی سزا مل چکی ہے۔ معاف کر دیں اسے۔“ رزاق صاحب کے ہاتھ ایک دم رک گئے۔ اور آفاق بہن سے لپٹ گیا وہ تھر تھر کانپ رہا تھا وہ نڈھال سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے خوں بار نظروں سے آفاق کی طرف دیکھ کر شجرہ کو اشارہ کیا اور بولے۔

”اس بد بخت کو میری آنکھوں کے سامنے سے لے جاؤ اور اپنی ماں کو بھیجو۔“ رزاق صاحب کے حکم پر عمارہ کی جان سولی پر اٹک گئی تھی، آفاق کا جسم لہو لہان ہو رہا تھا، چھوٹے بچے سب سے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ اور اشفاق غصے میں نہایت بے چینی کے ساتھ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ آفاق کی حالت اور باپ کی سختی کا اس نے کوئی ٹوٹس نہیں لیا تھا۔ اسے اپنے پروگرام کے مایا میٹ ہو جانے کا سخت افسوس تھا۔ اس نے آفاق کی طرف دیکھ کر دانت پیسے۔ کجخت تیرا بھی حساب کتاب آج ہی ہونا تھا، یہ وقت تو کسی طرح گھر سے نکلنے کے لیے موزوں نہ تھا۔ وہ باپ کے غصے سے کبھی واقف تھا، اور ان سے ڈرتا بھی تھا، اس نے جلدی کر شجرہ کو آفاق کے زخموں پر ٹکڑ کر تے ہوئے دیکھا۔ مشتاق نے پھٹکری ملا ہوا گرم دودھ کا گلاس بہن کے ہاتھ میں دے دیا۔ جسے آفاق نے پینے سے انکار کر دیا۔

”چندابی لو، تھوڑا سا تمہیں سکھانا مل جائے گا۔“

عمارہ نے دبلیز پر قدم رکھا تو رزاق صاحب ہاتھ میں چھڑی لیے کمرے میں چلے لگا رہے تھے۔ انہوں نے پلٹ کر بیوی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ذرا بھی گہرا ہٹ نہ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ اور عمارہ کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے بھی میاں کو کڑے تیور سے دیکھا اور بیٹھ گئیں۔ دونوں میاں بیوی آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ابھی تک رزاق صاحب کے ہاتھوں میں وہی چھڑی تھی۔ جس نے آفاق کی جگہ جگہ سے کھال ادھیڑ دی تھی۔ آج رزاق صاحب شوہر نہیں پولیس افسر نظر

آ رہے تھے اور عمارہ بیوی نہیں ممتا کی ماری خالصتاً ماں تھیں۔ ان کے چہرے پر ڈھکے سائے لڑزاں تھے۔ دل بیٹے کی چوٹوں پر بلک رہا تھا۔ اور وہ بیوی کی اولاد سے جانب داری اور کوتاہیوں پر تلملا کر ان سے یوچھ رہے تھے۔

”تم کیسی ماں ہو....؟ کہ تمہیں اپنے بچوں کی نشست و برخاست اور پروگراموں کا علم نہیں ہوتا۔ تم بار بار ان پر سختی سے مجھے روکتی رہیں۔ بار بار یقین دلاتی رہیں کہ بچوں کی سوسائٹی غلط نہیں۔ وہ میرے احکامات کی پیروی کر رہے ہیں۔ انہیں میرے اصولوں سے اختلاف نہیں، وہ اپنی تعلیمی ذمے داریاں پوری کر رہے ہیں۔ مگر اس یقین دہانی کے باوجود میں جب آدھی رات کو بڑے صاحبزادے کو چوروں کی طرح جوتے بغل میں دبائے کبھی کھڑکی سے کبھی چار دیواری سے اندر آتے دیکھتا تو میں اپنے کو دنیا کا ناکام ترین آدمی سمجھنے لگتا۔ سوچو اس وقت میرا کیا رد عمل ہونا چاہیے تھا۔ ایک وہ باختیار شخص جس نے بڑے بڑی عادی مجرموں سے کبھی ہار نہ مانی آج وہ اپنی اولاد کے آگے بے بس تھا۔ محض ایک جذباتی ماں کی وجہ سے کیا میں نے تم پر اعتماد کر کے غلطی کی.....؟“

عمارہ نے ایک نگاہ غلط انداز شوہر پر ڈالی۔ ان کی پیشانی کی سلوٹوں میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ذرا بھی ان کی آفسری سے مرعوب نظر نہ آ رہی تھیں انہوں نے باپ کی تمام دلیلوں، تمام محرکات کو نظر انداز کر کے صرف ماں بن کر کہا۔

”نہیں.... شاید میں نے ہی آپ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے میں نہیں سمجھ سکتی کہ ایک باپ اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ مانا کہ اس سے تصور ہوا۔ مگر وہ بچہ تھا، آپ اُسے سمجھا بھی سکتے تھے۔ نہ کہ اس کی کھال ادھیڑ کر رکھی۔ ایک غلطی تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔“

بڑی گرجدار ”ہوں“..... تھی۔ وہ کھڑے ہو گئے اور چھڑی آہستہ آہستہ اپنی ہتھیلی پر مارتے ہوئے ٹہلنے لگے۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اس وقت عمارہ خاتون بقول ان کے ظالم باپ کی عدالت میں ممتا کا مقدمہ لے کر آئی ہیں۔ چنانچہ کوئی دوسری بات شاید ان کے پلے بھی نہ پڑے۔ انہوں نے اپنے لہجے کو تھوڑا سا نرم کر کے ان کی.... طرف

دیکھا۔ ”بنیاد کی ایک غلطی ہی پوری عمارت کو کمزور بنا دیتی ہے۔ عمارہ خاتون.... میں نے ”گر بہشتن روز اول باید“ کے مقولے پر عمل کیا ہے۔ اگر یہ عمل جراحی میں نے اشفاق پر آزمایا ہوتا تو شاید مجھے آفاق کو سرنش کی ضرورت نہ پڑتی۔ کم سے کم یہ مار آفاق کو برسوں اپنی غلطی کا احساس دلاتی رہے گی۔ اور عمارہ بیگم اپنے ولی عہد کو سمجھا دینا کہ آدھی آدھی رات والے ڈرامے کا اب ڈراپ سین ہو چکا ہے۔ اور پانی سر سے گزر گیا ہے۔ بتا دینا اسے۔“ ایسا کہتے وقت پھر ان کی آنکھوں میں سختی اتر آئی۔ آواز

اونچی ہو گئی۔ انہوں نے اپنی چھڑی زور سے میز پر ماری تو عمارہ گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

”تظہیر کا یہ عمل جاری رہے گا۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ وہ برابر کا ہو گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر کونے میں ڈال دوں گا۔ مگر اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ وہ باہر.... آوارہ گردی کر کے اپنی زندگی اور ماں باپ کی عزت کو داؤ پر لگا دے۔“

عمارہ نے ایک نظر شوہر کی شعلہ بار آنکھوں کو دیکھا اور خاموشی سے باہر نکل گئیں۔ اس وقت رزاق صاحب باپ نہیں ایک پولیس آفیسر تھے۔ چنانچہ ان سے کچھ کہنا فضول تھا۔ بچوں اور خصوصاً اشفاق نے باپ کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ عمارہ نے ایک نظر زخمی زخمی آفاق کو دیکھا۔ تو ان کے رُکے ہوئے آنسو گالوں پر ڈھلک آئے، شجرہ اس کی چوٹی پر دو لگا رہی تھی۔ آفاق کی آنکھیں بند تھیں۔

”چچی جان آپ آرام کریں۔ آفاق سو گیا ہے۔ میں اس کے پاس ہوں۔“

”کچھ کھلایا پلایا بھی۔ میرے بچے نے تو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔“

”جی.....! میں نے اُسے گرم دودھ میں پھنکری ڈال کر پلادیا ہے۔“ شجرہ نے ڈھک سے چھلکتی آواز میں آہستگی سے کہا۔ عمارہ آچل سے آنسو پونچھتی ہوئی بچوں کے کمرے کی طرف گئیں۔ اخلاق اور مشتاق اسٹڈی میں مصروف تھے ماں کو دروازے میں کھڑا دیکھا تو سیدھے ہو گئے۔ وہ.... انہیں دیکھتی ہوئی خاموشی سے آگے بڑھ گئیں۔ آخر میں اشفاق کا کمرہ تھا۔ روشنی دیکھ کر قدم رک گئے۔ دونوں پٹ کھلے تھے۔ پردہ بھی سر کا ہوا تھا۔ وہ بے مقصد ہی وسط میں کھڑا چھت گھور رہا تھا۔ چہرے پر بڑی رعونت تھی۔ ماں کو سامنے خاموش کھڑا دیکھا۔ تو گڑبڑا کر تھوڑا آگے بڑھ آیا۔ عمارہ کی غمگین خاموشی اور بولتی فریادی۔ آنکھوں کو دیکھ کر اس کی گردن جھک گئی۔ جو چی چی کر بن آواز کہہ رہی تھیں۔ ”پورے گھر کو اس کرب میں مبتلا کرنے والے تم ہو.... صرف تم.... کاش.... کاش.... کاش۔“

وہ تیزی سے مڑیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں اور وہ اڑتے ہوئے لفظ پکڑتا رہ گیا۔ گویا کی ہمت نہ ہوئی۔ آج اُسے ماں پر بے طرح رحم اور اپنے آپ پر شرم آ رہی تھی۔ اور ماں جس نے ہمیشہ شفقت اور مہربان کر مگی فضا قائم رکھی۔ اس کی پردہ پوشی میں اپنا آپ کھوتی رہی، کتنی دیکھی اور شکستہ نظر آ رہی تھی۔ شاید ”ماں“ لفظ ہے ایک امتحان کا صبر اور مشکلات کا یہ نازک وجود اپنے اندر کتنی استقامت، کتنا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس وقت اشفاق ماں کے ضبط و ایثار کو سخت مشکل میں دیکھ رہا تھا۔ یہ بات اس پر واضح ہو چکی تھی کہ اب وہ شاید باپ کے اصولوں اور حد بندیوں کو آسانی سے نہ توڑ سکے گا۔ اس کے اندر کا سرکش انسان نروس ہو رہا تھا۔ مگر وہ اب بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

”آخر اس گھر میں ہمارا استحصال کب تک ہوتا رہے گا.....؟“

بغاوت کی حد تک وہ باپ سے فرٹ تھا اور شجرہ نے اس دن کے بعد سے اب تک اس سے بات نہ کی تھی۔ نہ اس کا کوئی کام اپنے ہاتھ سے کیا تھا۔ نہ کھانے کی میز پر ساتھ بیٹھی تھی وہ بھی گھر کے الجھاؤ اور ذہنی خلفشار کا سبب اسی کو جھٹکتی تھی۔ آفاق ٹھیک ہو رہا تھا، اشفاق کے وہی لیل و نہار تھے۔ عبدالرزاق صاحب بے حد مصروف تھے۔ لمبی لمبی مینٹیکس ہو رہی تھیں۔ مجرموں کی تلاش اور..... تخریبی سرگرمیوں کے متعلق ٹھوس اٹھارکھا تھا چھوٹی..... چھوٹی وارداتیں تو عام تھیں، لیکن ایک خاص تخریبی گروہ نے قانون نافذ کرنے والوں کے خلاف محاذ قائم کر لیا تھا۔ جن کی سرکوبی ضروری تھی۔ اسی آپریشن کے لیے اقدامات ہو رہے تھے۔ رزاق کے تمام پروگراموں کا علم گھر والوں کو ہو جاتا تھا۔ کیوں کہ عمارہ بچوں پر رعب..... ڈالنے کے لیے کہہ دیا کرتی تھیں۔ کہ دیکھو اپنے اٹو کو پریشان نہ کرنا۔ آج کل وہ گھر دیر سے آرہے ہیں۔ بہت تھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اپنی پڑھائی کا خیال رکھنا اور بچے تو ویسے ہی باپ سے بہت ڈرتے ہیں۔ لیکن یہ اطلاعات اشفاق کے لیے بڑے سکون کا باعث ہوتی تھیں۔

کئی دن سے گھر میں بڑی خاموشی تھی۔ شجرہ اس سے کئی کئی پھر رہی تھی۔ اور اب وہ ان گونگے بہرے لحوں کو سنستے سنستے تنگ آ گیا تھا۔ اور شجرہ سے دو..... دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ وہ چائے لے کر عمارہ کے کمرے کی طرف جاری تھی۔ اشفاق نے لپک کر اس کا آ پچل کھینچ لیا پیالی ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے رہ گئی۔ اس نے مڑ کر اُسے..... انتہائی سخت اور شاکی کی نگاہوں سے دیکھا تو وہ ہنس دیا.....

”میری چائے کہاں ہے؟“

”کچن میں جا کر پی لیجیے۔“

”نہیں میں تمہارے ہاتھ سے پیوں گا.....“ وہ بچوں کی سی ہٹ سے بولا۔

”مجھے فرصت نہیں ہے۔“

وہ بے گنگی سے آگے بڑھ گئی۔ اشفاق نے لپک کر اس کا پیالی والا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا اور پیالی اک..... چھنا کے ساتھ نیچے گر کر ٹوٹ گئی۔ گرم گرم چائے چھلک کر ہاتھ اور کپڑوں پر آ گئی۔

”اشفی..... وحشی.....!“ اس کے غصے..... سے مظلوم ہو کر وہ مسکرا نے لگا۔

”بخدا.....! تم سے یہی تو سب سنا چاہتا تھا۔ دیکھو کتنے دن ہو گئے۔ تمہارے ہاتھ کی کافی پینے اکیلے ناشتا کرتے کرتے منہ ذائقہ خراب ہو گیا۔ تمہاری مسکراہٹ کو ترس گیا

ہوں۔ یہ گھر بالکل شہر خموشاں لگنے لگ ہے اب تم ہی بتاؤ اس ورانے کی تمنا کون کرے؟“ شجرہ کچھ دیر اسے ٹولنے والی ظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر آہستگی سے بولی۔

”اس گلشن کو ویرانے میں بدلا کس نے؟ کچھ احساس ہے تمہیں؟ تمہارا ہم سے کیا تعلق باہر تمہاری دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہے۔ ہماری دنیا تو بڑی محدود ہے یہاں تو ذرا سی بات بھی دلوں کا میل بن جاتی ہے۔ نہ کہ تم نے ہماری محبتوں اور اعتماد کو سولی پر چڑھا دیا۔ اشفی میں نے..... تمہیں ہمیشہ اپنا پاسبان سمجھا۔ میں اپنے محبوب اپنے ساتھی کے لیے عجیب کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ پھر بتاؤ میرے چہرہ پر مسکراہٹ کیسے آئے؟“

شجرہ کا ہر لفظ سچائی کا مظہر تھا۔ اشفاق سمجھ رہا تھا۔ لیکن.....!

چھٹی نہیں سے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ وہ اپنی یار باشی اور آوارہ مزاجی سے مجبور تھا۔ پھر باپ اس کا پولیس کا اعلیٰ افسر دوست احباب اس سے ہمیشہ..... مرعوب رہتے۔ اور وہ ان کے درمیان اکر کر چلتا..... جیسے کہہ رہا ہو.....

سیاں بھنے کو تو اب ڈر کا ہے کا.....! جو بھی وہ کرے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ سارے پولیس والوں کو وہ اپنے باپ کا لے پالک سمجھتا تھا۔ حالانکہ شجرہ نے اُسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی کہ باپ کا یہ اعزاز بیٹے کے لیے اسی وقت تک اعزاز رہتا ہے۔ جب تک وہ اس کا تحفظ کرے ورنہ باپ کا یہی نمغہ بیٹے کی پیشانی پر..... کلنک کا ٹیکہ بن جاتا ہے۔

”اشفی..... تمہیں خود اپنی راہ بنانی ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا تمہارے لیے اور اب تم جو بھی کرو گے اپنی۔ اولاد کے لیے۔“ اشفاق مسکرایا۔

”شجھو.....! تم بہت اچھی ڈیوٹیئر ہو.....!“ اور شجرہ کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ اسی کو کہتے ہیں۔ اندھے کے آگے روئے۔ اپنے نین کھوئے۔

”یعنی..... میں اب تک بکواس کر رہی تھی.....“ اس نے آنکھیں نکالیں اور اشفاق نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ارے یار.....! تم بہت جلدی ناراض ہو جاتی ہو تمہیں ستانے میں مزہ آتا ہے۔ اب جو میں بات کہنے والا ہوں اُسے غور سے سنو..... دیکھو شجھو..... صرف ایک چانس ہے میں اُسے مس کرنا نہیں چاہتا“ اس کے بعد سے وعدہ کہ اپنی پوری زندگی اور زندگی کا لمحہ لمحہ تمہارے نام ہوگا۔ باہر کی ساری سرگرمیاں ختم اور اپنی تمام کوتاہیوں کی تلافی کر دوں گا۔ انشاء اللہ پھر مجھ سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہوگی.....!“

شجرہ حیران تھی کہ اتنی لمبی چوڑی تمہید کس لیے..... اٹھائی جا رہی ہے، وہ کیا کہنا چاہتا ہے.....؟ کیوں کہ اس سے پیشتر بھی وہ اسی قسم کے بہت سے وعدے کر چکا تھا۔ یہ کوئی نئی

بات نہ تھی اسی لیے اس نے یہ بات اہم نہ سمجھی اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”کس چانس کی بات کر رہے ہو اشفی؟ کیا کوئی چچا..... جادو گر مل گیا ہے۔ جو کسی غار سے جادو کا چراغ تم سے حاصل کرنا چاہتا ہے؟“ شجرہ کی باتوں میں شوخی تھی۔ وہ بھی ہنس پڑا۔
 ”میں بتا دوں گا تمہیں، مگر ابھی نہیں۔“
 ”اور یہ“ ابھی نہیں..... کا وقفہ کتنا طویل ہوگا؟“
 ”بس چند دن.....!“

اور یہی چند دن اشفاق کی زندگی کے لیے ”بھول بھلیاں“ بن گئے۔

☆.....☆.....☆

”یار تم آؤ جی کے مزاج اور ان کے اصولوں سے واقف ہو۔ اور میں مسلسل خلاف ورزیاں کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ میری چھٹیاں بھی ختم ہو رہی ہیں۔ میں اب نہایت دیانت داری سے اپنی تعلیمی ذمے داریاں پوری کرنا چاہتا ہوں۔“ اشفاق عزیز اور فراز تینوں دوست شالیمار کیمپس میں ایک..... خوبصورت پنج میں نرم ٹھنڈی گھاس پر بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ عزیز نے کہا۔
 ”میں جانتا ہوں مگر دوست! انکل کے ہوتے ہوئے تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر میرے ڈیڈی پولیس فورس کے کسی شعبے میں ہوتے تو پھر میرے ٹھاٹ دیکھتے پارتھ تو بے تاج کے بادشاہ ہو۔ صرف دودن کی بات ہے۔ اب یاروں کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے.....؟“ اشفاق کے چہرے پر کشمکش کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ اُسے تذبذب میں دیکھ کر فراز نے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے ہم نے تم پر اعتماد کر کے غلطی کی ہے، کیوں؟“ اشفاق چونک پڑا۔
 ”نہیں، ہمارے اس مشن میں قیاس آرائیوں کی گنجائش نہیں۔ جلدی مت کرو مجھے سوچنے دو یہ معاملہ اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ اور یہ خط اپنے ذہن سے نکال دو۔ کہ میرے آؤ جی محبت پر فرض کو قربان کر دیں گے۔ وہ بے حد بولڈ آفیسر ہیں، تمہیں جو بھی کرنا ہے اپنا پہلو بچا کر کرنا، نہایت ہوشیاری سے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو.....!“ عزیز نے خوش ہو کر اُسے دیکھا.....

”آج تم جلدی گھر چلے جاؤ..... تاکہ تمہاری نیت پر کوئی شک نہ کرے۔“
 اشفاق نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ ”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آؤ جی آج کل میٹنگوں میں مصروف ہیں۔ یہ پورا ہفتہ ہم آزادی کا جشن منائیں گے۔“
 وہ تینوں انتہائی خوش باش اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

اشفاق کے رویے میں کافی تبدیلی آ گئی تھی..... شام سے پہلے گھر آ جاتا، ہنستے ہنساتے، بھائیوں کے ساتھ وقت گزار دیتا، شجرہ کو لے کر کئی بار ساحل..... پر گیا ٹھنڈی ٹھنڈی چمکیلی ریت پر شنگے پاؤں چلتے ہوئے بہت سی باتیں کیں۔ پتھر پر بیٹھ کر سروں کو چوم کر گزرنے والی ہر لہر کو گواہ بنا کر اس نے ان گنت وعدے کیے۔ وفا اور اس کی چاہت میں جاں سے گزر جانے کے، اس کی..... نرم و نازک ہتھیلیوں کی پشت پر اس نے مہر محبت ثبت کر کے اپنی جبین بھکا دی۔

”تم یقین کر لو شجو..... میں بُرا نہیں ہوں۔“ وہ تڑپ گئی۔

”اشفی.....!“ اس نے اس کی جھکی ہوئی پیشانی اٹھا کر آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ”تم بہت اچھے ہو اس کی صداقت میرے دل کی ہر دھڑکن پکار پکار کر دے رہی ہے۔ تھوڑی سی اپنی راہ بدل لو..... مجھے فخر کرنے کا شرف بخش دو اشفی۔ تم سے تو اچھا کوئی نہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”تم ضرور فخر کرو گی مجھ پر، مگر تھوڑی سی مہلت دے دو بس کچھ دن کی۔“ وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ ”یہ تم اس قدر پر اسرار کیوں بنتے جا رہے ہو.....؟“ اس کا دل ہولنے لگا۔
 اس دن..... وہ عمارہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے سینے میں سر گھسا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے حیران ہو کر اس کے پال چوم لیے۔ سر سہلاتی ہوئی پیار سے بولیں۔

”اشفی بیٹے.....! کچھ چاہیے تمہیں.....؟“

”سب کچھ تو دے دیا آپ نے امی.....!“ وہ اپنے لہجے کو شہید آ گیس بنا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”محبتیں..... شفقتیں..... پیار..... عنایتیں..... کرم مجھے تو تنگی داماں کا احساس ہونے لگا ہے امی۔ آپ تو سمندر ہیں پیار کا۔ میرا ہی ظرف چھوٹا نکلا۔“

”یہ آج تو کیسی باتیں کر رہا ہے بیٹا.....؟“ انہوں نے اشفاق کو کلیجے سے بھینچ لیا۔

شجرہ دور کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس قدر سعادت مندی اور ڈالر ہیں یقیناً اس کا کوئی مفاد پوشیدہ ہے۔ جب وہ ہشاش بشاش چہرہ لیے کمرے میں داخل ہوا تو وہ جھپٹنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

”میں جانتی ہوں اشفی..... تم آٹن کے لیے پرتول رہے ہو.....!“ وہ ایک دم طوفان کی طرح اس کے سر پر پہنچ گئی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

”بھی کبھی مجھے شبہ ہوتا ہے کہ غلطی سے تمہاری رُوح حسین لڑکی کے بجائے کسی خون آشام کے قالب میں تو نہیں حلوں کر گئی، بخدا وہ اسی طرح جھپٹتی ہے۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔

”اشفی..... اشفی.....“ اس نے دانت کچکچائے۔
 ”نالنے کی کوشش مت کرو۔ سچ بتاؤ تم نے کیا پلاننگ کی ہے۔ تم چچی جان کو بے وقوف بنالو گے۔ مگر میں تمہارا قبر تک پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔“
 ”کسی کی قبر تک میری یا اپنی؟“ وہ لپکی اور..... اشفاق ہنستا ہوا مسہری پر چڑھ گیا۔
 کمرے کی تمام چیزیں کشن، نیے، ایش ٹرے، گلدان، ٹائم پیس جو ہاتھ لگا..... شجرہ نے اُسے تاک تاک کر مارنا شروع کر دیا۔ وہ ہاتھ جوڑتا ہوا بولا۔
 ”بندہ پرور صلح..... معافی.....!“ شجرہ کے ہاتھ رُک گئے۔ اور کمرے کی حالت دیکھ کر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ چاند ماری نے کمرے کو کباڑی کی دکان میں بدل دیا تھا۔
 ”نیچے اُترو.....!“ شجرہ نے حکم دیا۔ وہ نیچے اُتر کر بولا۔
 ”اب ہم اچھے دوستوں، اچھے دشمنوں کی طرح خوشگوار فضا میں مذاکرت کریں گے۔“
 وہ ہنستا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”جی نہیں مذاکرات بعد میں ہوں گے پہلے کمرہ ٹھیک کرو۔“ اس نے رعب ڈالا۔
 ”واہ..... میں کیوں ٹھیک کروں۔“ وہ اکڑ گیا۔
 ”بغیر کسی جواز کے مسماری تم نے شروع کی تھی۔ اب نتائج بھی تم ہی بھگتو۔“
 ”زیادہ باتیں نہ بناؤ اٹھو..... میری مدد کرو۔ اگر کوئی ادھر آ گیا تو جانے کیا سوچے۔“
 شجرہ نے نہایت نرمی سے اس کا بازو پکڑ کر اٹھا دیا۔
 ”کیا سوچے گا.....؟“ وہ معنی خیز نظروں سے..... مُسکرا کر اُسے دیکھنے لگا۔
 ”بکومت.....؟“ وہ بھی مسکرا دی۔ ذرا دیر میں ہر چیز اپنی جگہ پر صفائی سلیقے کے ساتھ پہنچ گئی۔ اب وہ دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔
 ”اشفی کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جو ہماری اس چھوٹی سی بے ضرر اور خوش و خرم دنیا کو آفات سے ہمکنار کر دے۔ یہ چمن ہمارے مشترکہ خوابوں کی تعبیر ہے۔ اس کی آبیاری ہم نے اپنے خون جگر سے کی ہے۔ یہ ہماری آرزوؤں کا مسکن ہے۔“
 ”میں جانتا ہوں شجرہ..... اسی لیے تم سے دودن مانگ رہا ہوں۔“
 ”اشفی..... دودن تو بہت ہیں۔ دوپل میں دنیا بدل جاتی ہے۔“ شجرہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔
 ”تم ہر چیز کا منفی پہلو کیوں تلاش کر لیتی ہو.....؟“
 ”اس لیے کہ ہمیں انجام تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔!“
 ”پلیز شجرہ..... میرے اوپر اعتماد کرو۔“

”وہ تو مجھے کرنا پڑے گا اشفی..... تمہاری ضد نے مجھے دوراے پر کھڑا کر دیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی تم اپنے مقصد میں کامیاب رہے ہو۔ منزل اگر مشکوک ہو تو واپسی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں اشفی! اس بات کا خیال رکھنا..... گھر کے تمام دروازے تمہاری آہٹوں کے منتظر ہیں گے۔ ہمیں کسی آزمائش میں مبتلا نہ کر دینا۔“
 اشفاق نے کچھ بتایا۔ کچھ نہیں اور اس پر اسرار کچھ ڈھکی، کچھ چھپی گفتگو سے شجرہ نے بہت کچھ معلومات فراہم کر لی تھیں اور ذہن نے جب واقعات کی کڑیاں ملانی شروع کیں تو اس وقت اشفاق کو گھر سے گئے ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔ شجرہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ ہنگامہ بازی اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑتے دیکھ رہی تھی۔ اور کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ باپ لمبی لمبی مینٹیکس کر رہے تھے۔ ماں اور بھائی سمجھ رہے تھے۔ کہ اشفاق پٹک پر حیدر آباد گیا ہے۔ مگر شجرہ کے سینے میں سانسیں گھٹ رہی تھیں۔
 یہ اس کا چونکا دینے والا رویہ! اچانک ٹوٹ پڑنے والی محبتیں، وعدے، قسمیں، یہ سب کیا تھا؟ میں نے اُسے کیوں جانے دیا۔ روکا کیوں نہیں؟
 ☆.....☆.....☆
 وہ سندھ کا ایک غیر معروف اور بنجر علاقہ تھا جہاں چھوٹی بڑی پہاڑیوں اور ٹوٹے پھوٹے مکانوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کبھی یہاں آبادی رہی ہوگی، ٹنڈ منڈ درخت جگہ جگہ کھڑے تھے۔ پانی تو پانی، دور دور تک کہیں سبزہ اور نمی نظر نہ آ رہی تھی۔ پانچ نفوس کا مختصر قافلہ آہستہ آہستہ ایک ٹوٹی پھوٹی حویلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جو ایک قلعہ کی مانند اپنے مجروح پنکھ دور تک پھیلے ہوئے..... کھڑی تھی۔ اس دشت کارواں میں تین مرد تھے دو لڑکیاں مردوں کے ہاتھوں میں رانفلتھیں تھیں اور لڑکیاں سندھی چادروں سے منہ چھپائے ہوئے تھیں، وہاں پہنچ کر انہوں نے کئی راہداریاں، کئی نشیب و فراز طے کیے۔ اور جب ٹوٹے پھوٹے بڑے سے آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو وہاں ایک مرغزار لہلہاتا ہوا نظر آیا۔ خدا کی شان وہ تو دنیا ہی دوسری تھی۔ جنت سے قریب تر۔ نعمتوں سے پھلکتی ہوئی، معلوم یہ ہوا کہ وہ ٹوٹی پھوٹی حویلی اس پر اسرار محل کا غلاف در غلاف تھی۔ جس کے اندر آسائش اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی، قیمتی سامان سے سجے ہوئے کشادہ کمرے تھے۔ مگر وہ پر اسرار ہاتھ نظر نہیں آ رہے تھے جنہوں نے اُسے سجایا، سنوارا، تعیش کی ہر چیز کے باوجود بڑی تنہائی اور ویرانی محسوس ہو رہی تھی۔ اشفاق نے سوالیہ نگاہوں سے عزیز کی طرف دیکھا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔
 ”کوئی سوال نہ کرنا۔ یہ اس دنیا کا دستور ہے..... جو دیکھو جو برتو جو محسوس کرو اُسے نوک

زبان پر لانا جرم ہے۔“ عزیز نے ایک ٹھنڈی بوتل فریج سے نکالی۔
 ”بڑی پیاس لگی ہے۔ چلو پانی پیو۔ سب کھاؤ۔“ میز پر رکھی ہوئی خوبصورت ٹوکری
 میں سبب دیکھ کر ٹوٹ پڑی۔ بے حد میٹھے نرم اور خوشبودار سبب تھے۔ مشعل کچھ نزد نظر
 آرہی تھی۔ سطوت نے اس کو تسلی دی۔
 ”تم ابھی سے ہمت ہارے دے رہی ہو۔ حوصلہ رکھو وہ لوگ بھی اب آنے ہی والے
 ہوں گے۔“

”سطوت مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ مشعل کی آنکھوں میں نمی ہو جائے گی۔
 ”ارے نہیں.... بے وقوفی کی باتیں نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

رات کو کھانے کی لمبی سی میز کے گرد وہ کھڑے ڈشوں میں بھنے ہوئے پورے مرغ۔
 ڈوگوں میں سالن گرم گرم نان اور خوشبودار بھاپ اڑاتی بریانی کی قاقیں بچی ہوئی دیکھ
 رہے تھے۔ اور حیران ہو رہے تھے۔ انہیں پکانے اور میز پر لگانے والوں کے نہ چہرے نظر
 آئے نہ ہاتھ اس خاموشی سے ہر چیز مہیا ہو گئی جیسے آسمان سے اتری ہو۔ اشفی نے کچھ کہتی
 کچھ کھوجتی نظروں سے سب کو دیکھا مگر وہ لوگ کھانے میں مصروف تھے۔ بڑی بے رحمی
 سے مرغ کی ٹانگیں نوچ رہے تھے۔ البتہ مشعل صرف وقت پاس کر رہی تھی۔ اشفاق نے
 بھی خاموشی ہی میں عافیت بھی اور وہ بھی اس جہاد میں شریک ہو گیا۔

”یار.....! کھانا بڑے مزے کا تھا۔“ فراز نے سرشار ہو کر کہا۔

”یہاں کے لوگ بڑے مہمان نواز معلوم ہوتے ہیں۔“ عزیز بولا۔

”ہاں اپنے مہمانوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ ذرا بھی ڈسٹرب نہیں کرتے۔“ اشفاق
 کے اعتراف میں طنز تھا۔

کچھ دیر کے بعد انٹرکام پر کسی نے اطلاع دی۔

”مہمان آگئے۔“ اس کے بعد دروازہ کھلا پہلے.... قاضی جی اپنی سفید عباسنبھالتے
 اور سفید لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی فرات سے ”اسلام.....!“ کہہ کر اندر
 داخل ہوئے۔ پھر فضل بڑا سا بیگ لیے آگے بڑھا۔ عزیز بیگ لے کر دوسرے کمرے میں
 سطوت اور مشعل کے پاس پہنچا..... بولا۔

”جلدی سے تیار کرو۔“ وہ اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

سطوت نے جلدی سے بیگ کھولا۔ عروسی جوڑا ہار پھول۔ جوڑیاں زبور نکالا اور مشعل
 کو تیار کرنے لگی.... اُدھر عزیز نے فراز کو بھی ایک نیا سفید شلوار سوٹ پہنا کر ایک بار گلے
 میں ڈال کر تیار کر دیا۔ مشعل دلہن بنی خاموش بیٹھی بڑی پیاری لگ رہی تھی اس نے تو ایسی

شادی کا تصور بھی نہ کیا تھا، مگر انسان کچھ سوچتا ہے اور قدرت کے ہاتھ کچھ انجام دیتے
 ہیں۔ اتنے میں عزیز قاضی جی کو لیے پہنچ گیا۔ نہایت خاموشی سے نکاح ہوا۔ ڈولہا۔ دلہن
 اور گواہوں کے دستخط لیے۔ اور کمرے سے چلے گئے۔ چھوہاروں کے ساتھ مبارکبادیاں
 بھی ملیں۔ اور قاضی جی کو ان کا نذرانہ بھی اس کے بعد فضل فوراً قاضی جی کو واپس لے
 گیا۔ مشعل سطوت سے لپٹ کر سسکتی رہی۔

کچھ دیر بعد فراز کو مشعل کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ عزیز اور سطوت ہال کمرے میں
 بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ اور اشفاق اپنی رائفل لے کر باہر چلا گیا۔ اُسے خدشہ تھا کہ کہیں
 جشیہ آ کر پنگامہ نہ کھڑا کر دے۔ آج کی یہ رات اس کی دوستی اور واپسی کے درمیان پہاڑ
 بن کر حائل تھی۔ اس نے شجہ سے وعدہ کیا تھا کہ تیسری دن وہ اپنی زندگی اور زندگی کی تمام
 تر خوشیاں اور اقتدار اس کے سامنے... وقت کے خوان میں سجا کر پیش کر دے گا۔ اس لیے
 یہ رات بڑی اہم تھی، اسے یقین تھا کہ جشیہ انتہائی کینہ توڑ اور کمینہ انسان ہے۔ وہ مشعل
 اور فراز کو چھوڑے گا نہیں۔ اور یہی اندیشہ آج رات اُسے جاگنے اور چوکنا رہنے پر مجبور
 کر رہا تھا۔ وہ اپنے دوست کو بہر صورت اُن شر پسندوں سے بچانا چاہتا تھا۔

وہ رائفل ہاتھ میں لیے ٹھہل رہا تھا، یہاں کے کمین کیسے ہیں؟ کہ اتنی بڑی حویلی۔ اتنے
 ساز و سامان کے باوجود کوئی چوکی پہرہ نظر نہیں آیا۔ نہ کسی طرف سے ہوشیار باش کی آواز
 ابھری.... اسی لیے یہ ناگوار فرض اسے انجام دینا پڑا۔ یہ سوچتا ہوا آہستہ آہستہ وہ کئی راؤنڈ
 پورے کر چکا تھا۔ رات کا کوئی پچھلا پہرہ تھا کہ اچانک فائر کی آواز گونجی، مشعل گھبرا کر فراز
 سے لپٹ گئی اور سطوت نے کانپ کر عزیز کا سہارا لے لیا۔ عزیز بھاگ کر دروازے پر گیا
 اور چلانے لگا۔

”اشفاق.....! اشفاق.....!“ پھر دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ سطوت چیخی۔

”زک جاؤ عزیز.....!“ فراز بھی دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے بدحواس مشعل
 تھی۔ سطوت نے اُسے تھام لیا۔

”گھبراؤ نہیں مشعل.....!“ پھر جانے کن کونوں گھد رویں سے لوگ نکل آئے۔ ان
 کے چہروں پر ڈھانڈا بندھا ہوا تھا۔ مگر آنکھوں میں وحشت نہ تھی۔ وہ رائفلیں ہاتھوں میں
 لیے نرم آواز میں پوچھ رہے تھے۔

”سائیں.....! فائر کس نے کیا۔ آپ کا آدمی کہاں ہے؟“

”گھبراؤ نہیں سائیں۔ اللہ بھلی کرے گا۔“

پھر ایک دم جیسے دن نکل آیا۔ بہت سی مہتابیاں روشن ہو گئیں۔ اور عزیز کی چیخ نکل

گئی۔ اس نے بجائے اشفاق کے جمشید کو زمین پر زخمی حالت میں پڑے دیکھا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ نکل کر زمین کو لالہ زار بنا رہا تھا۔ اور وہ بے ہوش تھا۔ فراز نے حیران ہو کر کہا۔

”یہ جمشید یہاں کیسے آیا۔ اور اشفاق کہاں چلا گیا۔“ جمشید کا نام سن کر مشعل تھر تھر کانپنے لگی۔ عزیز اور فراز نے کھڑے ہو کر ڈھانٹا باندھے محافظوں سے کہا۔

”تم لوگ فوراً اُسے اسپتال لے جاؤ۔ شاید یہ بچ جائے۔“ ان لوگوں نے بجلی کی سی تیزی سے جمشید کو اٹھایا اور جیپ میں ڈال کر جامشورو اسپتال روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد اشفاق کی تلاش شروع ہو گئی۔ فراز اور عزیز اور وہاں کے سارے محافظین ساتھ میں تھے۔ ایک ایک پتھر اور.... جھاڑی کی اوٹ میں دیکھتے رہے۔ آوازیں دیں۔ ہوائی فائر کیے۔ پورا علاقہ چھان مارا۔ مگر اشفاق نہ ملا۔ البتہ اس کی رائفل ایک جگہ پڑی مل گئی۔ عزیز۔ فراز اور دونوں.... لڑکیوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

صبح کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ آخر وہ تھک ہار کر واپس آ گئے۔ ان کی سمجھ میں یہ اسرار نہیں آ رہا تھا کہ آخر اچانک اشفاق کہاں چلا گیا۔ اور یہ جمشید....؟ وہ سخت سراسیمہ تھے۔ ان کے سامنے سب انسپکٹر و زاق کا پُر جلال چہرہ آ گیا۔ اور ان کی کچکی چھوٹ گئی۔

☆.....☆.....☆

فراز..... حیدر آباد کے مضافات سے بغرض تعلیم.... کراچی آیا تھا۔ ان کے والد زمیندار تھے۔ وہ بیٹے کو.... ایڈوکیٹ بنانا چاہتے تھے۔ گاؤں کے اسکول سے اس نے مڈل اور حیدر آباد سے میٹرک کیا۔ پھر ان کے والد نے خود اُسے کراچی ہوٹل میں داخل کروادیا۔ وہ تعلیمی مراحل طے کرتا رہا، پیسے کی اُسے کمی نہ تھی۔ کراچی کی زندگی.... کھلنڈرے دوستوں کی سنگت میں اس نے بھی خوب رنگ رلیاں منائیں۔ بینک اور پارٹیوں کا موسم آیا۔ کالج میں فراز کی ملاقات مشعل سے ہو گئی.... وہ خاموش، سہمی ہوئی.... اور خوبصورت لڑکی اُسے بہت اچھی لگی۔ وہ اس کی طرف کھینچتا چلا گیا۔ اور پسندیدگی رفاقت کی منزل میں داخل ہو گئی۔ اس بدحواسی لڑکی کے ساتھ یہ ٹری بیڈی تھی کہ اس کی ماں مرچکی تھی باپ نے دوسری شادی کر لی، مگر دوسری ماں نے اُسے قبول نہیں کیا۔ سوتیلی ماں کا ظلم بڑھتا رہا، مشعل کی نہ کوئی خالہ تھی نہ ماموں چچا۔ تایا نے پہلے ہی تعلقات ختم کر لیے تھے۔ وہ کس کے دامن میں پناہ لیتی۔ میٹرک کے بعد سوتیلی ماں نے اُسے جبراً گھر بٹھالیا۔ کیوں کہ دوسری ماں کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ گھر کا کام تھا یہ سب کون کرتا....؟ بچوں کو.... کون سنبھالتا، ایک دن مشعل نے باپ کو کمرے میں

تہا.... دیکھا تو اُن سے لپٹ کر رونے لگی۔ بولی۔

”بابا جان.....! میں آپ کی بیوی بچوں کی خدمت کروں گی۔ گھر کے سارے کام میرے ذمے۔ مگر مجھے آپ پڑھنے سے نہ روکیں۔ کالج میں میرا داخلہ کرادیں۔ میں آپ کو بھی شکایت کا موقع نہ دوں گی۔“

بیٹی کی بے بسی اور برستی آنکھوں کو دیکھ کر باپ کا دل پیچ گیا۔ اُسے گلے سے لگا کر وعدہ کیا۔

”تو نہ گھر بیٹھی.....! میں تیری ماں کو سمجھا دوں گا۔ تو ضرور کالج میں پڑھے گی، پر بیٹی گھر کا خیال رکھنا۔“

اس طرح وہ کالج میں پڑھنے لگی۔ فراز کی رفاقت محبت اور دلجوئی نے اس کے سارے غم بھلا دیے۔ وہ خوش تھی کہ کوئی تو اس کے دکھ درد کا ساجھی ہے۔ مشعل کی مشقت بڑھ گئی تھی۔ کالج سے آ کر سارے گھر کی صفائی ستھرائی، کھانا پکانا۔ سب کو کھلانا، رات گئے جب فرصت ملتی تو پڑھائی دیکھتی۔ اس کا جسم تھک کر چور ہو جاتا۔ مگر آگے بڑھنے کا نشہ۔ فراز کی محبت اُسے دوبارہ زندہ کر دیتی۔ اس کی توانائی بڑھ جاتی۔ اس کے باوجود سوتیلی ماں کی زبان میں تلوار سے زیادہ کاٹ ہوتی، شعلے برساتی آنکھیں مشعل کے اندر اتر کر آگ لگا دیتیں۔

ایک دن مشعل نے روتے ہوئے فراز سے کہا۔

”امی میری شادی ایک جاہل اور اُجڈ گنوار سے کر رہی ہیں، نہ جانے ایسا کر کے وہ اپنے کن جذبوں کی تسکین کرنا چاہتی ہیں۔ اور میرا باپ کچھ نہیں کر سکتا، میں مرجاؤں گی فراز.... مگر ایسا نہیں ہونے دوں گی....“ فراز نے اُسے تسلی دی کہا۔

”پریشان نہ ہو میں کوئی حل نکالتا ہوں۔“

ایک دن.... فراز مشعل کو اپنے دوست عزیز کے گھر لے گیا۔ عزیز کی شادی ہو چکی تھی اس کے باپ کا اپنا بزنس تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بزنس میں میرا ہاتھ بٹائے۔ اسی لیے وہ.... ایم بی اے کر رہا تھا۔ عزیز کی بیوی سطوت بڑی.... ہنس منگھ.... بلنسا لڑکی تھی۔ مشعل اُسے بہت پسند آئی جب اُسے مشعل کے حالات کا علم ہوا۔ تو وہ اس کی ہر ممکن مدد کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اور یہ مشورہ عزیز اور.... سطوت کا ہی تھا کہ دونوں خفیہ شادی کر لیں۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔ اس سلسلے میں عزیز نے پوری ذمے داری قبول کی۔ اس کے کچھ دوست سندھی تھے۔ انہوں نے یقین دلایا کہ کسی کو پتا نہ چلے گا۔ ہر کام بہ حسن و خوبی اور راز کے اندر ہوگا۔ اس کے لیے انہوں نے اس پر اسرار عمل نما۔

حویلی کا ذکر کیا۔ اشفاق۔ عزیز اور فراز تینوں جگری یار تھے۔ اس نیک کام میں انہوں نے اشفاق کو بھی شریک کر لیا۔ اس مہم میں اسے شریک کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اگر کوئی گزربڑ ہو تو اشفاق اپنے باپ کے اثر و رسوخ سے کام لے کر رفع دفع کر سکتا ہے۔ جمشید کالج میں لڑکیوں کے درمیان ولن کے حیثیت..... رکھتا تھا۔ اس نے مشعل سے صاف کہہ دیا تھا کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ اور میں اپنی پسندیدہ چیز مانگ کر نہیں چھین کر لیا کرتا ہوں۔ اس بات پر مشعل سہم گئی۔ کوئی نہ کوئی دھمکی مشعل کو دینا جمشید کا معمول بن گیا تھا۔ کئی بار فراز سے جھگڑا ہوتے ہوتے بچا۔ دو پارٹیاں بن گئیں۔ قریب تھا کہ سر..... پھٹول ہو جاتا کہ پرنس کی خبر ہو گئی۔ اور جھگڑا بڑھنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ لیکن جمشید اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا راہ میں مشعل کو روک کر کہہ دیتا۔

”آئی لو یو.....!“

مشعل جلدیلا کر رہ جاتی۔

ایک دن اس نے مشعل کا ہاتھ پکڑ لیا..... اور آواز میں سوز بھر کر کہا۔

”مشعل میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا.....!“ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر غصے سے کہا۔

”مر جاؤ..... دفع ہو۔ آئندہ سے بکواس کی تو..... پرنسپل سے شکایت کر دوں گی۔“ وہ نہایت بدتمیزی سے بولا۔

”اور فراز تمہارا کیا لگتا ہے؟“

”وہ میرا سب کچھ لگتا ہے۔“ وہ سگ کر بولی۔

”افسوس ہے جمشید تمہیں تعلیم نے بھی کچھ نہیں دیا۔ نہ تہذیب نہ شائستگی، پہلے بات کرنے کا ڈھنگ سیکھو۔“

”اوہو.....!“ وہ تہقہہ لگا کر بولا۔

”اب تم مجھے سبق پڑھانے لگی ہو۔ خیر میں۔ دیکھ لوں گا تمہیں بھی اور تمہارے فراز و ذریعہ کو بھی۔“

اس دن سے مشعل جمشید سے ڈرنے لگی تھی..... اشفاق بھی جمشید کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے کچھ دن۔ بعد اچانک جمشید میں حیرت انگیز تبدیلی آ گئی، کالج میں..... ہر ایک سے نہایت محبت اور شائستگی سے ملتا۔ زیادہ وقت تعلیم پر خرچ کرتا۔ خصوصاً مشعل سے بڑے احترام اور محبت سے پیش آتا۔ اس کے لہجے اور آنکھوں میں نرمی آ گئی تھی۔ وہ اہم بازی۔ چھیڑ چھاڑ ختم ہو گئی تھی۔ جو لوگ اس سے دور ہو گئے تھے وہ پھر اس کے قریب

آ گئے تھے۔ مشعل کی ماں کی ریشہ دوانیاں بڑھ گئی تھیں۔ جب وہ..... کالج سے جاتی وہ منقلاط پر اتر آتیں اور اتنا کام اس کے سامنے پھیلا ہوتا کہ سانسیں گھٹنے لگتیں، وہ اونچھے ہتھکنڈوں پر آ جاتیں۔ اس سے پوچھتیں ”اب کون سا گھر..... ڈھونڈ لیا ہے۔ کیا بوڑھے باپ کی سفید داڑھی میں۔ کالک ملنے کا پروگرام بن رہی ہو.....؟“

مشعل بھڑک اٹھتی، سوتیلی ماں کی باتیں ناقابل برداشت ہو گئی تھیں۔ آخر پانچویں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے منصوبے کو آخر شکل دے دی، سندھی دوست نے اپنا ایک آدمی بھیج دیا۔ کہ وہ تمہیں گائیڈ کرے گا۔ اور یہ بھی کہا۔

”وہاں تمہیں ہر چیز مل جائے گی۔ ضرورت کے تحت فراوانی کے ساتھ۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ اس حویلی کے متعلق اپنی زبان بند رکھنا۔“ پھر ایک مناسب دن یہ پانچویں افراد اجنبی گائیڈ کے ہمراہ اس پراسرار محل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہر کام ٹھیک ہوا۔ مگر جانے کیسے جمشید نے ان کے راز داں ذہن میں نقب لگالی۔ اور وہ ان کے پیچھے ہی چھپتا چھپاتا چلا گیا۔ اس نے صرف ماحول کو بنانے اور مشعل کو راہ راست پر لانے کے لیے نیک نامی کا یہ ڈرامہ کھیلا تھا۔ ورنہ اس کی نیت کبھی ٹھیک نہ تھی۔ اس نے اپنی مدد کے لیے بڑھان کو بھی تیار کر لیا تھا۔ وہ جمشید کا دوست تھا۔ عین وقت پر وہ ان کے منصوبے کو ناکام بنانا چاہتا تھا۔ مگر اُسے دیر ہو گئی۔ جب وہ پہنچا تو نکاح ہو چکا تھا۔ اور اشفاق اپنی رائفل لیے باہر پہرہ دے رہا تھا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ جمشید آتے ہی فائر جھونک دے گا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ نشانہ چوک گیا۔ اور اس لمحے سے فائدہ اٹھا کر اس نے فوراً جوابی فائر کر دیا۔ دو گولیاں نکلیں۔ اس کے سینے سے نیچے پیٹ میں لگیں۔ دوسری ٹانگ میں! جمشید گر پڑا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے خون میں نہا گیا۔ اشفاق کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

حالات کی نزاکت! اپنی پوزیشن ماں باپ کی عزت اور اجنبی جگہ دیکھ کر اُسے فرار کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس نے فراز اور عزیز کی چیخیں اور آوازیں صاف سنی تھیں، مگر وہ قتل کا مرتکب ہو گیا تھا، اس کے لیے یہاں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ کچھ شرم، کچھ باپ کا خوف۔ اپنی عزت نفس، اور دنیا داری کا خیال تھا۔ جس نے اُسے..... بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

☆.....☆.....☆

صبح ہوتے ہی عزیز اور فراز نے وہ جگہ چھوڑ دی۔ انہیں محافطوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ جمشید موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ زندگی سے اس کا رشتہ ابھی باقی تھا پھر تیسرے دن اخبارات میں جمشید کے قتل اور اشفاق کے فرار کی پوری داستان آ گئی، لکھا تھا۔

”کچھ دوست..... ایک لڑکی کا خفیہ نکاح پڑھانے سندھ کی ایک شستہ حویلی میں گئے“

وہاں انہوں نے قاضی کو بلوالیا۔ اور نکاح کی رسم ادا ہو گئی۔ لیکن کچھ دیر بعد لڑکی کا پہلا طلب گار آ گیا۔ احتجاج کے طور پر اس نے ایک ہوائی فائر کیا۔ مگر اشفاق نامی ایک لڑکے نے جو لڑکی کے ساتھ آنے والوں کا دوست تھا۔ اس نے جمشید پر گولی چلا کر اسے قتل کر دیا اور فرار ہو گیا۔“

عزیز اور فراز نے اخبار پڑھ کر اپنا سر تھام لیا، ان کے پسینے چھوٹ گئے۔

”یہ کون ہو سکتا ہے۔ کس نے اخبار کو یہ تفصیل فراہم کی.....؟“ وہ سوچتے سوچتے اُچھل پڑے۔

”اوہ.....! تو یہ ان کا ہی ساتھی معلوم ہوتا ہے۔ کیا نام تھا اس کا.....؟“ عزیز جلدی سے بولا۔

”برہان.....!“

”ہاں برہان! اس کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں ساتھ آئے تھے۔ اور جمشید کو گولی لگتے ہی وہ چھپ گیا.....!“

”اوہ میرے خدا!“ فراز نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”اب تو خیریت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔“ پھر عزیز نے اپنے والد کو اعتماد میں لے کر انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ یہ سن کر شپٹا گئے۔

”یہ تم لوگوں نے کیا کر دیا۔ اب کیا ہوگا اور وہ تمہارا دوست اشفاق.....؟“ انہوں نے انتہائی تشویش سے کہا۔

”سب انسپکٹر رزاق زمین و آسمان الٹ پلٹ کر رکھ دے گا۔ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ پتا نہیں اب وہ بچہ کہاں ہے۔ اس پر کیا گزری؟“

یہ لوگ انتہائی خوف زدہ اور سراسیمہ تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آنے والے طوفان سے کس طرح بچنا جائے۔ انسپکٹر رزاق کی مینٹیکنس جاری تھیں انہیں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ لیکن شجرہ نے خبر میں وہ اخبار پڑھ لی تھی۔ جس نے اسے جیتے جی آگ کے دریا میں اتار دیا تھا۔

”اشفی! یہ کیا کر دیا تم نے؟“

آخر آوارگی کا یہ انجام تو ہونا ہی تھا۔ وہ سینہ دبائے بن آواز سسکتی رہیں۔ اسے ڈر تھا عمارہ کا جس کی ممتا پر یہ خبر سن کر ہی غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ مگر سورج کو افق سے کس نے روکا ہے۔ دن کا اُجالا تو پھیلے گا ہی۔ رات بھی قدرت کا مقررہ کردہ نظام کے تحت آئے گی ضرور۔ پھر اس خبر کو کون روک سکے گا؟ ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ سو عمارہ نے جب

وہ خبر پڑھی تو بے ہوش ہو گئیں۔ گھر میں خاموشی بالکل مچی ہوئی تھی۔ صدمے سے زیادہ رزاق صاحب کا خوف انہیں کھائے جا رہا تھا۔ ان کی..... بلکہ وہ سب یہی چاہتے تھے کہ رزاق صاحب یہ خبر خود پڑھیں یا انہیں کوئی دوسرا آدمی سنائے..... گھر کی فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ لگ رہا تھا اس گھر میں کوئی موت واقع ہو گئی ہے۔ سب کے چہروں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں کرب ہی کرب ہلکورے لے رہا تھا کیسا کھانا..... کس کا آرام.....؟ آخر وہ قیامت کا دن آ ہی گیا۔

سب انسپکٹر عبدالرزاق صاحب آندھی اور طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئے۔ بیوی کے سامنے اخبار پھینک کر ان کی طرف خون چھلکانی نظروں سے دیکھا اور دھاڑ کر بولے۔

”یہ ہے آپ کی محبت کرشمہ ساز کا انجام۔ دیکھیے، پڑھیے اور جشن منائیے گا۔ آپ کے ہونہار بیٹے نے ہماری عزت کو ثریا گیر کر دیا ہے۔ جھنڈے گاڑ دیے ہیں ہماری نیک نامی کے یہ ٹائٹل آپ کے بیٹے نے دیا ہے۔ اب دنیا مجھے قاتل کا باپ پکارے گی۔“

اس کے جواب میں عمارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

”نہیں یہ جھوٹ ہے۔ میرا بچہ قاتل نہیں ہو سکتا۔ میرا شفقت قتل نہیں کر سکتا۔“

”یہ اس لیے کہہ رہی ہو کہ ماں ہوتی ہے ہمیشہ حقیقت کو پس پشت ڈال کر ایک ماں کی طرح سوچا۔ اس نرمی اور رعایت کا نتیجہ دیکھ لیا۔ اور کیا دیکھنا ابھی باقی ہے۔“

ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ آواز میں بجلیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ بچے خوفزدہ تھے۔ عمارہ کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے انھیں اور انہوں نے شوہر کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ ہچکیاں لیتی ہوئی بولیں۔

”میرے بچے کو ڈھونڈ کر لائیے۔ رزاق! میرے اشفی کو لاد دیجیے۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔“ شجرہ کی آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا۔ بھائیوں کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ پورا ماحول آنسوؤں میں ڈوب رہا تھا۔ رزاق صاحب کے سر سے طوفان گزر رہا تھا۔ ان کا دل کسی نے شکنجے میں کس دیا تھا۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ روتی تڑپتی بیوی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر قالین پر بیٹھتے چلے گئے اور عمارہ بے ہوش ہو کر ان کے بازوؤں میں جھول گئیں۔ انہوں نے آہستہ سے عمارہ کا سر قالین پر رکھا اور کھڑے ہو کر شجرہ سے کہا۔

”بیٹی! اپنی ماں کو سنبھالو۔“

یہ کہہ کر وہ مردہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ یہ جھٹکا بڑا شدید تھا۔

رزاق صاحب جیسا اپنی اعصاب کا انسان بھ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ صوفے پر اپنے کو گرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ رات اور اس جیسی کئی راتیں نیند کی توجہ سے محروم رہیں۔ سرخ روئی روئی آنکھیں شب بیداری کا اعلان کر رہی تھیں۔ صبح آفاق نے باپ کے سامنے سر جھکا کر درخواست کی۔

”ابو جی! اگر آپ اجازت دیں تو ہم کئی دوست مل کر بھائی جان کو تلاش کریں۔ شام کو واپس آ جائیں گے۔“

”کہاں جاؤ گے؟“

حیدر آباد کے مضافات میں۔“

”تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہارا انتظار کر رہا ہو گا وہاں۔“ انہوں نے انتہائی غیض کے عالم میں اسے دیکھا اور اپنی کیپ چھڑی اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

”اگر کسی نے گھر سے قدم نکالا تو مانگیں توڑ کر پھینک دوں گا۔ سمجھ۔“

وہ سہم کر چپ ہو گیا۔ شجرہ اشفاق کی ڈاڑی میں اس کے دوستوں کے فون نمبر تلاش کر کے فون ملانے لگی کہیں لائن ملی کہیں نہیں۔ عزیز فون پر مل گیا۔ وہ شجرہ کو جانتا تھا۔ اس نے نہایت افسردگی سے کہا۔

”شجرہ بہن۔ میں سخت شرمندہ اور دکھی ہوں۔ اس کی اچانک گمشدگی نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رکھا۔ یقین کریں ہمارے آدمی چاروں طرف اسے تلاش کر رہے ہیں۔“

شجرہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس نے اپنے کو سنبھال کر اتنا کہا۔

”عزیز بھائی۔ ہم بالکل بے خبر ہیں۔ اشفیٰ برعائد کردہ اس جرم کی نوعیت کیا ہے۔ آپ کچھ روشنی ڈالیں۔ پلیز....“ تب اس نے چھجکتے رکتے تمام واقعات من و عن مناڈالے۔ اور بولا۔

”ہم خود انسپکٹر صاحب سے مل کر بالمشافہ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔“

مگر اس کی نوبت نہ آئی تیسرے دن عزیز، فراز اور برہان گرفتار کر لیے گئے۔ جب کہ جمشید کو کراچی جیل کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اب وہ خطرے سے باہر تھا۔ انہوں نے اصل واقعات بیان کر دیے۔ کچھ نہیں چھپایا۔ سطوت اور مشعل کو بھی گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ ان کے بیان کی روشنی میں اشفاق نے صرف دوستوں کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ اور جمشید..... جیسا کہ اس کے کردار واقعات اور آخری دنوں کے رویے کو عدالت میں بیان کیا گیا تھا۔ اس نے محض گڑ بڑ پھیلانے اور مشعل کو پریشان

کرنے کے لیے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔ جب برہان سے سوال کیا گیا کہ فائر کرنے میں کس نے پہل کی؟ تو اس نے حلفیہ بیان دیا کہ جمشید نے اندر آتے ہی گولی چلا دی تھی۔ وہ تو اس کا نشانہ خطا گیا۔ ورنہ اشفاق کام آ گیا ہوتا۔ جب اشفاق نے جمشید کو ملحد دیکھا تو اپنے دفاع کے لیے اسے بھی فائر کرنا پڑا اور بد قسمتی سے وہ اسے گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ گولی کہاں لگی۔ جمشید زندہ رہا یا مر گیا۔ اس سے قطع نظر جب اشفاق نے اپنے ہی خون میں اسے نہائے بے سدھ پڑے دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ جمشید اس کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ اس خوف نے اسے فراز پر مجبور کر دیا تھا۔

بیان جاری رہا۔ رزاق صاحب کے اندر دھماکے ہوتے رہے۔ عمارہ اور شجرہ سر اٹھا دے بن گئیں۔ بھائیوں نے اپنی قوت کو گھٹتے محسوس کیا۔ آج انہیں معلوم ہوا کہ اشفاق اس گھر کے لیے اس کے لیے کتنی بڑی امیدوں کا پر بت اور سکون کا منبع تھا۔ وہ نہیں تھا تو دنیا انہیں خالی خالی نظر آ رہی تھی۔

ایک ہفتے کے بعد انہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا مگر جمشید جیل کے اسپتال میں زیر علاج رہا۔ اس نے یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ یہ سچ ہے کہ اس نے آتے ہی گولی چلا دی تھی۔ لیکن اس سے محض ان لوگوں کو سراسیمہ کرنا مقصود تھا۔ کسی کو مارنا نہیں۔ اس کے بعد پولیس کی ایک ٹیم نے سندھ کی اس شکستہ حویلی پر چھاپہ مارا جہاں پر یہ واردات ہوئی تھی۔ بڑے بڑے انکشافات ظہور میں آئے۔ وہ اسمگلروں کا گڑھ تھا۔ اس حویلی میں ایک اسلحہ خانہ بھی زیر زمین چھپا ہوا تھا۔ کچھ پیٹیاں چرس اور ماریفا کی بھی ہاتھ آئیں جب کہ بہت سا سامان پہلے ہی ہٹا دیا گیا۔ پوری حویلی خالی تھی۔ کوئی بندہ وہاں نظر نہ آیا۔ سب روپوش ہو گئے تھے۔

پولیس نے حویلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور عزیز کے اس دوست کی تلاش شروع ہوئی جس نے ان کی ساتھ اپنا آدمی گائیڈ کی صورت میں کر دیا تھا۔ نہ وہ آدمی ملا نہ دوست۔ پتا چلا کہ وہ ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔

اشفاق کی تلاش انتہائی سرگرمی کے ساتھ جاری تھی۔ سندھ کا پورا علاقہ دور تک چھان مارا گیا۔ جھاڑیاں جنگلات پہاڑ خندق صحرا مگر وہ نہ ملا۔ سب انسپکٹر عبدالرزاق صاحب ایک فرض شناس اور ذمے دار افسر تھے۔ اس لیے حکمہ ان کی قدر کرتا تھا۔ جس آفات سے وہی الوقت گزر رہے تھے۔ اس کا عم ہر ایک کے دل میں تھا۔

..... پورا عملہ چوکس اور ان کے حکم کا منتظر تھا۔ ذاتی طور پر وہ ان کی خدمت کرنے میں اپنی سعادت محسوس کر رہے تھے۔ اور قانونی حیثیت سے بھی ان کی کارکردگی میں کوئی

جھول نہیں تھا۔

اخبارات میں اشفاق کی تصویروں کے ساتھ دو بڑی بڑی سرخیاں نظر آ رہی تھیں۔
میں لکھا تھا۔

”اشفاق جہاں بھی ہو فوراً آ جاؤ تم پر کوئی فردِ جرم عائد نہ ہوگا۔ جمشید زندہ ہے۔“
”تمہاری ماں کی حالت خراب ہے جلد سے جلد گھر پہنچو۔“

اس کے علاوہ پولیس کی نفری پورے سندھ اور پنجاب میں پھیل گئی تھی۔ جگہ جگہ مایا پر اعلان کیا جا رہا تھا۔

”اشفاق! تم بے گناہ ہو جہاں بھی ہو آ جاؤ۔ جمشید بقیدِ حیات ہے تم سے کوئی باز پر نہ ہوگی۔“

مگر بے سود جو وقت گزر رہا تھا۔ شجرہ اور عمارہ کی قوتِ برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ ماں کے آنسوؤں کا تار نہ ٹوٹ رہا تھا۔ رزاق نے بھی اپنی سرکاری وغیرہ سرکارِ مصروفیات ترک کر دی تھیں۔ بیوی بچوں کو تسلی دیتے دیتے خود بھی بکھرے لگتے جب تھکے تھکے سے گھر میں داخل ہوتے ماں دیوانوں کی طرح دوڑ کر پاس چلی جاتی۔
”کیا میرے اشفی کی کوئی خبر آئی ہے۔ کہاں ہے وہ کب آ رہا ہے؟“

اور رزاق صاحب عمارہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آتے انہیں صوفے پر بٹھا کر خود بے سامنے بیٹھ جاتے۔ دونوں ایک دوسرے کو کرب آمیز نظروں سے دیکھتے اور عمارہ شوہر آنکھوں میں..... ناکامی کے سائے بڑھتے دیکھ کر ان کے ہاتھ پکڑ کر زار و قطار رو۔ لگتیں۔ ہچکیاں بندھ جاتیں۔

”رزاق! میرے اشفی جانے کہاں کہاں کی ٹھوکر کھاتا پھر رہا ہوگا۔

”عمارہ!“ رزاق صاحب کی آواز بھر آ گئی۔ انہوں نے بیوی کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔
”تم تو آنسو بہا کر رو کر اپنا دل ہلکا کر لیتی ہو۔ پر مجھے بتاؤ میں اپنے دکھوں کا بوج کہاں جا کر اتاروں۔ کیا تم نے مجھے پتھر کا سمجھ لیا ہے۔ کیا باپ کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ کیا مجھے اپنا بیٹا یا نہیں آتا کیا میری آنکھیں اسے نہیں ڈھونڈ رہیں۔ بولوں میں کہاں جاؤں کس کے شانے پر سر رکھ کر روؤں؟“ یہ کہتے کہتے ان کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ پڑے اور عمارہ کی گود میں سر رکھ کر رو پڑے۔ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ عمارہ اپنا رونا دھونا بھول کر انہیں سنبھالنے لگیں۔ ان کے آنسو پونچھنے لگیں۔ آج انہیں یقین آ گیا کہ رزاق کے فرض شناس سینے میں ایک شفیق دل بھی دھڑکتا ہے۔ اس کے بعد عمارہ نے بھی شوہر کے سامنے..... آنسو نہیں بہائے۔

رات اپنی سیاہ بختیوں کے ساتھ دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ گھر کا ہر فرد بے چین

تھا۔ رزاق صاحب اپنے بستر پر پڑے کروٹیں بدل رہے تھے۔ پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھے دیر تک کمرے میں ٹہلتے رہے پھر کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ باہر چاندنی میں درخت پودے پھول بھی سبز نہ ہوئے کھڑے تھے۔ چاندنی میں وہ اُجلا پن نہ تھا جس بیٹے کو وہ ہمیشہ غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے آج وہ کس قدر اہم ہو گیا تھا۔ اس کی محبت جانے کن کوئوں کھدروں سے نکل کر ان کے دامن سے لپٹ گئی تھی۔ اور انہیں اب احساس ہو رہا تھا کہ اشفاق کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں۔

سوچوں نے ان پر ایک دم یلغار کر دی۔

انہوں نے اپنا تجزیہ کیا پھر اشفاق کا تو قصور اپنا نکل آیا اور وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح سوچتے رہ گئے۔ اگر قصور ممتا کا تھا تو کوتاہی میری طرف سے بھی ہوئی۔ میں نے کیوں بچوں کو تنہا چھوڑ دیا کیوں نہیں ان پر نظر رکھی۔ میری مصروفیت اور گھر سے لائق نے بچوں اور خصوصاً اشفاق کو بے خوف کر دیا۔ ایک ایک ہفتے کی طویل مینٹننگس اور گھرے زیادہ دیر غیر حاضری نے مجھے اس قابل چھوڑا بھی کہاں تھا کہ میں بچوں کی طرف نگاہ نہ کرتا۔ انہیں توجہ دیتا۔

”قصور تو میرا بھی کچھ ایسا نہ تھا بیٹے۔ مگر..... بہت سے قصور اکٹھے ہو جائیں تو سزا کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے پھر اس کا بوجھ اٹھانے نہیں اٹھتا.....“

اشفاق پتا نہیں کب کا بھوکا پیاسا تھا۔ بھاگتے بھاگتے چلتے چلتے جوتے پھٹ گئے۔ تلوے زخمی ہو گئے۔ پہاڑوں کی اوٹ میں چشمہ بہتا دیکھا۔ کچھ سبزہ نظر آیا تو وہیں تھک کر بیٹھ گیا۔ یہ مقام آبادی سے الگ تھلک تھا۔ کنارے پر اسے امرودوں کا باغ نظر آیا۔ جس کی شاخیں پانی میں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے شاخ جھکائی تو کئی امرود زمین پر گر پڑے۔ اس نے دامن میں امرود نعمت معلوم ہوئے۔ چشمے کا ٹھنڈا پانی پیا اور وہیں لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں گزرے واقعات گھومنے لگے۔

فرزاد اور مشعل کا نکاح.... اس کا راقول لے کر باہر پہرہ دینا۔ پھر جمشید کا گولی چلانا اور اپنے دفاع میں اس کا جوابی فار..... خون کا دریا.... افراتفری.... آوازیں۔ ایک ایک بات اسے یاد آنے لگی۔ خدایا! وہ یقیناً مر گیا ہوگا....

میرے نصیب میں قاتل ہونا بھی لکھا تھا۔

کبھی اس کے سامنے ماں آ کر کھڑی ہو جاتی۔

کبھی شجرہ اور کبھی معصوم معصوم بھائی اس سے اس وقت رزاق صاحب رات کی تنہائیوں میں اسے آپ سے لڑ رہے تھے۔

تلاش جاری تھی نہ صرف پولیس کا عملہ بلکہ اشفاق کے دوست ان کے ملنے والے اور

”اوئے یارا تو کون ہے؟“ بولنے والے کا لہجہ بڑا شفیق تھا۔ بڑا میٹھا تھا۔

”کیا جیل سے بھاگے ہو؟“

”نہیں۔“ وہ گھبرا کر بولا۔

”پھر نکل کر فرار ہوئے ہو؟“

لحہ بھر میں اشفاق کی سٹی گم ہو گئی۔ آج پکڑے گئے۔ انہیں کیسے معلوم کہ میں کوئی واردات کر چکا ہوں؟

اس کی خاموشی دیکھ کر وہ تینوں اپنی بندوقیں اور چھانگلیں رکھ کر اطمینان سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے پہلا شخص بولا۔

”چلو روٹی شولی نکالو۔“

”آپ لوگ کون ہیں؟“ اب کے اشفاق نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ وہ شخص ہنسا۔

”ہم کوئی بھی ہوں مگر تمہارے دشمن نہیں دوست ہیں۔ ہمارے ساتھ چلو گے؟“

”آپ کہاں رہتے ہیں؟“

”ہمارا ٹھکانہ کسی ایک جگہ نہیں ہے جو ان۔ پوری دھرتی ہمارا گھر ہے۔“

پھر انہوں نے اپنی پونٹیاں کھولیں اور رومال بچھا کر کھانا لگا دیا۔ بھنا ہوا گوشت اور نان تھے۔ اشفاق نے کہا۔ ”ہمیں بھوک لگی ہے تم بھی یقیناً بھوکے ہو گے لو کھاؤ خوب ڈٹ کر۔“

وہ شخص کوئی پڑھا لکھا مہذب معلوم ہو رہا تھا۔ لب و لہجہ شائستہ اور دل میں اتر جانے والا تھا۔ یقیناً وہ اس کے ساتھ دشمنی نہیں کرے گا۔ خدا نے شاید اس کی شکل میں رجال الغیب نوبت دیا ہے۔ شاید واپسی کا راستہ مل جائے۔ یہ سوچ کر اس نے جتنے کے پانی سے ہاتھ دھو یا اور بسم اللہ کہہ کر اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ آٹھ ماہ کے بعد اسے روٹی کی شکل نظر آئی۔ بھنا ہوا گوشت اور روٹی کو وہ آسمان سے اتری سوغات سمجھ رہا تھا۔ من و سلوٹی میں شاید یہ مزہ نہ ہو جو آج اس کھانے میں محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سیر ہو کر کھانا چا ہا مگر چند لقیوں سے زیادہ نہ کھایا گیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ جنگلی پھل کھاتے کھاتے اس کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔ کھانا کھا کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اشفاق کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھالیا۔

”جو ان! مضبوطی سے مجھے پکڑ لینا۔ میرا گھوڑا چلتا نہیں اڑتا ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”دو گھنٹے کی مسافت کے بعد گھوڑا روک کر وہ اترے۔ اپنے مہمان کو اتارا۔ وہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک کھوہ نما مکان تھا۔ جو پتھروں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا اور اسے چھپانے کے لیے جنگلی جھاڑیاں لگادی گئی تھیں۔ اندر خاصا سکون تھا۔ کشادہ کمرے، دالان، نیواڑی

رشتے خاندان کے لوگ جس جس شہر اور جہاں جہاں بھی انہیں اطلاع دے دی گئی تھی اور وہ سب اشفاق کی بازیابی کے لیے سرگرداں تھے۔ بحجرہ نے مسجدوں میں آئینہ کریمہ کے خزانے شروع کر دیے تھے اور اشفاق کی واپسی کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ پوچھنے لگتے۔

”بھائی! تم نے اپنے ساتھ ہمارا مستقبل بھی داؤ پر لگا دیا۔ کیوں کر ایسا..... کیوں کیا؟“

اور کبھی باپ پولیس کی وردی میں اس کی طرف ہتھکری لے کر بڑھتا۔

اشفاق اپنا سر پتھروں سے نکرانے لگتا۔ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر چیخ پڑتا۔

”مت دیکھو مجھے اس طرح

مت پوچھو مجھ سے کچھ.....

اگر تم لوگ خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہو تو یقین کر لو کہ میں بے گناہ ہوں میں نے ارادنا ایسا نہیں کیا۔“ پھر اس نے بھیکے بھیکے چہرے کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا۔

”میرے آقا..... یہ سزا بہت ہے۔“

پولیس پارٹیاں ناکام واپس آ گئیں۔ ہر جگہ کی رپورٹ دل توڑ دینے والی تھی۔

وہ مفرور قیدی نہیں تھا۔

نہ اشتہاری ملزم.....

مگر..... تقدیر نے اسے اس مقام تک پہنچا دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ اخبار رپڈیو۔ ٹی وی نے اسے بے گناہ ثابت کر دیا تھا۔ اس پر سے تمام الزامات واپس لے لیے گئے تھے پھر بھی اس کا پتا نہ چل رہا تھا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس بد نصیب ناکردہ گناہ کا واسطہ اب شہروں اور آبادیوں سے نہیں رہا تھا۔

اب اس کا گزارہ جنگلی پھلوں، پتوں اور چشموں کے پانی پر تھا۔ درختوں کے سائے اس کی پناہ گاہ۔ کپڑے پھٹ گئے تھے۔ پیراہن بھان ہو گئے۔ داڑھی بڑھ گئی تھی۔ اسے گھریا داتا تو سینے سے دھواں اٹھنے لگتا۔ اب تو آنکھوں میں آنسو بھی نہ رہے تھے۔ ایسے میں اسے اپنا خدا کہیں قریب ہی محسوس ہونے لگتا وہ سجدے میں گر کر ترپے لگتا۔ دہائیاں دینے لگتا۔

”اے مولا! میرے بادشاہ! مجھے بے بارود مگرنہ اٹھانا۔ میں اپنوں کے بچ کرنا چاہتا ہوں۔ معاف کر دے اپنے اس گنہگار..... نا فرمان بندے کو۔“

دفعۃً بہت سے گھوڑوں کی ٹائیں شور مچاتی اس کے قریب آ کر رک گئیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور وحشت بھری نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ اپنے چہرے پر ڈھاٹا..... باندھے تھے۔ لمبے چوڑے جسیم لوگ ہاتھوں میں بڑی بڑی بندوقیں لیے اسے گھیرے کھڑے تھے۔

اپنی گدی پر بیٹھا مونچھوں کو اٹھٹھٹا رہتا ہے ڈاکہ وہ بھی مارتا ہے۔ غریبوں کا خون چوس چوس کر سود پر روپیہ کا دور و پیہ پتا کروہ کیا ڈاکہ نہیں مارتا؟
وہ جو کرسیوں پر فارن کا قیمتی تھری پیس سوٹ پہن کر گھومنے والی کرسی پر باس بنا ہوا فون کانوں سے لگائے بازار کا اتار چڑھا معلوم کرتا رہتا ہے وہ کیا کم ڈاکہ مارتا ہے؟
میرے بھائی یہاں ہر سرمایہ دار غریب پر ہر بڑا آدمی چھوٹے پر ڈاکہ مارتا ہے مگر ڈاکو نہیں کہلاتا۔ ہے نا عجیب بات؟

یہ ہماری مہذب دنیا کا سرمایہ دارانہ قانون ہے۔ اگر کوئی کمزور آدمی کسی شد زور سے روٹی چھین کر پیٹ کا دوزخ بھر لے تو وہ ڈاکو کہلانے لگتا ہے۔ یوں صبح وشام کتنی ہی بدعنوانیاں ہوتی رہیں۔ لاقانونیت پھیلتی رہے مگر سب پر دولت کا بھاری پردہ پڑ جاتا ہے۔ میں ڈاکو نہیں تھا۔ میں نے ایم ایس سی میں ٹاپ کیا تھا۔ اس ڈگری کو میں نے خزانے کی کلید سمجھا۔ حالانکہ راتوں رات امیر بن جانے والا جذباتی نوجوان نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے زندہ رہنے کے لیے کچھ چاہیے تھا۔ وہ مجھے نہیں ملا۔

”پھر.... دولت مندوں کے اس معاشرے نے مجھے یہ نام دے دیا۔ میں نے بھی ان کی تجوریاں خالی کر کے غریبوں کی جھولیاں بھرنے کا عہد کر لیا۔ بولو کیا میں نے کوئی غلطی کی؟“
”جی نہیں۔“ اشفاق نے پریشان ہو کر سر اٹھایا، ”کیسا۔“ شاید آپ درست فرما رہے ہوں۔ مجھے اس کا تجربہ نہیں میں تو اپنی اس جھولی سی لغزش سے در بدر ہوا میں اسی کے متعلق اپنے کو تیار کر رہا ہوں کہ آگے میری زندگی کا رخ کیا ہوگا؟“

”میں اپنے صحافی دوست سے بتا لگاؤں گا تم فکر نہ کرو۔ اگر وہ بندہ مر گیا تو تمہارے لیے واپسی کے دروازے..... شاید کبھی نہ کھلیں۔ اگر وہ زندہ ہے تو تمہیں اپنی زندگی بھر پور طریقے سے گزارنے کا پورا حق ہے۔“ اشفاق کا دل ایک بار پھر سینے میں زور سے دھڑکا۔ یہ تصور ہی اس کے لیے موت کے برابر تھا کہ اگر جمشید مر گیا تو.....؟ آگے اس کی سوچوں کی تمام قوت سلب ہو گئی۔

اشفاق کو اس پناہ گاہ میں رہتے ہوئے پندرہ دن ہو گئے۔ اس کے پیروں کے زخم بھرنے لگے تھے۔ پیٹ کا نظام معمول پر آ گیا تھا۔ چار یا پانچ دنوں کے بعد سردار علی اپنے ساتھیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔
”مبارک ہو جوان! وہ بندہ صحت یاب ہو کر اور چھ ماہ جیل کاٹ کر واپس گھر جا چکا ہے۔“

”جی.....؟“ اشفاق خوشی سے بے قابو ہو کر کھڑا ہو گیا۔

اور سردار علی نے آٹھ ماہ کے اخبار کا پلندہ اس کے سامنے ڈال دیا۔

پلنگ پڑے تھے۔ ایک طرف کھوہ میں چشمہ بہہ رہا تھا۔ وہیں پر نہانے دھونے کا بھم انتظام تھا۔ کام کے لیے دو تین ملازم اور دو بوڑھی عورتیں نظر آئیں۔

”میرا نام سردار علی ہے۔“ اس کے میزبان نے اپنا تعارف کرایا۔ اس وقت وہ اس کے سامنے بے نقاب تھا۔ خاصا خوبصورت و چہرہ آدمی تھا۔
اشفاق کو اطمینان ہوا یہ دیکھ کر کہ اس کا حسن اس کا میزبان ایک شفیق اور مہربان انسان ہے۔

”پہلے تم اپنی داڑھی مونچھیں صاف کرو۔ داڑھی اگر رکھنا ہے تو خوبصورت اور اسٹائل سے رکھو تا کہ مہذب نظر آؤ۔“ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پھر اپنے آدمی سے کہہ کر اشفاق کے بال اور داڑھی کا اسٹائل بدل دیا۔ جب وہ نہادھو کر کپڑے تبدیل کر کے آیا تو سردار علی اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

”اوہ یار! تو تو ایک دم ہیرو بن گیا ہے؟“ سردار علی نے بڑی گرم جوشی سے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ اشفاق کے چہرے پر پھیکی پھیکی ہنسی آ گئی۔
رات کھانے کے بعد بڑے اصرار سے اشفاق نے سردار علی کو اپنے اوپر گزری ہو واردات کے متعلق بتایا۔

”کمال ہے یار! کم سے کم کسی طرح یہ معلوم کیا ہوتا کہ بندہ زندہ ہے کہ مر گیا۔ اگر حیات ہے تو تمہیں چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر خدا خواستہ وہ کام آ گیا جب بھی پولیس کو بیان دیتے کہ گولی چلانے میں پہل جمشید نے کی تھی۔ تم نے تو صاف اینادفار کیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ چار چھ ماہ کی جیل ہو جاتی۔ زیادہ امکان یہ تھا کہ تم بری ہو جاتے۔“

”مگر بھائی مجھے معلوم کیسے ہوتا۔ جب کہ میں انسانوں سے چھپتا پھر رہا تھا۔ کون مجھے بتاتا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا؟“

”تم نے بھی ٹھیک کیا۔ بہر حال گھبراؤ نہیں۔ کچھ دن تم آرام کرو۔ میں پتا کر ہوں۔ شہر میں میرا ایک دوست اخباری رپورٹر ہے۔ میں اس سے آٹھ ماہ کا ریکارڈ معلوم کر کے بتاؤں گا۔ اب تم بے فکر ہو کر رہو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔“

”شکریہ بھائی!“ اشفاق نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”مگر آپ نے تو مجھ اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ آپ ڈاکہ ڈالتے، بینک لوٹتے ہیں یا کسی غیر ملکی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں؟“

سردار علی نے انتہائی برجستگی سے قہقہہ لگایا۔

”اوہ..... یار! اس دنیا میں ڈاکہ کون نہیں مارتا وہ جو موٹی توند بھاری جسم والا سیٹھ

اب یہ بات تو صاف ہو گئی تھی کہ اشفاق بے گناہ تھا۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ ایک نیکی کرنے چلا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ بھلائی زندگی کا عذاب بن جائے گی۔ جمشید کی بھی نیت بری نہ تھی۔ وہ صرف مشعل کو سراسیمہ کرنا چاہتا تھا۔ اور انہیں خوف زدہ کرنے کے لیے گولی چلائی تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اشفی نے اپنے دفاع میں فائر کر دیا۔ زخم کاری لگا۔ اسے گرتا دیکھ کر پھر خون کی پھوار نے اسے گھبرا دیا۔ اس کے سامنے اس وقت فرار کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ انجانے میں اس سے قتل کا جرم سرزد ہو چکا ہے۔ یہ بات اخبار کے ذریعے تمام شہر میں پھیل جائے گی۔ سب سے زیادہ دکھ اسے اپنے عزت مآب اور فرض شناس باپ کا تھا۔ جو ایک پولیس افسر اور عوام کی جان و مال کا محافظ تھا کیا ردِ عمل ہوگا اس کا کہ اس کا بیٹا اور قاتل.....؟ بس یہی شرمندگی تھی جس نے اسے منہ جمانے پر مجب کر دیا تھا۔ اور اب جب کہ غیبی امداد کے طور پر اسے ایک خضر مل گیا تھا۔ اس مہربان شخص نے اس کے اہلئے زخموں پر پھار رکھ کر اسے زندگی کی نوید سنادی تھی۔ اس نے اخبارات میں تمام تفصیل پڑھ لی تھی پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ گھر نہ جاتا۔ اس کی دوستوں کی کوششیں اب بھی جاری تھیں۔ وہ سب انسپکٹر رزاق سے معافی مانگ چکے تھے۔ جمشید نے چھ ماہ اور فراز نے تین ماہ کی جیل کاٹی۔ جبکہ عزیز کو بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑا اور اخبارات میں جو تھو تھو ہوئی وہ الگ۔ اگر مشعل کے والد اور خود مشعل خود عدالت میں یہ بیان نہ دے دیتے کہ یہ عقد ہماری مرضی سے ہوا تو شاید فراز کو لمبی سزا ہو جاتی۔ بہر حال خود سری اور بے راہ روی نے جو سزا دی وہ اشفاق کے حصے میں زیادہ آئی۔ شاید اس کے چھوٹے سے قصور میں اور بھی بڑی بڑی غلطیاں شامل ہو گئی تھیں۔

یہ آٹھ ماہ اس نے جزیہ اندمان کے قیدیوں سے بدتر گزارے تھے۔ آج اسے تجربوں کی تلخ دہلیز پر کھڑے ہو کر یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مفرور ملزم کی سزا پھانسی پانے والے مجرم سے ہزار گنا زیادہ ہوتی ہے۔ جنگلوں پہاڑوں، دیرانوں اور صحراؤں میں بھاگتے بھاگتے چھپتے چھپاتے اور لمحہ مرنے سے نہیں آسان وہ پھانسی کا پھندہ تھا جو ایک ہی جھٹکے میں زندگی کو تمام غموں اور الجھنوں سے نجات دلا دیتا ہے۔ اس کا جی چاہا وہ بچ کر کہے کہ جرم سے گھبرا کر راہ فرار بھی نہ اختیار کا کرنا۔ یہ راستہ سیدھا دوزخ کی باتال کی طرف جاتا ہے۔ وہ آگ نہ اسے مارتی ہے نہ زندہ رکھتی ہے۔ ایک اذیت ناک خوف میں جکڑ کر وہ زندگی کی نموکھو دیتا ہے۔ اس وقت اشفاق کے سامنے اس کی پوری زندگی روپ بدل بدل کر آ رہی تھی۔ اسے خود نہیں معلوم کہ اس کے دل میں کتنے سوراخ ہو گئے تھے۔ اور ہر سوراخ سے خون جگر اندر آ کر آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ ذہنی کرب اور بیگانہ بیگانہ چہرہ اسے یقین دل رہا تھا کہ اس نے صرف ایک گناہ نہیں بہت سے گناہوں کا

”اور کھو خان! تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟“
 ”نہیں دوست! ان لوگوں نے میرا بڑا خیال رکھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“
 ”ارے یار! تکلف نہیں یہ تمہارا گھر ہے۔ جب دنیا کے ہنگاموں سے دل گھبرا جائے تو یہاں آ جایا کرنا۔“
 ”ہاں۔ اوکے.... شب بخیر.....“ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

وہ ساری رات اس کی گلستاں بوستاں ہو گئی۔ اخبار کی ایک ایک سرخی نے اس کے زخموں کے کھرند نوح لیے۔ تمام صعوبتیں، دکھ، درد بڑی کے کرب، جدائی کے گھاؤ۔ پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔

”اوہ میرے خدا! میں نے ناکردہ گناہوں کی کتنی بڑی سزا جھیلی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو ٹھکرا کر ویرانوں اور جنگلوں میں بھٹکتا پھرا۔ میرے ماں باپ میرے بھائیوں اور میری شجرہ پر کیا کیا قیامتیں گزر گئی ہوں گی۔“ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ سسکیاں خود بخود ہونٹوں کو چھونے لگیں۔ آنسو اب آپ ہی آپ چہرہ بھگونے لگے۔ شاید یہ ان نافرمانیوں کی سزا تھی۔ جو ماں باپ کا کہنا مان کر مجھے ملی۔

”صبح ناشتے کے بعد سردار علی نے پوچھا۔“ کب تک چلنے کا ارادہ ہے۔ نو جوان؟“
 ”میرا تو جی چاہتا ہے کہ ہر لگ جائیں اور میں ابھی اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔“
 ”یقیناً چاہتا ہوگا۔ لیکن ایک دودن رک جاؤ۔ وہاں جانے کے لیے ابھی تمہیں چور دروازہ استعمال کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔“

آٹھ ماہ آٹھ صدیوں کی مانند ریگ ریگ آ خر گزر گئے مگر دکھ اور پچھتاوے باہر گراں اب بھی اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ بہت سی ہونی انہونی سوچیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ یہی عالم ادھر بھی تھا۔ ماں سوچ رہی تھی۔

”میں نے خود اپنے لال کو اپنے ہاتھوں گردش دوراں کے حوالے کر دیا ہے۔“
 شجرہ کا دل ماہی بے آب کی طرح پھل کر کھ رہا تھا۔
 ”تو نے اشفی کو کھو دیا۔ اتنی نرمی رعایت اتنا بھروسہ کب ایک خود سر ذہن کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کاش.....! تو اس دن اسے روک لیتی۔“

”میری برسوں کی ریاضت، نیک نامی کس کام کی۔ جب میں اپنے بیٹے کو واپس لاسکا۔ اتنی جدوجہد اتنی محنت میں نے اولاد کے درخشندہ مستقبل کے لیے کی تھی۔ پھر یہ کیا ملا؟ اس نوکری، عزت اور دیانت داری نے کیا دیا؟ میں تو محافظ تھا پھر بھی اپنے بچے نہ بچا سکا۔ میں استغنے دے دوں گا۔ چھابڑی لگا لوں گا۔ مگر اپنے بچوں کو پورا پورا اتنا دوں گا۔“

کفارہ ادا کیا ہے۔

راہوں میں پھولوں کے کج بھی آتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ رنگ اور خوشبو تک پہنچنے کے لیے کانٹوں کے جنگل بھی عبور کرنے پڑتے ہیں۔ جن کا کام ہی دامن پارہ پارہ کرنا ہوتا ہے نیم کے پتوں سے کسی نے شہد ٹپکتے نہیں دیکھا۔ یہ فطرت کا کلیتہ ہے اور قانون بہر حال قانون ہوتا ہے۔ اس کی حرمت کو جس نے پامال کرنے کی کوشش کی وہ خود پامال ہو گیا۔ پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم جو کرو گے اس پر کوئی دفعہ نہ لگے گی۔

اشفاق جب خود احتسابی کے دورے گزرا تو احساس ہوا کہ یہ بھی ہوا شاید اسے ایسا ہونا چاہیے تھا۔ ورنہ شاید اسے بھی جرم و سزا کی اہمیت کا یقین نہ آتا۔

”اٹھو.....“ اس کے دل نے کہا۔ ”اس خالق کائنات کا شکر یہ ادا کرو جس کی کرم نوازیوں نے تمہیں موت کی ان بھول بھلیوں سے نکال کر زندگی اور روشنی کا راستہ دکھایا اور اپنے ایک ناپسندہ بندے کو وسیلہ بنا کر اس کے گناہوں کا تھوڑا سا بوجھ ہلکا کر دیا۔ وہ اپنے نیک اور بد دونوں بندوں کا رب ہے اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ ظالم کی رسی کھینچ لے اور عادل کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کر دے۔ وہ نکتہ نواز بھی ہے اور قہار و جبار بھی۔

اشفاق تڑپ کر اٹھا اور وضو کر کے قبلہ رو کھڑا ہو گیا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس کے ضمیر نے جو کہا دل نے تسلیم کیا اور دماغ نے مہم لگا دی۔ صبح وہ نسبتاً پرسکون تھا۔ وہ رات ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے ہمیشہ کے لیے۔

”میں نہیں جانتا کہ تمہارے دل میں میرے لیے کیا تاثرات ہیں لیکن میں تمہارا لیے پُر خلوص تھا اور پُر خلوص ہوں۔“ سردار علی نے نہایت سنجیدگی سے اشفاق کو دیکھ کر کہا اس کی آنکھوں میں کرب بھی تھا۔ اور محبت بھی۔

”ایک بات کا خیال رکھنا میرے دوست جس رگنڈر سے ہو کر یہاں تک آئے ہو کبھی ادھر پلٹ کر نہ دیکھنا۔ اور میرے لیے بخشش کی دعا کرنا۔“ سردار علی کی آواز میں جانے کیا تھا کہ اشفاق مضطرب ہو گیا۔

”بھائی جان!“

”اس نے پہلی بار اسے بھائی کہہ کر مخاطب کیا تو سردار علی اپنے جذبات پر قابو نہ پا اور اسے کھینچ کر سینے سے بچھینچ لیا۔ آنکھوں سے لہو کی شکل میں دو آنسو ٹپک پڑے۔ اپنا بھائی، بہن ماں باپ اور گھربا آ گیا۔ کاش وہ اپنی چھوٹی جنت اپنے بازوؤں میں کر ایسی جگہ چلا جاتا جہاں کبھی نہ ختم ہونے والا سزا اور جزا کا یہ سلسلہ ہوتا نہ یہ فاصلے اور جدائیوں کا یہ جہنم.....“

”ایک بات میں بھی عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ بھائی جان۔“

”ہاں۔“ سردار علی جھگی پلکوں سے مسکرا دیا۔

”آپ بھی اگر ہو سکے تو ان بھول بھلیوں سے نکلنے کی کوشش کیجیے گا۔ زندگی خدا کی امانت ہے اسے ضائع نہ کیجیے۔“

”اچھا۔“ وہ زور سے ہنس پڑا۔

کچھ راستہ دونوں نے گھوڑوں پر طے کیا۔ اس کے بعد سردار علی کے آدمی جیپ لے کر آ گئے۔ اور وہ اس جانے پہچانے علاقے میں پہنچ گئے۔ جہاں دو چار بنگلوں کے بعد ایک خوبصورت کشادہ جنگل پر بجلی کے مکرر قیمتی کے درمیان سے ”رزاق پیلہ“ کی تختی چمک کر اسے بن آواز اپنی طرف بلا رہی تھی۔ جیپ ایک تاریک گوشے میں رک گئی۔ اس کا موٹر بند کر دیا گیا۔ اشفاق کے ہاتھ پاؤں سے جان نکلنے لگی۔ منزل کو اتنے قریب دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ سردار علی نے ہاتھ پکڑ کر اسے آہستہ سے نیچے اتارا اور ایک بار پھر گنگا کر گشتی میں کہا۔

”میں اس وقت تک یہاں موجود ہوں گا جب تک تم اندر نہیں چلے جاتے۔ خدا حافظ۔“ جب سے اشفاق لاپتا ہوا تھا۔ ماں باپ اور شجرہ نیند کی لذت سے محروم ہو گئے تھے۔ یا شاید وہ سونا بھول گئے تھے۔ بستر کانٹوں کی تیج بن گیا تھا۔ کروٹ بدلتے بدلتے گھبرا کر بیٹھ جاتے۔ لگتا جیسے کوئی بڑی دیر سے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اکثر گھر کے تمام دروازے کھلے رہتے وہ آس و امید کا دیا تھا ہے ایک ایک دروازہ کھول کر باہر دیکھتے کہ کہیں اشقی شرمسار کواڑوں کے پیچھے تو نہیں کھڑا ہے۔ ہائے ری ممتا۔ پیار محبت کے یہ رشتے ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتے۔ دور ہونے پر ان کی تڑپ اور بڑھ جاتی ہے۔

آج رات بھی نیند اور بیداری میں آنکھ پچولی ہو رہی تھی کہ ہلکا سا کھٹکا ہوا اور شجرہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سب چوکنہ ہو گئے رزاق صاحب نے پکارا۔

”کون ہے؟“

ایک دھم کی آواز آئی جیسے کوئی باہر سے اندر کودا ہو۔ اب تو سب ہی دوڑ مڑے۔ رزاق صاحب کے ہاتھ میں اب پستول تھا۔

”کون سے بولتے کیوں نہیں؟“

وہ سامنے گیلری کے فرش پر ایک گٹھڑی سی پڑی دیکھ کر لپکے۔ انہوں نے دھاڑ کر پتھار ان کے کچھ دور پر سارے گھر کی آنکھیں ادھر لگی ہوئی تھیں۔ دل دھامیں دھامیں مارتے تھے۔

”بولو۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔“ وہ اور قریب چلے گئے۔

گٹھڑی میں حرکت ہوئی۔

”مار دیجئے ابو جی!“ ایک درد سے گندھی ہوئی آنسوؤں میں پروئی آواز سسکی کی صورت میں ابھری۔ ”اپنے ہاتھ سے میرے سینے میں ساری گولیاں اتار دیجئے۔“ یہ کیسی آواز تھی کہ جس نے سب کے دل کھینچ لیے تھے۔ جان نکال لی تھی۔ باپ کے ہاتھ کانپے اور پستول نیچے گر پڑا۔ وہ ہنکے۔

”اش..... اشنی..... میرے بچے..... میری جان۔“

انہوں نے اسے ننھے بچے کی طرح ہاتھوں میں اٹھا کر سینے سے بھینچ لیا۔ اشفاق اپنے پیاروں کو اتنے قریب دیکھ کر ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھا اور بے ہوش ہو گیا۔ رزاق صاحب نے بے ہوش بیٹے کو پھولوں کی طرح اٹھا کر نرم بستر پر لٹا دیا اور ڈاکٹر کو فون کرنے لگے۔ ماں اس کے سینے پر سر رکھ کر بلک پڑی اور شجرہ اس کے زخمی تلوؤں پر اپنی بھیگی ہیکلی ہلکی ملنے لگی۔ دور کھڑے بھائیوں کی آنکھوں میں خوشی اور شکر گزاری کے آنسو زریں رہے تھے۔ آج ان کی طویل دعاؤں کا ثمر مل گیا تھا۔ بھائی کی شکل میں۔

وہ صبح بڑی نکھری نکھری اور سب دنوں سے زیادہ حسین تھی۔ اسکی آنکھ کھلی تو وہی اپنا کمرہ اور آرام دہ بستر تھا۔ وہی خواب ناک فضا تھی۔ کھڑکی سے ننھی ننھی چڑیوں کے چہچہانے کی مدھر آوازیں آرہی تھیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اپنے چہرے کی طرف چلا گیا۔ انگلیوں میں نمی اور خندک محسوس ہوئی۔ تو وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

چہرہ کلین شیو تھا۔ بال سیٹ تھے اور کپڑے بدلے ہوئے تھے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی وحشت انگیز خواب دیکھا ہو۔ مگر یہ خواب نہیں تھا۔ آنکھوں میں صدیوں کے سفر کی دھول ابھی تک اڑ رہی تھی۔ واقعات ایک ہی دائرے میں گھوم رہے تھے۔ اور وہ مہربان چہرہ ابھی تک نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ جو اس کی نجات کا محرک بنا تھا۔ اس نے نگاہ اٹھائی تو عمارہ اپنی شفیق مسکراہٹوں کے ساتھ اسکی طرف بڑھ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں پیار کا پورا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ ارد گرد تینوں بھائی اور پیچھے شجرہ ناشتے کی ٹرائی پکڑے آرہی تھی۔ دنیا کے ہر حسین منظر سے زیادہ دلکش اور حقیقی منظر اس کے سامنے تھا جس کی آرزو میں وہ ہر لمحہ موت سے لڑتا رہتا۔

طلوع ہوتی نئی صبحوں کا نور سب کے چہروں پر جگمگا رہا تھا۔ وہ بے خودی میں آگے بڑھا اور اپنے لمبے مضبوط بازوؤں میں سب کو سمیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

”خدا یا! اس جنت سے بڑھ کر بھی کوئی جنت ہوگی۔“

☆.....☆.....☆

مستعار لی ہوئی مسکراہٹ

”ہیلو ظفر کیا ہو رہا ہے۔؟“

عادل نے کتابیں لان میں ڈالیں۔ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے دنوں ہاتھ پیچھے لٹکا کر وہ اظفر اور راشدہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”بار آج کالج میں بڑی گہما گہمی ہے۔ کس ماہِ خوبان کی آمد آمد ہے۔ لڑکیاں کیسی جی بنی نظر آرہی ہیں مسکراہٹیں بکھیرتی ٹولیوں میں کھڑی سرگوشیاں کر رہی ہیں، کہیں انسپکشن تو نہیں ہو رہا....؟“ اس نے بڑی تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”ارے نہیں عادل۔ آج دوئی لڑکیاں آئی ہیں گلگت سے۔“

”گلگت سے اور ہمارے کلاس میں۔ یہ خوشگوار حادثہ کب وقوع پذیر ہوا۔؟“ وہ سیدھا ہو کر بولا۔

”جب تم حیدر آباد اپنی خالہ کو پیارے ہو گئے تھے۔“ اظفر نے قہقہہ لگایا۔

”اوہ....“

عادل نے منہ سکڑ کر سیٹی بجائی۔ اسے یاد آیا کہ وہ حیدر آباد گیا ہوا تھا، خالہ کے گھر

کسی شادی کے سلسلے میں، اتنے میں کئی لڑکیوں کے جلو میں شینا اور رینا مسکراتی ہوئی آتی

نظر آئیں۔ وہ قریب آئیں تو عادل اظفر وغیرہ کھڑے ہو گئے۔

”ہیلو....!“ عادل نے مسکرا کر کہا۔

”ہیلو....!“ رینا اور شینا نے مسکرا کر جواب دیا۔

صنوبر نے عادل کو دیکھ کر سرگوشی میں پوچھا۔

”کہاں رہ گئے تھے پارٹنر.....؟“

ابھی وہ جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ شانے اپنی چینی بوکھلاتی آواز میں اس کی طرف جھپٹ کر کہا۔

”ہائے عادل بھائی کہاں چلے گئے تھے آپ.....؟“

شاکے خلوص میں بلاشبہ کسی کو شک نہ تھا مگر اس کے اس طوفانی طرزِ مخاطب سے سب نالاں تھے۔

”ذرا آہستہ سے۔“ صنوبر نے اُسے ٹوکا۔ اس کی تیز آواز میں سب کی سرگوشیاں دب گئیں۔

”ارے بھی میں حیدر آباد گیا ہوا تھا۔“

”گدہ و بندر؟“ کسی نے ہانک لگائی۔

”گھبراؤ نہیں، ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔“ سب ہنس پڑے۔

”پلیز، پلیز خاموش۔“ اظفر نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ اور سب کا تعارف کراتے ہوئے کہا.....

”یہ شینا اور رینا ہیں۔ ان سے ملو اور نوید، عمر، لطیف، مرسل.... اور یہ ہیں....“ اس نے شینا اور رینا سے مسکرا کر کہا اور عادل کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یہ ہیں ہماری کلاس کے روح رواں.... خوش گفتار.... ہر دل عزیز، جدید رجحانات کے نمائندہ۔ خوش اطوار، شوخ و شنگ، ہنگامہ پسند عادل پر ریز صاحب....“

”ان کے ہوتے ہوئے ہم ذرا بھی بور نہیں ہوتے، یا یوں کہنا چاہیے کہ بوریت انہیں دیکھ کر بھاگ جاتی ہے۔“ سب نے بھرپور قہقہہ لگا کر اعتراف کیا۔ شینا اور رینا نے بھی مسکرا کر اس کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔

”ہمیں آپ سے مل کر واقعتاً بڑی خوشی ہوئی، اب ہمیں گھر سے دوری کا احساس پریشان نہیں کرے گا۔“ شینا بڑی اچھی اُردو بول رہی تھی، جب کہ رینا نے صرف مسکرانے ہی میں اپنا مطلب واضح کر دیا تھا۔

”شکریہ، عنایت....“

سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔

رینا بڑی معصوم سی۔ خاموش طبیعت اور کچھ بزدل سی لگ رہی تھی، اتنے لوگوں میں وہ زور نظر آ رہی تھی، دونوں بہنیں اپنی سبز چمکیلی آنکھوں، بھورے بالوں اور سرخ و سفید رنگت کی وجہ سے فائزرز معلوم ہو رہی تھیں۔ گلگت کی نہیں لگ رہی تھیں۔

بہر حال سب نے انہیں بھرپور کمپنی دی، شینا اور رینا نے بے حد انجوائے کیا۔ عادل بے حد شوخ اور ہلّا گلا کرنے والا نوجوان تھا۔ نت نئے ہنگامے اس کے مزاج کا ایک حصہ تھے۔ نئے نئے چہروں کو اپنی طرف مائل کرنے کا فن جانتا تھا۔ وہ ان خوش فکر

نوجوانوں میں سے تھا جن کا مقصد زندگی صرف کھانا، کھیلنا، ہنسنا ہنسانا، عیش کرنا اور پھر مرجانا ہوتا ہے۔ دنیا ان کے سامنے بازیچہ اطفال سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ کسی کے لیے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں، جانے کتنی معصوم لڑکیوں سے وہ فلرٹ کر چکا تھا۔ کتنی ہی لڑکیاں جذباتی طور پر اس کے ہاتھوں قتل ہو چکی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسی قدر معصوم اور بے نیاز بن کر سامنے آتا کہ اس کی ایک مسکراہٹ کی خاطر وہ اپنی نقد جان ہتے ہتے اس کے حوالے کر دیتیں۔

پورے سال وہ پڑھتا ہنگامے اٹھائے پھرتا۔ جب امتحان کا وقت آتا تو کلاس سے غائب ہو جاتا، نتیجے میں وہ پھر فیل ہو جاتا اور دوسرے سال کی تیاری میں لگ جاتا، دوسرا سال پھر ہنسی مذاق، کھیل کود اور تفریحات میں گزر جاتا، بڑے باپ کا بیٹا تھا، حقیقت یہ تھی کہ دولت کی فراوانی اور آزادی دنیا کی تمام برائیوں کی بنیاد ہوتی ہے، یہ بات جاننے اور سمجھنے کے باوجود والدین اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے چشم پوشی کر جاتے ہیں یہ ان کی اندھی محبت کا بڑا المیہ ہے۔ صنوبر بھی ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی، جسے گھر کی چار دیواری میں وحشت ہوتی تھی وہ عادل کا پہلا شکار تھی، لیکن چونکہ وہ بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی اس لیے زیادہ فرق نہ پڑا۔ مگر زویہ مانی اور رُخشی بہت شریف اور غریب والدین کی بیٹیاں تھیں۔ جنہیں تعلیم اس لیے دلانی جانی ہے کہ انہیں معاشرے میں ان کا جائزہ مقام ملے۔ وہ دنیا سے اپنے آپ کو منوا میں۔ اپنا تشخص برقرار رکھیں، اور غیرت و عزت کے ساتھ زندہ رہیں، ان کا مقصد صرف ڈگریاں لینا نہیں ہوتا۔ زویہ اور رُخشی کو عادل نے محبت اور شادی کا فریب دے کر لوٹ لیا۔ اور ان کے آگینے کے ٹوٹنے کی خبر کسی کو نہ ہوئی۔ مانی نے خود ہی گھبرا کر کالج چھوڑ دیا۔ اس کے بعد رُخشی اور زویہ کو بھی کسی نے نہیں دیکھا۔ جانے کہاں چلی گئیں۔ اُن پر کیا ہوتی؟

عادل طلباء کی یونین کمیٹی کا ممبر بھی تھا.... اُسے دوسروں کے دل میں گھر بنانا۔ اپنے کو منوانا آتا تھا۔ کسی بھی ایکشن، کسی فنکشن میں اس کی موجودگی کامیابی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ وہ اور صنوبر کالج کے روح رواں تھے۔ اور عادل کے رازوں کی وہ امین بھی تھی، رُخشی اور زویہ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ جانتی تھی، مگر لب نہیں کھول سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے دل کے ہاتھوں بے بس تھی، تب ہی عادل کی نفرتوں، جھڑکیوں اور غصے کے باوجود وہ اس کے گرد پروانے کی طرح منڈلاتی رہتی تھی۔ اس نے اپنا تن من ہار دیا تھا۔ وہ تھا بھی قدرت کا ایک مکمل اور مجمل شاہکار۔ وجہ اور پرکشش۔ اس کے علاوہ اس نے سادہ لوح اور معصوم لڑکیوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ایک خاص قسم کی سونٹس تیار کی تھیں۔ جو نشے کی جزیات سے بنائی گئی تھیں، اور ایک خوش رنگ سنوف بھی جسے گلاس میں پانی ڈال کر

خوشبودار شربت تیار ہو جاتا، ان چیزوں کی طلب انہیں کشاں کشاں اس کی طرف کھینچ لاتی، اور وہ جو چاہتا منوالیتا۔ یہ سلسلہ عرصے سے پس پردہ چل رہا تھا۔ عادل، صنوبر اور حنیف ان تینوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ بظاہر ایک شوخ، کھلنڈرا اور بے ضرر لڑکا اپنے اندر گناہوں کی کتنی ترغیب، کیسی وارداتیں اور کس قدر حشر سامانیاں چھپائے پھر رہا ہے اور پھر بھی مطمئن ہے۔ صنوبر نے کتنی بار اسے نشے کی اس ترغیب سے روکا۔ سمجھایا مگر عادل نے بری طرح اُسے جھڑک دیا۔

صنوبر نشہ نہیں کرتی تھی مگر عادل کی محبت کا نشہ ہزار نشے پر بھاری تھا، کروڑ پتی ہونے کے باوجود اس نے ہر نعمت ٹھکرادی تھی اور اس کی محبت میں سستی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس سے لڑ پڑتی..... بے تحاشہ چیخنے لگتی تھی..... ”عادل تو نے اتنی خوبصورت زندگی پوری کی پوری دنیا کی جھولی میں ڈال دی، کچھ تو اللہ کے لیے بھی چھوڑ دیا ہوتا.....؟“ اس کا ہاتھ گھوم جاتا وہ شعلہ بارانظروں سے صنوبر کو گھورنے لگتا۔

”بے وقوف لڑکی۔ مجھے تمہارا یہ بیویوں والا انداز پسند نہیں۔ دوست ہو دوست ہی رہو۔ یہ لیکچر یہ نصیحتیں مجھے راہ راست پر نہیں لاسکتیں۔“

وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی.....

”عادل! مت اپنے کو ضائع کرو۔ مت انگارے چباؤ پیلرز.....“

اُسے روتا دیکھ کر وہ کچھ نرم پڑ جاتا، اسے سرگوشیوں میں سمجھاتا۔

”تم جانتی ہو میری فطرت آزاد ہے۔ پابندی مجھے قبول نہیں، مجھے روکو نہیں، لوگو نہیں ورنہ چلی جاؤ اور پھر مجھے اپنی شکل مت دکھانا.....“ یہ کہہ کر وہ بے رحمی سے ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو جاتا اور صنوبر روتے روتے ہنس پڑتی.....

”تم جانتے ہو عادل کہ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ یہ دل صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے“ میں تمہاری دوست رہنا چاہتی ہوں۔ وہ بے نام جذبے، وہ تعلق، وہ رشتے، اسی دن میں نے وقف کر دیئے تھے جب زوبی اور رختی کو تم نے محبت کا فریب دے کر برباد کر دیا تھا، اور وہ معصوم غیرت مند لڑکیاں رات کی سیاہ چادر اوڑھ کر اس دنیا ہی کو چھوڑ گئی ہیں۔ ان کا درد میں نے اپنے دل کے قریب محسوس کیا تھا۔ ان کی چیخیں آج بھی میری سماعت میں اسی طرح محفوظ ہیں، اس کے باوجود میں تم سے نفرت نہ کر سکی کہ شاید صبح کا بھولا شام واپس آ جائے۔ اور اب تم نے رینا کے گرد ایک ان دیکھا سا جال پھیلادیا ہے۔ مجھے خوف آتا ہے خدا را عادل ٹوٹے دلوں کی بددعا نہ لو.....!“

صنوبر نے سراٹھایا تو اسے وہاں نہ پا کر ایک بھجانی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی، جب عادل اکتا جاتا تو فوراً صنوبر کے پاس سے ہٹ جاتا اور پھر کئی کئی دن اس سے نہ ملتا۔ بڑی مشکل

سے صنوبر اُسے مناپاتی۔ اس وعدے کے ساتھ کہ آئندہ وہ اس کے معاملے میں محتاط رہے گی، اب تو وہ شراب بھی پینے لگا تھا۔ ڈرنک کا تو ہمیشہ سے ہی متوالا تھا۔ اور جب ماحول ایسا بن گیا تو نت نئے اور شوق کے ساتھ یہ شوق بھی بڑھنے لگا۔ اپنے کو بھلانے کے لیے پھر پینا اور پلانا اس کی ضرورت بن گئی.....! کالج میں اس کا بڑا رعب تھا، ایک تو مل اور کا بیٹا۔ دوسرے یونین کونسل کا ممبر، ٹکلیل اور وجیہ، جو اس سے ملتا گرویدہ ہو جاتا، ہر پارٹی، ہر اجلاس اور ہر انکیشن پر وہ بے تحاشہ خرچ کرتا تھا۔ لڑکے لڑکیوں سے وہ فلرٹ بھی کرتا تھا، ان سے آزادانہ طور پر ملتا۔ انہیں سب کے سامنے کاروں پر گھماتا تھا مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی اس کے خلاف زبان کھولتا، رختی اور زوبی کے سلسلے میں ایک بار ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بڑی جانچ پڑتال ہوئی، ان کے والدین نے پرنسپل کا گھبراؤ کیا۔ مگر عادل کے والد نے کہہ دیا کہ جناب اس واقعہ سے بہت پہلے یہ جرمنی میں تھا ٹریننگ کے سلسلے میں، نشے کی سوشل لڑکیوں نے کسی اور جگہ سے حاصل کی ہوں گی۔ پرنسپل اور اساتذہ ان کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور تھے، دولت میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ وہ بے چارے اپنی شرافت کو آخری کا ندھا دے کر چلے گئے۔ بھاری دل اور لبریز آنکھوں کے ساتھ یہ سوچتے ہوئے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے اچھا کرتے تھے۔ شاید وہی زمانہ پھر واپس آ رہا ہے۔ کچھ دن چپ چاپتے گزر گئے۔ اب تو وہ نئی اور بگڑی ہوئی نسل کا ”ہیرو“ تھا، کچھ دن کی کشدگی کے بعد جب وہ آتا تو لڑکوں نے پر جوش ہو کر اسے کندھوں پہ اٹھالیا۔ مگر صنوبر اُسے لعن طعن کرنے سے باز نہ رہی۔ بڑی شرم دلائی۔ روئی دھوئی مگر وہ بے غیرتی سے ہنستا رہا اور اس کے گال تھپتھپا کر اونچے قہقہے کے ساتھ بولا۔

”یہ دنیا ہمارے لیے بنی ہے تو ہمیں اس کے ہر پھول، ہر پتی، ہر رنگ و خوشبو سے خوشیاں کشید کرنے کا حق ہے..... ڈارلنگ، کیوں ہمیں عذاب و ثواب کے چکر میں ڈال رہی ہو۔ ارے نادان، زندگی اور رعنائی کی بات کرو۔ روزِ محشر کس نے دیکھا ہے۔؟“

اور اسے اس خوش فکری سے قہقہے لگاتے ہوئے دیکھ کر وہ کھراٹھی اور بھاگتی ہوئی اپنی کار میں جا کر بیٹھ گئی اور کار فرائٹے بھرنے لگی راستے بھر اس کی سسکیاں ٹوٹی رہیں۔ آنسو اندر ہی اندر گرتے رہے۔ کئی دن وہ کالج نہیں آئی۔ اب رینا اور عادل ہر جگہ ساتھ ساتھ دیکھے جانے لگے۔ شینا بھی ابھی ان کی کمپنی میں شریک ہو جاتی۔ ورنہ زیادہ تر رینا عادل کے ساتھ گھومتی پھرتی رہتی شینا نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہ سلسلہ پورا سال چلتا رہا، اب تو وہ دونوں اکثر کلاس بھی نہ اٹینڈ کرتے۔ پھر اچانک شور اٹھا کر رینا ماں بننے والی ہے۔ شینا پاگل سی ہو گئی، اس نے عادل کا گریباں پکڑ لیا اور اپنے نوکیلے ناخنوں سے اس کا

”یہ کیا حالت بنالی ہے بیٹے تم نے؟“ وہ رو پڑیں۔
 ”ہم نے تو تمہیں یہاں اس لیے بھیجا تھا کہ طبیعت بہل جائے گی۔ مگر تم نے تو اپنی زندگی ہی سے آنکھیں چرائیں۔“

”ہاں امی....“ وہ مسکرا کر ماں کی آغوش میں سر ڈال کر بولا۔
 ”طبیعت ہی تو بہلارہا ہوں، مگر یہ دل جو ہے ناں۔ بڑی سرکشی پر اتر آیا ہے۔ گن گن کر بدلے چکارہا ہے مجھ سے۔ جو یہ کہتا ہے وہی کرتا ہوں پھر بھی ٹیکل ٹیکل رہتا ہے جی چاہتا ہے اسے ہی سینے سے نکال کر باہر پھینک دوں۔ نہ رہے گا بائس۔ نہ بجے گی بانسری بڑا خوار کیا ہے کم بخت نے....“

”بیٹے کیا کہہ رہے ہو۔ میری سمجھ میں تو تیری بات نہیں آئی۔ تم نے تو لکھا تھا کہ کوئی بزنس کر رہا ہوں، باپ سے جو لاکھوں روپیہ منگوا یا وہ کیا کیا بیٹا۔ مجھے تو تمہارے جسم پر کوئی ڈھنگ کا کپڑا بھی نظر نہیں آ رہا۔ نہ گھر ہی تمہارا ٹھیک ہے۔ اس سے اچھی حالت میں تو ہمارے نوکر رہتے ہیں تمہارے لیے کیا کمی تھی جو تم نے یہ زندگی پسند کی۔“ وہ اسے لپٹا کر بلک بلک کر رو دیں۔ عادل اب بھی نشے میں تھا ایک بجکی لے کر بولا۔

”مائی سویٹ مدر۔ میں نے بزنس تو کیا ہے۔ اپنے سکون دل کی خاطر۔ اس دنیا میں ہر چیز بکتی ہے۔ سو میں نے بھی قہقہے، مسکراہٹیں، رفاقتیں اور خوشیاں خرید لی تھیں اور اپنا سب کچھ اس پر لگا دیا۔ مگر بزنس تو آخر بزنس ہوتا ہے ناں (بجکی) سب فلاپ ہو گیا۔ درد دل کے سوا کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں بچا....“ وہ بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ ماں کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ آخر اسے وہاں کے ایک اچھے اسپتال میں کرادیا۔ عادل کے پھیپھڑے شراب نے چاٹ لیے تھے۔ اسے سخت نگہداشت اور علاج کی ضرورت تھی۔ شاہدہ بیگم نے پاکستان عاقل صاحب کو فون پر پوری صورت حال سمجھادی اور کہا۔

”عادل ابھی سفر کے قابل نہیں ہے مجھے کچھ دن اسپتال میں اس کے ساتھ رہنا پڑے گا۔“ وہ مطمئن ہو گئے۔ وہاں عادل کا ایک دوست انجمن ل گیا جو ڈاکٹر تھا۔ اس نے عادل کے ساتھ ایف، ایس، سی تک پڑھا تھا۔ یہ بہت پرانی بات تھی۔ لیکن انجمن اُسے پہچان گیا تھا۔ اس نے بڑے خلوص، محبت اور پوری ذمہ داری سے علاج میں اس کی مدد کی۔ اور وہ لمحوہ صحت کی طرف بڑھنے لگا۔ انجمن کو اس کی افتاد طبع کا اندازہ تھا، ایک دن عادل نے بڑی درد مندی سے کہا۔

”یار انجمن....! تم لوگوں نے مجھے مرنے سے کیوں بچالیا، میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔“
 ”تم ٹھیک کہتے ہو عادل۔ تم نے اپنی حماقتوں سے اپنی وجاہت کو داغ لگالیا، مگر زندگی بہر حال ایک مہلت، ایک وقفہ ہوتی ہے اگر انسان نے پھر بھی اپنی کوتاہیوں اور

چہرہ نوج ڈالا۔ اگر لڑکوں نے نہ چھڑا دیا ہوتا تو جانے کیا ہو جاتا۔ پھر پرنسپل کے کمرے میں دونوں کو فوری پیش کیا گیا۔ شینا بہن کو لے کر پہنچی تھی۔ باہر پہرہ لگا دیا گیا اور عادل سے پوچھ گچھ ہوئی تو وہ سخت غصے میں تھا پھر کر بولا۔

”یہ جھوٹ بولتی ہے۔ جانے کس کا گناہ میرے سر تھوپ رہی ہے۔ میں اس الزام مسترد کرتا ہوں، بے شک میں نے رینا کے ساتھ اچھا وقت گزارا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے اعمال میں بھی حصے دار بن جاؤں....؟“ یہ کہہ کر وہ کرسی دھکیلتے ہوئے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اسے روکتا۔ سب بے بسی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ دوسرے دن پچاس ہزار کا ایک چیک پرنسپل کو ملا جو رینا کے نام تھا۔ شینا نے اس چیک کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پرنسپل کے سامنے میز پر ڈال دیئے اور بولی۔

”میری بہن کی عزت کی قیمت بہت کم لگائی آپ نے پرنسپل صاحب۔! آپ لوگ بھی اس جرم میں شریک ہیں۔ سب کے ہاتھ میری بے گناہ بہن کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، جو ادارہ مظلوموں کو انصاف اور تحفظ نہ فراہم کر سکے اسے ختم ہو جانا چاہیے۔“

شینا نے کالج اور ہوسٹل چھوڑ دیا اور بہن کو لے کر چلی گئی، پرنسپل صاحب کو بڑا دھچکا ان کی برسوں کی ریاضت اور نیک نامی پر حرف آ گیا تھا۔ پہلے انہوں نے یونین کی ممبر شپ ختم کی اس کے بعد عادل کو کالج سے نکال دیا۔ عادل کے والد نے بڑا طوفان مچایا پرنسپل کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے فیصلہ واپس نہ لیا تو انہیں بلیک لسٹ کر دیا جائے گا۔ پرنسپل بھی معمولی آدمی نہ تھے۔ انہوں نے صرف ایک بات کہی ان سے۔ ”اگر آپ نے زیادہ شور مچایا اور اپنے ہونہار نیک کردار بیٹے کی شرافت کے پمفلٹ تقسیم کیے تو یاد رکھیے کہ اُن دو مظلوم بے گناہ لڑکیوں کی فائلیں بھی کھل جائیں گی، جو آپ جیسے دولت مندوں نے سرد خانوں میں ڈلوادی تھیں، پھر انصاف کے تقاضے پورے کرنے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا....“ پرنسپل صاحب کے تیور دیکھ کر عاقل صاحب کو خاموش ہونا پڑا۔ اس کے بعد عادل سیر و تفریح کے لیے مغربی ممالک چلا گیا۔ فرانس، یونان، پیرس، امریکہ وغیرہ۔ خوب رنگ رلیاں منائیں، عیش کیے۔ اب تو شراب ہی اس کا شغل تھا۔ اس نے اپنے آپ کو نشے میں غرق کر لیا۔ صبح وشام اس کی گرل فرینڈ لباس کی طرح بدل جاتیں۔ وہ تھا شراب تھی اور کلب کی ہنگامہ خیزیاں۔ مسلسل مے نوشی نے اُسے ناکارہ کر دیا۔ اس کی بیماری کی خبر ملی تو ماں چھوٹے بیٹے ہمراہ کینیڈا پہنچی، عادل ایک معمولی فلیٹ میں پڑا تھا، تین دوست اور ایک لڑکی نرس کی شکل میں اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے شاہدہ بیگم تڑپ اٹھیں۔

بے چینی سے کروٹیں بدلتا ہوتا، اور یہ اضطراب، تنہائیاں اور اداسیاں دیکھ کر ہی گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ اب عادل کی شادی کردی جائے۔ اس کے درد کا یہی مداوا دیکھ کر انھوں نے شادی کی تاریخ رکھ دی۔ اس نے بہت پیچھا چھڑانا چاہا کہ وہ شادی نہیں کرے گا لیکن گھر کی پاور فل ہستی شاہدہ بیگم نے اسے دلائل دے کر خاموش کر دیا، اور کہا۔

”بیٹا! آدھی زندگی تم نے عیش و عشرت میں گزار دی۔ جس کے تم تنہا مالک تھے اب باقی عمر کے خزاں سیدہ جاتی بہار کے یہ لمحے ہمارے ہیں۔ اگر تم نے اب بھی نہ مانا تو یاد رکھو۔ تلافی مافات کا کوئی لمحہ تمہاری مٹھی میں نہیں رہے گا۔ اور تم سے زندگی کا یہ بوجھ اٹھائے نہ اٹھے گا، تمہیں ایک رفیق سفر کی ضرورت ہے جس کا ہاتھ تھام کر تم اپنا سفر جاری رکھ سکو۔“

ماں کے دلائل بڑے وزنی اور ناقابل تردید تھے، اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اتنی بہت سی محبتوں کو ٹھکرا کر اپنے لیے کوئی گنبد، کوئی زنداں تلاش کرتا۔ وہ اب بہت تھک چکا تھا۔ اس لیے اس نے ماں کے آگے سر جھکا دیا۔ عقیفہ شیم اس کے لیے واقعی بہت اچھی بیوی اور بہت اچھی رفیق ثابت ہوئی، وہ کسی مل اور یا دولت مند کی بیٹی نہیں تھی۔ بلکہ ایک سیدھے سادے بینک منیجر کی نیک اور سلیقہ شعار بیٹی تھی جسے خدا نے بڑی پیاری صورت دے کر دنیا میں بھیجا تھا، سمجھدار ماں نے اُسے ازدواجی زندگی کے رموز و نکات سمجھاتے ہوئے نصیحت کی تھی کہ ”شوہر کے گھر بیٹی کا ڈولا جاتا ہے اور وہاں سے اس کا جنازہ نکلتا ہے۔“ بیٹی اپنے ماں باپ کی عزت کا بھرم رکھنا۔ خواہ کتنی آزمائشیں پڑیں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا اب وہی تمہارا سب کچھ ہے۔“

اور عقیفہ نے یہ نصیحت اپنے پلو میں باندھ لی تھی، اور بہت جلد اپنی محبت اور خدمت سے نہ صرف شوہر کو بلکہ سسرال کے ہر فرد کو اپنا مداح بنالیا، عقیفہ کو پا کر عادل نے محسوس کیا جیسے کڑی دھوپ میں چلتے چلتے کوئی ٹھنڈا میٹھا چشمہ اُسے مل گیا ہو، اس کی تمام عمر کی تشنگی جیسے مٹ گئی ہو۔ وہ اسے اپنی کسی بھولی بھنگی نیکی کا ثمر سمجھتا تھا، وہ اسے لے کر باہر نکلتا تو یہ دنیا سے بڑی حسین بڑی رنگین نظر آنے لگتی۔ ہر نظارہ اُسے اپنی طرف کھینچنے لگتا۔ اسی سحر میں سال پر سال گزرنے لگے۔ تو شاہدہ بیگم اور ان کی بیٹیاں چونک پڑیں، اور عقیفہ کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوکھا سامنہ بنالیتیں بھابھیاں مذاق کرنے لگیں۔

”اے دیورانی جی۔ خیر سے ہریرہ اور اچھوانی کب کھلا رہی ہو۔؟“

نندیں پیار سے شکایت کرنے لگیں۔

”ابن بھائی، ہماری تو بائیں ترس رہی ہیں بھائی جان کے ٹھہ کو کھلانے کے لیے۔“ جٹھانی نے عقیفہ کے کان میں سرگوشی کی۔

غلطیوں کا ازالہ ادا نہ کیا تو جزا کے یہ لمحے گزر جاتے ہیں اور زندگی صرف سزا بن کر رہ جاتی ہے، چنانچہ تمہیں ہر حال میں زندگی کی طرف لوٹنا ہے تاکہ کفارہ ادا کر سکو۔ خدا پر غفور الرزیم ہے۔“ عادل نے دوست کو سامنے پا کر اپنی زندگی کے تمام نشیب و فراز، اپنی زیادتیاں بتا کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیا تھا اور اب وہ اس کے شانے پر سر رکھے آنسو بہا رہا تھا۔ اور انجم اسے تسلی دے رہا تھا۔ اس کے آنسو پونچھ رہا تھا، سمجھا رہا تھا۔ اسے مہل صحت من ہونے میں چھ ماہ لگ گئے۔ باپ نے پانی کی طرح پیسہ بہایا۔ دعائیں کرائیں، صدقہ دیے۔ اب وہ اپنے گھر میں تھا۔ اسے ہر چیز بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ اس کی صحت یابی کا خوشی میں عاقل صاحب نے بہت بڑی پارٹی دی۔ اس کے بعد وہ اسے مل کا ڈائریکٹ نامزد کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اب اسے بنگاموں سے وحشت ہوتی تھی، رنگ و روپ گہنا گیا تھا۔ اس کی خوشیاں، شرارتیں ختم ہو گئیں۔ وہ یکسر بدل گیا تھا۔ دونوں بھائیوں کی بیویاں۔ ان کے بچے گھر میں اودھم مچاتے رہتے۔ مگر وہ سب سے الگ تھلگ اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ عاقل صاحب نے اپنے بیٹے کو مجبور نہیں کیا وہ ان کا سب سے چھوٹا، سب سے ہینڈسم، خوبصورت اور سب سے لاڈلا بیٹا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی انہوں نے اصرار نہیں کیا۔ اب رات کے اندھیرے میں اکثر اسے زوئی رختی اور رینا کے روتے سکتے چہرے روشنی کے جھماکوں کی طرح نظر آتے۔ زوئی کی چیخیں، بترتج سناٹوں میں گم ہونی محسوس ہوتیں تو وہ بکھر بکھر جاتا۔ وحشت زدہ ہو کر اپنے بال مٹھی میں جکڑ لیتا۔ پھر وہ اسے پاگل، دیوانی لڑکی صنوبر یاد آ جاتی جس نے اپنی انا، خود داری اور اپنی شخصیت کو اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ اگر شادک اس کے لیے ناگزیر تھی تو دنیا کے اس بازار میں صنوبر جیسی مزاج آشنا اور دل آگاہ لڑکی اور کوئی نہیں مل سکتی تھی لیکن اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ایک سال ہوا وہ کسی ڈاکٹر سے شادک کر کے تھائی لینڈ چلی گئی تھی۔ گویا اس کے سارے شناسا چہرے، تمام دوست، جانے پہچانے راستے مسدود ہو چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

شاہدہ بیگم آج کل عادل کے لیے لڑکی کی تلاش میں سرگرداں زمین و آسمان ایک دے رہی تھیں۔ وہ ایسی لڑکی چاہتی تھیں جو عادل کے مزاج، اس کی طبیعت اور عادات کے ساتھ ایڈجسٹ کر لے۔ جوان کی تمام بنیوں، بہوؤں کے معیار پر پوری اترے۔ آ کل عادل کا مزاج بے حد چڑچڑا ہورہا تھا، کار لے کر گھنٹوں سڑکوں پر دوڑاتا پھرتا، پاسا حل سمندر پر جولانی اور پھرتی ہوئی موجوں کا تماشہ دیکھتا رہتا، سیاہ راتوں کا آخرش کا چاند جب آہستہ آہستہ اپنا چہرہ بالوں سے نکالتا اس وقت وہ اپنے نوم کے نرم بستر

کی نند اپنی فیملی لیڈی ڈاکٹر سے اس کا چیک اپ کر رہی ہیں۔ کبھی کوئی مڈوائف بھولی
 بجلی ادھر آگئی تو اسے دکھا رہی ہیں۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ۔
 ”تمہاری بہو ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس اللہ کے حکم کی دیر ہے۔“
 مگر مسز شاہدہ یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ تھیں۔ چیخ پڑی۔
 ”اے واہ۔ تین سال ہو گئے۔ اگر کہن ٹھیک ہے تو پھر دیر کیسی؟“
 کوئی حقیقت شناس بیوی بول اٹھیں۔

”اے آپا۔ تم تو بچی کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ ذرا اپنے بیٹے کو بھی کسی ڈاکٹر کو دکھا دو حرج
 ہی کیا ہے۔؟ ذہن کا کاٹنا نکل جائے گا۔“
 بس پھر کیا تھا وہ تو اس بے چاری کی جان کو آگئیں۔ دھاڑ کر بولیں۔

”ذرا سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ میرا بیٹا شیر کا بچہ ہے کھرا سونا۔ اگر کسی نے اب کے ایسی
 بات کہی تو اس کا منہ نوچ لوں گی.....“ کہنے والی نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ مارے
 شرمندگی کے اٹھ کر چلی گئیں۔

اس کے بعد پھر کسی نے عادل کے چیک اپ کی بات نہیں کی۔ حالات سخت موڑ پر
 آ گئے تھے ایک سال اور چپکے سے آگے سرک گیا۔ اب تو ان کے ضبط کے پرچے اڑ گئے
 انہوں نے صاف عادل سے کہہ دیا۔ ”میاں بہت ہو گیا۔ یاد دوسری شادی کے لیے تیار
 ہو جاؤ یا پھر بیوی کو طلاق دے دو۔ بے پھل کا درخت کاٹ دینے ہی میں عافیت ہوتی
 ہے۔ ہم نے اپنے اصولوں کے خلاف بہت صبر کر لیا۔ اب صبر نہیں ہوتا۔“

گھر کا ہر فرد شاہدہ بیگم کے اس فیصلے پر دم بخود تھا۔ اور عادل کی طرف سے جواب کا
 منتظر.....!
 عاقل صاحب سخت برہم تھے عقیفہ انھیں بیٹیوں کی طرح عزیز تھی انہوں نے بیوی
 سے کہا۔

”شاہدہ بیگم۔ یہ تو تم نے ”لوح و محفوظ“..... تک رسائی کب سے حاصل کر لی۔ تقدیر
 کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں اگر تمہارے بیٹے کے نصیب میں اولاد نہیں ہے یا پھر اس کے
 جنم میں دو چار سال بعد پھول کھلنے کا وقفہ قدرت نے رکھا ہے تو پھر تم کیا کرو گی۔؟“
 ”آپ ہمارے معاملے میں نہ بولیں۔“ انہوں نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔
 ”میں اپنے بیٹے کی دوسری شادی کر کے رہوں گی۔“ انہوں نے ہٹیلے لہجے میں کہا۔
 ”نقصان اٹھاؤ گی۔“ یہ کہہ کر وہ غصے میں پاؤں پٹکتے چلے گئے۔

رات کو عقیفہ عادل کے شانے پر سر رکھے دھارم دھار رو رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ
 اپنے رخسار پر رکھے کہہ رہی تھی۔ ”میں آپ کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی عادل۔ ماں جی کا

”کل میرے ساتھ خان کلینک چلنا، مسز خان بڑی تجربے کا ڈاکٹر ہیں۔“
 وہ ان سرگوشیوں، اشاروں کنایوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی اس کے اندر پلچا
 مچی اور وہ ان چبھتی ہوئی نظروں سے گھبرا کر اپنے کمرے میں چلی گئی لمبی لمبی سانسیں لے
 لگی اور تھک کر اپنا سر تکیے پر ڈال دیا، آنسو خود بخود آنکھوں سے نکل کر اس کا چہرہ اور
 تکیے کو بھگو گئے۔

”یا اللہ کیا یہ سب کچھ میرے اختیار میں ہے۔؟“
 ”عادل کو بیٹا ماں کو پوتا، بہنوں کو بھتیجا چاہیے اور مجھے اس گھر میں رہنے، سراٹھا کر چا
 کا مان چاہیے۔ ماں بننے کا فخر چاہیے..... کون دے گا مجھے یہ سب کچھ۔ میرے غم
 مداوا تیرے سوا کون کرے گا.....؟“ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ رات کو عادل۔
 اس کی اتری اتری شکل، روئی روئی آنکھیں دیکھیں تو پریشان ہو گیا۔

”کیا ہوا عقی! کیا تم روئی تھیں؟ کیوں۔؟“
 اس نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر سر اٹھایا تو وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رودا
 عادل گھبرا گیا۔ ”عقی پلین نہ رو مجھے بتاؤ تمہاری ان خویصورت آنکھوں کو آنسو کس
 دیئے۔؟“ وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بڑا دکھی تھا
 ”عادل ماں جی کو پوتا اور نند جی کو بھتیجا چاہیے، اگر کہیں بازار میں ملتا ہو تو پلہ
 لا دیجئے۔ اب میرے سونی گوداؤں کو اچھی نہیں لگتی.....“

”اوہ....“ ایک لمبی سی سانس کی آواز آئی، دل و دماغ کو کرنٹ سا لگا اور وہ کانپ گیا
 دور کہیں بہت دور سے ڈاکٹر انجم کی آواز نے اس کے سکون کو تہ و بالا کر دیا.....
 ”عادل تمہاری بے راہ روی نے تمہاری وجاہت کو داغ لگا دیا۔ اب تم کبھی باپ نہیں
 بن سکتے.....!“ بڑی دیر تک وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہا۔ وہ عقیفہ سے نظریں چار کرے۔
 پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ عقیفہ کو اس کی اداسی، خاموشی سے ایک گونا سکون ملا کہ عادل اس
 شریک غم ہے وہ اس کا دکھ محسوس کر رہا ہے۔ اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”کیا سوچنے لگے۔؟“

”کچھ نہیں تخفیفی۔ سوچ رہا ہوں یہ تو خالص ”لوح و قلم“ کا فیصلہ ہے، تم اپنا دل نہ چھو
 کرو جب اللہ کا حکم ہوگا ہم ماں باپ بن جائیں گے۔ میں ابھی بچوں کے جھگڑے میں
 پڑنا نہیں چاہتا۔ دنیا کچھ کہے کہنے دو۔ ابھی تو چاہتوں کی راتیں۔ مرادوں کے دن ہیں
 زندگی کو زیادہ سے زیادہ انجوائے کرنا ہمارا حق ہے نا۔؟“ عادل نے بمشکل اپنے دل
 سنبھال کر ماحول کی کچی کو دبلا۔ اور عقیفہ بھی مطمئن ہو کر مسکرا دی۔
 پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا، کبھی بڑی بھابی اسے مسز خان کے ہاں لیے جا رہی ہیں، کبھی

فیصلہ میرے لیے پھانسی کا پھندا بن جائے گا۔ نہ میں آپ کو چھوڑ سکتی ہوں۔ نہ اپنی مہر میں بڑا رہ قبول کر سکتی ہوں۔“

عادل اس کے آنسو پونچھتے پونچھتے خود بھی رو دیا....

”عفیٰ۔ یہ فیصلہ امی نے کیا ہے میں نے تو نہیں پھر کیوں ہلکان ہو رہی ہو؟ ہم ساتھ زندہ رہے تھے اور ساتھ ہی مر جائیں گے۔ بس اب چپ ہو جاؤ عفیٰ پلیز....“

پھر اس نے شاہدہ بیگم سے دو ٹوک کہہ دیا۔

”امی جان! نہ میں دوسری شادی کروں گا نہ عفیٰ کو طلاق دوں گا! میرے سارے بھائی صاحبِ اولاد ہیں ایک اگر میں بے اولاد رہا تو کیا قیامت آجائے گی۔ آپ ان بچوں کو سینے لگا کر ارمان پورے کر لیں اور انہیں اپنا قانونی وارث بنالیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مگر خدا را میرا سکون برباد نہ کریں۔“ ایک عرصے کے بعد عادل نے ماں کے سامنے احتجاج کیا اور وہ بھی دو ٹوک کی چھوڑ کر کے لیے....

”اوندہ..... بڑا آیا حمایتی بن کر۔ دیکھتی ہوں میں تو کب تک اس کے سامنے دب بن کر کھڑا رہتا ہے؟“ بے سایہ ٹنڈ منڈ درخت جس کے پتے خزاں نے چاٹ۔ ہوں وہ بھلا کیا کسی کی توجہ حاصل کر سکتا ہے۔“ ماں کی باتوں نے عادل کو بے حد صدمہ پہنچایا۔ مگر وہ خاموشی سے چلا آیا۔

دوسرے دن عقیفہ کی بڑی بہن حنیفہ ملنے آئیں تو ساس کا پھولا ہوا چہرہ بیزار بیزار باتوں نے انہیں پریشان کر دیا۔ پھر عقیفہ کی روئی روئی آنکھوں اور عادل کی خاموشی بہت کچھ کہہ دیا۔ وہ مسکرائیں۔

”کیا بات ہے پانی پت کا مرحلہ پیش آ گیا کیا پھر کون جیتا کون ہارا؟“ وہ بڑ مزاحیہ طبیعت کی مالک تھیں عادل ہنس کر بولا۔

”باجی۔ فی الحال تو تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جنگِ عظیم کی اب دیکھیں کون ہارتا ہے کس کے مقدر میں جیت لکھی ہے۔“

”خدا نخواستہ ایسی کیا بات ہو گئی میاں۔؟“ وہ گھبرا گئیں۔

”بات ہونے اور گونجنے میں دیر نہیں لگتی باجی میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کچھ دنوں لیے عقیفہ کو ساتھ لے جائیں تاکہ یہ بارود اور زہریلی گیس کے اثرات سے محفوظ رہیں۔“

عادل.....! عقیفہ نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”گھبراؤ نہیں۔ کچھ دن بعد لے آؤں گا۔“

”مگر بات کیا ہوئی بتاؤ تو سہی۔؟“ حنیفہ نے وضاحت چاہی۔

”بات وہی پرانی صدیوں کی گھسی پٹی روایتی سی کہ امی کو میرا وارث چاہئے خواہ

سے یا دوسری بیوی سے۔ آج کل بڑی گرما گرمی ہو رہی ہے۔ امی کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ کچھ دنوں کے لیے یہ سامنے سے ہٹ جائیں تو یہ جوش کم ہو جائے گا۔“

”ویسے عادل ان محرکات میں تمہارا کردار کیا ہے۔؟“ انہوں نے نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔

”باجی۔ امی جذباتی ہو رہی ہیں میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ اگر خدا نے مجھے اولاد سے نوازا ہے تو اس کی ماں صرف عقیفہ ہوگی۔ کوئی دوسری عورت میری زندگی میں نہیں آئے گی۔ اب اس بے وقوف کو آپ ہی سمجھائیں اس نے رور و کر اپنی سبھی سی جان ہلکان کر رکھی ہے نہ مجھے سونے دینے دیتی ہے نہ خود سوتی ہے۔“ عادل نے بڑے پیار سے مسکرا کر چپکے چپکے آنسو بہاتی ہوئی عقیفہ کی طرف دیکھا۔ حنیفہ نے اس کے آنسو پونچھے اور اُسے گلے سے لگالیا اور مسکرا کر بولیں۔

”یہ تو سدا کی پائل ہے۔ اچھا اٹھو ہاتھ منہ دھو کر تیاری کرلو۔ میں ذرا تمہاری ساس کے مزاج پوچھ لوں۔“ وہ ان کی طرف چلی گئیں۔ شاہدہ بیگم بڑے غصے میں پاندان کھولے پان پر پان بنا کر کھائے جائے رہی تھیں۔ حنیفہ کو ہنسی آ گئی۔

”ارے آئی۔ کیا آج پان سے پیٹ پوجا کرنے کا پروگرام ہے.....؟“ وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”لایئے پھر۔ ایک دو پان مجھے بھی دے دیں چائے نہیں تو پان ہی سہی۔ ذرا منہ کا ذائقہ تو بدل جائے گا۔“ انہوں نے مسکرا کر آنکھوں سے دوڑیٹھی عقیفہ کی نندگی طرف دیکھا وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

”ہائے باجی! معافی چاہتی ہوں پلیز ابھی پان نہ کھائے گا۔“

حنیفہ نے ہتھکڑ لگا کر لپک جھپک جاتی ہوئی نائیلہ کی طرف دیکھا۔ اور کچھ دیر وہ ٹرے میں آلو کے چپس بسکٹ اور چائے لے کر آ گئی۔ انہوں نے پیار سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”شکریہ بے بی.....“

اور پہلے چائے بنا کر شاہدہ کی طرف بڑھائی۔

”بچئے آئی۔“

”بس بی بی۔ تم پیو میں زیادہ چائے نہیں پیتی۔“

انہوں نے اس طرح ترخ کر کہا جیسے کہہ رہی ہوں۔ میں آنسو پیتی ہوں چائے نہیں

یہی میرا مقدر ہے۔ حنیفہ نے مسکرا کر چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ اور چائے سے فارغ ہو کر بولیں۔

”آئی۔ امی کی طبیعت کئی دن سے خراب ہے۔ میں کچھ دنوں کے لیے عقیفہ کو لے جانا چاہتی ہوں۔“

”اے بی بی.....“ انہوں نے پان کی تھالی حنیفہ کی طرف رکھ کر زور سے پاندان بنا کر کے کہا۔

”میں کون ہوتی ہوں اجازت دینے والی۔ اس کے میاں سے پوچھ لو۔“

”میں نے عادل سے پوچھ لیا ہے۔“ حنیفہ نے پان کا بیڑہ منہ میں رکھ کر کہا۔

☆.....☆.....☆

عقیفہ کے جانے کے بعد میدان صاف تھا۔ شاہدہ بیگم نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں جانے کہاں سے تعویذ لاکر عادل کے کمرے کی دہلیز پر دبانے لگیں۔ آخری رات تاریک لمحوں میں عادل نے اکثر دیکھا اس کے سامنے کھلی کھڑکی میں اچانک روشنی جھماکہ ہوتا ایک لوسی جھلماتی اور بجھ جاتی، وہ حیران سا دیکھتا اور اُسے اپنا وہم سمجھتے ہو۔ کروٹ بدل لیتا اور اپنی کروٹ خالی دیکھ کر اسے عقیفہ بے طرح یاد آ جاتی۔ وہ اس بغیر کتنا خالی خالی تنہا تنہا تھا۔ اگر عقیفہ اس کی زندگی کی ذوقی کشتی کے پتوار نہ تھام لیتی حالات کی ظالم موجیں اُسے جانے کس پاتال میں پہنچا کر دفن کر دیتیں۔ غمی نے اسے سیکھایا اس کے اندر اتنا حوصلہ پیدا کیا کہ وہ اپنے گھناؤنے ماضی کی قبر پر ندامت اور شرمندگی کے دو آنسو بہا کر اپنا بوجھ تھوڑا ہلکا کر سکے۔ اس نے ہی اپنے بے پایاں مجہ سے عادل کو یہ فلسفہ سمجھایا تھا کہ انسان دنیا میں صرف محبت کرنے آیا ہے۔ نفرت کر نہیں۔ یہ قدرت کے اصولوں کے منافی ہے۔ اب اس کا ضمیر پوری طرح بیدار تھا، آ تنہا یاں اسے آئینہ دکھا کر ”عذاب و ثواب“ کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتی تھیں۔ وہ جد جدھر منہ موڑتا آئینے کا رخ اسی طرف گھوم جاتا۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ معصوم و مظل چہرے سامنے آ جاتے جن کے آگینے تقدس کو اس نے پامال کر دیا تھا، کان بند کرتا سماعت میں ان کی چیخیں گونجنے لگتیں اور وہ تکیے میں منہ چھپا کے بے ساختہ رو پڑتا، ا میں عقیفہ کی محبت نے اس کو حوصلہ دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے اندر کے اندھیرے چھ رہے ہیں، روشنی کی ننھی سی کرن آہستہ آہستہ اس کے وجود کو اپنی گرفت میں لے رہی ہے تب اسے ادراک ہوا کہ محبت وہ نہیں تھی جس کے نام پر تم دوسروں کو مصلوب کرتے رہے تھے، محبت یہ ہے جس نے تمہارا کھرا کھوٹا نکال کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے، ”اصل ا

نقل“ کا فرق سمجھایا۔ وہ اب اپنے اندر حیرت انگیز تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے عقیفہ کی قدرت کی خوبصورت عطا سمجھا۔ ایک مہلت، ایک رعایت یا شاید سنہلنے کا ایک موقع..... اور وہ اس احساس سے پُر سکون ہوتا چلا گیا، عقیفہ کو پا کر وہ کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا، بلکہ وہ تو اسے اپنی گناہ آلود زندگی کے لیے توبہ کا ایک دروازہ سمجھ کر اپنے مہربان رب کے آگے جھک گیا تھا، مگر پھر یہ کیا ہو گیا.....؟ سیدھا چلتے چلتے اچانک یہ موڑ کہاں سے آ گیا تھا.....

اولاد کی خواہش.....؟

وارث کی آرزو.....؟

خاندانی وقار کا مسئلہ.....؟

ساس اور بہو کی روایتی چچقلش.....؟

طلاق.....؟

دوسری شادی.....؟

یہ تمام مسئلے چٹان بن کر اس کے اور عقیفہ کے درمیان آ کر کھڑے ہو گئے تھے جب کہ وہ سمجھتا تھا کہ ان تمام حالات میں عقیفہ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ڈاکٹروں کو دکھانے سے پہلے اور بعد تک وہ لرزتا رہا، عقیفہ کی آنکھوں میں وہ آنسو دیکھ کر ترپ جاتا۔ اسے معلوم تھا قصور وار وہ ہے تو سزا بھی اسی کو ملنی چاہئے۔ لیکن اس معاشرے میں شروع سے لے کر آخر تک مردوں کی حاکمیت مروج رہی ہے۔ ان کا قانون ہمیشہ کمزور کو ملزم قرار دیتا آیا ہے۔ پھر اب یہ کیسے ممکن تھا اس کی کون سنے گا۔؟ اس کا دل چاہتا وہ چیخ چیخ کر کہے.....

”لوگو..... پھانسی کا یہ پھندا میرے گلے میں ڈالو، قصور وار میں ہوں.....؟“

”فیصلے میں مداخلت نہ کرو۔“

”خدا را سوچو، سمجھو۔“

”میں اس بے گناہ کو کیوں طلاق دے دوں۔؟“

”کیوں دوسری شادی کروں..... کیوں..... آخر کیوں.....؟“

مگر کوئی بھی اس کی امنڈتی گھمنڈتی آنکھوں کے چھلکتے کرب کو نہیں دیکھ رہا تھا، سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔ اور وہ گھبرا گھبرا کر گونگے سونے درود یوار کو تک رہا تھا۔

ایک دن سب لوگ بیٹھے ناشتا کر رہے تھے کہ اچانک جیسے دھماکہ سا ہوا شاہدہ بیگم اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ”بس بہت ہو چکا عادل۔ تمہیں عقیفہ کو طلاق دینی ہی دینی ہے۔“

لوٹ پر جام لگاتے ہوئے عادل کے ہاتھ رک گئے۔ عاقل صاحب انڈے کے نل منہ میں رکھ رہے تھے۔ کانٹا ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ میں چھنا کے سے گر

پڑا وہاں بیٹھے ہوئے باقی افراد نے ایک نظر اٹھا کر ماں اور بیٹے پر ڈالی اور پھر ناشتے میں مصروف ہو گئے۔

”میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ چار سال کم نہیں ہوتے۔ جس پیڑ پر پھل نہ لگے اُسے کاٹ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اور پھر دوسری شادی کوئی گناہ نہیں.....“

انہوں نے اپنی بات مکمل کر کے بیٹے اور شوہر کی طرف دیکھا۔ عادل نے ہاتھ کا ٹوسٹ پلیٹ میں رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

”امی جان۔ اگر میرے نصیب میں اولاد ہے تو اس کی ماں بھی عقیفہ ہی ہوگی۔ وقدر کے فیصلے کو بدلنے پر نہ میں قادر ہوں نہ آپ.....“

پھر وہ باپ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”ڈیڈی!..... امیری کتاب زندگی کا ورق ورق آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے اور یہ کہ اللہ کی بخشی ہوئی اس نعمت غیر مترقبہ کو میں نے کسی بے دردی سے لٹایا ہے یہ میری بھوتھی یا میرے اعلیٰ اسٹینس کا المیہ۔ میرے راستوں میں بڑے نیچ و خم ہیں، ڈھلوان اور ڈھلوان..... فراز کا سر اتواب میں نے پایا تھا ڈیڈی عقیفہ کے روپ میں، مگر امی جا اور گھر والوں کے رویے نے مجھے ایسے دورا ہے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ جہاں سے نہ اوپر جا سکتا ہوں نہ نیچے مارنا ہے تو ڈیڈی ایک دم شوٹ کر دیجئے یا پھر مجھے میرے حال چھوڑ دیجئے۔ میں اور زیادہ دکھ اٹھانے کی اپنے میں سکت نہیں پارہا۔ پلیز ڈیڈی پلیز۔ وہ رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا، عاقل صاحب نے ایک قہر آلود نگاہ سے بیوی کو دیکھا اور لپک بیٹے کی طرف آئے اور اس کا ہاتھ تھام کر کمرے میں لے گئے اُسے کرسی پر بٹھا۔ ہوئے پیار سے بولے۔

”بیٹا... پریشان نہ ہو۔ یہ سب وقتی باتیں ہیں دنیا کی روایت پسند مائیں اکثر ارا مانوں سے دوسروں کے ارا مانوں کا خون کرتی چلی آتی ہیں جو اکثر دل میں گھاؤ ڈالتے ہیں تو پھول بھی کھلاتے ہیں۔ یہ ساری ممتا کی شکلیں ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری مار سمجھا دوں گا۔“ وہ مسکرائے۔

”میں آج ہی فون کر کے عقیفہ کو بلوا لیتا ہوں۔ اسے تمہارے پاس ہونا چاہیئے۔ آپ آرام کرو.....“ وہ اسے بستر میں لٹا کر اور آرام کی تلقین کر کے چلے گئے۔ باہر شاہدہ بیگم تلوار کی مانند تڑپ رہی تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی جھٹکا گونجی.....

”میں کہتی ہوں اب تو ہوش میں آ جاؤ۔! یہ عمر اس کے لاڈ پیار کی نہیں رہی۔ برا بیٹا ہے اُسے سمجھانے کی ضرورت ہے۔“

”جب تم اس بڑھاپے میں نہ سمجھیں تو پھر وہ تو ہمارا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔؟“ انہوں نے بیوی کو شوخ نظروں سے دیکھا تو وہ بھڑک اٹھیں۔

”بس رہنے دیں یہ چونچلے آپ ہی نے اسے بگاڑا ہے۔ آپ نے نہیں سوچا کہ اس طرح اس کی نسل کشتی ہو رہی ہے.....“

”ذرا سوچ سمجھ کر بولا کرو شاہدہ بیگم۔! تم سے درخواست ہے کہ اپنے اس وارث کے خطہ کو دل سے نکال دو اللہ نے ہمیں بہت سے وارث دیئے ہیں۔ ایک عادل سے نہیں ہوگا تو کیا قیامت آ جائے گی۔ ہمیں اس کی صحت اور خوشی کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اگر تمہاری طرف سے کوئی نقصان اسے پہنچا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔“

شاہدہ بیگم جزبہ ہو کر رہ گئیں، شام کو عقیفہ اپنے چھوٹے بھائی کے ہمراہ آ گئی۔ سامنے ہی ساس بیٹھی تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر انہوں نے کڑوا سا منہ بنالیا، اس نے قریب آ کر بڑے ادب سے سلام کیا تو انہوں نے اس طرح لٹھ مار جواب دیا کہ ”جیتی رہو“..... جیسے کہہ رہی ہوں، ”منہ کالا تمہارا.....“

وہ گھر میں سب سے مل کر کمرے میں گئی تو عادل لیٹا ہوا تھا۔ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ وہ بے چین ہو کر آگے بڑھی اور ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ جو کافی گرم تھی۔ وہ جھک گئی۔

”کیسی طبیعت ہے عادل آپ کی۔؟“

اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا، اس کی آنکھوں میں بڑا کرب اور شکوہ تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔

”یوں کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے۔؟ آپ ہی نے تو زبردستی باجی کے ساتھ بھیجا تھا۔؟“ وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر رودی۔

”آپ کیا جانیں یہ پندرہ دن میں نے کس طرح آگ پر چل کر گزارے ہیں۔“

”اور میں تو بڑے چین سے لمبی تان کر سویا ہوں۔“ وہ منہ پھلا کر بولا۔

عقیفہ روتے ہوئے ہنس پڑی۔

”پھر روک لیا ہوتا۔ کیوں جانے دیا تھا۔ بڑے کٹھور ہیں آپ۔“

”امی سے ملی تھیں۔؟“

”ہاں..... وہ مجھ سے بدستور ناراض لگتی ہیں۔“ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی بولی۔

”گھر کی فضا میں جس طرح برہم برہم چھوڑ کر گئی تھی مجھے کچھ اور قہر آلود معلوم ہو رہی

ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ اگر ایسا موڑ آ گیا کہ مجھے آپ سے جدا ہونا پڑا تو میں کیسے می سکوں گی عادل!“ اس کے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
”بڑی خود غرض ہو۔ میرے متعلق کیا خیال ہے۔؟“

”آپ مرد ہیں۔“

”کیوں مردوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا کیا۔؟ ان کے پاس جذبات اور چاہے جانے کی کوئی حس نہیں ہوتی.....؟“ عادل کی پلکیں بھیگ گئیں۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر اس کی سوچ کو بننے کی راہ مل گئی..... شادی سے پہلے اگر کوئی مجھ سے یہ بات کہتا تو مجھے اپنے مرد ہونے پر جتنا فخر و ناز ہوتا کم تھا۔ کیونکہ میں نے اپنے دل پر ونگیل مرد ہونے کا بے حد فائدہ اٹھایا تھا۔ پیسے کی کمی نہ تھی۔ ڈیڈی سے سوا ملتا تو ہزار لڑ جاتے۔ ہائی سوسائٹی کی یہی تو خوبیاں ہوتی ہیں۔ جنہیں عام زندگی میں بے راہ روی۔ موسوم کیا جاتا ہے۔ آزادی اور خواہشوں کی دوڑ شروع ہوئی تو میں بے حسی اور بے رحمی کا

حد تک لا پرواہ اور خود مختار ہوتا چلا گیا۔ جذبات کیا ہوتے ہیں۔ احساسات کب پیا ہوتے ہیں میں نہیں جانتا تھا میں دل کو محض خون تقسیم کرنے والا ایک سپینگ اسٹیشن سمجھ تھا۔ جس کا کام ہی جسم میں خون سپلائی کرنا ہوتا ہے۔ اندر سے کہیں ابھرنے والا ضرورتوں اور آرزوؤں کو ایک مشینی عمل جانتا تھا کہ جب معدہ خالی ہوتا ہے تو بھوک محسوس ہوتی ہے۔ دل جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو اسے پانی کی ضرورت ہوتی ہے اسی قسم کی اور بہت سی خواہشوں اور طلب کو میں نے ”سپر نیچرل“ کا نام دے دیا تھا اور پڑا شاید یہی ”سپر نیچرل“ جذبے مجھ پر حملہ آور ہوتے تھے کہ میں نے ان کا مضحکہ اڑایا تھا۔ کا مقام نہ سمجھ سکا۔ جس کی سزا مجھے لمحے لمحے نے دی ہے۔ پھر شاید قدرت کو مجھ پر آ گیا۔ غفی مجھے مل گئی۔ اس نے مجھے زندگی کے نئے روپ۔ نئے رنگ سے روشناس کرایا۔ دل کو پہلی بار میں نے اس انداز سے دھڑکتے ہوئے پایا تھا۔

”کیا سوچنے لگے عادل۔! کس کشمکش سے آپ دوچار ہیں۔ کیا میں اپنے کو تنہا؟ لوں اور آپ کو فوج اور..... بے بس.....؟“ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو جمع ہونے لگے۔
”نہیں غفی جان! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کوئی سوچ نہیں کوئی کشمکش نہیں نہ میں مجھ ہوں نہ بے بس۔ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا۔؟“

عادل نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اسے قریب کرتے ہوئے کہا۔

”غفی۔! تمہارا دل فریب وجود بادل کا وہ ٹکڑا ہے جو میری خشک بجز زندگی پر مسلسل پڑ کر اسے شاداب اور شانت کرتا رہا ہے تم سے جدائی کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

بھی ایسا لمحہ آ گیا تو گھبرانا نہیں فنا اور بقا کی اس جنگ میں تم مجھے ہم قدم پاؤ گی۔“
شادہ بیگم کے رویے میں اچانک تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ اب بیٹے پر بہت مہربان ہو گئی تھیں۔ بہو اب بھی ان کی نظر میں معتب تھی۔ جانے کہاں کہاں سے رشتہ داروں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ کبھی چچا کی فیملی آرہی ہے۔ ان کی ضیافت کا اہتمام ہو رہا ہے۔ کبھی پھوپھی اپنی بیٹیوں سمیت آرہی ہیں تو کبھی خالہ کبھی ماموں کبھی ڈیڈی کے دوست کی بیٹیاں تو بھی خود شادہ بیگم کی سہیلیاں۔ گھر میں ہر وقت دھما چوکڑی مچی رہتی جشن کا سا ساں رہتا۔ ایک سے ایک حسین، قیشن اسٹیل شوخ لڑکیاں عادل کے آگے پیچھے پھرتی رہتیں۔ ایک دن دو تین لڑکیاں ہنستی کھلکھلاتی اس کے کمرے میں گھس آئیں۔

”اللہ عادل بھائی۔ چلیں کسی کو لڈا ساٹ پر آئیں کریم کھانے۔“

”بھئی مجھے ڈاکٹر نے منع کیا ہے آئیں کریم کھانے سے...“ وہ کتاب پر بدستور نگاہ جمائے بولا۔

”افو۔ کتنے بور آدمی ہیں آپ کو ڈاکٹر نے آئیں کریم کھانے سے منع کیا ہے مجھے تو نہیں۔“ ایک لڑکی نے کتاب چھین کر دوڑ پھینک دی۔ عادل نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”اوہ۔ مس نا عجیب یا.....“

”میرا نام نا جبہ ہے مسٹر..... اور میں آپ کی کزن ہوں۔“ اس نے تعارف کرایا۔
”تعارف کا شکریہ۔ مگر سویٹ کزن میں باہر نہیں جاسکتا.....“ عادل نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

’اور یہ بات شاید آپ کی بیگم صاحبہ نے منع کی ہوگی۔؟‘ دوسری لڑکی نے بڑی اداسے مگر جمل کر پوچھا۔

”ماشاء اللہ۔ بڑی ذہین معلوم ہوتی ہیں آپ.....“ وہ مسکرایا۔

”اونہ۔ آپ اپنے کو سمجھتے کیا ہیں۔؟“

”رلجہ اندر.....“

ناجبہ نے برا سامنہ بنایا.....

”بڑی خوش فہمی ہے آپ کو اپنے متعلق کبھی آئینہ دیکھا ہے۔؟“

”آئینے کی کیا ضرورت ہے۔ جب آپ سامنے ہیں تو۔“ وہ دھیمے سے مسکرایا۔

”اونہ۔ آپ کے پاس تو ایسی کیٹ نام کی کوئی چیز نہیں چلو سکتا.....“

وہ مڑی۔ اور سب لڑکیاں کورس میں ”بور بور بور“ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

تھی۔ انجم نے ڈاکٹروں سے مل کر بڑی تندہی سے اس کا علاج کیا تھا۔ دوا بھی، دعا بھی، پیار بھی اور شفقت بھی، سب کچھ اسے وافر ملا اور وہ صحت کی طرف بڑھنے لگا۔ شراب کو بھی بھول گیا تھا اور جب اسے اسپتال سے رخصت کیا گیا تو ڈاکٹر انجم نے اسے سینے سے لگا کر سرگوشی کی.....

”دوست۔ تم نے زندگی پالی، صحت پالی، مگر اپنی وجاہت اور وراثت کا فخر کھو دیا، اب تم کبھی باپ نہیں بن سکتے ہو.....!“

عادل نے مغموں ہو کر سر جھکا لیا اور دھیرے سے بولا۔

”میں جانتا ہوں دوست۔“

جب سے یہ کاٹا اس کے احساس سے کھٹک رہا تھا، جب گھر والوں نے اس کی شادی کی تحریک چلائی وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے سب کو منع کیا کہ میں شادی نہیں کروں گا، مگر اس پر گھر والے ایک زبان ہو کر اس سے وجوہات معلوم کرنے لگے..... اب وہ ان سے کیا کہتا چپ ہو گیا۔ آخر سب نے عادل کا انکار ایک عذر لنگ سمجھا۔ ماں نے کہا۔

بھائیوں نے کہا۔

”وہ سدا کا آزاد پنچھی ہے۔ اپنی آزادی سلب کرنا نہیں چاہتا۔“

بھائیوں نے مذاق اڑایا۔ بہنوں نے اپنا حق جتایا۔ ماں نے اپنی ممتا کی تسکین چاہی، مگر وہ اپنے زخموں کا مرہم کس سے مانگا۔ وہ اپنا دکھ کسی کو نہ بتا سکا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتار ہا سستار ہا، اور عقیفہ اس کی تنہائیاں بانٹنے آگئی۔ اس کی وہ بے حد معصوم اور بے ضرر ساتھی۔ اگر وہ اداس ہوتا تو وہ گھبرا جاتی۔ چپ ہوتا تو اداس ہو جاتی۔ ایسا بھی ہوا کہ وہ گھٹنوں میں سر دے کر رو پڑتا تو عقیفہ بھی رونے لگتی، وہ گھبرا کر سر اٹھاتا۔

”تم کیوں رورہی ہو۔؟“ وہ سرخ سرخ آنکھوں سے پوچھتا۔

”آپ کیوں رورہے ہیں۔ مرد بھی روتے ہیں۔؟“

”افوہ۔ کیسی بیوقوف لڑکی ہے اچھا اچھا، اپنے آنسو پونچھو میں رو نہیں رہا تھا۔ یونہی سر میں درد ہو رہا تھا۔“ وہ جھٹ سے تیل کی شیشی اٹھالائی۔

”پلیز۔ آپ لیٹ جائیے، میں تیل ڈال دوں سر میں۔ بڑی اچھی مالش کرتی ہوں میں۔“

”اچھا.....“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”یہ کام بھی تمہیں آتا ہے۔؟“

”جی بھی ابو جان کے سر میں درد ہوتا، انہیں نیند نہ آتی تو ان کے سر میں مالش کر کے

عادل قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ”بیوقوف.....!“

تقریباً روز ہی اس قسم کی نوک جھونک ہوتی تھی۔ اور شاہدہ بیگم لڑکیوں کی کوئی نہ کوئی ٹولی لے کر نہایت ہشاش بشاش چیرے کے ساتھ آ کر تعارف کے فرائض انجام دیتیں۔ یا کبھی عادل کو بلا کر یہ رسم ادا کی جاتی۔ وہ موسم کا بدلتا رنگ دیکھ رہا تھا اور عقیفہ نروس ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی نہ کوئی لڑکی ہنس ہنس کر سولہ سنگھار کیے عادل کے ساتھ باتیں کرتی نظر آتی۔ عادل کے قہقہے بھی ان میں شامل ہو جاتے اور اس کا دل بیٹھنے لگتا۔

”خدا یا کیا ہونے والا ہے۔ کیا ہوگا۔؟“

رات کو وہ عادل کے قدموں سے لپٹ کر رو پڑی۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گیا، اور اسے اٹھا کر بولا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں عفی۔؟“

”عادل آپ بیشک شادی کر لیجئے گا مگر مجھے طلاق نہ دیجئے گا۔ میں آپ دونوں کی خدمت کر کے جی لوں گی۔“ وہ ہچکیاں لیتی ہوئی بولی۔ اور وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے دکھ سے کہنے لگا۔

”پاگل ہو گئی ہو عفی۔ تمہیں یہ خیال آیا کیوں۔؟“

”عادل کیا میں ان محفلوں اور مہمان نوازی کا مطلب نہیں سمجھتی۔ آخر کب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ کبھی نہ کبھی تو وہ مقام آ ہی جائے گا جب آپ ہتھیار ڈال ہی دیں گے۔“

”اتنی مایوس کیوں ہوتی ہو عفی۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں، ارے دنیا بھر کو اپنے ارمان نکال لینے دو ہمارا بھی اللہ مالک ہے۔“ اس نے عفی کے گال مسکرا کر چھپھپھائے۔

پھر ایک دن اچانک اسے ڈاکٹر انجم کے آنے کی اطلاع ملی، وہ کینیڈا سے پاکستان آئے ہوئے تھے فون پر عادل کو پتا چلا تھا۔ جب سے وہ انجم کے متعلق ہی سوچ رہا تھا، وہ اس کا ایسا دوست تھا جو آنکھوں سے میٹرک اور میٹرک سے ایف، ایس، سی تک ساتھ پڑھا تھا۔ بڑا ہنس مکھ اور سحر خیز شخصیت کا مالک تھا۔ دوبارہ اس کی ملاقات اسپتال میں ہوئی۔ جب وہ موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ شراب کی زیادتی نے اس کی جوانی اور صحت کو ناکارہ بنادیا تھا اسے اس عالم میں دیکھ کر انجم کے آنسو نکل پڑے۔ وہ جو اپنے حلقہ احباب میں پرنس کہا جاتا تھا۔ لڑکیاں اس کے گرد پروانوں کی طرح منڈلاتی تھیں، آج اس کا رنگ دروہ کوئی چرا کر لے گیا تھا۔ نہ شوخی، نہ شرارت۔ لگتا تھا اسے مسکرائے بھی زمانہ بیت گیا تھا لگتا ہی نہ تھا کہ یہ وہی عادل ہے.... وقت نے اس کے ساتھ یہ کیسی سا...

میں انہیں سلا دیتی تھی۔“

”چلو اگر تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔“

وہ سچ مچ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اور عقیفہ کی نرم و گداز انگلیوں کا سحر اس کے پورے میں اتر کر اسے خوابوں کے گل رنگ جزیرے میں پہنچا دیا۔ عقیفہ کی مخفی خوبیاں اجاگر ہوتی گئیں اور عادل اس کے سحر میں جکڑتا گیا، اسے دیکھ کر اسے چھو کر اس سے باتیں کر کے اسے اس قدر خوشی ہوتی جیسے قدرت نے بطور خاص اس کے لیے یہ تحفہ اپنے ہاتھ سے تراشا ہو، وہ کسی حد تک اپنی محرومیوں کو بھول گیا تھا۔ اس کے احساس کی کھٹک عقیفہ نے اپنی محبتوں، مسکراہٹوں کی تہوں میں کہیں نیچے ہی نیچے دبا دی تھی۔ دو تین سال اسی مدد ہوش اور سیر و تفریح میں نکل گئے۔ ہوش تو اس وقت آیا جب گھر کی فضا میں مدہم مدہم سرگوشیاں گونجنے لگیں کہ ابھی تک چھوٹی دلہن کا پاؤں بھاری نہیں ہوا۔ وہ تو یونہی ہلکی آزاد پھر رہی ہے کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں؟

بدقسمتی سے یہ معاشرہ ساری گڑبڑ اور خرابیوں کی ذمہ داری بے چاری عورت پر ڈال دیتا ہے۔ کبھی اپنا گریباں نہیں جھانکتا۔ یہی حال عقیفہ کا ہوا۔ شاہدہ بیگم اب تک تو بڑی خاموشی اور صبر سے بہو کی ایک ایک جنبش نوٹ کرتی رہیں۔ مگر دو سال گزرنے کے بعد انہیں صبر کا یار نہ رہا۔ جھاڑ پھونک، دعا، تعویذ سے لے کر ڈاکٹر تک کھنگال ڈالے پھر عادل کی بڑی بہن اسے گانا کا لو جھٹ کے پاس لے گئیں تو عادل کے صبر کے پرچے اڑ گئے۔ اور جب مختلف ٹیسٹ کے بعد ہر جگہ سے یہی رپورٹ ملی کہ یہ ٹھیک ہیں۔ بس اللہ کے حکم دیر ہے.... سب کے چہرے لٹک گئے۔ اس دن وہ کھٹک.... وہ نرم جس پر عقیفہ کی محبتوں نے مرہم رکھا تھا۔ ایک دم چیخ کر کھل گئے۔ اس کی ٹیسیں اس قدر شدید تھیں کہ وہ رات بھر تڑپتا رہا۔ بے نام سادر دے آواز سسکیاں، خشک آنکھوں کے تلے آنسوؤں کا تلاطم برپا رہا۔ مگر پاس لیٹی ہوئی عقیفہ کو خبر نہ ہوئی کہ اس کے محبوب نے یہ رات کس طرح تڑپ کر گزار دی تھی.....

پھر احساس جرم کا وہ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی دو سال اور آگے سرک گئے۔ اور تب ہی ڈاکٹر انجم کا فون عادل کو ملا۔ اور اس کی سماعت میں وہ الفاظ گونجنے لگے.....

”میرے دوست۔ تم نے زندگی پالی، صحت پالی، لیکن اپنی وجاہت اور وراثت کا فخر کھو دیا۔ اب تم کبھی باپ نہیں بن سکو گے۔ اب تم کبھی باپ نہیں بن سکتے، تم کبھی..... کبھی..... تم..... تم.....“ اس کے ہاتھ سے ریسور چھوٹ گیا۔

یہ عمل کا وہ دائرہ تھا جس میں انسان ہمیشہ چکراتا رہتا ہے اور اسے راستہ نہیں ملتا، مکافات کا عمل بھی آسمان سے آتا ہے اور وہ آئینے کی طرح انسان کے سامنے مختب بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ میرا نام عادل کیوں رکھا گیا تھا، جب کہ میں نے اپنے ساتھ عدل کیا نہ دوسروں کے ساتھ۔ مگر اب جو بھی ہو آنے والے لمحوں کو گزرے دنوں کا حساب تو دینا ہی تھا۔

دوسرے دن۔ ڈاکٹر انجم عادل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا اونچے اونچے تہقبے لگا رہا تھا۔

”بار تمہاری صحت پر تو رشک آ رہا ہے۔ چشم بدور۔ کہیں سے بھی نہیں لگتا کہ تم وہی نچرہ ہو غفلت لیموں ہو جو امریکہ کے اسپتال کے بیڈ پر پڑا زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا....“ عادل نے تہقبہ لگایا۔

”مثال کوئی تم سے سیکھے۔ بھلا یہ غفلت لیموں کیا ہوتا ہے؟“

”ارے بھائی۔ وہی بڑا سا گول میٹھا سا کچھ ترش پیلے رنگ کا مگر شاید تم نے نہیں دیکھا۔ ہائے کیا یاد دلایا۔ گاؤں میں ہمارے گھر کے بڑے سے کچے آگن میں لگا تھا۔ خوب توڑتے اور اپنے دوستوں کی ضیافت کرتے تھے۔ اچھا خیر ذکر تھا تمہارے حسن جہاں سوز کا.....“

اس نے چائے بنائی ہوئی عقیفہ کی طرف دیکھا۔ جس کی لمبی سیاہ پلکیں جھکی ہوئی تھیں، چاندی پیشانی پر کچھ شوخ لیٹیں جھک آئی تھیں، انجم نے مسکرا کر اپنی بات مکمل کی۔

”اب سمجھا تمہاری دلکشی کا راز کیا ہے؟“

”کیا مطلب.....؟“ عادل نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

”سیدھی سی بات ہے تمہارا یہ رنگ روپ، یہ کشش یہ خوبصورتی بھابی سے مستعار لیا ہوا ہے۔ یہ ان کے چہرے کا حسن ہے جو تمہارے پیکر میں جھلک رہا ہے۔“

”یہ کیجئے۔“ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”انجم بھائی۔ آپ باتیں بہت اچھی کرتے ہیں، یقین مانیے آج میں نے پہلی بار انہیں اس قدر بھرپور انداز سے تہقبے لگاتے دیکھا ہے، ورنہ میں سمجھتی تھی کہ انہوں نے صرف مسکرائی ہی سیکھا ہے۔“

”ہائیں..... بہروپے۔“ انجم نے ایک ہاتھ اس کی پشت پر مارا۔

”یہ کیا سن رہا ہوں میں۔ بھابی کے سامنے پوز مارتے ہو۔“

”انجم۔ غنی جانتی ہے کہ گھر میں کس قدر کھٹن ہے، ماحول بغاوت پر تلا ہوا ہے ایسی

صورت میں کیا ہنسنے کا جی چاہے گا۔ میں نے تمہیں تمام حالات سنا دیئے تم خود ہی انصاف کرو۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے۔“

”الحق آدمی ماحول انسان خود بناتا ہے یہ ٹھنکن وٹن کوئی چیز نہیں ہوتی، کم سے کم بھابھ کے لیے خوش رہنے کی کوشش کرو۔ ان کے لیے تہقہ لگاؤ۔ انہیں کہنی دو۔“
عادل نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”ہاں دوست! میں نے جینا ہی ان سے سیکھا ہے۔ یہی تو ایک ہستی ہے جس نے میرے ہونٹوں کو مسکراہٹیں دیں۔ پیار دیا۔ میں زندہ کس لیے ہوں انجم۔؟“
”ماشاء اللہ۔ میں تمہارے منہ سے یہی کچھ سننا چاہتا تھا اب بتاؤ آؤنگ کا پروگرام کب بنا رہے ہو۔؟“
”جب چاہو بنا لو۔“

”میرا جی چاہتا ہے بھابی کے ساتھ کچھ یادگار لمحے گزاروں، تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ مسکرایا۔
”اب مار بیٹھوں گا۔ میں تو کہتا ہوں تم خود غفی کو لے جا کر گھملاؤ۔ میں تھوڑا سا آرام کر لوں گا۔“

عفیہ کا دل دھڑک دھڑک اٹھا۔ اس نے سہمی سہمی نظروں سے عادل کی طرف دیکھا۔
”ارے نہیں یار۔ اتنی دور سے تو ملنے آیا ہوں تم سے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم نے شادی کر لی ہے۔ تمہارے بغیر کیا اچھا لگے گا۔ اچھا اب اجازت۔؟“ اس کے ساتھ غفی اور عادل بھی کھڑے ہو گئے۔ اس نے عادل سے ہاتھ ملایا اور عفیہ کی طرف عقیدت سے تھوڑا سا جھکا اور مسکرا کر بولا۔

”بھابی۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ بالکل مغلیہ شہزادیوں کی طرح مشرقی لباس گھنے بالوں کی لمبی سی چوٹی، جھکی جھکی پللیں۔ ہونٹوں پر مدھم مدھم مسکراہٹ اور اندر کی پاکیزگی سے جگمگاتا ہوا چہرہ بخدا امریکہ اور یورپ میں مجھے یہ روپ کہیں نظر نہ آیا آنکھیں ترس گئی تھیں۔“

عفیہ کٹ کر رہ گئی۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دبا کر آہستہ سے گردن موڑ کر عادل کی طرف دیکھا تو اس کا بھرپور تہقہ ابل پڑا۔

”یار! اتنے مشینی اور خشک ماحول میں رہ کر بھی تمہاری شاعرانہ حس ابھی باقی ہے۔ بھئی، میری طرف سے کھلی اجازت ہے۔ جہاں چار ہو غفی کو لے جاؤ، یہ مشرقی ضرور ہیں مگر نئے زمانے کی قدروں سے بھی واقف ہیں۔ تم بور نہیں ہو گے۔“

”شکریہ عادل۔ بس اتنا کافی ہے میرے لیے۔“

اور وہ ہنستا ہوا کار کی چابی انگلیوں میں گھماتا باہر چلا گیا۔ عادل اسے کار تک پہنچانے آیا۔

”تم بہت لکھی ہو عادل کہ تمہیں ایسی بیوی ملی ہے مگر اس کا افسوس بھی ہے کہ تقدیر نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ خیر اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ خدا حافظ“

☆.....☆.....☆

اس دن عفیہ اور نائیلہ کچن میں تھیں، شاہدہ بیگم لان میں کرسیوں پر اپنی کسی مہمان خاتون کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کچن کی کھڑکی لان کی طرف کھلتی تھی اس وقت کسی بات پر نائیلہ ہنس کر غفی سے کچھ کہہ رہی تھی۔ غفی مسکرا دی۔ نائیلہ پلیٹیں دھو رہی تھی اور غفی انہیں تولیے سے خشک کر کے رکھ رہی تھی.....

”بھئی۔ میں نے تو فریدہ کے لیے باجی اماں سے بات کر لی ہے۔“ شاہدہ بیگم نے کہا تو غفی کے کان کھڑے ہو گئے۔

”انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ بالکل راضی ہیں۔ اے شرع میں تو چار شادیوں کی اجازت ہے مرد کو..... اگر میرا بیٹا..... دوسری کر لے گا تو کیا قیامت آجائے گی۔“

عفیہ کا ہاتھ کانپا اور پلیٹ نیچے گر کر ایک چھنا کے کے ساتھ ٹوٹ گئی۔

”ارے بھابی کیا ہوا۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟“

نائیلہ نے عفیہ کے چہرے کا اڑا اڑا رنگ دیکھ کر کہا۔

”بھابی۔ آپ جا بیٹے پلیز آرام کیجئے۔ باقی کام میں کر لوں گی۔“

”ارے کیا ٹوٹا بھگوان.....؟“ شاہدہ بیگم نے لان سے چیخ کر پوچھا اور غصے میں بولیں۔

”جب یہ دونوں کچن میں ہوں گی تو ضرور توڑ پھوڑ کریں گی۔“

”کچھ نہیں امی.....“ نائیلہ ہنس کر بولی۔

”کی حرام نصیب کا دل ٹوٹا ہے شاید.....؟“

”ہاں نائیلہ۔ شاید تم نے ٹھیک کہا ہے۔“

وہ لڑکھرائی ہوئی جا کر کمرے میں لیٹ گئی۔ پھر یہ بات بڑی تیزی سے گھر کی فضا میں گونجنے لگی کہ فریدہ عادل کی دوسری بیوی بن کر آ رہی ہے۔ عاقل صاحب غصے میں بیترے بدل بدل کر بیوی کو کھانا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور وہ بڑے سکون سے جیسی مسکراہٹ کے ساتھ خاصداں میں پانوں کی گھوریاں سجا رہی تھیں۔ رات غفی نے

”کیا بتاؤں انجم کل سے رورو کر دریا بہا دیئے۔ سوچ رہا ہوں پار کیسے جاؤں گا؟“ وہ مسکرایا چائے پی کر دونوں لان میں ٹہلنے رہے۔ انجم نے کہا۔
 ”عادل ان حالات کے ذمہ دار تم خود ہو کیا شادی سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔؟“
 انجم نے اس کی طرف دیکھا۔

”کسی کو بھی اعتماد میں لیا جاسکتا تھا، یا پھر تم مجھ سے رجوع کرتے۔؟“
 عادل نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”انجم۔ ہمارے معاشرے کی عورت خواہ کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو جب وہ بیٹے کی ماں بنتی ہے تب سے ہی اس کے سر پر سہرا سجانے کے خواب دیکھنے لگتی ہے اور میں تو بڑا ہی لاڈلا شہزادوں کا شہزادہ تھا، میری ماں نے تو میرے آگے پیچھے لڑکیوں کی لائن لگا دی تھی اسی لیے فرار ہو گیا۔ مگر کیا جانتا تھا کہ بربادیاں مجھے آواز دے رہی ہیں، میں نے بہت کہا، شور مچایا۔ مگر سب نے اپنے اپنے ارمانوں کی کٹھری میرے قدموں میں لا کر رکھ دی، میں نے ڈیڈی کو اعتماد میں لینا چاہا مگر زبان نہ کھلی انہوں نے بڑی شفقت سے کہا۔

بیٹا۔ اگر کوئی معقول جواز تمہارے پاس شادی نہ کرنے کا ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں سب کو منع کر دوں گا۔ اب تم کالج کے کھلنڈرے لڑکے نہیں، میچورڈ ہو اور تمہیں اس وقت ایک لائف پارٹنر کی ضرورت ہے۔“

”تمہارا پتہ میرے پاس نہیں تھا۔ میں خاموش رہا صرف اس لیے کہ میرا رب بڑا خطا پوش ہے اور وہ اپنے بندوں سے بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ کسی کی عیب جوئی نہ کریں، حتیٰ کہ وہ سچ جو کسی کی زندگی میں زہر گھول دے اس سے بچیں، میرا جوا المیہ تھا اس کی خبر میرے خدا کو بھی یا اس راز میں تم شریک تھے اب میں اپنے عیبوں پر سے پردہ ہٹا کر دنیا کے سامنے کیا منہ لے کر جاتا میرے گھروالوں پر کیا گزرتی۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے انجم۔ لوگ طنز و تحارت کے پتھروں سے ہمیں سنگسار کر دیتے اس لیے خاموشی ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔“
 ”تمہیں تو عافیت مل گئی۔ مگر اس بے گناہ پر کیوں سزا کے دروازے کھول دیجئے۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے۔؟“

”میں جانتا ہوں۔ محسوس کرتا ہوں انجم۔ مگر پھر بھی اس ظلم کا ازالہ میرے بس میں نہیں، سوائے اس کے کہ اپنی نقد جان سے گزر جاؤں.....“ اس کی موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔

”بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔“ انجم نے اسے لپٹا لیا اور بولا۔
 ”ایسا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا کہ غشی بھی تمہاری سانسوں سے لپٹی ہوئی

روتے روتے جل تھل مچا دیا۔ عادل کا گریبان اس کے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔
 ”اب شاید وہ لمحہ آ گیا ہے عادل کہ میں آپ کی زندگی سے خاموشی کے ساتھ ٹکل جاؤں ہمیشہ کے لیے.....“
 ”بڑی خود غرض ہو.....“ اس نے مسکرا کر اس کے آنسو پونچھے۔

”اکیسے ہی جانے کی بات کر رہی ہو۔ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اگر ایسی کوئی آزمائش کی گھڑی آگئی تو ایک ایک گولی ہم دونوں کے لیے کافی ہوگی.....“ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔

دوسرے دن عقیقہ کو بخار ہو گیا۔ عادل دوا لینے گیا تھا کہ انجم آ گیا۔ وہ عفی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کھلے ہوئے لمبے سیاہ بال اس کے شانے پر پریشان پڑے تھے، چمکیا آنکھوں میں گلابی ڈورے گہرے ہو گئے تھے اور بخار میں متمتا ہوا چہرہ۔ اس عالم میں بھی وہ کوئی پری لگ رہی تھی، انجم کو دیکھ کر اس نے اپنے گرد سیاہ شال لپیٹ لی اور اس پذیرائی کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”آداب!.....“
 ”خیریت تو ہے بھابی۔ کیا ہوا آپ کو.....؟“ وہ بڑی اپنائیت سے بولا۔

”تشریف رکھیے!.....“
 ”شکریہ!.....“ وہ بیٹھتے ہوئے اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا اس نے نظریں پٹ کر کے کہا۔

”کوئی خاص بات نہیں، سر میں درد تھا کچھ بخار بھی ہو گیا، عادل میڈیکل سینٹر۔ دوا لینے گئے ہیں۔“

”ابھی آتے ہیں.....“ یہ کہہ کر وہ ہاتھ روم چلی گئی۔ ٹھنڈا پانی بڑا سکون پہنچا رہا تھا آنکھوں کی جلن کچھ کم ہو گئی تھی۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں برش کیا اور ڈھیلا ڈھ جوڑا باندھا اور شال اوڑھے باہر آ گئی۔ انجم اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بھابی۔ میں نے خواہ مخواہ آپ کو ڈسٹرب کیا۔“
 ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”میں آپ کے لیے چائے لے آؤں.....“ وہ جواب کا انتظار کیے بغیر چھپاک۔
 باہر نکل گئی، عادل آگئے تھے۔ وہ دونوں باتیں کرتے رہے، عقیقہ ٹرائی میں چائے۔ لوازمات لے کر آ گئی۔

”یہ بھابی کو کیا ہو گیا عادل۔؟“

ہے۔“

”ہاں انجم۔ میں غنی کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں.....“

پھر کئی دن گزر گئے۔ شاید بیگم کی سرگرمیوں میں کوئی بریک نہ لگا تھا۔ غنی اس گٹھ سے گھبرا کر لان میں آگئی۔ انجم کی کارگیٹ پر آکر رکی تو اس نے عقیفہ کو لان میں دیکھ لیا تھا۔ وہ مہندی کی بازھ پھلانگ کر اندر آ گیا۔

”ہیلو بھابی۔!“ وہ مسکرایا۔

”آداب!“ وہ اسے سامنے دیکھ کر کچھ جھج گئی۔

”عادل نہیں آیا۔؟“

”وہ دیر سے آئیں گے۔ آج ان کی مینگ ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔“ عقیفہ۔

بید کی خوبصورت کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”شکریہ۔!“ پھر اس کی طرف بغور دیکھ کر بولا۔

”معلوم ہوتا ہے آپ پھر روٹی تھیں۔ آنکھیں کسی طوفان کا پتہ دے رہی ہیں۔“

نے مسکرا کر کہا۔

”انجم بھائی۔! طوفان سے لڑنا تو ہمارا مقدر ہے یہ کوئی نئی بات نہیں۔“

”عادل بتا رہے تھے کہ آئی ان کی دوسری شادی کر رہی ہیں۔“

”وہ صحیح کہہ رہے تھے۔“

”پھر آپ نے اپنے دفاع کے لیے کیا کیا ہے۔؟“

”کچھ نہیں انجم بھائی۔ روایتوں میں جڑی ہوئی ایک کمزور لڑکی کیا کر سکتی ہے۔؟“

”کیا اولاد نہ ہونے سے عورت اتنی بے قیمت ہو جاتی ہے۔؟“ انجم نے پوچھا۔

”شاید.....“ غنی نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

”یہ ہماری جوائنٹ فیملی سسٹم کا بڑا المیہ ہے۔“ انجم نے دکھ سے کہا۔

”عادل کا کیا خیال ہے۔؟“

”وہ بھی ایسا نہیں چاہتے.....“

”پھر آپ کیوں پریشان ہیں۔ نوپرا بلیم۔“

”یہ محض ہماری خوش فہمی ہے انجم بھائی۔ معاملہ خاندانی وراثت کا ہے۔ معلوم نہیں

حالات کیا ہوں۔“ اس کی..... آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”بھابی۔ میں آپ کو روئے نہیں دوں گا۔ پلیز، پلیز.....“

وہ کرسی پر بیٹھ کر ایک طرف جھک گئی اور منہ پر آچل رکھ لیا۔ انجم بڑی بے بسی۔

اس کو دیکھتا رہا پھر وہ آنسو پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔

”سوری انجم بھائی..... مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ میں سب کچھ برداشت کر سکوں۔“ اس کی چھوٹی سی ناک سرخ ہو گئی تھی۔

”آپ فکر نہ کریں بھابی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جا رہا ہوں عادل سے کہہ دیجئے گا کہ مجھے فون کر لے۔“

”نہیں آپ بیٹھیں میں چائے.....؟“

اس نے مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اور بولا۔

”چائے پھر کبھی.....“

وہ جس طرح مہندی کی بازھ پھلانگ کر آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا، وہ اس کے سرخ دسپید اونچے پرکشش پیکر کو دیکھتی رہی اور پھر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

انجم امریکہ واپس جانے والا تھا اس لیے وہ مصر تھا کہ عادل عقیفہ کے ساتھ مری اور سوات چلے۔ اس طرح کچھ عرصہ وہ گھر کی فکر اور سوچوں کی گٹھن سے دور ہو کر فریش ہو جائیں گے۔ عادل بھی اس شعلہ سا ماں حصار سے نکلنا چاہتا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے ہی سہی وہ تازہ ہوا میں سانس لے کر زندگی کو زندگی کی طرح گزارنا چاہتا تھا وہ اوائل مارچ کے نائل سے دن تھے موسم خوبصورت ہو گیا تھا پہلے وہ لوگ ایبٹ آباد شاہراہ ریشم اور خنجراب کے علاقوں کی سیر کرتے رہے، انجم نے دوران سفر دونوں کا بڑا خیال رکھا تھا خصوصاً عقیفہ کو اپنی باغ و بہار باتوں اور لطیفوں سے خوب ہنساتا رہا۔ اس نے ایبٹ آباد سے اپنے دوست کی جیب لے لی تھی۔ اور یہ پیشکش بھی عادل کو انجم کی طرف سے تھی۔ ان کے درمیان بڑی تکرار رہی وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ تم ہمارے مہمان ہو۔ مگر انجم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”یار۔ بلاوجہ تم مجھے اپنے گھر میں مہمان بنانے پر تلے ہوئے ہو یہ گھر تو ہمیشہ سے ہمارا ہے اور ہمیں ایک دن اسی مٹی میں واپس آنا ہے۔ البتہ اس وقت تم میرے مہمان ہو اور بھابی وی آئی پی.....“

وہ آنکھوں سے عقیفہ کے گلابی اور شگفتہ چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور عادل انجم کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اسے مسکرا کر خاموش ہونا پڑا۔ پھر وہ لوگ اسلام آباد آ گئے۔ اسلام آباد میں انجم کے چچا کا خوبصورت بنگلہ تھا اور ان کے بیوی بچے کوئٹہ کسی ٹھکانے میں گئے ہوئے تھے پچانے بڑی ہوش انداز میں انجم کو سینے سے لگایا اور خیریت پچتے رہے۔ اس نے عادل اور عقیفہ کا تعارف کرایا۔ وہ بولے۔

والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ہنڈی پوائنٹ کی طرف تو پورے پورے نشیب برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ کہیں چٹان کی طرح سخت بھی تو کہیں بھر بھری۔ بچے برف کے گولے بنا بنا کر کھیل رہے تھے، وہاں پر عادل کی طبیعت خراب ہو گئی..... آتے آتے لکچکی کے ساتھ تیز بخار آ گیا۔ عقیفہ گھبرا گئی.....

وہ لوگ جلد واپس آ گئے۔ ان کا پروگرام مری کے بعد سوات جانے کا تھا مگر عادل کی بیماری کی وجہ سے انہیں ملتوی کرنا پڑا۔ اس پر سردی کا شدید حملہ ہوا تھا۔ انجم کی دواؤں اور انجمن سے کافی افاقہ ہوا تھا۔ چچا کا گھر خاصا کشادہ تھا۔ سچے ہوئے کمرے خوبصورت لان، بڑی بڑی کھڑکیاں۔ یہاں پر رہنے والے کوئی بھی ہوں بازوق لوگ تھے۔ نوکر ہر وقت خدمت کے لیے رہتے خود چچا بھی ان کا خیال رکھ رہے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ مری سے آنے کے بعد اسلام آباد میں ڈالہ باری کے ساتھ سخت بارش ہوئی۔ جھکڑ چلے۔ جس نے ایک دم موسم کا رنگ ہی بدل دیا، عقیفہ کو ہمیشہ بارش اور ڈالہ باری میں مزہ آتا تھا۔ سب کے منع کرنے کے باوجود وہ بھاگ بھاگ کر لان سے اگلے چن چن کر کھاتی رہی۔ آخر انجم نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر کے بڑی اپنائیت سے بولا۔

”عادل نے تو بستر سنبھال لیا۔ اب کیا آپ کا بھی بیمار ہونے کا ارادہ ہے، نابابا“ میں یہاں تیار پرسی کے لیے نہیں آیا۔“ وہ ہنسا تو عقیفہ جھینپ گئی۔

”اچھا میں کھڑکی میں کھڑی ہو سکتی ہوں ڈاکٹر صاحب!“

”ہاں۔ آپ یہاں سے موسم کا نظارہ کر سکتی ہیں۔“ وہ جانے کے لیے مڑا تو عقی کو چھینک آ گئی وہ پلٹ آیا۔

”دیکھا یہ ابتداء ہے....“ اس نے گہری نظر سے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تو عقیفہ کی ہنسی نکل گئی۔

”اچھا میں نوکر کے ماتھے جائے بھجوا رہا ہوں اور گولی بھی“

اس نے شال صوفے پر سے اٹھا کر اس کی طرف اچھال دی، ایک ماہ میں عقیفہ انجم سے کافی بے تکلف اور مانوس ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ خوشی اسے اس وقت ہوتی جب انجم اور عادل باتیں کرتے ہوئے فلک و گاف قہقہے لگانے لگتے۔ وہ ان قہقہوں اور خوشیوں کو ترس گئی تھی۔ عادل کے دوست کی حیثیت سے وہ انجم کو پسند کرتی تھی اور اس کے حوالے سے وہ اس کی عزت کرتی تھی، عادل کا بخار نہیں ٹوٹ رہا تھا، بارش اور والوں کی بھر سے موسم بے حد سرد ہو گیا تھا اوپر سے ہوا چل گئی۔ عقیفہ بہت پریشان تھی، انجم کئی دنوں سے بدل چکا تھا، انجم کی واپسی کے دن بھی قریب آ رہے تھے۔ اس کی سیٹ بک ہو چکی تھی۔ وہ اپنے گاؤں ماں باپ سے بھی مل آیا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ سب ساتھ ہی کراچی

”بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ بیٹا گھر میں نوکر ہیں اور ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ جس طرح چاہو اپنا گھر سمجھ کر رہو جب تک جی چاہے۔ اگر تمہاری چچی اور بچے ہوتے تو تم زیادہ خوش ہوتے....“

پہلے تو انہوں نے اسلام آباد کی سیر کی، مارگلہ ہلز، شکر پڑیاں اور دامن کوہ۔ عقیفہ کو خصوصاً یہ جگہ بے حد پسند آئی۔ وہ خوبصورت وادی، پرسکون ماحول، اونچے نیچے ہر ہر پہاڑوں اور بلند قامت درختوں سے دبے پاؤں گزرتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں سکوت میں بھی دل چھو لینے والی مدھم موسیقی کا احساس نمایاں تھا۔

دامن کوہ جاتے ہوئے عقیفہ کو ایک بورڈ نظر آیا جس پر لکھا ہوا تھا ”ایک درخت سے لاکھوں ماچس کی تیلیاں بنائی جاسکتی ہیں“ جب کہ ایک تیلی لاکھوں درخت جلانے کے لیے کافی ہے.....!“

”واہ کیا سچی بات کہی ہے کسی نے....“ اس نے سر اٹھا کر حد نگاہ تک ہرے بھرے جنگل اور درختوں کو دیکھا۔

”وہ ایک چھوٹی سی چنگاری ہی تو تھی جس نے لکا ڈھادیا تھا....“ اس نے سوچا۔

”یہ چنگاری دل سے لپٹ جائے....“

گھر میں پڑ جائے..... یا.....

سوچوں کی پھولاری سے گزر جائے.....

سب کچھ جلادیتی ہے، کیونکہ اس کا کام ہے جلادینا.....

عقیفہ کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے سایہ سا آ گیا۔

”ہیلو۔ ہیلو....“ انجم نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا،

”درختوں کے ان پتوں پر شبنم کے جو قطرے نظر آ رہے ہیں یہ میں آپ کی آنکھوں

میں دیکھنا نہیں چاہتا۔“ انجم نے کہا۔

”ادھر دیکھئے۔ ان جھومتے مسکراتے پھولوں کی طرف۔ وقت کی بے ثباتی اور موسم کی

چھیڑ چھاڑ سے کتنے بے نیاز ہوتے ہیں یہ لحائی زندگی میں خوش رہنے کا فلسفہ کوئی ان سے سیکھے۔“

عقیفہ نے مسکرا کر سر جھکا لیا، عادل دیکھ رہا تھا کہ یہاں آ کر عقیفہ کا رنگ دروہ کس قدر نکھر گیا تھا۔ آنکھوں کے ستاروں میں اور چمک آ گئی تھی، ہونٹوں کے گوشے خود بخود مسکرانے لگے تھے، وہ جان لیوا کشمکش اور دکھ کا پتہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا، جس سے انہوں نے فی الوقت فزیر حاصل کر لی تھی، پھر وہ لوگ مری چلے گئے۔ کچھ دن پہلے مری میں برف باری ہو چکی تھی۔ درختوں، پہاڑوں اور سڑکوں کے کناروں پر اب بھی جمی ہوئی برف آئے

جا کر انجم کو رخصت کریں گے مگر عادل کی مسلسل کھانسی اور بخار نے آخر انہیں کراچی واپس جانے پر مجبور کر دیا۔

اس رات شاید پھر کوئی طوفانِ باد و باران آنے والا تھا۔

صبح ہی سے سیاہ بادلوں نے اسلام آباد کو تاریکی اور ٹھنڈ میں لپیٹ دیا تھا، ہر کمرے میں ہیٹروشن تھے۔ دن میں رات کا سا سماں تھا چائے اور کافی کا دور چل رہا تھا۔ شام ہوتے ہوتے بارش اور آندھی نے طوفانی شکل اختیار کر لی۔ ساتھ ساتھ اولوں کی تڑتڑاہٹ بھی جاری تھی، کھڑکی کے شیشوں پر مسلسل چاند ماری ہو رہی تھی اور عادل کی کھانسی اور تھرتھراہٹ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ انجم نے کوئی گولی گرم گرم چائے کے ساتھ اسے کھلا دی تھی اور اب وہ لحاف میں دبکا نیند کی پرسکون وادی میں محوِ نظر تھا، عقیفہ اسے ابھی ہوئی مغموم نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“ وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”انجم بھائی۔ یہ کب ٹھیک ہوں گے؟“ وہ روہا کسی ہو گئی اور آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک گئے۔

”ارے اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“ انجم نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

”فکر کی بات نہیں۔ اب یہ تمام رات پرسکون نیند کے مزے لیں گے اور صبح بالکل فریش ہو کر اٹھیں گے۔ آئیے چلیں۔ ابھی تو رات کی ابتداء ہوئی اتنی جلدی نہ مجھے نینا آئے گی نہ آپ کو کچھ گیمز ہو جائے۔“

”اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت پڑی تو؟“

”ارے بھی میں نے کہا نہیں کہ چار پانچ گھنٹے تک انہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ان کے لیے آرام بیکھ ضروری ہے۔“

وہ دونوں عادل کے کمرے سے ملحق دوسرے کمرے میں جواب انجم کا کمرہ تھا چلا گئے۔ انجم نے کارڈ نکالے اور میز پر پھیلا دیئے، کمرہ کافی گرم تھا۔ کچھ دیر تک دونوں کارڈ زکھیلے رہے، گاہے گاہے انجم کی وارفتہ نگاہیں عقیفہ کی جھکی جھکی نظروں اور روشن پیشانی کا طواف کرنے لگتیں۔

”آپ بہت خاموش ہیں۔ کیا بات ہے؟“

”جی، مجھے نیند آرہی ہے۔“ اس نے ہاتھ سے پتے میز پر رکھ دیئے۔

”ارے اتنی جلدی؟“ میں تو آپ کو نہیں سونے دوں گا۔ ٹھہریے میں آپ کے لیے

کافی بنالوں.....

”یہ کوئی وقت کافی پینے کا ہے؟“

”تو یہ وقت سونے کا بھی نہیں میڈم۔“ وہ مسکرایا۔

”میں بہت اچھی کافی بناتا ہوں۔ اور کافی پینے کا مزہ بھی اسی موسم میں آتا ہے، مگر

بے ایمانی نہ کیجئے گا کہیں پتے بدل کر....“ وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

اور عقیفہ مسکرا کر اس خوشبو کو لمبی لمبی سانس لے کر اپنے اندر اتارتی رہی جو انجم نے استعمال کی تھی۔ یوڈی کلون کی تیز خوشبو.... تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ میں پکڑے خوشبودار بھاپ اڑاتی کافی کے دو نفیس گلا کر اس نے ایک عقیفہ کے سامنے رکھ دیا اور دوسرا اپنے سامنے۔

”انجم بھائی! آپ اس وقت کافی پلا کر میری نیند کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔ اور ہونٹوں سے سگ لگایا۔

”میں نے کوئی زیادتی نہیں کی، پاں اگر آپ میری یہ مخلصانہ پیشکش قبول نہ کرتیں تو ضرور آپ کی طرف سے زیادتی ہو جاتی....“

انجم نے اپنی گہری نظریں عقیفہ کے چہرے پر گاڑ دیں، وہ اپنا گد دو تین گھونٹوں میں خالی کر چکا تھا، اور اب عقیفہ کی اٹھتی گرتی پلکوں کی جھالروں میں اسے اپنا دل دھڑکتا نظر آ رہا تھا۔ خالی کپ میز پر رکھ کر وہ کھڑی ہو گئی، اس کی آنکھوں میں آہستہ آہستہ خمار اتر رہا تھا۔

”میں جا رہی ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے....“

”اچھا۔ آئیے میں آپ کو کمرے تک چھوڑ آؤں۔“ وہ آگے بڑھا تو عقیفہ کے اٹھتے قدم لڑکھڑا گئے اس نے دونوں بازوؤں میں اسے تھام لیا۔ اور وہ لیکھت اس کے سینے سے ٹکرا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔ انجم نے اسی ماحول کو ترتیب دینے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔ اور آج وہ تمام لمحے اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے اسے ہانپوں میں سنبھال کر اپنے نرم گرم بستر پر لٹا دیا اور کمرے کی لائٹ آف کر دی.....!

رات بھر طوفان بڑے گھن گرج کے ساتھ جاری رہا، زندگی ٹوٹی رہی، مکھرتی رہی، بڑے بڑے تناور درختوں نے اپنی جڑیں چھوڑ دیں، اچانک کہیں زور سے بجلی گری اور وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ زیر و پاؤر بلب کی نیلی اور مدہم روشنی میں وہ آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ یہ اس کا کمرہ تو نہیں تھا؟

یہ بستر.....؟

یہ خوابناک ماحول، یہ اڑتی ہوئی خوشبو کس کی تھی؟

اس نے اپنے اوپر نگاہ ڈالی تو سسک کر اپنا ہاتھ کاٹ لیا۔ ایک الاؤ تھا جو اس کے اندر

اتر گیا تھا.....

”یہ کیا ہوا؟“

”کیوں ہوا؟“

”خدا یا۔ میں اتنی سستی اور بے قیمت تو نہ تھی؟“

اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں، وہ گھبرا کر نیچے اترتی اور دوڑتی ہوئی دروازے تک چلی گئی اور بند دروازوں سے اپنا سر ٹکرایا۔ وہ پاگل ہو رہی تھی، پھر جیسے اُسے ہوش آ گیا۔ کھڑکی پر وہ سر کا کر دیکھا عادل ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ پلٹی۔ اس کے اندر نفرتیں ابلنے لگیں، ہاتھ روم دیکھا، اسٹور دیکھا۔ کہیں بھی وہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس کا سوٹ کیس بھی غائب تھا۔ اگر وہ اس وقت سامنے ہوتا تو جانے کیا کر بیٹھتی.....

دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے اور کمزوروں پر بے خبری میں حملہ کرنے والے خدا کو کیا جواب دیں گے؟“ عزت و قدر، دوستی، خلوص و اعتماد کا بت جو اس نے انجم کے پیکر سے تراشا تھا آج اوندھے منہ گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں آئی، اور کھڑکی کا پردہ پورا ہٹا دیا۔ صبح ابھی پوری طرح سے بیدار نہیں ہوئی تھی، طوفان آ کر گزر چکا تھا۔ کیاریوں میں چھوٹے چھوٹے پودے ٹوٹے پڑے تھے۔ لان میں معلوم ہوتا تھا جیسے گھوڑے چھوڑ دیے گئے ہوں۔ کچلی ہوئی گھاس اور جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ یہی عالم اس کے اندر کا تھا۔ معلوم ہوتا تھا طوفان نے اس کی ساتھ کوئی سازش کی ہو، ہوا کے ساتھ درختوں کے پتوں سے بارش کے قطرے اب بھی جھڑ رہے تھے۔ تیز و تند ہوا کا جھونکا آیا تو اس نے بھٹ سے کھڑکی بند کر دی۔ عادل نے کروٹ بدلی تو وہ گھبرا کر جلدی سے ہاتھ روم میں گھس گئی۔ ٹھنڈے پانی کا شاور کھول دیا۔ اس کے اندر آگ دہک رہی تھی، انگ انگ جل رہا تھا۔ وہ اسی طرح اس کے نیچے بیٹھ گئی۔ دل و دماغ۔ اس کی سوچیں زلزلے کے جھٹکے محسوس کر رہی تھیں، اوپر سے شاور کھلا تھا اور آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے، جی چاہ رہا تھا اس سیل بے کنار میں ڈوب جائے، سطح کے نیچے نیچے اور کبھی نہ ابھرے.....

”کاش اس رات کی صبح کبھی نہ ہوئی۔“

یہ اس کی زندگی میں سورج پھر طلوع نہ ہوتا.....

مگر نہ کسی نے سورج کو نکلنے سے روکا تھا نہ صبح ہونے سے..... صبح کا سرمئی اجالا بڑی دیر تک نہانے کے بعد وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر آ گئی، صبح کا سرمئی اجالا آہستہ آہستہ پہاڑوں سے اتر رہا تھا کچن سے چائے کی خوشبو آرہی تھی۔ اس نے دھیرے سے عادل کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے بخار نہیں تھا اور کھانسی بھی نہیں تھی، جی

چاہا اس کے سینے سے لگ کر آنکھوں کے باقی ماندہ آنسو بھی بہا دے اور اسے جھنجھوڑ کر بتائے.....

میرے ہمسفر، میرے محبوب۔ تمہارے دوست کے اعتبار نے تمہاری غمی کو لوٹ لیا..... مگر وہ اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی کہ بہت سارے زخم ایسے ہوتے ہیں جنہیں چھپا لینا ہی بہتر ہوتا ہے کیونکہ تقدیر کی ایسی ظالمانہ واردات کا سوا خدا کے کوئی گواہ نہیں ہوتا۔ پھر وہ کس کس کو اپنی بے گناہی کا یقین دلائے گی۔ لوگ اسے کب جینے دیں گے؟

”عادل.....!“ اس کے منہ سے سرد آہ کے ساتھ ایک ٹوٹی ہوئی سسکی نکل گئی۔

”عادل۔ اٹھ جائیے میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ وہ اس کے سینے سے لگ کر رو پڑی۔

عادل نے آنکھیں کھول دیں۔

”کیوں غمی.....؟“ وہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھرنے لگا۔

”آپ بہت دیر تک سوتے رہے ہیں عادل۔! بس میرا جی پریشان ہو گیا۔“ اس نے سر اٹھا کر آنسو پونچھے وہ اسے پیار سے دیکھ کر ہنس پڑا۔

”پاگل.....“ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آپ نے کیا نیند کی گولیاں کھائی تھیں۔؟“

”ہاں غمی..... کل میرے سینے میں بہت درد تھا کھانسی کے جھٹکوں نے الگ نیم جاں

کر دیا۔ میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے انجم سے بے حد اصرار کے بعد

گولیاں لی تھیں۔ اس سے کہا تھا میں نے کہ کوئی ایسی چیز دے دو مجھے کہ میں رات سکون

کے ساتھ سو سکوں۔ صبح سے پہلے نہ اٹھوں اور دیکھو غمی۔ میں کتنا فریش ہو گیا ہوں کئی

راتوں سے نہیں سویا تھا ناں۔“ عادل نے مسکرا کر غمی کی نرم نرم اور گلابی آنکھوں میں جھانکا۔

”وہ تو چلا گیا ہوگا۔؟“

”کون۔؟“ غمی چونک پڑی۔

”انجم..... اس کی تو چار بجے کی فلاٹ تھی۔“

وہ چپ رہی مگر اس کے اندر شور برپا تھا کہ وہ رہزن عقل و ہوش جاتے جاتے تمہارا

تمام اثاثہ لوٹ کر لے گیا۔ اتنے میں ملازم نے گرم گرم چائے اور کچھ بسکٹ لاکر رکھ دیئے

میز پر اور بولا۔

”صاحب جی۔ ناشتہ کب کریں گے آپ۔؟“

”ایک گھنٹے کے بعد.....“ یہ کہہ کر عادل ہاتھ روم چلا گیا۔

کو سہا دیا تھا....

اس وقت عادل اپنے کمرے میں پشت پر ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا۔ اس کے قدموں کی بے ربطی دل اضطراب کو ظاہر کر رہی تھی۔ بڑی آہا عیفہ کو چیک اپ کے لیے لے گئی تھیں۔ اس نے الماری کے اندر ٹنگے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ نکالا۔ اور کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ لکھا تھا.....

”میرے دوست! میری اس جسارت کو معاف کر دینا۔ یقین کرو، میری نیت بری نہ تھی تم مجھے ہمیشہ سے بے حد عزیز ہو اور تمہارے حوالے سے غفی بھی مجھے اتنی ہی عزیز ہو گئی تھی جب کہ میں تم دونوں کا المیہ جانتا تھا۔ اور یہ بھی کہ تم ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم ہو۔ اگر زمانے کی بے رحم فطرت نے تمہیں الگ کر دیا تو تم مر جاؤ گے۔ یہ خیال مجھے اذیت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ میں تم دونوں کو بچانا چاہتا تھا۔ اور اس کے سوا مجھے تمہاری اور غفی کی ذات کی تکمیل کا کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آیا۔ عادل میں تمہاری امانت میں خیانت کا مرتکب ہوا ہوں۔ بخدا میں خود اپنی نظروں میں گر گیا۔ لیکن یہ گناہ صرف میرا ہے۔ اس کی باز پرس بھی حشر کے دن مجھ سے ہی کی جائے گی۔ خدا را اس کے لیے نہ تم اپنے سے کوئی حساب لینا نہ غفی سے۔ وہ بہت معصوم ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں۔ تمہاری طرح میں نے اسے بھی ایک گولی کافی میں گھول کر پلا دی تھی۔ کبھی بھی کسی وقت بھی تم غفی کو اس راز میں شریک نہ کرنا، میں اب ہمیشہ کے لیے تم دونوں کی زندگی سے دور جا رہا ہوں، اپنے گناہ گار وجود کے ساتھ کبھی نہ آنے کے لیے۔ فقط

”انجم“

یہ پرچہ انجم نے عادل کے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ دیا تھا۔ وہاں سے آنے کے کئی دنوں بعد جب یہ پرچہ عادل کے ہاتھ میں آیا تو اس کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ وہ حواس باختہ ہو گیا۔ یہ کیا ہو گیا؟ اس کی جلتی کرہتی سوچیں اسے بہت پیچھے لے گئیں....

”اس نے دورانِ تعلیم کسی حدیث میں پڑھا تھا کہ اگر تم کسی کی بیٹی یا بیوی پر غلط نگاہ ڈالو گے تو ایک دن تمہاری ناموس بھی اسی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔!“

یہ گنبد کی صدا تھی جیسی کہو ویسی سنو.... آج چاند پر تھوکا ہوا جب خود اس کے منہ پر اگر اکتب اسے اس ذلت اور درد کا احساس ہوا۔ اجو اس نے دوسروں کی جھولی میں ڈالے تھے۔ وہ بے آواز رو رہا تھا۔ ٹپ رہا تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ قدرت کا قانون الٹ ہوتا ہے، پھر بھی اس نے وہ پرچہ تلف نہیں کیا، دل میں کہیں یہ شبہ چھپا ہوا تھا کہ کہیں پرانم نے اس کے ساتھ مذاق نہ کیا ہو، لیکن جب ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر اس جان لیوا

گھر میں پوری تیاریاں مکمل تھیں۔ بس عادل کا انتظار ہو رہا تھا کہ اچانک فریدہ کے والد کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور انہیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اس کے بعد پھر ان کے شفایاب ہونے کا انتظار ہونے لگا۔ غفی کو ایک ماہ ہو گیا تھا۔ لیکن اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، اس میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ چکر آنے لگے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔ ابکائیاں آنے لگیں۔ شاہدہ بیگم نے بہو کو غور سے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئیں، ایک دن غفی کو اتنے زور و چکر آیا کہ وہ گر پڑی فوراً عادل اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگا۔ چیک اپ ہوا تو اثر نے زبردست دھماکہ کر دیا کہ ”مبارک ہو عادل صاحب آپ کی بیگم تخلیق کے دور سے گزر رہی ہیں، ان کے آرام کا خیال رکھیں۔“ اس انکشاف نے دونوں پر سستہ طاری کر دیا۔ ایسی باتیں کہاں چھپی رہتی ہیں۔ گھر میں خوشیوں کی ترنگیں جاگ اٹھیں۔

”ہائے اللہ۔ چار سال سے اس خوشخبری کے لیے ترس رہی تھی، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے مولا۔“ شاہدہ بیگم نے اپنا آنچل پھیلا کر کہا۔ اور بہو کی بلائیں لینے لگیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں قربان ہوئی جا رہی ہیں، ننڈیں اُسے زمین پر قدم نہیں اتارنے دیتیں۔ عاقل صاحب نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک علیحدہ ملازمہ کا انتظام کر دیا تھا۔ ہر شخص اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا، مگر وہ جیسے پتھر کی بن گئی تھی۔ اس کے سائے چہرے پر کسی خوشی، کسی غم، کسی تبدیلی کا رنگ نہیں تھا۔ اس کے لیے تو اب ہر موسم بے رنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا دل اور ذہن جس عذاب سے گزر رہا تھا صرف اسی کو معلوم تھا جو ار کی شہ رگ سے بھی قریب تر تھا۔ وہ جانتی تھی کہ دنیا کے رسم و رواج اور بے رحم ذہینوں میں گھر کر ایک کمزور، معصوم لڑکی کیا کر سکتی ہے.....

”ان کے ہاتھوں میں جانی کی لڑیا کی طرح بے بس تھی۔“

”وہ تو کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھی۔“

پھر وہ اسی عالم الغیوب سے پوچھتی.....

”بتا میرا تصور کیا تھا؟“

”کیوں مجھے جیتے جی، جہنم بخش دیا.....؟“

”اگر یہ گناہ ہے تو کس کے کھاتے میں.....؟“

عادل بھی اسی ذیت اور کشمکش سے گزر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے لگتا کسی نے لہو کو ایک ایک بوند نچوڑ لی ہو، جب وہ دونوں پاس ہوتے تو ان کے دل احساسِ جرم سے دھڑکنے لگتے۔ آنکھیں بڑی بہادری سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈھنے لگتیں۔ آخر دونوں مسکرا دیتے کہ زبان کو کچھ کہنے کا یارا نہ ہوتا۔ اس انکشاف نے دونوں

مذاق کی پردہ کشائی کردی تو اسے یقین کرنا پڑا کہ اس کی سزا میں شاید کچھ اور توسیع کردی گئی ہے۔ قدرت کے ترکش میں ابھی تیر باقی ہیں جو تاک تاک کر اس کے سینے میں پیوست ہو رہے ہیں۔ اس نے پرچے کے ہزار ٹکڑے کر کے ماچس دکھادی۔ وہ اس کی راکھ سمیٹ رہا تھا کہ عقیقہ اندر آگئی، جلی ہوئی راکھ دیکھ کر بولی۔

”یہ کیا جلادیا عادل.....؟“

دونوں آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے ایک کی آنکھوں میں چھین بھی دوسرے کی آنکھوں میں خوف۔

”یہ میرا دل تھا جسے میں نے جلادیا۔ دیکھو گی.....؟“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اپنے تلے ہاتھ سے ایک پتھر اس کے رخسار پر جڑ دیا، پھر دوسرا بھی، غمی دونوں ہاتھ منہ پر رکھے سسکیاں لینے گی اور اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”مارئے اور مارئے۔ جان سے ختم کر دیجئے مجھے میں اسی قابل ہوں.....“

وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس کے گلاب جیسے رخساروں پر سرخ انگلیاں اچھل آئی تھیں۔ اس کی برستی آنکھوں میں بڑی بے بے چارگی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ دیکھا اور پھر اسے کھینچ کر سینے سے لگا کر رو پڑا۔

”مجھے معاف کر دو غمی۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ اپنے ہوش میں نہیں تھا۔“ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور غمی اپنی تکلیف اپنا رونا دھونا بھول کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”عادل آپ کی طبیعت مجھے خراب لگ رہی ہے۔ میں ڈاکٹر کو فون کر رہی ہوں.....“ وہ اس کی گرفت سے نکلنے لگی۔ تو عادل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں صوفوں پر بیٹھ گئے۔

”غمی۔ اب میں ٹھیک ہوں، پتا نہیں کبھی کبھی مجھے کیا ہو جاتا ہے۔؟“

”تو ڈاکٹر کو دکھا دیں ناں.....“

”میری ڈاکٹر تو تم ہو غمی۔ اگر کبھی غلطی ہو جائے تو معاف کر دیا کرو۔ مریض جو ٹھہرا تمہارا.....“ وہ آستین سے اپنے آنسو پونچھ کر بولا، ”دیکھو اب دل ذرا قابو میں آیا ہے۔“

”ہائیں..... ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میں نے دل جلا کر راکھ کر دیا ہے اور اب.....؟“ وہ معصوم صورت بنا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ ہنس پڑا۔

”بڑا سنجیدہ مذاق کرتی ہو۔ ارے بھئی وہ اصلی والا دل تھا جو جل گیا۔“

”پھر آپ غلط جملہ بول گئے۔“ وہ مسکرائی۔

”یوں کہیے جو جل گیا، راکھ ہو گیا وہ خیالی دل تھا اب جو خیر سے دھڑک رہا ہے وہ اصلی دل ہے۔“

”بڑی نباض ہو۔ ہاں شاید میں اسی طرح کہنا چاہتا تھا۔“

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیئے۔ عادل کو اب اسی سراب میں زندہ رہنا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی پناہ گاہ تھے، جب زیادہ گھبراتے۔ سراب سے نکلنے کا راستہ نہ پاتے تو بازو پھیلا کر ایک دوسرے کی پناہ میں آ جاتے، آنکھیں بند کر لیتے..... پھر وقت مقرر پر قدرت نے انہیں ایک نہیں دو بچوں سے نوازا، دو جڑواں بچے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ گھر والوں پر شادی مرگ طاری ہوئی۔ خوشیاں ٹوٹ ٹوٹ کر فضا میں تھپتھپے بکھیر رہی تھیں۔ اندر باہر مبارک سلامت کا شور برپا تھا۔ عاقل صاحب نے بڑے فخر سے بیوی کی طرف دیکھا۔

”لے نیک بخت۔ اب سنبھال اپنے پوتے کو بھی اور پوتی کو بھی، دینے والا یوں چھتر پھاڑ کر دیتا ہے۔ شکر ادا کر اس کا۔“

”ہائے میں کیا جانتی تھی کہ خدا ہمارا امتحان لے رہا ہے۔“ شاہدہ بیگم نے کہا۔

”خدا تو نہیں، البتہ تم ان معصوم بچوں کا ضبط آزار ہی تھیں۔ دیکھا کیسا صبر کا میٹھا پھل ملا ہے میرے بچوں کو۔“ جس دن اسپتال سے اس خوشخبری نے گھر میں قدم رکھا۔ عادل رات بھر سجدے میں بڑا رہا، اللہ سے اپنے گناہ بخشواتا رہا، روتا رہا، گڑگڑاتا رہا.....

”اے علیم و بصیر۔ تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ میں شرمسار ہوں مجھے معاف کر دے۔ اور حوصلہ دے کہ میں اس ذمہ داری کو اٹھا سکوں۔ اتنا ظرف دے کہ میں ان کے ساتھ انصاف کر سکوں.....“

دو تین دن بعد۔ وہ غمی کے بیڈ کے پاس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی کمزور نظر آ رہی تھی۔ رنگ پیلا ہو گیا تھا۔

”کیسی ہو غمی۔؟“

اس نے آنکھیں کھول دیں، مسکرائی۔

”میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں۔؟“

”خدا کا شکر ہے۔“

”عادل اپنے بچوں کو نہیں دیکھو گے۔؟“ متا سے مغلوب ہو کر غمی نے اس کی طرف دیکھا، وہ گھبرا گیا۔

”ہاں ہاں۔ غمی.....!“

پاس ہی پالنے میں دو ننھے منے گلاب سرخ کبیل اوڑھے اپنی تارہ جیسی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ عادل نے ایک ٹھنڈی ساس بھری، اور جھک کر دونوں کی پیشانی چوم لی،

”عادل، بیٹا بالکل آپ کی طرح ہے اور بیٹی میرے جیسی۔“ غمی کا چہرہ متا کے نور سے جگمگا رہا تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک ماں تھی، ہر خیال، ہر شبہات سے بالاتر ہو کر ایک

”اس نے عبیرہ کو مارا تھا۔ اس سے کہئے یہ بہن سے پیار کرے اور ماما کو سوری کہے۔“
 ”اوہو ہو۔۔۔۔۔“ عادل نے شرمندگی سے گردن جھکائے راشل کی طرف پیار سے دیکھا،
 ”بیٹے۔! آپ کی مناسبت کہہ رہی ہیں ناں۔۔۔؟“
 ”جی ہاں پاپا۔“

”تو پھر جاؤ اپنی پیاری سی بہن کو پیار کرو۔“
 راشل نے عبیرہ کا چہرہ ننھے منے ہاتھوں میں تھام کر پیار کر لیا۔ پھر اس نے ماں کی
 طرف دیکھا کچھ جھجکا اور دوڑ کر عقیفہ کے گلے میں جھول گیا۔
 ”سوری ماما۔۔۔۔۔“

عقیفہ کے سینے میں ماما کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس کی پلکیں بھیگی گئیں۔
 ”میری جان۔ دیکھو عبیرہ تمہاری گڑیا سی بہن ہے اور بہنوں سے تو پیار کیا جاتا ہے
 نا۔ انہیں مارا تو نہیں جاتا۔؟“
 عقیفہ نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش،
 ”ماما عقی نے میری تتلی کی الہم پھاڑ دی تھی۔“ اس نے منہ بسورتے ہوئے جواز پیش
 کیا۔

”چہ چہ۔۔۔“ عادل نے عبیرہ کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

”بے بی۔ اب تو بھائی کی کتاب نہیں پھاڑو گی۔؟“

اس نے معصومیت سے گردن نفی میں ہلا دی۔

”میں اپنے بیٹے کو اس سے بہت اچھی الہم لادوں گا۔۔۔۔۔“

عقی کے دل سے ہوک سی اٹھی

”اللہ ہم اپنے بچوں سے کتنے دور ہو گئے تھے۔“

عادل نے دونوں بچوں کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”عقی کل ہم بچوں کو لے کر کلفٹن کی سیر کرنے جائیں گے۔ انہیں جھولا جھولائیں گے

یہ بجلی کی ریل پر بیٹھیں گے۔“

”اور پاپا۔ کون بھی کھائیں گے۔؟“ عبیرہ نے یاد دلایا تو عقی مسکرا دی، عادل نے کہا،

”ہاں بھئی۔ کون تو ہمیں بھی بہت پسند ہے اور آپ کی ماما کو بھی۔۔۔۔۔“

عقیفہ آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر تبسم لیے عادل کی خوشی اور اس کی محبت کا اندازہ

لگا رہی تھی۔

اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے دل کا بوجھ بھی رفتہ رفتہ کم ہو رہا تھا، بچے ماں

باپ کے گرد ہنستے کھلکھلاتے پھرتے۔ عقی انہیں ہوم ورک کراتی۔ عادل اب انہیں خود
 اسکول چھوڑنے جاتا۔ مگر پھر بھی کوئی کھٹک تھی جو اکثر ان کی خوشیوں میں حائل
 ہو جاتی۔۔۔۔۔!

☆.....☆.....☆

اس رات پھر آسماں بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ گہرے سیاہ بادل چھا جوں برسنے کے
 لیے تیار کھڑے تھے، پل دوپل میں آسماں سے زمین تک پانی کی چادر تن جائے گی، اور
 تشہل تمام چیزیں اس چادر میں لپٹ کر سیراب ہو جائیں گی، مگر اس کے اندر جو رہ کر
 شعلہ لپک اٹھتے ہیں انہیں کون سر دکرے گا۔

مہاوات کے یہ بھرے بادل۔؟

یا خون جگر کے یہ قطرے۔؟

جو آنسو بن کر اس کے دل پر گر رہے تھے، آج پاگل ہوا بھی چیختی پھر رہی تھی، سرد
 ہواؤں کی ٹھنڈی تھیں اور اس کی دہلی دہلی سی کراہیں۔۔۔۔۔

اب وہ آ کر کسی پہر بچوں کے پاس سو جاتی تھی۔ عادل بھی اسے نہیں روکتا تھا، آخر وہ
 ان کی ماں تھی۔ اس وقت باہر کے موسم کے ساتھ اچانک اس کے اندر کا موسم بھی بدل گیا
 تھا۔ وہ کمرے میں بولا کی بولا کی پھر رہی تھی۔ یوں جیسے کشتی ساحل کو ڈھونڈھتی ہے۔۔۔۔۔
 عقیفہ نے سوچا۔

”اب مجھ سے لمحہ لمحہ کا یہ کرب نہیں سہا جاتا۔ میں خائن بن کر جینا نہیں چاہتی، میں
 عادل کو صاف بتا دوں گی کہ وہ ان بچوں کا باپ نہیں ہے۔۔۔۔۔ خواہ عادل مجھے کچھ بھی سزا
 دیں۔۔۔۔۔“ اس نے کہا۔

اُدھر اسی بے چینی سے عادل بھی دوچار تھا، وہ بھی اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا سوچ
 رہا تھا۔۔۔۔۔

”کیا میں عقی کے سامنے اپنا ماضی کھول کر رکھ دوں۔؟“

”میرے ضمیر کی بڑھتی ہوئی خلش مٹ جائے گی، بلا سے وہ ناراض ہو جائے مجھ سے
 نفرت کرنے لگے۔ میں اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دوں گا۔ معافی مانگ لوں گا۔
 اسے منالوں گا۔ میں نے تمام زندگی دوسروں کو شکست دے کر فخر حاصل کیا ہے۔ آج اگر
 میں ہار بھی جاؤں تو مجھے غم نہیں ہوگا۔۔۔۔۔“

اس خیال سے اس نے عقیفہ کے پاس جانے کے لیے دروازہ کھولا۔ تو خلاف توقع
 اس سنگم پر اسے کھڑا پایا۔۔۔۔۔

”عقی۔۔۔۔۔!“ عادل دو قدم اور بڑھا تو وہ بلک کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

”عادل‘ میں بہت بری ہوں، بہت بری....“ آگے الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔
”تو میں کب اچھا ہوں غفی....؟“

اس نے شکست خوردہ آواز میں کہہ کر اس کا سر اٹھایا۔

”مجھے بھی اعتراف کرنے دو غفی۔ کہ میں تمہارا گناہ گار ہوں۔“

”اور میں بھی آپ کی عدالت میں جواب دہ ہوں عادل....“ اس نے سر جھکا لیا۔

”اچھا آؤ۔ آج میزان میں اپنے اپنے گناہ کھ کر دیکھیں کہ کس کا پلڑا بھاری ہے۔“

وہ غیفہ کا سر دکھانے لگا ہوا ہاتھ تھام کر بچوں کے کمرے میں آ گیا۔ اور دونوں بچوں کے

پاس بیٹھ کر بولا۔

”غفی بندہ خطا کا پتلا ہے۔ میں بھی تم بھی اور دنیا کا ہر فرد۔ مگر اس غفور الیم نے اس

کے ازالے کے لیے بھی بہت کچھ رکھا ہے۔ اگر ہم حالات پر قانع رہ کر خدا کو یاد کرتے رہیں

تو دنیا کے یہ لکھے ٹیڑھے میڑھے راستے ہمارے لیے آسان ہو جائیں گے۔“

عادل نے اپنی آنکھوں میں نرم نرم اچلے اچلے جذبوں کی روشنی بھر کر کہا۔

”غفی۔! یہ بچے ہمارا آئینہ ہیں....“

”ہمارا میزان ہیں....“

”ان کی خوشی آرام ان کی محبت ان کی تعمیر اور ان کے بہتر مستقبل کی جدوجہد ہی

ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے۔“

”آؤ۔ آج ہم عہد کریں کہ انہیں کبھی اپنے سے دور نہیں کریں گے۔ انہیں دنیا کا

کامیاب ترین انسان بنائیں گے....“

”اپنے باطنی کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیں گے۔“

”اور پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھیں گے....!“

آج غفی پر عادل کے جو ہر کھلے تو اسے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ کتنا بڑا انسان ہے۔ اس

کے تمام وسوسے اندیشے جھاگ بن کر اڑ گئے۔ اندر کہیں نرم نرم ٹھنڈی پھواریں برس رہی

تھیں، بہاریں رقص کر رہی تھیں جن کا عکس اس کی آنکھوں اور چہرے پر نظر آ رہا تھا۔ وہ

اپنے کو بے حد ہلکی پھلکی اور پُر سکون محسوس کر رہی تھی.... انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ

تھام رکھا تھا.... اور پیار و ممتا سے چھلکتی نظریں دونوں بچوں کی بند پلکوں کو چوم رہی

تھیں....!!!

☆.....☆.....☆

پناہ گاہ

”میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آپ اس قدر زور و زنج اور حساس کیوں ہیں۔ ذرا

ذرا سی بات میں پریشان ہو جاتے ہیں۔ لگتا ہے ساری دنیا کو سدھارنے کا

ٹھیکہ آپ ہی نے لے رکھا ہے۔“ صبا نے مسکرا کر جہاں زیب کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تم نہیں سمجھو گی صبا۔ میں وہ دل و جگر کہاں سے لاؤں جو سب کے دکھ پر گڑھنا

چھوڑ دے۔ یہ تو بس اپنے اپنے محسوسات کی بات ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ آج کے سانس ہی دور نے اسپریر پارٹس کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ دل“

گردے اور آنکھوں کا تبادلہ اب دشوار نہیں رہا۔ کسی موقع پر آپ کا دل بھی بدلوادیں گے

بڑا تنگ کرتا ہے آپ کو یہ۔“ صبا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

”مذاق نہ کرو صبا، میں سیریس ہوں۔“

”آپ سیریس کب نہیں ہوتے جہاں زیب یہ تو میں جانتی ہوں۔ لیکن کم از کم اس

انتہا پسندی سے گریز کیجیے۔“ وہ مسکرائی۔

”بس اسی طرح ہنستی مسکراتی رہا کرو صبا۔“ جہاں زیب نے پیار سے اس کی طرف

دیکھا۔ ”میرے احساسات پر چھایا ہوا کٹھن چھٹنے لگتا ہے زندگی پر مجھے پیار آنے لگتا ہے

ورنہ یہ دنیا بڑی ظالم ہے اور یہاں پر بسنے والے لوگ اس سے زیادہ سفاک.... کسی کے

دکھ درد سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔“

”اچھا خیر چھوڑیں چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ آج میں نے یہ کیک اپنے ہاتھ سے

بنایا ہے۔ آپ کو کیک بہت پسند ہے نا۔“ اُس نے چھری سے کیک کاٹا اور ایک پیس

کانٹے سے اٹھا کر اس کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے جلدی سے منہ کھول دیا۔

”تم میری کتنی مزاج آشنا ہو۔“ جہاں زیب منہ چلاتے ہوئے بولا۔

”آپ تو میرا جہاں ہیں۔ میں مزاج آشنا نہیں ہوں گی تو اور کون ہوگا؟“

وہ مسکرائی اور چائے کا کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔

جہاں زیب کی پوری زندگی لمحہ لہلہا اور آزمائش سے گزری تھی۔ بقول شمسہ۔ وہ بھٹی میں تپ تپ کر سونا بناتا تھا۔

اسی لیے اپنے وہ دن نہیں بھولا تھا جنہوں نے اسے قدم قدم پر موت و زیست سے ہمکنار کیا۔ اذیت اور محرومی کی تلخیوں سے دوچار کیا۔ دنیا صرف ان کی ہے جن کے پاس لامحدود وسائل اور بے شمار دولت ہوتی ہے جن کے گودام اجناس اور دسترخوان ہمیشہ نعمتوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ فلاں لوگوں کو دنیا میں پیدا ہونے کا کوئی حق نہیں۔ فطرت سے بغاوت کا یہ تصور اس کی سوچوں کو زہریلا بناتا گیا۔ اس کی رگ رگ میں آگ بھڑکی جس نے اس کے تن من کو خاکستر کر دیا تھا۔

اس کے والد اکبر حسین نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے تین بیٹے، تین بیٹیاں تھیں۔ وہ سب جوان اور شادی شدہ تھے۔ سب برسر روزگار اور اچھا کھارہے تھے۔ اکبر حسین کے بھی کئی پرویشن اسٹور چل رہے تھے۔ جن پر ملازمین کام کر رہے تھے۔ ایک میڈیکل اسٹور پر خود بیٹھتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کے دست نگر نہیں تھے بلکہ وہ خود بے لیتے رہتے تھے۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ بیوی کے مرنے کے بعد ان پر وہ توجہ نہیں رہی تھی جس کی انہیں ضرورت تھی۔ لینے والے سب تھے مگر خیال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ بذات خود بڑے مخلص اور نرم خو تھے۔ ان کے دسترخوان پر دو چار مہمان ضرور ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بڑا کھلا ہوا ہاتھ تھا۔ ان کی حیثیت ایک بادشاہ کی تھی۔ ان کی داد و دہش سب کے لیے تھی۔ ابر کرم کی طرح وہ سب پر چھائے ہوئے تھے۔ پھر ان کی بیوی جنہوں نے اپنے شوہر اور اس کے گھر پر کم و بیش تیس سال حکومت کی تھی، قضائے الہی سے فوت ہو گئیں۔ اکبر حسین کی بیوی سے زیادہ ان کی ذات سے وابستہ آرام و آسائش کے جھن جانے کا دکھ تھا۔ جو وہ اپنے بے تاج بادشاہ اپنے محبت کرنے والے شوہر کے لیے مہیا کرتی تھیں۔ تینوں بہوئیں بچے اور نوکران کی نگرانی میں... الرٹ رہتے تھے۔ ابرو کا ایک اشارہ کافی تھا اور ہر چیز سامنے آ جاتی تھی۔ مگر بیوی کے بعد بہوئیں بیٹیاں اور نوکر جیران و پریشان تھے ان کی سمجھ میں یہ سسٹم نہیں آ رہا تھا۔ وہ بوکھلائی ہوئی تھیں۔ حالانکہ یہی لوگ تھے کرنے اور کرانے والے۔ پھر جانے کیوں اب ان کے کاموں میں نہ وہ نفاست رہی تھی نہ رغبت۔ کوئی کام وقت پر نہ ہوا۔ ہر کام الٹ ہو جاتا تھا جیسے اس گھر میں پابندی وقت کا کوئی ضابطہ ہو نہ عمل، اکثر اکبر حسین بھری ہوئی میز چھوڑ کر اٹھ جاتے تھے۔ کسی سے کچھ نہ کہتے تھے۔

”اوجی، آپ نے بیٹھا تو لیا ہی نہیں۔ اور یہ کباب، قورمہ آپ تو صرف تھوڑے سے

چاول لے کر اٹھ گئے، اس طرح تو آپ کی صحت خراب ہو جائے گی۔“ بڑی دلہن سر سے پیار سے کہتیں تو آخر سر کو منہ کھولنا پڑتا۔

”دلہن۔ یہ بات گھر میں سب جانتے ہیں کہ میں شوگر اور بلڈ پریشر کا مریض ہوں۔ پڑنگ میں بے تحاشا چینی تھی کباب میں مرچوں کی بھرمار تھی۔ تورے میں لگ رہا تھا کہ بونیاں گھی میں تیر رہی ہوں۔ ڈاکٹر نے مجھے زیادہ چینی، زیادہ نمک مرچ اور گھی سے منع کیا ہے۔ کیا تم نے اپنی مرحومہ ساس کو نہیں دیکھا کہ وہ میرے لیے کھانا کس طرح تیار کرتی تھیں۔ بیٹھا واجبی ہوتا۔ چائے یا دودھ پھیکا ہوتا مگر چینی کا پاٹ ساتھ میں ہوتا کہ اگر جی چاہے تو تھوڑی چینی ڈالی جاسکتی ہے، ساکن میں گھی تیل نمک مرچ برائے نام ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ گھر میں ایسا مینو سب کے لیے نہیں بن سکتا، اسی لیے تمہاری ساس میرے لیے ہانڈی الگ تیار کرتی تھیں۔ پھر ان کے جاتے ہی نظام میں گڑ بڑ کیوں پیدا ہو گئی۔ تم سب سے بڑی ہو سب کی مزاج آشنا ہو۔ تمہیں اپنی ساس کی جگہ بیٹھ کر سب کو گاند کرنا چاہیے تھا۔“

سوری اوجی اب آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی، میں خیال رکھوں گی۔“
یہ کہہ کر وہ چلی گئیں لیکن یا تو انہوں نے کسی سے کہا نہیں یا پھر سر کے ساتھ یہ امتیازی سلوک انہیں پسند نہ آیا۔ گھی تیل نمک مرچ چینی نسبتاً کم ہو گئی لیکن ہانڈی ایک ہی رہی۔ یعنی جو سب کیلئے وہ ان کے لیے بھی۔ اکبر حسین نے خاموشی اختیار کر لی۔ جو کچھ مل جاتا مبر و شکر سے کھا لیتے۔ مگر کب تک؟
جو شخص صاحب اختیار، صاحب ثروت ہو وہ کب تک دوسروں کے رحم و کرم پر رہ سکتا ہے اور کیوں؟

جب ایک دن انہوں نے متوسط طبقے کے ایک شریف خاندان کی خوبصورت، خوب برت لڑکی سے عقد کر لیا تو خاندان بھر میں ہلچل مچ گئی۔ گھر والوں کو قطعی امید نہیں تھی کہ کہ باپ ایک سال ہی میں گھبرا کر ایک نئی نو بلی دلہن لے آئے گا۔ حالانکہ یہ شخص بہو بیوں کا خیال تھا، حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اکبر حسین اپنی تنہائیوں کا رفیق، ہمدرد، غم گسار جانتے تھے۔ ابھی وہ اتنے بوڑھے نہیں ہو گئے تھے کہ وہ گھر کے کسی کو نے میں ہانے مال کی طرح پھینک دیے جائیں جبکہ ان کے پاس اتنا تھا کہ وہ ایک وقت میں دو گھر... دو بیویوں کو رکھ سکتے تھے۔ انہوں نے تو صرف ایک ہی ساتھی اور رفیق زندگی کو تلاش کیا تھا۔ جو ہمہ وقت ان کا خیال رکھ سکے، اپنے بچوں کی حق تلفی نہیں کی تھی۔ پھر کسی کو کیوں اعتراض تھا۔ انہوں نے تو اپنے سکون کی خاطر یہ قدم اٹھایا تھا۔ وہ چاہتے وہ سکون، جوان کے بچے فراہم نہ کر سکے تھے پھر انہیں باپ سے کیوں شکایت ہو گئی تھی۔ وہ دیکھ

کھیلوں سے دلچسپی لیتی۔ ان کے لیے نت نئے کھیل کے سامان منگوا کر دیتی۔ پرانے کھلونوں کی جگہ نئے کھلونے آ جاتے۔ وہ جو بھی فرمائش کر دیتے فوراً ہی پوری کر دی جاتی۔ جس کی وجہ سے بچے اپنی جوئیر اور چھوٹی دادای امی سے بہت خوش نظر آنے لگے۔ وہ ان کے گرد بھرا کرتے۔ یہ چیز ان کی ماؤں کے لیے چیلنج بن گئی۔ انہیں بالکل اچھا نہ لگتا کہ زبیدہ بیگم ان کی محبتوں میں سیڑ کرے۔ اور بچے ماں سے زیادہ دادی کو پکاریں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ بہو بیٹیوں اور گھر کے بچوں کو آج بھی وافر جیب خرچ اکبر حسین کی طرف سے ملتا تھا۔ اس کے علاوہ پھل، فروٹ، مٹھائیاں اور سیزن کے ملبوسات بھی دادا جان لا کر دیتے تھے اس پر اگر کسی بہو بیٹی نے کوئی فرمائش کر دی سوا لگ پوری کی جاتی تھی۔ اس لیے یہ ظاہر وہ زبیدہ بیگم کے خلاف زبان کھولنے کی مجاذ نہیں تھیں۔ اگر وہ اکبر حسین یا ان کی بیوی کی طرف سے کوئی پر خاش نکالنے کی کوشش بھی کرتیں تو ان کی یہ ساری مراعات کے دادو دہش بند ہو جانے کا خطرہ تھا۔

زبیدہ سے اکبر حسین کے.... صرف دو بچے ہوئے۔ ایک بیٹا جہاں زیب، دوسری بیٹی سین۔ جہاں زیب اور سین میں پورے آٹھ سال کا فرق تھا، درمیان میں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اکبر حسین اپنی آخری اولادوں سے بہت پیار کرتے تھے اور انہیں وہی مراعات، وہی ماحول اور آسائیاں حاصل تھیں جو ان کے پوتے پوتیوں اور بیٹوں کو ملی ہوئی تھیں۔ جہاں زیب کو ایک بہترین اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا اور اس کے لیے ٹیوٹر علیحدہ گھر پر پڑھانے آتا تھا۔ ہر چند کہ یہی سب کچھ بڑے بیٹوں کی اولاد کو حاصل تھا۔ مگر در پردہ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ سوتیلا بھائی ان کی برابری کرے یا ان کے بچوں سے سبقت لے جائے۔ یوں تو وہ سب جہاں زیب پر جان چھڑکتے تھے مگر اندر ہی اندر ان کے دلوں میں طوفان گرج رہے تھے۔

دس سالہ زندگی میں جو سکھ زبیدہ بیگم نے اکبر حسین کو دیا تیس سالہ ازدواجی زندگی میں ان کی پہلی بیوی نہ دے سکی تھی۔ کچھ زبیدہ کے حسن اور کم عمری کا تقاضا بھی تھا جو اکبر حسین انہیں پروانہ وار چاہتے تھے اور زبیدہ نے کبھی ان کی محبت سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ جی جان سے ان کی خدمت کرتی تھی۔ کبھی چھوٹی سی چھوٹی کوتاہی بھی اس کی طرف سے نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود اکبر حسین نے اس معصوم غریب خاندان کی شریف لڑکی سے انصاف نہیں کیا۔ کاش وہ اپنی زندگی میں اس کے لیے کچھ کر جاتے۔ کوئی دکان، مکان، بینک میں کوئی کیش وغیرہ فکس ڈپازٹ بچوں کے نام کر جاتے۔ معلوم نہیں ان کے ساتھ کیا ہوا تھا کہ اچھے بھلے وہ رات کو سب کے ساتھ کھانا کھا کر ہنستے بولتے لیٹے۔ اور صبح وہ زندگی کے بوجھ سے آزاد تھے۔

رہے تھے کہ سب ان سے کٹے کٹے پھر رہے تھے۔ منہ پھلائے۔ نگاہیں بدلے۔ مگر اب انہیں کسی کی پروا نہیں تھی۔ ان کی شوخیاں، ان کا چونچال پن، ان کی مسکراہٹیں، بات بات میں قہقہے واپس آ گئے تھے۔ ہر چند کہ اکبر حسین اور زبیدہ خانم میں بیس سال کا فرق تھا۔ مگر یہ فرق زیادہ واضح نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ سدا کے خوش لباس تھے۔ اپنا خاص خیال رکھتے تھے۔ ایک نوکر صرف بڑے صاحب کے کاموں پر مامور تھا کہ وہ ان کے لباس، اسٹری جوئے، ان کی اور بہت سی چیزوں کا خیال رکھتا تھا۔ اور ان پر ہمیشہ متوجہ رہتا تھا۔ لیکن بیوہ کے فوت ہوتے ہی وہ نوکر ہٹا دیا گیا۔ اور اب شادی کرنے کے بعد پھر اکبر حسین نے ایک خصوصی ملازم بلوایا۔ زبیدہ خانم بھی بہت اچھی اور سنگھڑ بیوی ثابت ہوئی تھیں۔ پہلا رات میں انہوں نے اپنا اور گھر والوں کا پورا تعارف کر دیا تھا۔ اپنے مزاج۔ پسند و ناپسند کے متعلق بھی بتا دیا تھا۔ اس کے بعد سے انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ نوکروں سے کام لینے کا الگ طریقہ ہوتا ہے۔ نوکر تو بہر حال نوکر ہوتا ہے۔ رو بوٹ کی طرح کام کرنے کا عادی۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر کام نوکروں پر چھوڑ کر گھر کی بربادی کا شاندار منظر دیکھا جائے۔ زبیدہ کے طور طریقے۔ اس کا حسن، انتظام، حسن اخلاق دیکھ کر بڑی چھوٹی اور مچھلی بہو جلیس ہو گئی تھیں۔ جبکہ اکبر حسین نے پہلی رات ہی میں سمجھا دیا تھا کہ۔

”میں تمہیں اس وقت بیاہ کر لایا ہوں جبکہ میری تنہا ملکیت پر کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی دوسرا حق دار بھی پیدا ہو جائے گا۔ تم میری بیوی ہو۔ اس گھر کی آدمی مالک.... گھر والے تمہیں پسند نہیں کریں گے۔ کیونکہ تمہاری موجودگی میں ان کی آزادی میں فرق آ گیا۔ وہ تم پر قدغن لگانے کی کوشش کریں گے، تمہیں بہت کچھ سننا اور برداشت کرنا پڑے گا۔ مگر تم کسی کی پروا نہ کرنا۔ اپنے کام سے کام رکھنا۔ ہر صورت میں تم ان کی ماں ہو اور ماں شفقت و محبت کا سمبل ہوتی ہے۔ اپنے اعلیٰ کردار کو ان کے احقانہ رویوں سے داغدار نہ کرنا۔ میں صرف تمہارا ہوں.... یہ احساس تمہاری ہر سوچ پر غالب رہنا چاہیے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی نا انصافی نہیں کروں گا۔“

زبیدہ نے سر تسلیم خم کر دیا اور مسکرا کر بولی۔

”آپ فکر نہ کریں۔ انشاء اللہ آپ کی ہدایت پر پورا پورا عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔“

اور پھر زبیدہ نے گھر کو بدل کر رکھ دیا۔ نوکروں سے نرمی اور محبت سے گھر کے مقررہ کاموں کے علاوہ بھی دو کام زیادہ کر لیتی تھی۔ دادو دہش سے الگ نوازی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چھوٹی بیگم کے گن گانے لگے۔ بیٹے بہوؤں سے بھی نہایت محبت سے پیش آئی۔ ان کی ہر بات کا جواب ایک نرم تبسم کے ساتھ دیتی۔ بچوں پر بے تحاشا پیار لٹاتی تھی۔ ان کے

بیٹے نے نوٹوں کی ایک گڈی اُن کی طرف اچھال دی اور کہا۔ ”آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔“

وکیل صاحب نے یہ لہجہ یہ انداز اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا اور سنا تھا۔ انہیں اپنی بڑی سبکی محسوس ہوئی۔... اگر آج اکبر حسین زندہ ہوتے تو انہیں کتنا صدمہ پہنچتا۔ جی تو یہ چاہا کہ نوٹوں کی یہ گڈی ان کے منہ پر جوا بامادیں مگر ان کے بچے بھی تو تھے اُن کی اپنی ضروریات بھی تھیں۔ جبکہ یہ ظالم منافق لوگ کسی رعایت کے مستحق نہیں تھے اور یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ زبیدہ بیگم کو کچھ نہیں ملے گا۔ یہ خیال بڑا تکلیف دہ تھا۔

اور یہی ہوا کہ زبیدہ بیگم کو عدت گزارنا مشکل ہو گیا۔ اُن کے بچوں کی زندگی اور ان کا مستقبل داؤ پر لگ گیا۔ آج ان کی بہوؤں، بیٹیوں اور بیٹوں کے منہ میں زبان آگئی تھی۔ وہی زبان جو باپ کی زندگی میں کہیں گروی رکھ دی تھی اب زہرا گئے لگی تھی۔ جہاں زیب اور سبین کو اکبر حسین کے وفادار نوکروں نے سنبھال لیا تھا چھپا کر انہیں کھلاتے پلاتے تھے اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ ان کا خاص ملازم اپنی چھوٹی مالکن کے لیے باقاعدہ ان کے کمرے میں کھانا پہنچاتا تھا۔ اور زبیدہ بیگم نماز اور تلاوت میں مشغول رہتی تھیں، میکے میں کوئی نہیں تھا اُن کے۔ نانا نے اپنے پھولوں جیسی نواسی کو اکبر حسین کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ہونے کو دور پرے کے رشتے دار بھی تھے مگر کون کسی کسی کے کام آتا ہے۔ اس کو گلے لگا کر دو آنسو بہا لیے اور چلے آئے پھر خبر نہ لی۔

جس دن زبیدہ کی عدت کا آخری دن تھا سارے لوگ اس کے کمرے میں آ گئے۔ زبیدہ کا دل دھڑھڑ کرنے لگا۔ وہ خاموشی سے ایک ایک کی شکل دیکھنے لگیں۔ بڑی دہن نے زبان کھولی۔

”زبیدہ بیگم اب آپ کی بادشاہت ختم ہو گئی۔ آپ اپنے بچوں کو جہاں جی چاہے لے کر چلی جائیں، اکبر حسین کی زندگی میں جو عیش کرنا تھے کر لیں۔ اس خیال میں نہ رہنا کہ ان کی جائیداد سے آپ کو کچھ مل جائے گا۔“

وہ چپ ہو گئیں تو بڑا بیٹا بولا۔
”بس آپ یہاں سے چلی جائیں۔ یہ کمرہ خالی کر دیں۔۔۔۔۔ سوائے چند جوڑوں کے یہاں سے آپ کوئی چیز بھی نہیں لے جاسکتی۔“

زبیدہ کے چہرے پر بڑا اٹھراؤ تھا۔ اُس کی آنکھوں میں دکھ کا سمندر بلکورے لے رہا تھا۔ انہوں نے بڑے بیٹے اور بہو کی طرف دیکھ کر نہایت نرمی سے کہا۔

”آپ نے ٹھیک کہا۔ جب تخت اجڑ جائے تو اسیروں کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے جو آپ نے کیا۔ اور آپ لوگ پریشان نہ ہوں کیونکہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

سو تیلے بیٹے بہوؤں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ انہوں نے زبیدہ بیگم پر الزام لگایا تھا کہ اس نے اپنے شوہر کو زہر دے دیا ورنہ رات کو وہ ٹھیک ٹھاک سوئے تھے۔ ان کے فیملی ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور ان کے اس شبے کی تردید کر دی کہ انہیں زہر دیا گیا بلکہ ان کی موت ہارٹ اٹیک سے ہوئی ہے۔ یہ حملہ رات کو اچانک ہوا تھا جس کی کسی کو خبر نہیں۔ اس نے ان کے ڈسٹھ سرٹیفیکٹ میں یہ بات لکھ کر ان کے بیٹے کو دے دی جس پر ان کے بیٹی نے برا بھلا کہا۔ ”آپ نے غلط رپورٹ بنائی ہے، میں کسی اور ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔“ ڈاکٹر اقبال نے غصے میں کہا۔

”انور صاحب۔ آپ کسی بھی ڈاکٹر کو دکھادیں کہیں بھی زہر خورانی کا امکان نہیں ملے گا۔ وہ بھی یہی کہے گا کہ ان کی موت ہارٹ اٹیک سے ہوئی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چلے گئے مگر بیٹوں نے ڈاکٹروں کا پینل بلا کر بٹھالیا۔ سب نے بغور اکبر حسین کی لاش کا معائنہ کیا اور کچھ دیر بعد متفقہ فیصلہ دے دیا کہ انہیں دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔

حالانکہ انھوں نے چند ڈاکٹروں کو بھاری رقم دے کر اپنی مرضی کی رپورٹ تیار کرنے پر زور بھی دیا مگر انہوں نے سختی سے انکار کر دیا اور چلے گئے۔

یہ کہو کہ زبیدہ بیگم کی قسمت سازگار تھی۔ وہ قاتل بننے سے بچ گئیں۔ وہ تو یوں بھی بے بال اور پرہو گئی تھیں۔ ان کا تخت و تاج اجڑ چکا تھا۔ وہ کس سے جا کر فریاد کرتیں، کس سے انصاف مانگتیں۔۔۔۔۔ سوئم کے بعد بڑے بیٹے اپنے وکیل کو بلوا کر پوچھا۔

”ابو جان نے کوئی وصیت وغیرہ تو نہیں لکھوائی تھی۔“

”نہیں انور میاں، لکھوائی تو نہیں تھی کوئی وصیت مگر ذکر ضرور کیا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں سب بچوں کو اپنی وراثت میں حصہ دے کر جاؤں۔ تاکہ سو تیلے بہن بھائیوں کے درمیان جھگڑا نہ ہو۔ دوسری بیوی کے حق مہر میں انہوں نے پہلے ہی مکان لکھوا دیا تھا۔ بچوں کے لیے وہ اپنی جائیداد کا نصف حصہ لکھوانا چاہتے تھے باقی میں آپ لوگ کیونکہ بیٹیوں کا حق انہوں نے ادا کر دیا تھا۔ تین بیٹوں کو نصف جائیداد برابر تقسیم کرنا چاہتے تھے مگر افسوس موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ اب مرحوم بات کی خواہشات کا احترام آپ لوگوں پر واجب ہے ویسے بھی آپ بڑے ہیں اور انصاف کے تقاضے اب آپ ہی کو پورے کرنے ہیں۔“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب آپ کا کام اب ختم ہو گیا اور اس خاندان کا اب کوئی تعلق آپ سے نہیں رہا۔ ہم انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہیں یا نہیں۔ اس کی فکر آپ کو نہیں ہونی چاہیے۔ اور یہ بات آپ کسی سے نہیں کہیں گے۔۔۔۔۔ یہ لیجیے اپنی فیس۔“ بڑے

جس نے پیدا کیا ہے وہی ہمیں کھانے، سرچھپانے اور تن ڈھانپنے کو بھی دے گا.... آپ کو یہ دھن۔ دولت۔ جائداد۔ ملبوسات۔ گھر مکان سب میاں رک ہو۔ ہمارا اللہ مالک ہے۔“ صرف بڑا بیٹا اور بڑی بہو بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی باقی سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ جب کوئی نہیں بولا تو زبیدہ نے کہا۔

”بڑی بہو۔ ہم فی الحال بچوں کو لے کر رہداری میں رات گزار دیں گے۔ ایک سوٹ کیس میں اپنی۔ اپنے شوہر کی چند نشانیاں۔ یادگاریں اور بچوں کے وہ ملبوسات جو وہ مرنے سے ایک روز قبل بچوں کے لیے لائے تھے انہیں رکھنے کی اجازت دے دیجیے۔ یا پھر خود آپ اپنے ہاتھ سے رکھ دیجیے۔“

ماحول میں ایک دم سناٹا آ گیا۔ زبیدہ نے جواب کا انتظار کیے بغیر بچوں کا ہاتھ پکڑا اور رہداری میں پڑے ہوئے تخت پر جا بیٹھی۔ کچھ دیر تک آپس میں کھسک پھسک ہونے لگی جاتے وقت زبیدہ انہیں الماری اور بکس کی چابیاں دیتی گئی تھیں۔ وہ چابیاں بڑے بیٹے کے ہاتھ میں تھیں... وہ آپس میں مشورہ کر رہے تھے کہ پہلے الماری کھولی جائے یا بکس؟

دونوں بڑی بہو بیٹے ہی بکس کا جائزہ لیتے رہے۔ باقی بہو بیٹے بچے صرف خاموش بیٹھے تھے۔ شاید یہ سب کچھ ان کی مرضی کے خلاف تھا بلکہ وہ دکھ محسوس کر رہے تھے کہ بابا جان کی زندگی میں زبیدہ بیگم کو بڑی عزت اور احترام سے چھوٹی امی۔ چھوٹی امی کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا اور اب انہیں ان کا نام لے کر مخاطب کیا جا رہا تھا۔ اور نہ چہرے پر ندامت تھی نہ زبان میں لکنت۔ مگر وہ بھی مجبور تھے کہ بڑے بھائی بھادج نے پہلے ہی پلاننگ کے تحت سب کچھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ چھوٹا بیٹا اور چھوٹی بہو اکبر حسین سے بہت قریب تھے۔ اس لیے اس نے پہلی بار بھادج سے کہا۔

”بھائی، چھوٹے امی جو چیزیں کپڑے اور زیورات جہیز میں لائی تھیں وہ ابا جان نے علیحدہ بکس میں رکھوا دیے تھے۔ چنانچہ وہ چیزیں انہیں واپس کر دیجیے۔“

”اوہو۔ بڑی ہمدردی ہو رہی ہے ان سے۔ کیا لائی تھیں تمہاری چھوٹی امی؟“ وہ نخوت سے بولیں۔ ”اونہ، جہیز۔ بڑا جہیز لائی تھی وہ فقیر۔ ٹرک بھروا کر لائی تھی چیتھروں اور کباڑ کے۔ چند ہلکے پھلکے زیور جن کا وزن مشکل سے چار یا پانچ تولے سے زیادہ نہیں ہوگا۔ اسی لیے تو ابا جان نے علیحدہ بکس میں رکھوا دیے تھے۔ تاکہ کسی کی نگاہ نہ پڑے اور رونمائی میں ہیرے کے جڑاؤ کنگن میرے ساس کے اور پہنادیے۔ ابا جان نے اپنی عزت کے لیے ایسا کیا تھا۔ ورنہ وہ تو جانے کس بھوکے ننگے خاندان سے آئی تھی۔“

”ایسا تو نہ کہیں بھائی۔ چھوٹی امی نے جس تہذیب، سلیقے، شائستگی اور جس حسن سلوک

سے اس گھر کا نظام چلایا۔ ہم سب سے اپنائیت اور خلوص کا برتاؤ کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ کتنے دل اور بڑے ظرف کی خاتون ہیں اگر ان کی جگہ کوئی نچلے طبقے کی بھوکی تنگی عورت ہوتی تو گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتی اور بابا جان کی زندگی ہی میں اپنے بچوں کا حق لے کر رہتی۔ آخر وہ ابا جان کی شرعی بیوی تھیں مگر افسوس کہ آپ لوگوں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔“

”مگر بھائی جان۔“ اب کی مٹھلے بھائی نے کہا۔ ”جہاں زیب اور سین بھی تو ہمارے باپ کی اولادیں ہیں ان کے ساتھ چھوٹی امی کو بھی رکھ لیں جب پڑھ لکھ جائیں گے کسی قابل ہو جائیں گے تو الگ کر دیں گے۔“

”تم اس نزاکت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر وہ یہاں رہے تو جائداد کا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا۔ ہم اور مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ ابھی تو یہ چھوٹے ہیں کل جوان ہوں گے تو ماں کے ساتھ مل کر ہم پر چڑھ دوڑیں گے۔ چنانچہ انہیں جانے دو۔“

سب لوگ چپ ہو گئے۔ بڑے بھائی کے سامنے یوں بھی کوئی بھائی نہیں بولتا تھا اور اب تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔

دوسرے دن.... گاڑی میں ملازم نے زبیدہ بیگم کا سامان لا کر رکھ دیا۔ زبیدہ نے مزاحمت کی بولیں۔ ”میں یہاں سے کچھ نہیں لے جاؤں گی۔“ تب چھوٹے بیٹے اور بہو نے آ کر کہا۔

”چھوٹی امی، یہ وہ سوٹ کیس ہے جس میں آپ کے جہیز کے کپڑے زیورات اور کچھ گفٹ وغیرہ ہیں جسے ابا جان نے الگ رکھوا دیا تھا دوسرا سوٹ کیس بچوں کا ہے۔ جو چیزیں اور کپڑے ابا جان لائے تھے وہ ہیں۔ اس میں گھر اور بھائیوں کی لائی ہوئی کوئی چیز نہیں۔ انہیں آپ ابا جان مرحوم کی نشانی سمجھ کر قبول کر لیں۔ اور ہماری خطاؤں کو معاف کر دیں، ہم بہت مجبور تھے۔“ دونوں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

زبیدہ بیگم نے بھیکے ہوئے رخسار بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ انہیں گلے سے لگالیا۔ ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور بولیں۔

”کوئی بات نہیں بیٹا۔ کتاب زندگی کا یہ صفحہ پھاڑ کر پھینک دینا۔ اور کبھی یاد نہ رکھنا کہ تمہارے نیک دل باپ کی زندگی میں کوئی آیا تھا۔ یا شاخ سے ٹوٹے ہوئے ان پتوں۔ مسکے ہوئے پھولوں سے تمہارا کوئی رشتہ تھا۔“ انہوں نے دونوں بچوں کو سینے سے لگا کر روٹی ہوئی بہو بیٹے کی طرف دیکھا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اور زبیدہ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنسوؤں سے ان کا گریبان بھیگتا رہا۔ وہ بچوں کو سینے سے لگا کر سوچتی رہیں۔ دس سال قبل بھی یہی راستے۔ سرکیں اور گلیاں تھیں۔ یہی گاڑی اور گھر تھا۔ جہاں پھولوں

”کیسا گھر؟“ اُس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس گیا۔ اپنا گھر تو وہ بہت پیچھے کہیں چھوڑ آئی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔
یہ تو اس کا گھر نہیں تھا۔
پھر یہ کیا تھا۔

دروازے پر کریم بابا دونوں پٹ کھولے اپنی بوڑھی پندھی آنکھوں سے نانا کی لاڈلی نواسی کو بچوں کے ساتھ نیچے اُترتے دیکھ رہے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں آگے بڑھے۔ گاڑی واپس جا چکی تھی۔ دونوں سوٹ کیس ڈرائیور نے اندر جا کر رکھ دیے تھے اور سلام کر کے گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ کھڑی سوچ رہی تھی کہ بیٹی کو اپنے گھر رخصت کرتے وقت ماں باپ نصیحت کرتے ہیں کہ بیٹی اُس گھر سے تمہارا جنازہ نکلے۔ جیتے جی کبھی قدم نہ نکالنا۔ (سستیاں)۔

”مگر میں زندہ کب ہوں نانا جان۔“ وہ رو پڑی۔
”وہاں سے تو میرا زندہ لاشہ نکلا ہے۔ دکھ لیں اپنی لاڈلی کو آ کر۔ کیا آپ نے مجھے اسی طرح رخصت کیا تھا۔ کیا میں آپ کو زندہ لگتی ہوں؟“ وہ دروازہ پکڑ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

”امی مت روئیں۔“ جہاں زیب نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سین ماں کا آنچل پکڑے باہر کی طرف کھینچ رہی تھی..... ”امی گھر چلیں۔“
پھر کریم بابا آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

”بیٹی، اندر چلو۔ مجھے سب پتا چل گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تمہاری آخری منزل یہی ہے۔ آؤ شاباش۔“ کریم بابا زبیدہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر آئے تو دونوں بچے بھی ساتھ آ گئے۔ وہ کچا پکا دو کمروں کا ایک چھوٹا سا گھر تھا مگر کھلا ہوا صاف ستھرا۔ زبیدہ کا کمرہ اسی طرح تھا۔ پلنگ بستر۔ الماری۔ چھوٹی سی میز کے ارد گرد دو کرسیاں۔ میز پر اُسی کی کتابیں، قلمدان..... نانا نواسی کی ایک تصویر فریم میں جڑی میز پر رکھی تھی۔ وہ تصویر اس کی زمانہ طالب علمی کی تھی۔ کتابیں لیے نانا کے پہلو میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ گلاب کا ایک نوشگفتہ بھول۔

”آہ.....“ اُس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آہ نکل گئی۔ دونوں بچے اس کے ساتھ ساتھ کمرے کے اندر گئے۔ پھر کمرے کے باہر آ گئے پھر وہ نانا مرحوم کے کمرے کی طرف پڑھے۔ نانا کا کمرہ کریم بابا کے تصرف میں تھا۔ مگر ان کی چیزیں اسی طرح رکھی ہوئی تھیں۔ ان کا حقہ انکی چھڑی، ٹوپی، ان کی شیروانی، ان کی جوتیاں، ان کی کتابیں.... ان کا

ہاروں سے لدی پھندی ایک سچی بنی معصوم حسین دلہن اُتری تھی، کسی کے مضبوط بازوؤں کے سہارے۔ پھر بہت سے خوبصورت نازک بازو آگے بڑھے تھے جن میں ٹھنکتی ہوئی چوڑیوں، کنکٹوں نے جملہ عروسی میں ملے جلے تہقبوں کے ساتھ طریہ موسیقی کا سحر پھونک دیا تھا۔ ان اُجلے اُجلے بازوؤں نے اسے پھولوں اور ادھ کھلی کلیوں کی مہکتی ہوئی بیج پر بٹھا دیا تھا۔ مہارکبادیوں اور تہقبوں کے مدھم مدھم شور میں اس کی سماعت سے چند رس میں بھیکے الفاظ بھی ٹکرائے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

”دلہن کتنی کم عمر اور حسین ہے۔ اکبر حسین کے منہ پر بالکل نہیں جیتی۔“
”اے چھوڑو بھی۔ مردوں کی عمر کا کیا ہے، دو چار بچے ہو جائیں گے تو ہماری جیسی لگنے لگے گی۔“ بات تو تم نے ٹھیک کہی۔ (قہقہہ) مگر اکبر حسین کو بیوی بہت خوبصورت ملی ہے اتنی حسین تو ان کی بیوی بھی نہیں تھی۔

”اری پُچ کر۔ کہیں کوئی سن نہ لے۔ ویسے جوڑا اب بھی بُرا نہیں۔ قد کا ٹھ میں دونوں برابر ہوں گے۔ پھر اکبر حسین یوں بھی قدر دانوں میں سے ہیں۔“
”ہاں سنا ہے، پہلی بیوی کو بھی اکبر حسین بہت چاہتے تھے۔ حالانکہ سب کہتے ہیں کہ مرحومہ بڑی تیز مزاج کی تھیں، اکبر حسین کو انگلیوں پر نچائی تھیں مگر یہ بے چارے سدا کے ہی سیدھے سادے تھے۔ اسی لیے گزارہ بھی ہو گیا۔“

”مگر یہ تو مجھے اللہ میاں کی گائے نظر آتی ہے۔ میاں تو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔“
”خیر چھوڑو۔ چلو زونمائی ہونے والی ہے۔“ پھر وہ سب اٹھ کر چلی گئیں

اُس نے اپنے آنسو پونچھے نانا ابا (جنت مکانی) کا علاقہ آنے والا تھا۔ اس کے سامنے پھر چمچاتی دلہن آ گئی۔ معلوم نہیں زونمائی میں کیا کیا ملا تھا۔ مگر اصل زونمائی دولہا کی تھی۔ اس پیاری سی دلہن کو اُنھوں نے ہیرے کے جواؤ کنکٹن پہنائے تھے۔ کنکٹن ج رے تھے اُس کی گوری گوری۔ بھری بھری کلائیوں میں وہ کنکٹن۔ کتنی دیر وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑے کنکٹوں کی قسمت پر رشک کرتے رہے تھے۔ زبیدہ بیگم پللیں جھکائے اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھالتی رہی تھیں۔ آخر میں انہوں نے دونوں مہندی اور چوڑیاں انگوٹھیوں بھرے ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیے اور اُس کے پورے وجود میں سنسنی سی پھیل گئی۔ اور وہ چھوٹی موٹی کی طرح سمٹ گئی۔

”بیگم صاحب گھر آ گیا۔“ ڈرائیور کی آواز پر وہ چونک پڑی۔
”کون سا گھر؟“
”کس کا گھر؟“

چشمہ۔ اُن کا تخت۔ بستر۔ وہ ایک ایک چیز سے لپٹ لپٹ کر روتی رہی اور بچوں کو اپنے مہربان نانا کے متعلق بتاتی رہی۔

کریم بابا کمرے میں ضرور سوتے تھے، مگر نانا کی کوئی چیز استعمال نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ایک طرف اپنا کھٹولا ڈالا ہوا تھا۔ اسی پر بستر لگا لیا تھا، وہیں سوتے تھے۔ باقی وقت اُن کا صفائی ستھرائی میں گزارتا تھا یا پھر صحن میں لگے درختوں، پھولوں پودوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ نانا کا وہ گھر اور وہاں کی چیزیں ایک میوزیم کی حیثیت رکھتی تھیں جس کی کریم بابا بڑی عقیدت اور محبت سے دیکھ بھال کرتے تھے۔

کریم الدین نانا کے ملنے والوں میں تھے۔ وہ بھی دنیا کے ستائے ہوئے ایک تہا انسان تھے جن کے اکلوتے بیٹے اور بہو نے انہیں گھر سے نکال دیا تھا اور نانا انہیں اپنے پاس لے آئے تھے۔ پڑھے لکھے تھے نہیں، مزدوری کرتے تھے۔ اور اب بڑھاپے میں انہیں مزدوری بھی کوئی نہیں دیتا تھا۔ اور ان کے سب ساتھی ہوتے ہیں۔ اولاد بھی آجکل کسی کی ہوئی ہے۔ بوڑھے باپ کی ایک روٹی انہیں گراں گزرنے لگی تو بیٹے نے انہیں دھکا دے دیا۔ کریم بابا کی حیثیت نوکروں جیسی تھی۔ وہ گھر کا سارا کام کرتے تھے۔ سودا سلف لاتے تھے اور کھانا بھی خود ہی پکاتے تھے۔ پھر ساتھ میں بیٹھ کر کھاتے تھے۔ کریم بابا ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ نانا بھی ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ انہوں نے کہا۔

”یار کریمے، ہم دو آدمی ہیں، مل جل کر کام کر لیا کریں گے،“ مگر کریم بابا نے کہا۔ ”نہیں رحمن صاحب۔ اس بڑھاپے میں تو آپ ہمیں ملے ہیں، کچھ خدمت کر لینے دیں۔ میری عاقبت سنور جائے گی اور زندگی کی بقیہ سائیس سکون سے گزاروں گا۔“

نانا مسکرا دیے۔ زبیدہ کی شادی کے بعد نانا تنہا رہ گئے تھے۔ ایسے میں کریم بابا کا وجود ان کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے تھے۔ اب وہ اس گھر میں نوکر نہیں نانا کے دوست بن گئے تھے۔

شادی کے بعد بہت کم زبیدہ میکے آئی تھی۔ کریم بابا زبیدہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ اب نانا نہیں رہے تھے اور کریم بابا نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ زبیدہ بھی ان کی اسی طرح عزت کرتی تھی، ان کا خیال رکھتی تھی۔ دونوں بچے ان سے مانوس ہو گئے تھے۔ کریم بابا ان کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتے تھے۔ ہنستے اور شور مچاتے تھے۔ تنہا گھر میں کریم بابا کا وجود بڑا غنیمت تھا۔ جہاں زیب وہاں سے آیا تھا تو چھٹی کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ نو سال کا بچہ خاصا باشعور اور سمجھ دار ہوتا ہے مگر وہ اور بچوں سے زیادہ ذہین اور حساس تھا۔

وہ سب کچھ سمجھتا تھا۔ ان رشتوں کو بھی جانتا تھا۔ اور دولت کی طمع میں انہیں توڑ کر ان سے منہ موڑنے والے ان نام نہاد بھائی بہنوں کو بھی جانتا تھا۔ اس نے باپ کے مرجانے پر ماں کو بے دخل ہوتے بھی دیکھا تھا۔ اور اپنے اوپر محبتوں کے دروازے بھی بند ہوتے دیکھے تھے۔ اس کا ننھا سادل سسک پڑا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جب اس نے اپنی بیٹی کو جھل پلکوں سے اپنے بھائیوں کی طرف دیکھا تو انہوں نے منہ پھیر لیے۔ ان کی بیویاں کام کا بہانہ کر کے اٹھ گئیں۔ تب اس نے آسمان کی طرف دیکھا کہ شاید اوپر سے کوئی نیبی اشارہ ہو جائے اور وہ لوگ در بدر ہونے سے بچ جائیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ زبیدہ بیگم نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور چھوٹے بھتیانے اُسے کھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”بیٹا، میں بہت مجبور ہوں۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ تمہارے لیے کچھ نہ کر سکا، تم بہت سے کام لینا۔ اب تم ہی اس ٹوٹی پھوٹی کشتی کے ناخدا ہو۔“ وہ آنسو جو اس کی پلکوں کے نیچے جمع ہو گئے تھے، اس نے چھوٹے بھتیانے کے دامن میں ڈال دیے اور آستین سے آنسو پوچھتا ہوا جا کر ماں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

”میں نے جب اس عالم رنگ و بو میں آنکھ کھولی تو ایک شاندار بڑی سی کوٹھی کا باغ و بہار ماحول تھا۔ آگے پیچھے نوکروں کی فوج ظفر موج تھی۔ دنیا کی آسائشیں تھیں۔ پھر جب بڑا ہوا تو بابا نے مجھے زمری میں داخل کر دیا۔ اس وقت میں تین سال کا تھا لیکن میرا ذہن بڑوں کی طرح سوچتا تھا۔ میرے جیسے۔ مجھ سے چھوٹے۔ مجھ سے بڑے بہت سے بچے تھے وہاں۔ خوبصورت شفاف یونی فارم میں ملبوس، اُجلے اُجلے چہروں کی مسیں تھیں۔ پہلے مجھے کھلونوں کے ذریعے پڑھایا گیا۔ ان کی شناخت کرائی گئی۔ یہ کتا ہے۔ یہ بلی ہے۔ یہ شیر ہے۔ یہ ہوائی جہاز اور یہ ریل ہے۔ اس کے بعد الفاظ میں بتایا گیا۔ مجھے سب یاد ہو جاتا تھا۔ جب دوسرے دن وہی سبق مجھ سے پوچھا جاتا تو میں فر فر سنا دیتا تھا۔ مِس حنا بہت خوش ہوتی تھیں اور انعام کے طور پر مجھے بل گم اور ٹافیاں ملتی تھیں پھر میں نے زمری پاس کر لی اور کے جی ون پھر ٹو اور تھرڈ میں آ گیا۔ بہت سی پوسٹریاں مجھے از بر تھیں۔ شام کو جب بابا آتے تو امی کے سامنے بڑے ایکشن سے وہ پوسٹریاں سناتا تھا۔ امی بابا مجھے گلے سے لگا لیتے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ گھر میں میرے بھائیوں کے بچے بھی تھے۔ شاید ان کی امی نے منع کیا ہو۔ مگر میری امی نے بھی ان سے بولنے اور کھیلنے کے لیے منع نہیں کیا۔ میں ہمیشہ ان سے ہنستا بولتا تھا۔ اور پھر کمرے میں آ کر کتابوں سے

چھیڑ چھاڑ کرتا۔ ان سے گپ شپ لگاتا تھا۔ یہی کتابیں اصل میں میری پر خلوص دوست تھیں۔ میری بہن بین ابھی چھوٹی تھی مگر وہ اکثر میری کتابیں پھاڑ دیتی تھی۔ کبھی امی مجھے دوسری کتاب لا کر دے دیتی تھیں تاکہ میری پڑھائی کا نقصان نہ ہو اور جب امی اپنے نانا کے خالی گھر میں آ گئیں اور مجھے بغیر قالین کے کمرے، بغیر فوم کے بستر پر سونا پڑا تو عجیب سا لگا۔ بدن چھلنے لگا اور میں گہرا کراٹھ بیٹھا.... مجھے ایسا لگا کہ شاید خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ مجھے امی دوبارہ لٹا کر میرا سر سہلانے لگیں۔ میری پوری کھلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر وہ دوبارہ بولیں۔

”کیا بات ہے بیٹا؟“

شاید جان بوجھ کر انہوں نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔ میں پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”امی مجھے میرا کمرہ میرا بستر چاہیے۔“ میں نے سپاٹ چہرے خالی خالی آنکھوں سے ان کو دیکھ کر کہا۔

”بیٹا۔ اب تمہارا کمرہ۔ تمہارا بستر یہی ہے۔ سو جاؤ میرے لال۔“ امی رو پڑی تھیں۔

”مگر کیوں امی؟“ میں جانے کیوں ضدی لہجے میں بولا۔

”بیٹا۔ زندگی کیسا بے سرنہیں ہوتی۔ تمہارے بابا جان کی زندگی تک وہ سب کچھ۔ کمرہ بستر بے شک تمہارا تھا مگر اب وہ تمہارا نہیں رہا جو چیز اپنی ہوتی ہے، وہ اپنے پاس ہوتی ہے۔“ امی نے مجھے بہلانے کی کوشش کی۔

”امی یہاں تو کھانے کی میز بھی نہیں۔ ویسا فرنیچر، ویسے برتن بھی نہیں۔ نوکر لوگ بھی نہیں، امی ویسا اچھا کھانا بھی نہیں ہوتا۔ یہاں اسکول کی گاڑی بھی نہیں آتی.... ہمارے بابا تو بہت امیر آدمی تھے۔ ان کے مرتے ہی ہم اتنے غریب کیوں ہو گئے امی؟“

میں طرح طرح کے سوال کر کے انہیں پریشان کر دیا کرتا تھا۔ وہ رونے لگتی تھیں۔ اُن کے پاس میری کسی بات کا جواب نہیں ہوتا تھا۔ پھر امی نے مجھے اسی علاقے کے ایک سینڈری اسکول میں داخل کر دیا۔ وہ اسکول سرکاری تھا۔ وہاں کا ماحول انتہائی گنجلک اور گندا تھا۔ ایک ایک کلاس میں پچاس پچاس لڑکے پڑھتے تھے۔ اسکول بھی کوئی بڑا نہ تھا۔ نہ ڈیسک، نہ کرسیاں۔ اس اسکول کی حالت میرے جیسے یتیموں، غریبوں اور لاوارثوں جیسی تھی۔ جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ بہر حال اور بچوں کی طرح میں بھی وہاں پڑھنے لگا۔ اب میں ذہنی طور پر بڑا ہو گیا تھا۔ چھوٹے بھتیجا کی وہ بات اب بھی میرے ذہن میں محفوظ تھی کہ بیٹا اپنے میں ہمت پیدا کرو اب تم ہی اس ٹوٹی پھوٹی کشتی کے ناخدا ہو۔ میں نے سوچا اگر میں تعلیم حاصل نہیں کروں گا تو پھر میرا مستقبل کیا ہوگا۔ میں معاشی جدوجہد

میں کس طرح آگے بڑھوں گا۔ آخر میرے سامنے میری ماں تھی۔ ایک چھوٹی بہن تھی۔ ان کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ ایک اچھی زندگی اور بہتر مستقبل کے لیے تعلیم کتنی ضروری تھی اس کا مجھے اور اک ہو گیا تھا۔ اس لیے میں محنت اور مستعدی سے پڑھنے لگا۔ ہر چند کہ وہ گورنمنٹ اسکول تھا، فیس زیادہ نہیں تھی مگر پھر بھی کتابوں اور کاپیوں اور یونی فارم کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی جبکہ امی کے پاس کچھ نہیں تھا۔ آخر انہوں نے اپنے جہیز کی چار ہلکی چھلکی چوڑیاں کریم بابا سے بکوا دیں اور ان سے جو رقم لی اس سے گھر میں راشن بھر والیا اور باقی میری کتابیں کاپیاں اور یونی فارم میں خرچ کر دی۔

تھوڑے بہت پیسے بچے تھے۔ کریم بابا کبھی کبھی منڈی چلے جاتے تھے۔ کچھ مزدوری مل جاتی تھی اس سے وہ گزارہ کرتے تھے۔ اب امی نے انہیں منع کر دیا تھا کہیں جانے کو کیونکہ وہ تنہا تھیں۔ میں بھی اسکول چلا جاتا تھا۔ سین چھوٹی تھی اس لیے اسکول نہیں بھیجا امی نے۔ انہیں خوف تھا کہیں کوئی پکڑ کر نہ لے جائے۔ انہوں نے سین کو گھر میں پڑھایا۔ اس طرح کئی مہینے سکون سے گزر گئے۔ پھر حالات بگڑنے لگے۔ راشن ختم ہونے لگا اور ستم یہ ہوا کہ کریم بابا بیمار ہو گئے۔ پھر ایک رات وہ بھی ہمیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ امی کے پاس جو کچھ تھا ان کی تدفین پر خرچ کر دیا اور ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گئیں۔ اس کے بعد فاقوں کی نوبت آ گئی۔ امی کا سارا زور یتیمی اشیاء بک چکی تھیں۔ انسانی ضروریات میں سرفہرست پیٹ کی آگ ہوتی ہے جو اگر نہ بجھے تو انسان کو پاگل کر دیتی ہے اگر پاگل نہیں کرتی تو مار دیتی ہے۔

ہمارے گھر اکثر بیگم رقیہ اعجاز آتی تھیں۔ اُن کے سر نانا کے دوست تھے۔ بڑی اچھی شطرنج کھیلتے تھے اور امی کے نانا شطرنج کے باہر کھلاڑی تھے۔ تب سے ہی ان کی دوستی ہو گئی۔ اس طرح دونوں کا وقت بہت اچھا گزر جاتا تھا.... عجیب بات یہ تھی کہ امی جان کے نانا اور اعجاز صاحب کے والد پندرہ دن کے وقفے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لوگ کہتے تھے کہ چونکہ دونوں کو شطرنج نے اتنا قریب کر دیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی دوری برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے اس لیے ایک کے پیچھے دوسرا بھی محفل سے اٹھ کر چلا گیا۔ تب سے بیگم رقیہ اعجاز کبھی کبھی امی سے ملنے آ جاتی تھیں مگر وہ بہت لیے دیے رہنے والی اور عطاء قسم کی خاتون تھیں۔ امی نے ہمیشہ اپنے اور ان کے درمیان فاصلہ رکھا تھا۔ اس لیے رقیہ گفتگو اور چائے پان کے آگے بات نہیں بڑھی تھی۔ ویسے بھی ہمارے حالات ایسے نہ تھے کہ امی ان سے بے تکلف ہونے کا رسک لیتیں۔ انہوں نے کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہمارے گھر چولہا نہیں جلاتا تھا۔ نہ کبھی اپنی کم مائیسی کا رونارویا۔ یا کبھی کسی کوشبہ نہ ہونے

میرے پیٹ میں بھی اٹھن ہونے لگی۔ اور خالی پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ تب میری آنکھوں میں یہ سوچ کر آنسو آ گئے کہ جب میرا یہ حال ہے تو اس معصوم بچی کا کیا حال ہوگا؟

میں ابھی اپنے محلے سے نکلا تھا کہ میں نے سامنے مسجد میں دو تین لڑکیوں کو کھانا لے جاتے دیکھا۔ شام کا وقت تھا، مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ میں ایک جگہ کونے میں کھڑا ہو گیا۔ جب وہ لڑکیاں واپس ہوئیں اور دور نکل گئیں تب میں دھڑکتے دل کے ساتھ اندر چلا گیا۔ وہاں ایک بارش بزرگ ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھے تھے۔ وہ مسجد میں اذان دیتے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
”السلام علیکم بزرگوار“

”علیکم السلام بیٹا۔ کیا بات ہے؟“ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تب میری ہمت بندھی میں نے کہا۔
”محترم بزرگ۔ کیا یہاں غریبوں کے لیے کھانا ملتا ہے؟“ بڑی آہستگی سے کہا کہ کوئی سن نہ لے۔

انہوں نے نیچے سے اوپر تک مجھے دیکھا اور بولے۔
”برخوردار یہ لنگر خانہ نہیں، خدا کا گھر ہے۔ اکثر مسافر یہاں آ کر رات بسر کر لیتے ہیں اور خدا کی عبادت کرتے ہیں تو محلے والے اُن کے لیے کھانا بھیج دیتے ہیں۔ مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو، کون ہو تم؟“

”جناب“ میں ایک غریب لڑکا ہوں۔ میرا کوئی سرپرست نہیں، ایک بیمار ماں اور چھوٹی بہن ہے۔ کئی دن فاقے سے گزر جاتے ہیں۔ چھوٹا لڑکا سمجھ کر مجھے کوئی نوکری نہیں دیتا۔ میں سرکاری اسکول میں ساتویں جماعت میں پڑھ رہا ہوں۔ اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ شاید یہاں سے روٹی کا کوئی انتظام ہو جائے۔ میں نے جھجکا لیا۔ میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ کچھ توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔
”تم کہاں رہتے ہو؟“

”ادھر ایک گلی چھوڑ کر دوسری گلی میں میرا گھر ہے۔“
”ٹھیک ہے بیٹا۔ میں تمہاری اتنی مدد کر سکتا ہوں کہ جو کھانا مسافروں سے بچ جائے وہ تمہیں دے سکتا ہوں۔ اور بیٹا تم پر نماز فرض ہے، شام کو مغرب کی جماعت میں شریک بنایا کرو۔ اللہ تمہاری پریشانی دور کر دے گا۔“
”ٹھیک ہے بزرگوار، میں آجایا کروں گا۔“

دیا کہ بچے بھوکے ہیں۔ میں تو خیر سمجھ دار تھا، بھوک برداشت کر سکتا تھا مگر سین چھوٹی تھی لیکن وہ بھی کبھی کسی کے سامنے نہیں کہتی تھی کہ میں بھوکی ہوں یا امی مجھے روٹی دو۔ بڑا صابروشا کر بچی تھی۔ البتہ جب اسے بھوک زیادہ ستاتی تو امی سے ضد کرنے لگتی کہ اگر جلدی سے روٹی پکا دو۔ اور امی اسے اپنے زانو پر لٹا کر آہستہ آہستہ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتیں، اور وہ سو جاتی۔ ایک دن نے بہت تنگ کیا۔ تھوڑی سی روٹی تھی، امی نے اسے کھلا دی مگر دوسرے وقت اس نے خوب رونا شروع کر دیا کہ مجھے اور روٹی دو۔ مجھے اور روٹی دو۔ امی نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا آنسو پونچھے اور مسکرا کر بولیں۔
”تم تو بہت سمجھ دار اور پیاری بیٹی ہو نا؟“ امی نے پوچھا۔
”جی امی، کیا آپ مجھے سمجھ دار اور پیاری بیٹی نہیں سمجھتیں۔“ اس نے ہنس کر کہا اور روز دھونا بھول گئی۔

”سمجھتی ہوں۔ تب ہی تو پوچھ رہی ہو۔“ انہوں نے پھر اسے اپنے زانوں پر لٹالیا اور بولیں۔
”تم نے روٹی کے لیے کہا کہ جلدی سے پکا دوں، تو بیٹے۔ گندم کے دانے تو ابھی کھیت ہی میں پڑے ہیں۔“

”مگر امی کیوں، وہ کھیت میں کیوں پڑے ہیں؟“ اس نے دلچسپی سے کہا۔
”ابھی ٹرک جو نہیں آیا۔ پھر وہ بوریوں میں بھر کر دوکان پر جائیں گے اور دوکان سے آنا پینے والی چکی پر گندم کے دانوں سے آٹا نکلے گا پھر وہ آٹا پنساری کی دوکان پر آئے گا۔ اور وہاں سے تمہارے جہاں زیب بھیتا لائیں گے۔ تب ہم اپنی بیٹیا کے لیے گرم گرم روٹی اور آلو کی بھیجا پکائیں گے پھر سب مل کر کھائیں گے۔“ امی کی بات پوری بھی نہ ہوئی کہ وہ سو جاتی۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ہم پر کئی کئی فاقے گزر جاتے اور آس پاس والوں کو خبر نہ ہو پانی کہ آج بیمار پڑوسی بھوکا سو گیا ہے۔ میں تو خیر سمجھ دار بھی تھا اور حالات نے مجھے اتنی قوت دے دی تھی کہ میں بھوک اور پیاس برداشت کر سکتا تھا۔ امی بھی اگر شاید پورے ہفتے بھی بھوکی رہتیں تو اُف نہ کرتیں۔ مگر سب سے زیادہ خراب حالت سین کی تھی۔ چار پانچ سال کی بچی جس کے کھیلنے کودنے اور دودھ پینے کے دن تھے روٹی کے ایک لفٹے کو ترس رہی تھی اور میں بے بس تھا۔ میرا اس دنیا میں اُن دونوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ میں انہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔

ایک دن میں اس نیت سے باہر نکلا کہ کچھ ہوا اگر مجھے کسی کے آگے ہاتھ بھی پھیلا نا پڑا تو اپنی معصوم بہن کے لیے پھیلاؤں گا مگر خالی ہاتھ گھر نہیں جاؤں گا۔ روٹی کا خیال آیا تو

ہو گئی۔ کئی دن ہو گئے تھے روٹی کا کوئی ٹکڑا میسر نہیں آیا تھا۔ اب وہ بالکل نہیں روتی تھی۔ خدا نے اسے اتنا صبر اور حوصلہ دے دیا تھا کہ وہ ہمارے چہروں، ہماری نظروں کو پڑھ کر چپ ہو جاتی تھی۔ ہم کسی ڈاکٹر سے بخاری دوا بھی نہیں لاسکتے تھے۔ ایک قطرہ دودھ بھی اس کے حلق میں نہیں ٹپکا سکتے تھے گھر کی تمام چیزیں بک گئی تھیں۔ اب کوئی چیز بکنے کے لیے نہیں رہ گئی تھی۔ جیب بھی ہمارے پیٹ کی طرح خالی تھی۔ کسی کو ہماری خبر بھی کیسے ہوئی۔ امی نے کوئی راہ و رسم بھی نہ رکھی تھی کہ کہیں نانا مرحوم کا بھرم نہ ٹوٹ جائے۔ وہ بڑی عزت والے تھے۔ غریبی میں بھی رئیسوں کی سی آن بان کے ساتھ رہتے تھے اور ان کی جو پنشن آتی تھی اُسی میں گزارہ کرتے تھے۔

پانی پی پی کر ہم نے اپنی آنٹوں کو سوکھنے نہیں دیا تھا۔ مگر خالی پیٹ میں آنٹوں کی بے چین کروٹیں ان کا گھومنا پورے وجود کو توڑنے لگتا تھا۔ خدا کسی کو بھی بھوک کی مار نہ دے۔ دنیا میں اس عذاب سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔

پیٹ کی اس دوزخ سے بڑھ کر کوئی دوزخ نہیں جو گنہگاروں کی طرح کبھی بھرتی ہی نہیں تھی۔ میرا دل پڑھائی سے اُچاٹ ہو گیا۔ سب سے زیادہ فکر مجھے سین کی تھی۔ فاقوں سے اس کا چہرہ کھلا گیا تھا۔ رنگ سنولا گیا تھا اور آنکھیں پانی کا بلبہ بن گئی تھیں۔ بولنے کا یارا بھی نہ رہا تھا۔ امی الگ آنکھیں بند کیے پڑی رہتی تھیں گویا موت کا انتظار کر رہی تھیں کہ کب آئے اور وہ دونوں اس بندھن سے آزاد ہو جائیں۔ اس دلخراش منظر کو دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

ایک دن میں پھر صبح صبح روٹی کی تلاش میں گھر سے نکلا۔ میں نے دیکھا۔ کچرا گھر کی بائیں طرف والی کھڑکی کھلی اور کسی نے اخبار میں لپٹا ہوا ایک بنڈل نیچے اچھا ل دیا۔ کھڑکی بند ہو گئی۔ میں نے غور سے اس بنڈل کو دیکھا۔ پھر قریب جا کر میں نے ادھر ادھر دیکھا اور وہ بنڈل اٹھالیا۔ پھر تیزی سے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ گھر میں داخل ہو کر کچھ دیر تک کھڑا اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ اور سوچ سوچ کر گھبراتا رہا کہ کہیں کنسی نے دیکھ نہ لیا ہو مگر بھوک اور ضرورت ان سوچوں پر غالب آ گئی۔ میں بچھے بچھے دل سے کچن میں چلا گیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے بنڈل کھول کر دیکھا اس میں باسی روٹیاں، پراٹھوں کے ٹکڑے اور کچھ ڈبل روٹی کے سوکھے پیس اور آلو کے قتلے تھے۔ میں نے انہیں سونگھا مگر وہ ٹھیک تھے۔ روٹیاں باسی تھیں مگر پراٹھوں کے ٹکڑے تازے اور نرم تھے اور آلو کی ترکاری بھی تازہ معلوم ہو رہی تھی۔ بڑے گھروں کے نوکر بھی اتنے آسودہ ہوتے ہیں کہ وہ روٹی، پراٹھوں اور ڈبل روٹی کے بچے کچھے ٹکڑوں کو کچرا گھر میں بلی کتوں کو ڈال دیتے ہیں جو کئی

پھر انہوں نے ایک تھیلی میں سالن اور اخبار میں روٹیاں لپیٹ کر مجھے دے دیں۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے وہ چیزیں تھام لیں۔ ایسا کرنے سے میرے اندر چیخیں بلند ہونے لگیں۔ جس کے باپ کے آستانے سے بھوکے آسودہ اور پیاسے سیراب ہوتے ہوں جس کی دسترخوان پر چار پانچ مہمان روز کھانا کھاتے ہوں اس کی اولاد آج بے سروسامانی کی حالت میں محتاجی کے کھانے پر گزارہ کرے۔ امی نے کھانا دیکھ کر پوچھا۔

”بیٹا کہاں سے لائے ہو؟“
میں نے پتی اور شرمسار نظروں سے مختصر جواب دیا۔
”مسجد سے۔“

پھر انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ اس دن کئی دنوں بعد ہم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ پھر میں مولوی صاحب کی ہدایت پر روز مغرب اور عشا کی نماز میں شریک ہونے لگا۔ فی الحال روٹی کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔ جو روٹی بچ جاتی تھی وہ صبح ناشتے میں کام آ جاتی تھی۔ او سارا دن ہم لوگ بغیر کھائے ہوئے گزار دیتے تھے۔ یہ بھی آسرا بہت تھا۔ میں جبر اسکول میں پڑھ رہا تھا کریم بابا کی کوششوں سے نہ صرف میری فیس معاف ہو گئی تھی بلکہ مجھے کتابیں اور کاپیاں بھی اسکول سے مل جاتی تھیں۔ کریم بابا نے مجھے اپنا پوتا بتایا تھا ویسے بھی میرا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ کریم بابا جاتے جاتے میٹرک تک میری تعلیم مفت انتظام کر گئے تھے میں نے اس سہولت سے پورا فائدہ اٹھائے ہوئے کافی محنت ا تھی اور بجلی کی ایک دوکان پر وائرنگ بھی سیکھنے جاتا تھا۔ میں انہیں دو گھنٹے دیتا تھا۔ وہ آ کا کوئی معاوضہ نہیں دیتے تھے۔ میں تو کام سیکھنا چاہتا تھا اپنی زندگی اور بہتر مستقبل خاطر۔

پھر یہ ہوا کہ مولوی صاحب کا تبادلہ کسی اور مسجد میں ہو گیا، ان کی جگہ کوئی دوسرا آ لیکن سابقہ امام کی طرح وہ درد مند اور رحم دل نہیں تھے۔ انہوں نے مجھے مسجد سے یہ کہہ نکال دیا کہ جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے یہ اللہ کا گھر ہے کوئی محتاج خانہ نہیں۔ اس رات سجدے میں گر کر میں بہت رویا۔ اللہ پاک سے فریاد کرتا رہا کہ ”میں تیرے گھر آیا تھا، اپنا خالی دامن پھیلانے اور تو نے اپنے کرم سے میرا دامن بھر دیا۔“ تیرے بندوں کو یہ منظور نہیں۔ اب آگے بھی تو ہی ہماری دشگیری فرما میرے مولا۔“ مگر شاید آزمائش کی گھڑیاں ابھی باقی تھیں، میری عزت نفس مجھے دوسروں کے آ ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ میں نے امی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ انہا نے اپنے ہونٹ سی لیے۔ ان کی ویران آنکھوں میں آنسو منجمد ہو گئے تھے۔ سین

بھوکے انسانوں کے پیٹ کی آگ بجھا سکتے ہیں۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور چنگیر اٹھا کر اس میں روٹیاں رکھیں۔ آلو کی ترکاری پلیٹ میں۔ ڈبل روٹی کے پیس اور پراٹھوں کے ٹکڑے ایک پلیٹ میں رکھے اور وہ سب چیزیں میں نے کئی وقت کی بھوکی ماں اور بہن کے سامنے لے جا کر رکھ دیں۔ اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اب تو ماں مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھتی تھی کہ بیٹا یہ تم کہاں سے لائے؟

شاید گزرتے وقت کی اذیتوں نے اسے یہ احساس دلادیا تھا کہ میرے بیٹے کو قدرت نے اسی طرح رزق کا وسیلہ بنا دیا ہے پھر یہ آسودہ حال خاندان کئی دن تک فاقوں کی اذیت سے دور رہا۔ میں بڑی مجبوری سے ادھر کا رخ کرتا تھا۔ کچرا گھر میں بہت کم ایسی چیزیں ملتی تھیں جو دل قبول کر سکے۔ ورنہ تو ادھر دیکھتے ہوئے بھی کراہت ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھر وہی فاقہ مستی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک دن میں نے دوکان کے مالک سے کچھ قرض مانگا۔ اس نے مجھے خونخوار نگاہوں سے دیکھا۔ میں ڈر گیا۔ وہ دباڑ کر بولا۔

”ابھی تو نے سیکھا کیا ہے جو پیسے مانگ رہا ہے۔ صرف تار جوڑنے اور سوچ لگانے سے تو کارگر بن گیا۔ میں نے غریب سمجھ کر رکھ لیا تھا کہ آوارگی سے بچ جائے گا۔ پہلے کچھ کام کر کے دکھا پھر مانگنا پیسے۔“ اس نے مجھے بری طرح جھڑک دیا اور میں آنسو پیتا ہوا وہاں چپے چلا آیا اور سوچنے لگا کہ وہ..... پیشہ ور بھکاری ہم سے اچھے ہیں جو جھوٹ بول کر مکاری سے لو لے لٹکڑے اور اندھے بن کر لوگوں کی جیبوں پر ڈاکا ڈالتے ہیں۔ اور لوگ خوشی خوشی اپنی جیب خالی کر کے سمجھتے ہیں کہ انہوں نے جنت میں اپنے لیے ایک قطعہ پلاٹ لکھوایا ہے۔ اور اس کی قطبیں وقتاً فوقتاً غریبوں کو بھکاریوں کو دان کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح عزت والے شریف مگر غریب لاوارث اور یتیم بچوں، بیوہ عورتوں کا حق مارا جاتا ہے۔ وہ غیرت کے مارے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے۔ اور بسک کر میری طرح گناہی کی موت مر جاتے ہیں۔

ایک دن میں گھر میں آیا تو ماں پر ات میں آنے کی جھنجھی ہوئی بھوسی لیے چن رہی تھیں۔ میں کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا چیز ہے اور کس کام آئے گی... میں نے اسے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

”امی اس کا کیا کریں گی؟“

”بیٹا۔ میں نے بھوسی ٹکڑے والے سے کچھ پرانی کتابیں دے کر لی ہے۔ یہ بڑی طاقتور ہوتی ہے۔ تھوڑی سی چینی پڑی تھی۔ میں نے سوچا اس کا نشاستہ بنالوں گی بڑے مزے کا ہوتا ہے۔“

میں چپ ہو گیا۔ حالات کی سنگینی اور بھوک کی اذیت کس کس طرح انسان کو سراپوں کے صحرا میں بھٹکانی ہے۔ اور فریب نظر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ماں نے شام کو بغیر گھی اور کم چینی کا نشاستہ تیار کیا۔ اور تین پیالیوں میں نکال کر سامنے رکھ دیا۔ اور ہم تینوں بچے سے مزے لے لے کر پیتے رہے جیسے بھی ہم لوگ کوئی میں بڑی سی میز کے گرد بیٹھ کر چکن سوپ پیا کرتے تھے۔

سنا تھا کہ بھوک میں سوکھے ٹکڑے بھی شیرمال کی طرح لذیذ معلوم ہوتے ہیں۔ سو اس وقت وہ کم چینی اور بغیر گھی کا گرم گرم سناستہ من و سلوٹی لگ رہا تھا۔ دوسرے دن امی نے شام کو بھوسی کی روٹی پکائی۔ صبح امی نے بھوسی نمک ڈال کر اس کا پیڑہ بنالیا اور پراٹھے کے توے پر وہ پیڑا رکھ کر پھینکا دیا۔ پھر اسے الٹ پلٹ کر اچھی طرح سینک لیا۔ ایک بڑی سی روٹی تیار ہو گئی۔ اور لہسن نمک مرچ کی چٹنی پیس کر ہم لوگوں نے وہ روٹی خوب مزے لے لے کر کھائی۔

زندگی عجیب و غریب تجربے سے گزر رہی تھی۔ بچپن اتنے عیش میں گزرا تھا کہ انڈے جام جلی۔ مکھن ڈبل روٹی اور دودھ کے علاوہ ناشتے میں کوئی دوسری چیز دیکھی نہ کھائی۔ یا پھلوں کی ورائٹز ہوتی تھیں اور آج وقت اتنا مہربان ہو گیا کہ بھوسی کی سخت روٹی کے لقمے چٹنی سے لگا کر روایت پوری کی جا رہی تھی۔ یاد دوسرے الفاظ میں پیٹ کو دھوکا دیا جا رہا تھا۔ سین نے ایک دو چھوٹے چھوٹے لقمے کھائے اور ہاتھ کھینچ لیا۔ بولی۔

”امی جی یہ روٹی بڑی سخت ہے۔ میرا تو منہ دکھنے لگا کھاتے کھاتے۔ اسے پانی میں بھگو کر رکھ دیں۔“

مجھے ہنسی آ گئی۔ معلوم نہیں، سین کی معصومیت یا اپنے حال پر۔

”کیا تم پو پولی ہو گئی ہو۔ روٹی بھگو کر تو بڈھے لوگ کھاتے ہیں جن کے دانت نہیں ہوتے۔“

”بھئی، ایسی روٹی تو بڈھے بھی نہیں کھاتے ہوں گے یہ تو عجیب و غریب روٹی ہے، اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا کسی کو کھاتے ہوئے۔“ اس کے لہجے میں بڑی بے جا رگی تھی۔ میں نے اس سے آنکھیں چرائیں۔ امی نے کبھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور روٹی گیلے کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دی۔ اور اس کے گال پیار سے تھپتھا کر کہا۔

”بیٹی جب کچھ کھانے کو نہ ہو تو ایسی چیزیں نعمت ہوتی ہیں۔“

”امی مجھے نیند آ رہی ہے۔“ اس نے کہا۔

”سو جاؤ جا کر۔“ وہ اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی۔

رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا کہ سین نے ایک چیخ ماری اور اٹھ کر رونے لگی۔ اس کے پیٹ میں شدید درد تھا۔ وہ مارے تکلیف کے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ امی اسے سنبھال رہی تھیں۔ شاید بھوسی کے چند لقمے اسے ہضم نہیں ہوئے تھے۔ اسے موشن لگ گئے پھر التیاء ہونے لگیں۔ قے میں بھوسی کی روٹی کے ٹکڑے نکل رہے تھے۔ صبح ہو گئی تھی۔ وہ التیوں سے بے حال ہو گئی تھی۔ امی رو رہی تھیں۔ میں سرکاری ڈپنسری سے حال کہہ کر دوا لے آیا۔ مگر قے اور دست میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سارے جسم کا پانی نکل چکا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے لیے نمکول بھی دیا۔ امی نے اسے نمکول کا پانی بھی پلایا مگر کوئی افادہ نہیں ہوا۔ آخر تیسرے دن اس نے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں ہمیشہ کے لیے۔ اُس نے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں ہمیشہ کے لیے۔ اس کی موت نے ہمیں بے موت مار دیا تھا۔ امی کی بے تحاشا چیخوں نے سارے محلے کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہمارا گھر عورتوں سے بھر گیا۔

”ارے کیا ہوا؟“

”کیسے مر گئی؟“

”اسے کیا ہوا تھا؟“ وغیرہ وغیرہ۔ طرح طرح کی بولیاں تنقیدیں.....

”اے بہن کس ڈاکٹر کو دکھایا تھا؟“

”اے بہن پاس پڑوس والے تو رشتے داروں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ بچی گزر گئی اور ہمیں خبر نہ ہوئی۔“

امی کو چپ لگ گئی۔ وہ کیا کہتیں۔ گھر کی ہر چیز غربت، کسمپرسی اور افلاس کی کہانی بنا رہی تھی۔ آخر محلے والوں نے ہی اس کی تدفین کی۔ میرے گھر کی ہستی بولتی مینا بابا کی پیاری بیٹی۔ میری مظلوم بہن فاتوں کے ہاتھوں شکست کھا کر لحد میں جاسوئی۔ میں نے شاید پہلے ذکر کیا تھا کہ نانا مرحوم کے مرحوم دوست کی بہورقیہ اعجاز کبھی بھی امی سے ملنے آ جاتی تھیں پر انے تعلقات کی بنا پر۔ مگر امی نے کبھی انہیں منہ نہیں لگایا۔ کیونکہ وہ کھاتے پیتے خاندان کی متمول اور بڑھی لکھی خاتون تھیں۔ امی کا تخت و تاج اُبڑ چکا تھا ان کی ریاست پر ظالموں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ ان کے پاس دو وقت روٹی کا سہارا نہیں تھا تو وہ آنے والوں کی ضیافت کا انتظام کہاں سے کرتیں۔ حالات نے انہیں سردمہر اور محتاط کر دیا تھا۔ ان کی مجبوریاں کون سمجھ سکتا تھا۔ رقیہ اعجاز نے آنا جانا کم کر دیا۔ اب جبہ سین کا انتقال ہوا تو وہ ہمارے گھر اپنی ساس نندوں کے ساتھ آئیں۔ خلاف توقع انہوں نے بے حد اپنائیت۔ ہمدردی اور اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ امی کو گلے سے لگا کر تسلی دی اور شکوہ کیا کہ

”آپ نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔ حالانکہ بابو جی (سر) کے حوالے اس گھر کے دکھ درد سب ساجھے تھے۔ ہم سے کچھ چھپا ہوا نہیں تھا۔ مگر ہم نے مداخلت کر کے آپ کو شرمندہ کرنا نہیں چاہا۔ ہمیں آپ کی عزت نفس بہت عزیز تھی۔ اس کے باوجود بھی ہم اتنے بگڑے ہوئے حالات کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں اس کوتاہی کے لیے معاف کر دیجیے ورنہ خدا کے گھر ہماری سخت پکڑ ہوگی۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہم لوگوں نے شاید اندازہ لگانے میں غلطی کی تھی۔ بیگم رقیہ اعجاز تو ہمارے تصور سے زیادہ اچھی اور باظرف خاتون تھیں۔ امی نے ان کی طرف دیکھا ان کی نگاہوں میں حیرت بھی تھی، افسوس بھی اور ندامت بھی۔ وہ رمان سے بولیں۔

”ہم مشیت کی رضا میں راضی رہنے والوں میں سے ہیں۔ ہمارا دکھ اپنا دکھ ہے۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ آپ جس اپنائیت سے میرے دکھ میں شریک ہوئیں اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ خدا آپ کو اس کا اجر عظیم دے گا۔“

”نہیں نہیں۔ اس طرح نہ کہیں زبیدہ بیگم۔ یہ تو میرا فرض تھا مگر میں اسے ادا نہ کر سکی۔“ انہوں نے گھبرا کر امی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارے گھر ہمہ نعمتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اور فرش پر دریاں چاندنی بچھوا کر قرآن خوانی شروع کرادی۔ سوئم تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

امی جیسے بولنا بھول گئیں۔ جو کھانا جو چیزیں ان کی طرف سے آتی تھیں وہ پڑھنے والی خواتین میں تقسیم کر دی جاتیں۔ سب نے لاکھ لاکھ امی کو کھانا چاہا مگر انہوں نے ہر بار کھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے امی سے پلٹ کر خوشامد کی۔ ان کے آگے ہاتھ جوڑے دیا اور کہا۔

”اس طرح بغیر کھائے سے تو آپ بھی مرجائیں گی۔ پھر میں کیا کروں گا؟ کہاں جاؤں گا؟“ میری سسکیاں نکل گئیں۔ امی نے مجھے سینے سے لگا کر کہا۔

”میری جان۔ میرے لال۔ میرا جی نہیں چاہتا کچھ بھی کھانے کو۔“

”اچھا تھوڑا دودھ ہی پی لیں۔ کچھ توانائی آئے گی۔“ میں نے اصرار کیا تو وہ ایک دم پلٹ پڑیں۔

”میری معصوم۔ نازوں پلٹی بچی ایک روٹی۔ ایک گھونٹ دودھ کو ترسی ہوئی بھوک پیاسی مر گئی اور میں پلاؤ زردہ، تورمہ روٹی کھا کر آسودہ ہو جاؤں۔ یہ کھانا۔ یہ نعمتیں اب میرے حلق سے نہیں اتریں گی۔ اب مجھ سے کچھ نہ کہنا میری جان۔ بس مجھے تھوڑا سا پانی پلاؤ۔“

اختیار کر لیتے۔ کبھی چائے کی پیالی میں ڈھل جاتے کبھی بھاپ اڑاتی بریانی کی پلیٹ، کبھی اٹلے ہوئے انڈے اور دودھ کے گلاس کی شکل میں الفاظ پورے صفحے پر ناپتے پھرتے اور میں گھبرا کر کتاب بند کر دیتا۔ میری آنتیں اینٹھنے لگتیں۔ ایک آگ سی بدن کو جلانے لگتی تھی۔ اگر دنیا میں اللہ بھوک پیدا نہ کرتا تو شاید اس دنیا کی کوئی اہمیت، کوئی کشش نہ ہوتی۔ کتنی ظالم بے درد اور کتنی طاقتور چیز ہے یہ بھوک بھی۔ انسان کو انسان ہی نہیں رہنے دیتی درندہ بنادیتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ بھوک کیا چیز ہوتی ہے۔ میں نے فاقوں کی لذت چکھی تھی۔ اس پر عذاب کیفیت سے گزرا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرا دل اتنا حساس اور اتنا رقیق ہو گیا تھا کہ اگر میں کسی بلی کتے کو ہانپتے کانپتے یا بھوکا محسوس کرتا تھا تو میری حالت دگرگوں ہونے لگتی تھی۔ بھرے ہوئے پیٹ میں بھی چوہے دوڑنے لگتے، جب تک میں اسے روٹی کا ٹکڑا، بوٹی یا کوئی کھانے کی چیز اس کے آگے نہ ڈال دیتا، مجھے سکون نہ ملتا تھا۔ تو اس عالم خواری اور فاقہ مستی میں میٹرک اچھے نمبروں میں پاس کر لیتا، امداد غیبی کے مترادف تھا۔ اس پاک پروردگار کے ہزار بار صدقے جس نے مجھے یہ عزت دی، اور میرے لیے آگے تعلیم حاصل کرنا آسان بنا دیا۔ بابا کی اچانک موت اور سوتیلے ظالم بھائیوں کی بیدخلی نا انصافیوں اور بھوک و افلاس کے یہ چار سال ہم نے آگ کا دریا پار کر کے اور شیشوں کی کرچیوں پر چل کر گزارے تھے۔ نہ صرف میرے پاؤں بلکہ دل اور پورا جسم زخم زخم تھا۔ رب قدر نے ان آتی جاتی سانسوں اور دنیا میں رہنے بسنے کی کتنی بڑی قیمت رکھی تھی۔ کتنے دکھ، کتنے آلام، کتنی کنھنیاں یا بہ زنجیر تھیں۔ یہ زندگی اسی لیے شاید انمول کہی گئی تھی.... اگر دنیا کی حقیقت اور بے ثباتی کو انسان سمجھ لیتا تو وہ ہرگز اس دارالحقن کی خواہش نہ کرتا۔ بیگم رقیہ اعجاز کی شکل میں اس گھٹے ہوئے ماحول اور زنداں میں قدرت نے ایک دروازہ کھول دیا تھا، جہاں سے تازہ اور خوشگوار ہوائے زندگی کا رخ بدل ڈالا تھا.... بعض وقت میں اپنے گھر میں اجنبیوں کی طرح ایک ایک درود یوار۔ ماں اور نانا کی چھوڑی ہوئی چیزوں کو ہاتھوں سے چھو چھو کر دیکھنے لگتا تھا۔ اپنے کو یقین دلاتا رہتا تھا کہ یہ گھر نہیں، میوزیم ہے۔ جہاں ہر چیز میں تین پشتوں، تین نسلوں کی تاریخ کندہ تھی۔ اور اب میں ان کا تنہا محافظ اور وارث تھا۔

بیگم رقیہ بے حد مہربان اور شفیق خاتون نکلیں۔ پہلے تو انہوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں ان کے اوپر والے پورشن میں آ جاؤں۔ ”وہاں تمہیں یادیں ڈسٹرب کریں گی۔ ان کی خوشبو بے چین کرے گی۔ تمہاری پڑھائی کا ہرج ہوگا۔ میں چاہتی ہوں، تم بی ایس سی کر کے ڈی ایس پی یا ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ تک پہنچو۔ لمبی لمبی ڈگریاں لو۔ میں تمہیں بہت

میں بے بس ہو گیا۔ اس رات امی کی طبیعت بگڑ گئی۔ ان کے پیٹ میں درد اٹھا اور ان کی چیخیں ناقابل برداشت ہو گئیں۔ اسی وقت بیگم رقیہ اپنی گاڑی میں امی کو ڈال کر اسپتال لے گئیں۔ فوری توجہ سے ان کی تکلیف کم ہو گئی تھی مگر لگتا تھا، جیسے آخر شب کا چراغ بجھ کر اپنی روشنی کو بام و در پر پھینک کر بجھنے والا ہو۔ وہ ہونٹ پیچھے ایک ایک کو خاموشی سے دیکھ رہی تھیں ان کی آنکھوں میں بڑی ویرانی تھی۔ میرا دل انہیں دیکھ کر دہل گیا۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میرے ہاتھ چومے۔ میرا ہاتھ چوما، اور بولیں۔

”بیٹا۔ میں تمہیں اس بھری دنیا میں تنہا چھوڑے جا رہی ہوں۔ شاید خدا کو اسی طرح منظور تھا۔ بیٹا، تمہاری مصیبتوں کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ خوب دل اکا کر پڑھنا۔ محنت سے کبھی منہ نہ موڑنا۔ اچھا انسان بننے کی کوشش کرنا۔ کسی کا دل نہ دکھانا۔ ضرورت مندوں کی مدد کرنا۔ اچھے دنوں میں اپنے یہ دن نہ بھولنا اور میرے بعد اس گھر کو نہ چھوڑنا بیگم رقیہ اعجاز بہت اچھی خاتون ہیں۔ وہ تمہاری دیکھ بھال کریں گی۔ انہوں نے تمہیں مجھ سے مانگ لیا ہے اپنا بیٹا بنالیا ہے تمہیں۔ ان کا کہنا ماننا، ان کا احترام کرنا۔ میری جگہ انہیں سمجھنا۔ اللہ تمہارا نگہبان۔“

وہ چپ ہو گئیں اور میں ان کے سینے پر سر رکھ کر چیخیں مارنے لگا۔ میری ماں مجھ سے جدا ہو رہی تھی۔ بابا چلے گئے۔ میرا آشیانہ تنکے تنکے بکھر گیا۔ بہن نے ساتھ چھوڑ دیا اور اب ماں بھی جا رہی تھی۔ ”نہیں امی، مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جائیے میں بھی ساتھ چلوں گا۔“ میں ٹپ ٹپ کر رو دیا۔ جب بیگم رقیہ اعجاز نے مجھے ماں کے سینے سے اٹھا کر لپٹا لیا تو ماں ہمیشہ کے لیے مجھ سے ہچکچکی تھی۔ وہ مجھے باہر لے گئیں۔ آنسو پونچھے۔ تسلی دی۔ پانی پلایا۔ دیر تک وہ مجھے سمجھاتی رہیں کہ ”جو ذی روح جتنی زندگی دنیا میں لے کر آتا ہے اس سے ایک منٹ بھی زیادہ نہیں جیتا۔ تمہاری ماں اور بہن اتنی ہی زندگی لے کر آئی تھیں۔ تم ان کی ہدایت پر عمل کرنا۔ بہت سا پڑھنا۔ اچھے کام کرنا۔ ان کی روح تم سے بہت خوش ہوگی۔“

☆.....☆.....☆

اب بیگم رقیہ اعجاز میری مربی اور سرپرست تھیں۔

میں نے میٹرک کر لیا تھا اور خلاف توقع بہت اچھے نمبروں میں پاس ہوا تھا۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ بھوک، افلاس اور تنگ دستی سے ہر لمحہ نیروآزما ہوتے ہوئے میں نے کیسے میٹرک کر لیا۔ جبکہ چار دن اسکول جاتا جھپٹے میں اور دو دن روٹی کی تلاش میں گزارتا۔ اسکول میں بھی بھوک کی وجہ سے کتابوں کے الفاظ کبھی روٹی کی شکل

بڑا آدمی دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”جی آئی۔ انشاء اللہ میں ضرور بڑا آدمی بننے کی کوشش کروں گا۔ یہ خواہش میری امی جنت مکانی کی بھی تھی۔ مگر مجھے آپ وہیں رہنے دیں۔ مجھے وہیں سکون ملتا ہے۔ لگتا ہے میری امی میرے بہت قریب ہیں۔ میری پڑھائی کا حرج بالکل نہیں ہوگا۔“ میں نے انہیں اطمینان دلانا چاہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں وہاں زیادہ سون ملے گا اور تم کیسوی سے اسٹڈی جاری رکھ سکو گے تو میں اصرار نہیں کروں گی۔ ماشاء اللہ تم خود سمجھ دار ہو۔ میں کل سے ملازمہ کو بھیج دوں گی، وہ گھر کی صفائی ستھرائی کر دیا کرے گی اور تمہارا ناشتہ بنادیا کرے گی۔ شام کو کھانا تم میرے ساتھ کھاؤ گے۔“ میں نے سر جھکا کر اقرار کر لیا۔

امی کے بعد میں اپنے خدا سے زیادہ قریب آ گیا تھا..... پنج وقتہ نمازی بن گیا تھا، وہیں پر ایک مولوی مجھے مل گئے تھے ان سے میں نے قرآن شریف پڑھ لیا تھا۔ میرا سارا وقت پڑھائی اور نماز تلاوت میں صرف ہونے لگا۔ فجر کی نماز کے بعد کام کرنے والی آ جاتی تھی۔ مجھے پتا ہی نہ چلا اور آئی نے گھی چینی آنا اور ناشتے کا پورا سامان مع فریج کے کچن میں رکھوا دیا تھا۔ میں چپ تھا۔ کیونکہ امی نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں بیگم رقیہ کی کوئی بات نہ ٹالوں۔ کسی بات پر اعتراض نہ کروں اس لیے کہ انہوں نے تمہیں اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ اور یہ سب انہوں نے اپنے بیٹے کی سہولت کے لیے کیا تھا۔ پھر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں تھی..... میں قدرت کی اس عطا پر خاموش بھی تھا اور شکر گزار بھی۔

پھر ایک دن جب میں نماز اور تلاوت سے فارغ ہوا تو روئین کے مطابق سامنے ناشتے کی ٹرے آگئی مگر اسے لانے والے ہاتھ نوکرانی کے نہیں تھے۔ میں نے چونک کر نگاہ اٹھائی تو ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں حیرانی سے اس کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ یہ آسمان سے اتر ہے یا زمین پھاڑ کر نکلی ہے۔ سفید ڈھیلے ڈھالے جارجٹ کے سوٹ اور باریک دوپٹے میں سفید چہرہ اڑتے بادلوں سے چاند کے جھانکنے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ کر کہا۔

”آداب۔“

میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ حسین مخلوق اچانک کہاں سے میرے درمیان آ گئی تھی۔

”جہاں زیب صاحب‘ تشریف رکھے‘ حیرانی کی کوئی بات نہیں‘ میں آپ ہی کی دنیا

کی ایک مخلوق ہوں۔“ وہ مسکرائی اور میں جلدی سے اپنی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔

”اچھا تو آپ کو ہمارا نام بھی پتا ہے۔ اب اپنا نام اور حدود دار بچہ بھی بتا دیجیے۔“

”میرا نام صبا ہے اور میں رقیہ اعجاز کی بھانجی ہوں۔ لاہور میں پڑھتی ہوں‘ آج کل ہوشل میں چھٹی تھی اس لیے اپنی خالہ جان سے ملنے چلی آئی۔“

”خالہ جان سے یا.....؟“ میں نے پہلی بار شوخی سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”جی نہیں۔ آپ اتنے خوبصورت نہیں کہ آپ سے ملنے آ جاؤں‘ جبکہ میں آپ کو جانتی بھی نہیں۔“ اس نے پٹاخ سے جواب دیا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

”یہ تو میں نے نہیں کہا کہ آپ مجھ سے ملنے آئی ہیں.... اور خوبصورت تو خیر میں ہوں۔ میں ہی خواہ مخواہ کسی کو لفٹ نہیں کراتا۔“ میں نے مسکرا کر ان آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور ناشتہ کرنے لگا۔

”اونہہ۔ بڑی خوش فہمی ہے آپ کو اپنی طرف سے۔“

”ہونی ہی چاہیے۔“

”خیر خیر۔ آپ یہ بتائیے کہ یہ پراٹھے اور آملیٹ کیسا لگا آپ کو؟“

”کیوں کیا خاص بات ہے ان میں؟“ میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔

”ارے ارے‘ یہ کس نے کہا کہ آپ ہاتھ روک لیں۔ میرا مطلب ہے کہ پہلے بوا کے ہاتھ کا ناشتہ کرتے تھے۔ آج میں نے بنایا ہے۔ کچھ فرق تو ہوگا۔“

”ہاں‘ یقیناً ہوگا بلکہ اضافہ۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اضافہ کس چیز کا؟“

میں نے سوٹ ڈش کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ۔ ہاں آپ کہہ سکتے ہیں۔ اصل میں مجھے میٹھا بہت پسند ہے۔ بغیر میٹھے کے میرا ناشتہ ہی مکمل نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ اضافہ کیا لگا آپ کو؟“

”بہت اچھا بلکہ خوشگوار۔“ میں نے کھڑے ہو کر کہا۔

”ارے‘ ابھی ناشتہ مکمل کہاں ہوا۔ یہ لیجئے جائے۔“

”اوہ‘ جائے کا تو خیال ہی نہ رہا‘ شکر یہ صبا‘ آپ کے پڑخلوص ناشتے کا۔“

میں نے کتابیں اٹھائیں اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ اس کا یہ اپنا اپنا سا انداز مجھے بہت اچھا لگا۔ پھر تو یہ معمول گیا۔ میں نے پوچھا۔

”صبا‘ کیا آئی نے تمہاری ڈیوٹی لگا دی ہے ناشتہ تیار کرنے کی۔ وہ ملازمہ کہاں چلی

گئی؟“

”کیوں؟ کیا آپ کو میرے ہاتھ کا ناشتہ پسند نہیں؟“
میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں، یہ بات نہیں صبا۔“

”پھر کیا بات ہے۔ میں آپ کو اچھی نہیں لگتی اس گھر میں چلتی پھرتی.....؟“

”کیوں میرا امتحان لینا چاہتی ہو صبا۔ یقیناً آنٹی سے میرا ایک گراؤنڈ معلوم ہو گیا ہوگا آپ کو۔ پھر اس درجے مہربانی کیا معنی؟ خدا را مجھ پر ترس نہ کھائیں۔“ میرا موڈ ایک دم بدل گیا۔ ”بلاشبہ آنٹی کی محبت نے مجھے میری ماں بھلا دی ہے مگر میں ان پر بوجھ بننا نہیں چاہتا۔ ایک آدمی کی روٹی تو میں بھی کما سکتا ہوں۔ پلیز صبا مجھ پر مزید رحم نہ کریں۔“

اس دن اچانک میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ وہ سارے زخم ہرے ہو گئے جن پر کھرٹڈ آگئے تھے ان سے ٹیسس اٹھنے لگیں۔ میں ایک دم بکھر سا گیا۔ رکائیں پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور کتابیں اٹھا کر فوراً باہر نکل گیا۔ میری حالت پہلے جیسی ہو گئی۔ میں اس دن کالج نہیں گیا اور پارک کے ایک پھولوں بھرے رخ میں ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھولوں سے مس ہو کر میرے اطراف پھیل گئی۔ میرے حواس رفتہ رفتہ درست ہونے لگے۔ میرے سامنے صبا کی حیرت میں ڈوبی ہوئی معصوم صورت آ گئی۔ میں اپنے دل میں بے حد شرمندہ تھا۔ مجھے ایک بات یاد آنے لگی۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ اس معصوم لڑکی نے میرے لیے کیا سوچا ہوگا۔ کہ میں کتنا بد اخلاق۔ اپنی ذات کا قیدی اور سلیفش انسان ہوں۔“

اُس دن میں اتنا بے زار اور بد مزہ ہو رہا تھا کہ جی چاہتا، ویرانوں میں نکل جاؤں۔ بے مقصد ہی ادھر ادھر پھرتا رہا۔ شام کو گھر آیا تو گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ صبا جاتے جاتے اپنی خوشبو چھوڑ گئی تھی۔ جدھر نگاہ اٹھتی وہ مجھے نظر آ جاتی۔ روٹھی روٹھی اداس سی۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلے آج چائے بنانے اور پینے کو بھی میرا جی نہیں چاہ رہا تھا.... سوچتا رہا کہ میں آنٹی کے پاس جاؤں نہ جاؤں۔ وہاں صبا ہوگی۔ میں اپنی جگہ خود ہی شرمندگی سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ بہر حال اگر نہ گیا تو وہاں سے کوئی نہ کوئی ہر کارہ بلانے آ جائے گا۔ اس لیے میں چلا گیا۔ حسب معمول وہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھیں۔ کھانے کی میز پر سب آگئے تھے۔ میرے سلام کا جواب حسب عادت محبت سے ملا۔

”آؤ بیٹا ادھر آ جاؤ میرے پاس۔“ ہمیشہ کی طرح آنٹی نے باغ و بہار لہجے میں کہا۔

میرے ذہن پر چھایا ہوا غبار آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ مجھے ماحول میں کوئی کھنچاؤ کوئی نیا پن نہیں محسوس ہوا میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ نگاہ اٹھائی تو مجھے صبا کہیں نظر نہ آئی۔ یہ دیکھ کر میں تھوڑا سا پریشان ہو گیا۔ بہر حال میں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ آنٹی نے خود ہی کہا۔

”بوا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے صبا نے دو تین دن ناشتے کی ذمہ داری خود ہی اٹھالی تھی۔ کل سے بوا آئیں گی۔ ویسے بھی صبا کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں، وہ لاہور چلی گئی۔“

مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

”کوئی بات نہیں آنٹی۔“ میں نے کہا۔ ”میں آپ سب کی محبتوں کا ویسے بھی مقروض ہوں۔“

”نہیں بیٹا۔ ہم نہ کسی کو قرض دیتے ہیں نہ لیتے ہیں۔ یہ لین دین سا ہو کاروں کا کام ہے۔ تم اس چکر میں نہ پڑو۔ اپنی پڑھائی پڑھیاں دو۔“ وہ مسکرا دیں۔

میرے ذہن سے بوجھ اتر گیا تھا۔ کہ وہ بات صرف میرے اور صبا کے درمیان تھی۔ مگر ایک پھانس ضرور دل میں رہ گئی تھی کہ شاید صبا مجھ سے ناراض ہو کر گئی ہے۔ بہر حال میں نے اپنے آپ کو مصروف کر لیا اور لگا بندھا وہی روٹین چلنے لگا۔ یعنی گھر سے کالج اور کالج سے گھر۔ رفتہ رفتہ میں نے دو تین ٹیوشن لگا لیں۔ بچے گھر پہ آنے لگے۔ دوستوں کا اصرار تھا کہ میں انہیں ان کے گھر جا کر پڑھا دیا کروں۔ مگر میں نے کہا۔ تم لوگ خود ہی میرے گھر آ جایا کرو۔ میری تنہائی بٹ جائے گی۔ اور تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔

اس دن سے میرے گھر میں بھی رونق ہو گئی، میرا وقت اچھا پاس ہونے لگا اور میرے ہاتھ میں پیسے آنے لگے۔ اب میں نے بوا کو صبح صبح آ کر ناشتہ بنانے کے لیے منع کر دیا تھا۔ انڈا خود ہی بوائے کر لیتا۔ جام جیلی ڈبل روٹی لاکر رکھ دی تھی۔ صبح چائے بنا کر ناشتہ کر لیتا۔ آنٹی نے مجھ سے پوچھا۔

”تم نے بوا کو ناشتے کے لیے کیوں منع کر دیا۔“

”آئی ایک ناشتے کے لیے میں خواہ مخواہ بوا کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ اور میں خود بھی کچھ کرنا چاہتا ہوں اس لیے منع کر دیا تھا۔ صفائی ستھرائی کے لیے جب جی چاہے آ جایا کریں۔“ میں نے کہا۔

”تو یقیناً تم کیا بنا لیتے ہو۔ سامان وغیرہ تو.....؟“ وہ فکر مند ہو گئیں۔

”میں نے جام جیلی اور انڈے لاکر رکھ لیے ہیں۔ صبح انڈا بنالیا، ایک کپ چائے بنانی

اور تو سوں پر جام جلی لگا کر رکھی ہے۔“ میں ہنس پڑا۔
 ”اوہ۔ ماشاء اللہ ہوشیار ہوتے جا رہے ہو، خیر اگر کسی وقت تکلیف محسوس کرو تو ہوا سے
 کہہ دینا۔“ وہ ہنس دیں۔

اس دن سے میں ناشتے میں خود کفیل ہو گیا تھا۔ اور مجھے خوشی تھی۔ میں نے دو پہر کا
 کھانا تقریباً ختم کر دیا تھا۔ جسے ایک وقت کھانا میسر نہ آ سکے تو اس کے لیے تین وقت
 کھانے کا کیا تصور کیا جاسکتا تھا۔ میں نے مذہبی کتابوں میں ایک کھانے اور ایک ناشتے
 کے متعلق پڑھا تھا کہ سیدنا رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ناشتے ایک کھانے
 پر زور دیا تھا۔ وہ خود بھی اس پر عمل فرماتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی امت میں
 اکثریت غریبوں کی ہوگی۔ ویسے بھی ڈاکٹری نقطہ نظر سے ایک ناشتے ایک کھانے کا فلسفہ
 زندگی کے نشیب و فراز کے لیے بڑا سودمند تھا۔ صحت کے لحاظ سے بھی اور معاشی لحاظ
 سے بھی، سو میں نے دو پہر کا کھانا چھوڑ دیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد شام کو آٹنی کے ساتھ
 کھانا کھاتا تھا۔ مجھے بھوکا رہنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ ویسے بھی اگر دو چار وقت نہ ملتا
 اب کچھ فرق نہیں پڑتا تھا لیکن ہاتھ پاؤں میں ٹنسنی پھیل جاتی اور آنتیں اینٹھنے لگتی تھیں۔
 تب احساس ہوتا کہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے روٹی تنی ضروری ہے۔
 زندگی پھر روٹین کے مطابق چلنے لگی تھی۔ رقیہ آٹنی کی محبتوں میں کوئی فرق نہیں آ
 تھا۔ انہوں نے جب ایک ناشتے ایک کھانے کا فلسفہ سنا اور یہ کہ میں نے دو پہر کا کھا
 چھوڑ دیا ہے تو انہیں افسوس ہوا۔

”بیٹا۔ یہ ایک ناشتے ایک کھانے کا فلسفہ ہم جیسے عمر رسیدہ لوگوں کے لیے ہے۔
 تمہاری جیسی بڑھی ہوئی عمر کو کھانے پینے کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں ابھی بہت
 آگے جانا ہے جب خدا نے دیا ہے تو نہ کھانا کفرانِ نعمت ہے۔ تمہیں اپنی صحت کا خیال
 رکھنا چاہیے بیٹا۔“

میں چپ ہو گیا اور اس دن سے ان کا دودھ والا شام کو دودھ دینے لگا۔ اور نہ چاہتا
 کے باوجود مجھے سونے سے قبل ایک گلاس دودھ لینا پڑتا۔ مگر میں جب بھی دودھ پیتا۔ مجھے
 گلاس میں اپنی معصوم بہن سبین کا چہرہ نظر آنے لگتا۔ بیماری میں ڈاکٹروں کے بار بار کہنے
 کے باوجود اس کے لیے کہیں سے دودھ مہیا نہ کیا جاسکا اور اسے پانی پر بھلا دیا گیا۔ ایک
 بار اس نے کہا۔ ”بھیا، تھوڑا سا دودھ لا دو۔“

اور میرے ساتھ امی بھی اپنے آنسوؤں پر ضبط نہ کر سکیں۔ ہائے کیسی مجبوری تھی۔
 میرے منہ سے دودھ واپس آ گیا۔ میں نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ ایک بڑی سی تے ہوا

اور دودھ کے ساتھ کھانا بھی الٹ گیا۔ اس دن سے میں نے دودھ بند کر دیا۔ اور آٹنی
 سے میں نے معذرت کر لی کہ دودھ مجھے ہضم نہیں ہوتا وہ چپ ہو گئیں۔

حالات نے مجھے اس قدر حساس کر دیا تھا کہ شام کو جب میں آٹنی کے گھر کھانا کھانے
 جاتا تھا اور بڑی سی میز ہمہ نعمتوں سے بھری دیکھتا اور سب لوگ کھانے بیٹھتے تو میرا جی
 چاہتا کہ یہ سارا کھانا اٹھا کر اُن بھوکوں اور فاقہ زدہ لوگوں میں بانٹ دوں جن کو حالات
 نے پابہ زنجیر کر دیا تھا۔ وہ غیرت مند لوگ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے۔ جن کے
 ہونٹ غربت کے مارے سل گئے تھے۔ اپنا خالی پیٹ کسی کو نہیں دکھا سکتے تھے۔ میں
 خاموشی سے سر جھکائے کھانے لگتا۔ میرے آنسو اندر ہی اندر گرتے رہتے۔ آٹنی غور سے
 میرا چہرہ دیکھنے لگتیں۔

”کیا بات ہے بیٹھے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“
 ”جی آٹنی۔“ میں گھبرا کر کہتا۔ ”میری طبیعت ٹھیک ہے۔“ اور کھانے میں تیزی
 دکھانے لگتا وہ مسکرا نے لگتیں۔

ایک دن میرے شاگرد نے مجھے اپنے بھائی کے ویسے کا کارڈ لا کر دیا اور بے حد اصرار
 کرنے لگا کہ ”سر آپ ضرور آئیے گا ہماری عزت بڑھ جائے گی۔“
 میں نے آٹنی کو کارڈ دکھا کر کہا۔
 ”کل کھانے پر آپ انتظار نہ کیجئے گا۔ میں دعوت میں جا رہا ہوں۔“
 وہ کارڈ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں بولیں۔

”بڑی اچھی بات ہے بیٹا۔ شادیاں دعوتیں پارٹیاں اٹینڈ کیا کرو اس طرح تمہارا دل
 بھی بہلے گا اور دنیا کا تجربہ بھی حاصل ہوگا۔“

اس دن میں نے پہلی بار کلب میں کوئی پارٹی اٹینڈ کی تھی۔ اب مجھے پہننے اوڑھنے
 اٹھنے بیٹھنے اور محفل میں بات کرنے کا شعور آ گیا تھا۔ میرے کئی شاگرد اس تقریب
 میں شریک تھے۔ انھوں نے مجھے بڑی عزت دی اور خصوصی طور پر کھانے کی میز پر لے
 گئے۔ یہاں سے وہاں تک میزوں پر کھانا لگایا جا رہا تھا۔ چاق و چوبند باوردی بیرے ادھر
 ادھر ٹرے لیے پھر رہے تھے۔ کھانا شروع ہو چکا تھا۔ لوگ اس طرح ٹوٹے پڑ رہے تھے
 جیسے کئی دنوں کے فاقے سے ہوں۔ انتہائی ندیدے پن سے اپنی پلیٹ بھر لیتے اور مرغی کی
 ٹانگیں خوب بھنبھوڑنے لگتے۔ میں اپنا کھانا بھول کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کھاکم رہے
 تھے ضائع زیادہ کر رہے تھے۔ مجھے احساس زیاں ہونے لگا۔ سینے پر جیسے ایک بوجھ آ گرا
 تھا۔ میں نے دو چار لٹے بریانی کے لیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے اوپر گزرے ہوئے لمحوں

نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ وقت بے وقت سامنے آکھڑے ہو جاتے تھے۔ خصوصاً نعتوں سے بھری ہوئی میزوں اور کھنٹی دیگوں کو دیکھ کر میری ماں بہن مجھے یاد آ جاتیں جب وہ ایک لقمے کے لیے ہزار ہزار آنسو خلق سے اُتارتی تھیں مگر وہ ایک لقمہ جوئے شیر بن گیا تھا۔ حتیٰ کہ زبان کھانے کا ذائقہ بھول گئی تھی۔ آنٹیں مکھ مکھ کر اٹھنے لگی تھیں۔ آہ۔ جب انسان پر اتنا بڑا وقت آجائے تو پھر یہ زردہ پلاؤ کی قایمیں مرغی کی مانگیں کھیر کیسکو رے! آکس کریم اور کولڈ ڈرنک کی ٹھنڈی بوتلیں کیا مزہ دے سکتی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے کھانا نہیں کھایا، نیم کی پیتاں چبائی ہوں۔ وہ چند لقمے جیسے باہر آنے لگے طبیعت ایک دم بگڑنے لگی۔ میں گھبرا کر باہر آ گیا۔ میرا دوست بھی میرے ساتھ باہر نکل آیا۔

”کیا بات ہے جہاں زیب؟“

”کچھ نہیں، میرے پیٹ میں کچھ گڑبڑی ہو رہی ہے۔“

میرا شاگرد مجھے دیکھ کر میری طرف دوڑا۔

”سر کیا بات ہے، کھانا پسند نہیں آیا؟“

”نہیں بھائی، کھانا بہت اچھا تھا۔ بس یونہی منہ خراب سا ہو رہا ہے۔“ میں نے آنکھیں بند کر کے کرسی کے پیچھے سر ڈال دیا۔

میرا دوست جلدی سے تاجستہ گلاس میرے ہاتھ میں دے کر چلا گیا۔ اس میں لیموں اور نمک کے آمیزے نے مجھے بڑا سکون پہنچایا۔ لان کا خوشبو بھرا ماحول۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے میری طبیعت سنبھلنے لگی۔ پھر میرا ایک شاگرد مجھے سونف الاچکی کا خوشبودار پان دے کر چلا گیا۔ مجھے لوگوں کی محبت کا اندازہ تھا۔ مگر میں اپنی طبیعت اور احساسات کے ہاتھوں مجبور تھا۔ میں انہیں کیا سمجھاتا اور ان کی سمجھ میں کیا آتا۔ میں اپنی حالت سے خود ہی خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ اس قسم کی تقریبات سے میں کترانے لگا۔ جا کر خواہ خواہ شرمندگی اور احساس زیاں میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

پھر میں نے اپنے آپ کو کتابوں میں دفن کر دیا۔ پہلے سب کا خیال تھا کہ میں سائنس میں امتیازی ڈگری حاصل کروں۔ مگر میں چارنڈ کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے بجائے سائنس کے کامرس لے لی تھی۔ آخر خدا نے مجھے سُرخ رو کیا اور میں نے بی کام میں غیر متوقع طور پر پورے کالج میں فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ اخباری رپورٹروں نے میرا گھیراؤ کر لیا۔ میری تصویریں اخبارات کی زینت بننے لگیں۔ مجھے ذہین طلبا کی صف میں شامل کر لیا گیا۔ میرے دوست اور بیگم رقیہ اعجاز بہت خوش تھیں انہوں

نے بے اختیار گلے سے لگا کر مجھے چوم لیا اور کہا۔
”تمہاری اور تمہارے سارے دوستوں کی پارٹی میرے ذمے ہے۔ جیسے اور جس طرح چاہنا اُسے ترتیب دے لینا۔“

پھر انہوں نے مجھے سی اے کرنے کا مشورہ دیا۔۔۔۔۔ یہ خواہش تو خود میری بھی تھی۔ اس رات کو جب میں بستر پر لیٹا تو مجھے اپنی مظلوم بہن اور ماں بے تحاشا یاد آ گئی۔ آج اگر وہ حیات ہوتیں تو مجھے تری کی اس منزل پر دیکھ کر بہت خوش ہوتیں۔ میں اس قابل ہو گیا تھا ”سین میری بہن کہاں ہے تو۔۔۔۔۔“ میں پاگل سا ہونے لگا۔ تکیہ میرے آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔ اس رم جھم میں آنکھوں کے سامنے ایک معصوم چہرہ ابھرا، وہ پر خلوص چہرہ صبا کا تھا۔ آج بڑے دنوں بعد وہ مجھے یاد آئی تھی۔ میری کامیابی پر آئی نے مجھے بتایا تھا کہ صبا نے فون پر تمہیں بہت مبارکباد دی ہے اور مٹھائی بھیجی ہے۔ اتنا بہت تھا کہ وہ مجھ سے ناراض نہیں تھی۔ اور میری کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اسی لیے وہ چاہ رہا تھا کہ وہ پاس ہوتی تو میں اپنے گزرے ہوئے اذیت ناک لمحوں کی کہانی اسے سنا دیتا۔ ایسا راز داں کون تھا میرا اس کے سوا۔ اس وقت میں اُسے اپنی رگ جاں سے زیادہ قریب محسوس کر رہا تھا۔ دل کی حالت دگرگوں تھی۔ روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ مگر میرے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ نہ جانے کب نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہو گئی۔ جب اٹھا تو صحن میں دھوپ اتر آئی تھی۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے وضو کیا، فجر کی قضا نماز ادا کی۔ اللہ سے صبر و سکون کی دعا مانگی

طبیعت کسی قدر پرسکون ہو گئی تھی۔ چونکہ ابھی میں فارغ تھا اس لیے آنٹی کی ہدایت کے مطابق میں وہاں چلا گیا۔ ناشتے پر وہ میری منتظر تھیں۔ میں نے سلام کیا تو انہوں نے اٹھ کر مجھے لپٹا لیا۔

”آج مجھے دیر ہو گئی شاید؟“

”کوئی خاص نہیں۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا، پھر بولیں۔

”بھئی سب سے پہلے منہ میٹھا کرو۔“ انھوں نے تازہ گلاب جامنوں کی پلیٹ میرے سامنے کر دی اور کہا۔ ”یہ مٹھائی صبا کی طرف سے تمہارے لیے۔۔۔۔۔“ وہ مسکرائیں۔

تب مجھے دودن قبل کی بات اچانک یاد آ گئی۔ آنٹی نے کہا تھا۔ صبا نے تمہاری کامیابی کی مبارکباد دی ہے اور مٹھائی بھیجی ہے، میرے اندر جیسے ٹھنڈے میٹھے جھرنے کھل گئے۔
”شیر۔۔۔۔۔ شیر۔۔۔۔۔“
”کیا بات ہے تم نے ہاتھ کیوں روک لیا؟“

”اوہ آنٹی۔ کچھ نہیں۔“ میں جھینپ کر بولا۔ ”آنٹی۔ صبا سے میرا شکریہ ادا کر دیجیے گا، میری طرف سے۔“ اس بات کا مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ صبا مجھ سے ناراض نہیں ہے۔ اسکے بعد میں منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہا۔ میرا رنگ روپ نکھر گیا تھا۔ جب میں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا تو مجھے بے اختیار اپنے بابا اکبر حسین یاد آ جاتے۔ کاش! آج وہ حیات ہوتے تو میرے آئینے میں اپنی بھرپور جوانی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔ میں نے اُن کی جوانی کی تصویر دیکھی تھی۔ ہو بہو میں اپنے باپ کی بھرپور تصویر تھا۔ آج میری جوانی، میری دجاہت کی آرتی اُتارنے والا کوئی نہ تھا۔

پھر میں نے سی اے بھی امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا۔ کبھی کبھی مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ میں نے کوئی خاص اسٹڈی نہیں کی تھی پھر بھی پاس ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بابا جان کی رحلت کے بعد کے حالات اور فاقہ مستی کی حالت میں میری مظلوم ماں اور معصوم بہن کے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کے سارے مناظر میری آنکھوں میں محفوظ تھے۔ جب بھی میں تنہائی سے گھبراتا یا امی اور بہن مجھے یاد آ جاتیں تو وہ سارے مناظر آنکھوں کے سامنے مجسم ہو جاتے اور میری یکسوئی پارہ پارہ ہو جاتی تھی۔ پھر میرا دل بیزار ہو جاتا۔ ایسے عالم میں درجہ بدرجہ تعلیم میدان میں مسلسل آگے بڑھنا ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔ میں آج تک ان دکھ بھری یادوں سے دامن نہیں چھڑا سکا تھا۔ آج بھی میرے اندر میری معصوم بہن اور مظلوم ماں اپنی تمام نا آسودگیوں اور نارسائیوں کے ساتھ زندہ تھی۔ پھر میں نے یہ تمام کامیابیاں اور ترقیاں کیسے حاصل کر لیں۔ یہ میرے رب کی کرم نوازیات تھیں۔ میری مرحوم ماں کی دعائیں یا پھر ان ظلم و نا انصافیوں اور اذیتوں کا نعم البدل تھا جو میں نے اور میری ماں بہن نے مسلسل بھیلیں۔ بہر حال زخم تو بھر گئے تھے مگر ٹیسیں کم نہیں ہوئی تھیں۔

مجھے ایک فارن کی تیل کمپنی کی طرف سے آفر ہوئی تھی۔ اور میں نے آنٹی سے مشورہ کر کے یہ آفر قبول کر لی تھی۔ ایک دن آنٹی نے مجھ سے بڑے پیار سے کہا۔ ”بیٹا! اب تم ماشاء اللہ سروس سے لگ گئے ہو۔ آج میں تمہاری ماں کی روح سے سُرخرو ہوئی۔ اب ایک فرض اور رہ گیا ہے اُسے بھی ادا کرنے کی اجازت دے دو تو میں پرسکون ہو جاؤں گی۔“

”آنٹی! اجازت کیسی۔ آپ میری ماں کی جگہ ہیں۔ میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا ہوں کہ ایک ماں گئی تو دوسری آگئی ہے۔ اگر میری طرف سے کبھی کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔“ میں چپ ہو گیا۔ انہوں نے میری طرف پیار سے دیکھ کر کہا۔

”ارے نہیں بیٹا۔ کیسی گستاخی کیسی کوتاہی تم تو بے حد سعید اور فرماں بردار بیٹے ہو۔ تم نے جتنا مان میرا رکھا، اتنا تو میری اولاد نے بھی نہیں رکھا۔ بات صرف تمہاری شادی کی تھی۔ میں اس فرض سے بھی ادا ہو جانا چاہتی ہوں اور جس لڑکی سے میں نے تمہاری شادی طے کی ہے، معلوم نہیں وہ تمہیں پسند آئے گی یا نہیں۔“ رقیہ بیگم نے مسکرا کر مجھے دیکھا تو میں ٹپٹا گیا اور جلدی سے بولا۔

”مجھے آپ کی ہر خوشی منظور ہے آنٹی۔ یقیناً آپ نے میرے لیے بہتر سوچا ہوگا۔“ میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ تو دیا مگر جانے کیوں میرا دل بجھ سا گیا۔

”یوں نہیں بیٹا۔ پہلے مجھ سے پوچھو کہ وہ کون لڑکی ہے، کہاں رہتی ہے، کیا نام ہے کس خاندان سے ہے وغیرہ وغیرہ کیونکہ وہ تمہارا حق ہے۔“

”آنٹی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جیسی بھی ہوگی، اچھی ہی ہوگی۔“

”تم یوں نہیں مانو گے۔“ وہ اٹھ کر میرے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئیں۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔

”تم صرف ہاں یا نہیں میں جواب دو گے۔ اچھا تو سنو۔“ انہوں نے ایک بار میری طرف دیکھا۔

”وہ میری بھانجی صبا ہے جس کا امین میں نے تمہیں بنایا ہے۔ وہ ایک ایسا ہیرا میں نے تمہارے لئے چٹا ہے جس کی روشنی تمہاری زندگی کے لیے مینارہ نور ہوگی۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں بیٹا۔ یہ حقیقت ہے کہ صبا اتنی ہی اچھی لڑکی ہے۔ آج میں تمہیں مختصر بتاتی ہوں۔“

”صبا کی ماں میری چھوٹی بہن تھی سگی۔ مگر اُس کی زندگی نے وفانہ کی۔ وہ اسکول میں پڑھ رہی تھی کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور چہلم کے بعد ہی باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اور میں اُسے گھر لے آئی۔ صبا فطرتاً نیک، عفو و درگزر کرنے والی، باحوصلہ اور بہادر لڑکی ہے۔ اُسے زندگی گزارنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ میں نے اُسے لاہور ہوٹل میں داخل کرادیا۔ لاہور میں میرے بڑے بھائی بھانوج رہتے ہیں۔ وہ لا ولد ہیں صبا کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے وہ زبردستی صبا کو گھر لے آئے ہیں۔ میرے دو بیٹے تعلیم کے سلسلے میں امریکہ گئے تھے مگر باہر کی ہوا انہیں ایسی لگی کہ وہ شادی کر کے وہیں ٹھہر گئے۔ شادی بھی امریکن لڑکیوں سے کی۔ میں اُن کی صورت دیکھنے کو ترس گئی۔ بیٹیاں اپنے گھر کی ہو گئیں۔ تم ہی میری تشنہ لب ممتا کی تسکین تھے۔ کچھ میں نے تمہاری مرحوم ماں سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا، کچھ میں نے اپنی محبت کے تقاضے پورے کئے۔ خدا نے مجھے سب کچھ دیا تھا۔ مگر اولاد کی طرف سے میرے حصے میں یہ محرومی آئی تھی، سو آگئی۔ اتنا

ہونے کے باوجود انھوں نے نہ ماں باپ کا بھرم رکھا نہ ان کا حق ادا کیا۔ مگر یہ ساری کمی نفی اور محرومی تم نے دور کر دی بیٹے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ میری بڑی آرزو تھی کہ صبا میری بہو بنے۔ مگر میرے بیٹے اس اعزاز کے قابل نہ تھے۔ اس عزت اس نعمت اور اس لازوال دولت کے حق دار صرف تم تھے۔ اب مجھے بتاؤ کہ میرا یہ انتخاب کیسا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں.....؟“ انہوں نے معنی خیز نظروں سے مسکرا کر کہا۔

مجھے تو زندگی بھر کی صعوبتوں کا صلہ مل گیا تھا۔ یہ کیسا آسانی نغمہ تھا جس نے میری سماعت میں گھل مل کر مجھے مسحور کر دیا تھا۔ صبا۔ صبا۔ صبا یہ آوازیں باوصصر کی طرح میرے کانوں میں موسیقی بن کر گونج رہی تھیں۔ شاید آئنی نے میرے دل کی آواز سن لی تھی۔ آخر وہ ماں تھیں۔ میرے جواب کی منتظر نظریں میرے چہرے پر جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ میں دفعتاً جیسے ہوش میں آ گیا اور بے ساختہ اُن سے لپٹ کر بولا۔

”مجھے منظور ہے امی۔“

”امی؟“ انہوں نے میرا چہرہ اٹھا کر بغور مجھے دیکھا اور مجھے اسی بے تابی سے چومنے لگیں جس بے تابی کا میں نے اظہار کیا تھا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے تھے۔ مگر ہونٹوں پر بڑی شفیق مسکراہٹ تھی۔ دل تو میرا بھی بھرا آیا تھا جس نے میری پلکیں بوجھل کر دی تھیں۔ مگر وہ موقع آنسو گرانے کا نہیں تھا۔ میں نے اُن کے ہی آنچل سے اُن کے آنسو پونچھے اور دونوں ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگالی۔

”بس امی آج سے آپ میری آئی نہیں امی ہیں.... آپ کا حکم میری عبادت کا درجہ رکھتا ہے آپ کے قدموں میں میری جنت ہے۔ آج مجھے محسوس ہوا کہ میں تو آپ ہی بیٹا تھا آج سے نہیں ہمیشہ سے۔“

”جیتے رہو بیٹا۔ خوش رہو میری تمام زندگی کی محرومی آج دور ہوگئی تم نے میرا مان رکھ لیا۔“

انہوں نے پھر مجھے گلے سے لگالیا۔ آج میں واقعی بہت خوش تھا۔ صبا میری ہے۔ میری تھی۔ اس نوبہد مسرت نے مجھے کتنے ہی دن سرشار رکھا۔

صبا نے تعلیم ختم کر لی تھی اور اب وہ اپنے بڑے ماموں ممانی کے ساتھ کراچی آ رہی تھی۔ امی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ میں لہن کو اپنے ہی گھر رخصت کر کے لے جاؤں گا۔ اس پر انہوں نے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ مکان کی کچھ مرمت کرا دی۔ کچن بڑا کر کمرہ بڑا کر دیا۔ کچن دوسری طرف بنوایا۔ رنگ و روغن کروا دیا۔ کمرے کی سیٹنگ خود میں نے کی۔ کمرے کی سجاوٹ میرے شاگردوں نے کی۔ گھر کی ہینٹ ہی بدل گئی تھی۔ کتہ خوی صورت اور کھٹلا کھٹلا لگ رہا تھا۔ بڑے بڑے پلانٹ کے گیلے امی نے منگوا کر سجادیے

تھے۔ دیواروں پر بوگن ویلیا اور رات کی رانی کی بلیں چڑھادی تھیں۔ امی کے وقتوں کا پُرانا سامان جو بیچ گیا تھا ایک ٹرک میں بھر کر اسٹور میں رکھوا دیا تھا۔ اسی میں نانا مرحوم کی یادگار چیزیں بھی تھیں یہ رکھتے ہوئے میں کتنا رویا تھا۔ امی نے مجھے پیار سے گلے لگاتے ہوئے تسلی دی اور کہا۔

”بیٹا۔ یہی زمانے کا دستور ہے۔ آگے جانے والا اپنی جگہ پیچھے رہ جانے والے کے لیے خالی کر دیتا ہے۔ زندہ انسان کے ساتھ کتنے مراحل کتنے مسائل ہوتے ہیں۔ اگر وہ مرنے والے کی یادوں کو سینے سے لگائے اپنا قیمتی وقت اُس کے ماتم میں گزارے گا میں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے اور مسکرا کر بولا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں

امی“ اور میری شادی ہوگئی۔ امی نے خوب خوب ارمان نکالے تھے۔ سمجھے کہ انہوں نے پہلے بیٹے کی شادی کی تھی اور گھر میں پہلی بہو آئی تھی۔ صبا کو پا کر میں نے دنیا کی ہر خوشی پائی تھی۔ واقعی وہ ایک مثالی لڑکی تھی۔ میرا پورا گھر آرائشی سامان، جدید کراکری اور فرنیچر سے آراستہ ہو گیا۔ میں نے اس پر اعتراض کیا تو امی نے کہا۔

”بیٹا یہ ساری چیزیں اُن کے بڑے ماموں نے صبا کو دی ہیں۔ یہ ضروری چیزیں تھیں۔ ان میں کوئی اضافی چیز نہیں جھینر کے خلاف تو میں بھی ہوں، مگر یہ جھینر نہیں ہے بیٹی کے لیے خانہ داری کا ضروری سامان ہے جو صبا خود اپنی پسند سے لائی ہے۔“

یہ سن کر میں خاموش ہو گیا اور اُس کی پسند کا میں دل سے معترف ہو گیا۔ ان دنوں میں بہت خوش تھا۔ وہ جب بھی سامنے آتی ایک نئے روپ۔ نئی جج دھج سے اُسے پہننے اوڑھنے کا بڑا سلیقہ تھا۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ قدرت نے مجھے اتنی اچھی رفیقہ حیات دی ہے۔

اُس دن میں ایس لی ایم سے ایک دستاویزی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ فلم میں ”ہیٹی“ کے حالات دکھائے جا رہے تھے۔ ایک بھوکے ننگے قافلے نے امداد میں بھیجا ہوا پورا ٹرک لوٹ لیا تھا۔ فوجی مزاحمت بھی کام نہ آئی۔ مقامی لوگ آٹے کی بوریاں اٹھا اٹھا کر بھاگ رہے تھے۔ اکثر کے ہاتھوں میں پتھر یاں تھیں۔ بندوق کی گولی بھی اُن کا راستہ نہ روک سکی۔ سارا سامان کھانے کے تھیلے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئے کچھ زخمی بھی ہوئے۔ جب فوج سے پوچھا گیا کہ تمہارے ہوتے ہوئے یہ افراتفری کیوں ہوئی؟ انہیں اسلحہ کے زور پر کیوں نہ روکا گیا۔ تو انہوں نے جواب دیا۔

”سر ہم نے ان کی آنکھوں اُن کے چہروں پر بھوک کے شعلے لپکتے ہوئے دیکھے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں بڑے بڑے پتھرے تھے جن سے وہ ہم پر حملہ آور ہوئے

”صبا جان۔ کوئی بھوت پریت نہیں۔ بعض وقت ہمارے اندر خود طلسمی شہر نمودار ہو جاتے ہیں اور اس میں محیر العقول مخلوق دندناتی پھرتی ہے۔ کبھی وہ ہم سے اور کبھی ہم اُس سے ڈر جاتے ہیں۔ بس ایک ایسا ہی مرحلہ شاید اس وقت پیش آ گیا تھا۔“ میں چپ ہو گیا۔ صبا نے مسکرا کر کہا۔

”پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ آپ منہ ہاتھ دھو لیجئے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی..... ”میں آپ کے لیے گرم گرم سوپ لارہی ہوں۔“

وہ چلی گئی اور میں سوچنے لگا کہ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ صبا نے کیا سوچا ہوگا۔ میرے پاس اب کیا کچھ نہیں ہے۔ میرا ایکسپورٹ اپورٹ کا علیحدہ دفتر تھا۔ میں نے اپنی امی کا گھر کرائے پر اٹھا دیا تھا اور ایک معروف علاقے میں اپنا اپنا ایک خوبصورت بنگلہ بنوایا تھا جہاں ہماری رہائش تھی۔ نئے ماڈل کی کار تھی۔ ایک بیٹا ایک بیٹی قدرت نے دل بہلانے کے لیے بھیج دی تھی۔ محبتوں اور پیار سے گندھی نرم نرم خوشبو خوشبو باتیں کرنے والی بیوی ملی تھی۔ اور یہ سارا کرم عنایتیں، محبتیں اور شفقتیں بیگم رقیہ اعجاز کی تھیں۔ جن کے ہاتھوں میں میری مظلوم ماں میرا ہاتھ تھما گئی تھی۔ اُس عالی ظرف خاتون نے واقعی مجھے فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا تھا۔ میری ادھوری تعلیم پوری کی۔ میرا ہر طرح خیال رکھا۔ ایک ماں کا بھرپور پیار دیا۔ اور پھر میری شادی اپنی بھانجی سے کردی۔ مجھے اپنے خاندان میں شامل کر کے مجھے فخر و عزت کا مقام دیا تھا۔ مگر آج بھی قدرت کی یہ بخشی ہوئی نعمتیں مجھے پُرسکون رکھنے کے لیے ناکافی تھیں۔ یہ میری بد نصیبی تھی کہ میں کفران نعمت کا مرتکب ہوا تھا۔ ذہن کی کوئی روڈ دل کا کوئی گوشہ ماضی کی ان نا انصافیوں، رشتوں، زیادتیوں اور بے رحمیوں کی کر بنا کیوں سے اتنا متاثر رہا تھا کہ میں خود اپنی زندگی سے انصاف نہیں کر سکا تھا۔ ایک دن صبا نے بڑے پیار سے کہا۔

”میں آپ سے یہ نہیں پوچھوں گی کہ اچانک آپ کو کیا ہو جاتا ہے۔ اس قدر ڈسٹرب کیوں ہونے لگتے ہیں مگر میں آپ کو کسی سائیکا ٹرسٹ کو ضرور دکھانا چاہتی ہوں۔ کچھل دفعہ آپ کی حالت دیکھ کر میں حیران تھی۔ خدا نے ہمیں ہر خوشی اور ہر نعمت دی ہے۔ پھر آپ کو کیا غم ہے جو اندر ہی اندر آپ کو اپنے سے بے خبر کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک چٹ لکھ کر دی تھی۔ اس پر سائیکا ٹرسٹ ڈاکٹر منشور کا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔ اس نے ہدایت کی تھی کہ میں آپ کو اُسے ضرور دکھاؤں۔

میں نے حیران اور کچھ ڈس موڈ ہو کر صبا کی طرف دیکھا۔

”کیا تم مجھے پاگل سمجھتی ہو؟“ میرا لہجہ بے حد کاٹ دار تھا۔ مگر صبا ہنس پڑی۔

تھے۔ ہم ایک طرف ہٹ گئے۔ انہیں نہیں روک سکے کیونکہ ہم یہ امدادی سامان لے کر جا رہے تھے۔ شاید یہ لوگ اُن سے زیادہ مستحق تھے۔ وہ ایک طاقت بن کر آئے تھے۔“

”کیا وہ تم سے زیادہ طاقتور تھے؟ ننگے بھوکے لوگ اور تم اُن کی چھریوں سے ڈر گئے۔ اُس دن میری طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ جس نے بھوک کی اذیت اٹھائی ہے وہی اس کی کیفیت میں مبتلا بد نصیبوں کا حال سمجھ سکتا تھا۔ اور ایسے منظر دیکھ کر یا تو میں بے ہوش ہو جاتا تھا یا مجھ پر ہڈیانی کیفیت طاری ہو جاتی اور میں چیخنے لگتا۔

شادی کے بعد پہلی دفعہ میری یہ حالت ہوئی اور اس شدت سے کہ میں اپنے ہوش و حواس جیسے کھو بیٹھا تھا۔ صبا بھاگی بھاگی پھرنے لگی۔ کبھی وہ مجھے سنبھالتی بھی جا کر پانیلاتی۔ کبھی ڈاکٹر کو فون کرنے لگتی۔ کبھی مجھے سمجھانے لگتی اور پُپ کرانے کی کوشش کرتی اور آخر گھبرا کر رونے لگتی۔ ڈاکٹر آیا اُس وقت میرا چیخنا بند ہو گیا تھا۔

”ڈاکٹر۔ یہ تو بے حد صبر پسند انسان ہیں ان کے تو سب دوست ہیں جھگڑا یہ کس سے کریں گے۔ مگر پتہ نہیں لی وی دیکھتے دیکھتے انہیں کیا ہو گیا کہ چیخنے لگے۔ ایسی حالت تو کبھی نہیں ہوئی۔“

”لی وی پر کیا دکھایا جا رہا تھا؟“

”پتا نہیں میں کچن میں تھی۔“

اُس نے ہر طرح سے ڈاکٹر کو مطمئن کرنا چاہا۔ مگر ڈاکٹر نے مجھے ایک انجکشن دے کر کہا۔

”یہ کچھ دیر میں پُرسکون ہو جائیں گے، لیکن آپ انہیں کسی سائیکا ٹرسٹ کو دکھادیں ان کا کیس نفسیاتی معلوم ہوتا ہے۔ میں آپ کو پرچا لکھ دیتا ہوں۔ آپ انہیں لے کر چلی جائیے گا۔“

”شکریہ۔ ڈاکٹر صاحب“ وہ پرچہ سائیکا ٹرسٹ ڈاکٹر منشور کے لیے تھا۔ وہ چلا گیا۔

کچھ دیر بعد میں ہوش میں آ گیا۔ میری نگاہ سامنے پریشان بیٹھی صبا پر پڑی تو میں چونک اٹھا۔

”کیا بات ہے صبا۔ یوں خاموش کیوں بیٹھی ہو۔ بچے کہاں ہیں؟“

صبا اٹھ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور پیار سے سر سہلاتے ہوئے مسکرا کر پوچھنے لگی۔

”بچے اپنی نانوں کے گھر ہیں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ آپ نے کون سا بھوت دیکھ لیا تھا لی وی پر جس سے خوف زدہ ہو کر چیخنے لگے تھے اور میرے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ بڑی دیر تک میں اُس سے نگاہ ملانے کے قابل نہ رہا۔ پھر میں نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اور والدہ کی بید غلی سے لے کر اب تک کے تمام واقعات مجھے لکھ کر دے دیں۔ کوئی گوشہ آپ کی زندگی کا مخفی نہ رہے۔ اس کے بعد میرا طریقہ علاج شروع ہو جائے گا۔“

”اس طرح میں نے اپنی خود نوشت لکھنا شروع کی..... زندگی کا ہر موڑ۔ ہر خلیج۔ ہر نشیب میں نے شامل کر دیا۔ کچھ بھی چھپا کر نہ رکھا۔ دراصل میں خود ایسی ذہری زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بہت دُکھ جھیل لیے تھے۔ اور ان بوجھل بوجھل سوچوں کا بوجھ اٹھائے اٹھائے تھک گیا تھا۔ میں نے بڑی ذہانت داری سے اپنا محاسبہ کیا تھا۔ پھر وہ کیس ہسٹری میں نے ڈاکٹر کو دے دی۔ اُس میں ڈاکٹر سے میں نے ایک مشورہ مانگا تھا۔ کہ شاید میرے علاج میں کوئی مدد مل جائے انہیں۔

میں ایک فلاحی ادارہ قائم کرنا چاہتا تھا جہاں نادار، بیوہ، عورتیں، یتیم بچے اپنی روزی بھی کمائیں اور تعلیم بھی حاصل کریں۔ جن عورتوں کے پاس سر جھپانے کی جگہ نہ ہو، اُن کے لیے وہاں رہائش کا بھی انتظام کیا جائے۔ کوئی عورت، کوئی بچہ بھوکا ننگا اور جاہل نہ رہے۔

☆....☆....☆

صبا بہت خوش تھی۔ اور مجھے ڈاکٹر منشور کے فون کا انتظار تھا۔ اس عرصے میں کوئی پارٹی اینڈ کی نہ میں کسی تقریب میں گیا۔ بس گھر سے آفس سے گھر۔ یہ میری اپنی احتیاط تھی۔ ایک ہفتے بعد ڈاکٹر منشور نے مجھے فون پر کہا۔ ”آپ کل تشریف لے آئیں۔“

ہم جب وہاں پہنچے تو ڈاکٹر کا موڈ بہت اچھا تھا۔ بڑی گرمجوشی سے اُنھوں نے مصافحہ کیا اور مسکرا کر بولے۔

”مسٹر جہاں زیب آپ کی اسٹوری ہماری دنیا سے ماورا نہیں ہے۔ ہماری قومی اور معاشرتی نظام میں ایسے مناظر عام دیکھنے میں آتے ہیں۔ انسانی زندگی کا یہ بڑا المیہ ہے۔ اس پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا، بلکہ انسان کی اپنی ”دل پاؤز“ ہوتی ہے جو اُسے اس بحران سے نکالنے کا سبب بنتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس فیلڈ میں آپ کافی تجربہ حاصل کر چکے ہیں مگر اسے اپنے حواسوں پر طاری کرنے کی کوشش نہ کریں۔ رہ گئی ماضی کی مویشا گافیاں تو انسان کا ماضی اُس سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی زندگی کی جڑیں ہیں جو ماضی سے جال و مستقبل تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، انہیں اکھاڑ کر پھینکا نہیں جاسکتا۔ یہ تو ہر انسان کے تشخص کی اپنی پہچان ہے۔ چنانچہ آپ اپنی ہی قوت ارادی سے اس بحران پر قابو پانے کی کوشش کیجئے۔ اس کے علاوہ آپ نے رفاجی ادارے کی جو پلاننگ کی ہے، بڑی سودمند ہے۔ خود آپ کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ اچھا مشغلہ بھی ہے اور خدمتِ خلق بھی۔ اپنا کچھ وقت پُر فضا مقام پر گزاریں اور ذہن کو ہلکا پھلکا چھوڑ دیں، کچھ نہ سوچیں

”خدا نہ کرے جہاں زیب پاگل آپ کے دشمن ہوں۔ اگر آپ اپنا مکمل چیک اپ کرائیں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اب ماضی کے ان تکلیف دہ حالات کا تاثر ختم ہونا چاہیے۔ ہم زندگی کی تمام وکمال مسرتوں کو انجوائے کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا حال و مستقبل شاندار ہے۔ ہمارے پیارے پیارے بچے ہیں۔ ہم سوسائٹی کے رُوح رواں ہیں۔ ہمارا اپنا ایک اینٹیٹس ہے اب آپ کو سب کچھ بھولنا پڑے گا۔ وہ جو کچھ تھا منجانب اللہ تھا۔ آزمائش تھی۔ لیکن اب یہ آزمائش کے دن ختم ہو گئے، مصائب کا نعم البدل ہمیں اچھے مستقبل کی صورت میں مل گیا ہے۔ اس کے لیے ہر لمحہ شکر گزار ہونا چاہیے نہ کہ ان نعمتوں کو ٹھکرانا، انہیں نظر انداز کرنا یا ماضی کی نا انصافیوں کو یاد کر کے اپنے کو وقف الم کر دینا کسی طرح جائز نہیں۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کی زندگی کے اُن تاریک گوشوں کو منور کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز آپ انکار نہ کیجئے گا۔ میری اور ان بچوں کی خاطر۔ میرا جہاں آباد رہے۔ اور مجھے کچھ نہیں چاہئے۔“ صبا نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا اور میرا دل پانی پانی ہو کر بہنے لگا۔ صبا میری زندگی تھی۔ میرے دُکھوں کا انعام تھی۔

میری مانگی ہوئی بہت سی اچھی دعاؤں میں سے ایک دعا تھی۔ میرے دیکھے ہوئے اُن گنت خوابوں میں سے ایک خواب کی حسین تعبیر تھی۔

وہ قدرت کی ایک عطا اور میری خوش بختی تھی۔

سچ پوچھیں تو میں بھی اس طلسمی جال سے نکلنا چاہتا تھا۔ ان حالات سے تنگ آ گیا تھا۔ ان زنجیروں کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ میں ماضی کے دروازوں کو ہمیشہ کے لیے بند کر دینا چاہتا تھا۔ صبا کی کوئی بات رو کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر وہ نہ ہوتی تو میں نہ ہوتا۔ میں نہ ہوتا تو وہ نہ ہوتی۔ ہم دونوں لازم و ملزوم تھے۔ میں اُسے دکھ دینے یا ناراض کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بھی یہ بات آسان معلوم ہوئی کہ میں ڈاکٹر منشور کے پاس چلا جاؤں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب جو بھی ہو، میں صبا کے ساتھ ڈاکٹر منشور سے ضرور ملوں گا۔ یہ سوچ کر میرا ذہن ہلکا پھلکا ہو گیا۔

پھر صبا نے ڈاکٹر منشور سے ٹائم لے لیا۔ اور ایک روشن دن ہم نے اُس سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر نے مکمل طور پر میرا چیک اپ کیا۔ اور مسکرا کر بولے۔

”مسٹر جہاں زیب۔ آپ جسمانی طور پر ماشاء اللہ بالکل صحت یاب ہیں۔ ذہن بھی آپ کا فریش لگتا ہے مگر جیسا کہ آپ کی بیگم صاحبہ نے آپ کے ماضی کے متعلق چند باتیں میرے گوش گزار کی ہیں، جنہوں نے آپ کے ذہن کو متاثر کیا ہے، میں نے سن لی ہیں مگر دراصل میں آپ کی کیس ہسٹری خود پڑھنا چاہتا ہوں۔ آپ اپنے والد کے انتقال

اور بھابی صاحبہ.....“ ڈاکٹر منشور صبا سے مخاطب تھے۔
 ”اپنے گھر کا ماحول باغ و بہار۔ طرب و خوش کن بنائیں انسان کی پناہ گاہ اُس کا گھر
 ہی تو ہوتا ہے۔“

☆...☆...☆

ڈاکٹر منشور کی باتوں نے میرے ذہن کی ساری کھڑکیاں کھٹکھٹ کھول دیں۔ اور
 تازہ ہوانے مجھے روحانی مسرت سے دوچار کیا تھا۔ زندگی اتنی بے قیمت اور غیر اہم نہیں
 تھی کہ جسے خواہ مخواہ حالات کی سرد مہری کے سپرد کر دیا جائے۔ زندگی انمول تھی اور
 خوشیاں انسان کو کہیں راستے میں پڑی ہوئی نہیں ملتیں۔ اُن کی قدر کرنا چاہیے۔ یہ نسخہ کیمیا
 میں نے اپنی زندگی میں شامل کر لیا تھا۔ ساتھ ساتھ فلاحی ادارے پر بھی کام شروع کر دیا
 تھا۔

وہ میرے دوست کا چار سو گز کا پلاٹ تھا۔ جسے اُس نے اسی مقصد کے لیے گفٹ کر دیا
 تھا۔ رقیہ بیگم نے اس میں بھی دلچسپی کا اظہار کیا۔ دو سال کے عرصے میں وہ عمارت بن کر
 تیار ہو گئی۔ پھر اُسے یتیم بچوں، نادار اور بیوہ عورتوں کی ”پناہ گاہ“ بننے میں دیر نہ لگی۔ بہت
 سی اصلاحات کے دروازے کھل گئے۔ کچھ لوگ رضا کارانہ طور پر اس کار خیر میں شریک
 ہوئے۔ کچھ نے پس پردہ مدد کی۔ اور آج زندگی کا وہ آدھا چہرہ مکمل ہو گیا تھا۔ جو میں
 نے حالات کے آئینے میں اکثر دیکھا تھا۔ یہ درست تھا کہ انسان کا ماضی اُس سے کبھی
 جدا نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ سو میرے اندر بھی میرا ماضی زندہ تھا اور اُس کے
 حوالے ہی سے یہ ”پناہ گاہ“ معرض وجود میں آئی تھی۔ آج بھی جب میں کسی کوننگا بھوکا
 دیکھتا ہوں تو اُس کی ستر پوشی اور شکم پر سی کے لیے دوڑ پڑتا ہوں۔ یہ چیز میری سرشت میں
 داخل ہو چکی ہے۔ اب نہ میں چیختا ہوں نہ بکھرتا ہوں نہ گھبراتا ہوں۔ میرے ساتھ میری
 شریک حیات صبا میرے مشن میں میرے قدم سے قدم ملا کر چلتی ہے اور مجھے گامد کرنی
 ہے۔

میں ”بھوک“ کو کوئی پرتو نہ لڑکا سکا البتہ اس کی تسکین کے راستے تلاش کر لیے ہیں۔

☆...☆...☆



”شیبا! آپ اتنی چائے نہ پیا کریں۔ سینہ جلادیتی ہے۔“ بھوک مرجاتی ہے
 تب ہی تو آپ ایک روٹی سے زیادہ نہیں کھاتیں ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آپ کا
 خون گاڑھا ہو گیا ہے کیونکہ آپ پانی کم اور چائے زیادہ پیتی ہیں اب آپ چائے کم اور
 پانی زیادہ پیا کریں تاکہ خون پتلا ہو اور اس میں تحریک پیدا ہو یہ آپ کے جوڑوں میں درد
 بھی شاید اسی وجہ سے ہو گا۔“ زرقون نے مسکراتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔
 ”ارے چند! اب جلنے کے لیے باقی رہ گیا ہے۔ سب کچھ تو جدا یوں دکھوں اور
 پچھتاؤوں کی آگ نے جلا ڈالا۔ یہ تو زندگی کے کھنڈر میں ایک بے کل روح ہے جو
 تنہائیوں سے گھبرا کر درد کی شکل میں جسم کی دیواروں سے ٹکریں مارتی رہتی ہے اور یہ اسی
 ایک روٹی اور ان گنت چائے کے پیالوں کا کمال ہے جس نے آتی جاتی سانسوں کی
 ذوری کو تھام رکھا ہے۔ ورنہ تمہاری شیبہ آئی بھی کی آسمانوں پر پرواز کر جاتیں۔“ یہ کہہ
 کر وہ خوب ہنسیں اور بارہ سالہ زرقون حیران رہ کر ان کے چہرے پر بکھری ہوئی روشنی
 دیکھتی رہی جب بھی وہ ہنستی تھیں ان کا چہرہ چمکنے لگتا تھا۔ آج بھی وہ بہت حسین تھیں ان کی
 براؤن آنکھیں، اجلی رنگت اور نقش کسی تعریف کے محتاج نہیں تھے ان کی آواز میں جھرنوں
 جیسی موسیقی اور لہجے میں کپکپ سیب کی چاشنی تھی۔ پچاس سال کی تھیں مگر چالیس
 سے زیادہ نہیں لگتی تھیں۔

شیا آئی! میری دادی امی کی سہیلی تھیں۔ کافی زیادہ وقت انہوں نے ساتھ گزارا تھا، دادی امی نے بتایا تھا کہ موسیقی کے ایک پروگرام میں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور ان دونوں نے ایک دوسرے کو اس طرح مسکرا کر دیکھ لیا تھا۔ جیسے بڑی پرانی شناسائی ہو۔ شیا آئی کے ساتھ ان کی سوتیلی چھوٹی بہن دلنواز بھی تھی۔ وہ شیا سے تقریباً پانچ سال چھوٹی تھی۔ گلاب کی ادھ کھلی کھلی کی طرح ان چھوٹی۔ نرم اور خوشبو میں بسی ہوئی نظر افروز جسے دیکھ کر ہاتھ بڑھا کر چھو لینے کو جی چاہے۔ دادی امی کہتی تھیں، دونوں بہنیں قدرت کا حسین شاہکار تھیں۔

میں نے اس سے پہلے کبھی شیا آئی کا نام نہیں سنا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میری دادی امی کی بھی کوئی سہیلی تھیں۔ کیونکہ دادی امی دوست بنانے کی قائل نہیں تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ محض وقت کا زیاں ہے دوستی اگر کرنی ہے تو کتابوں سے کرو، پھولوں اور خوبصورت پرندوں سے کرو ان کی سچائی اور معصومیت تمہیں زندگی سے پیار کرنا سکھا دے گی اور نہ تم اپنے آپ سے نفرت کرنے لگو گے، اپنی سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں۔ یہاں تو اسکول سے لے کر کالج تک لڑکے، لڑکیوں کی اتنی سہیلیاں اور دوست ہوتے کہ ٹیم کا گمان ہوتا تھا مگر دادی امی کا فلسفہ یہ تھا کہ دوستی کے لائق صرف بے زبان ہوتے ہیں۔ کتابیں بھی بے زبان ہوتی جنہیں ہم زبان دیتے ہیں اور پھول، پرندے بھی بے زبان جن سے باتیں کر کے، جنہیں دیکھ کر ہم محظوظ بھی ہوتے ہیں اور اس خالق کائنات کے شایعہ خواں بھی جس نے دنیا کو اتنے عجائبات اور حسین رنگوں، خوشبوؤں سے نوازا، سچا بہر حال دادی امی کے اس انکشاف پر دادی امی کی بھی کوئی سہیلی ہے، ہم دونوں بھائی بہن کو بڑی خوشی ہوئی تھی کہ ہماری دادی امی کی بھی کوئی سہیلی تھی۔ پھر ایک دن شیا آئی ہمارے گھر دادی امی سے ملنے آئیں تو پہلی بار انہیں دیکھ کر دادی امی کے انتخاب اور ان کے حسن ذوق کی داد دینا پڑی۔ شیا آئی کتنی پیاری، کتنی خوبصورت تھیں، انہیں دیکھ کر بے اختیار پیار آتا تھا۔

☆...☆...☆

میں نے جب ہوش سنبھالا تو میں دادی امی کی بڑی سی کوٹھی اور بہت سے نوکروں کے ہمراہ تھی۔ میرے ساتھ میرا ایک بھائی بھی تھا۔ جو مجھ سے دو سال بڑا تھا۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے جب دادی امی کی تنہائی کو دیکھ کر پاپا اور ماما نے مجھے امریکہ سے بھیجنے کا فیصلہ کیا تو حسن بھی بھند ہو گیا کہ میں بھی دادی امی کے پاس جاؤں گا۔ آخر پاپا کو اسے بھی ساتھ بھیجنا پڑا۔ اب ماما کے پاس میری چھوٹی دو بہنیں مریم اور حریم اور دو بھائی نوفل اور رافیل رہ گئے تھے۔ ہمیں پاکستان دادی کے پاس بھیجنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہم

دادی کے زیر سایہ اچھی تعلیم و تربیت حاصل کریں۔ امریکہ میں کون ہم پر توجہ دیتا کیونکہ ماما اور پاپا دونوں جاب کرتے تھے۔ اس طرح میں اور حسن چھ اور آٹھ سال کی عمر میں دادی کے پاس آ گئے تھے۔ یہاں میری دو چچا چچی اور ان کی اولادیں بھی رہتی تھیں مگر وہ علیحدہ فلیٹوں میں تھے اور دادی امی سے ملنے آ جاتے تھے۔ اکثر میرے کزن کئی کئی دن کے لیے آ کر رہ جاتے تو بہت اچھا لگتا تھا۔ دو ٹیوٹر گھر بڑھانے آتے تھے ہم دونوں کو ایک انگلش اور حساب دوسرا عربی اور دینی تعلیم دینے پھر خود دادی امی بھی ہم دونوں کو پڑھاتی تھیں۔ پیغمبروں کی کہانیاں، اچھے لوگوں اور اللہ رسول کی باتیں۔ جنت، دوزخ اور گناہ ثواب کی باتیں بتاتی سمجھاتی تھیں اور جب رات کو میں دادی امی کے پاس لیٹی تو میں ان سے پریوں اور جنوں کی کہانیاں ضرور سنتی تھی۔ انہی کہانیوں میں وہ مجھے اکثر ”سفید محل“ کی ایک پراسرار کہانی بھی ضرور سناتی تھیں۔ میں بڑے شوق سے سنتی تھی۔ محبتوں اور طویل جدائیوں کی وہ کہانی جو نفرتوں کے سائے میں پروان چڑھی پھر ایک دوسرے کی طلب میں بہر فانی غرق ہو گئے یا غرق کر دیے گئے۔

دلنواز اور دلشاد۔ اس کہانی کے دو کردار تھے۔

جول مل کر پھرتے رہے۔ ان کے درمیان دیواریں کھڑی ہوتی رہیں اور یہ دیواریں کھڑی کرنے والی خود اس کی سوتیلی بہن رشنا تھی۔ جو اپنی بہن سے بے ظاہر ٹوٹ کر محبت کرتی تھی مگر باطن میں نفرتوں کی وہ آماجگاہ تھی جہاں وہ اپنی محبوب دلشاد کی خاطر قتل کر دینے سے بھی نہ دریغ کرتی۔ جب کہ دلشاد ہمیشہ رشنا کا بڑی بہن کی طرح احترام کرتا تھا۔ لیکن رشنا اس سے محبت کرتی تھی اور دلشاد دلنواز کو اپنی زندگی سمجھتا تھا اور دلنواز دلشاد کے بغیر جینے کا کوئی تصور نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں شاید قدرت نے ایک دوسرے ہی کے لیے پیدا کیا تھا۔ ہاں اگر دلنواز اور دلشاد کو پہلے معلوم ہو جاتا کہ اسکی بہن دلشاد کو پسند کرتی ہے تو وہ یقیناً ان کے راستے سے ہٹ جاتی اور دلشاد کو بھی اپنی محبت کا واسطہ دے کر رشنا سے شادی کرنے پر آمادہ کر لیتی لیکن اس امر کا انکشاف اس وقت ہوا جب وہ دونوں اپنی اپنی زندگیاں ایک دوسرے کے حوالے کر چکے تھے۔ ان کی خوشیاں ایک دوسرے سے مربوط ہو چکی تھیں اور وہ اتنی دور نکل چکے تھے کہ واپسی کے تمام دروازے بند ہو گئے تھے۔

”رشنا! یہ سراسر زیادتی ہے، میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ دلنواز کی محبت تو میرے خون کے ساتھ شریانوں میں دوڑ رہی ہے۔ میں کس طرح اس سے دستبردار ہو جاؤں۔ تم کیسی بہن ہو کہ اس قدر محبت کرنے کے باوجود اس سے اسکی زندگی مانگ رہی ہو؟“

ایک دن رشنا جب دلشاد کا راستہ روک کر اس سے اپنے دل کی بات کہی تو پہلے وہ

حیران ہوا پھر فیصلہ کن لہجے میں صاف انکار کر دیا کہ ”ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا رشتا۔ دل کے علاوہ ہر چیز مانگ سکتی ہو میں بخوشی دینے کو تیار ہوں مگر اس دل پر صرف دلنواز کا حق ہے۔“

”آخر کیوں دلشاد میری طرف دیکھو کیا میں دلنواز کی طرح خوبصورت نہیں ہوں۔ میرے بال میری آنکھیں میرا چاند چہرہ صراحی دار گردن میری مورنی جیسی چال تمہیں نظر نہیں آتی۔ میری آواز میں تمہیں موسیقی کا گماں نہیں ہوتا۔ آخر دلنواز میں ایسی کیا چیز ہے جو مجھ میں نہیں ہے؟“ رشتا بڑے انداز دلربائی اور تفاخر سے دلشاد کا طواف کرتی رہی مسکراتی رہی اور اپنے سنہرے لمبے بالوں پر مسکرا مسکرا کر ہاتھ پھیرتی رہی۔

دلشاد نے بڑے غور سے اسکو دیکھا اور بولا۔ ”جو بھی تمہیں ملے گا اپنے بخت پر ناز کرے گا۔ تم واقعی حسین ہو رشتا لیکن محبت یہ سب کچھ نہیں دیکھتی۔ میں نے اپنی محبت کو کبھی حسن و رعنائی کے میزان پر نہیں رکھا۔ یہ جذبے کی حوالے اور جواز کے محتاج نہیں ہو جتے وہ خود بخود اپنی جگہ بنا لیتے ہیں بس مجھے وہ اچھی لگتی ہے اس کی معصومیت اور بے ساختگی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور ہماری آنکھیں ایک دوسرے کا آئینہ بن گئیں اب دلنواز کے بغیر یہ دنیا بیچ لگنے لگی۔“

رشتا کے چہرے کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ اس نے غصے میں بل کھا کر کہا۔ ”دلشاد! تم تمام زندگی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگو گے مگر پانہیں سکو گے۔ یہ میرا چیلنج ہے۔“

”یہ تمہارا چیلنج نہیں رشتا تمہارا کمپلکس ہے۔ وہ نفرت ہے جس پر تم نے دلنواز کی محبت کا ملمع چڑھا لیا ہے اور شاید تم یہ بھول گئی ہو کہ ہم جیسے محبت کے پنچھیوں کے دلوں میں بسیرا ہوتا ہے کسی پڑاویا شاخ پر نہیں تم اپنی سی کوشش کر لو۔ ہماری گرد بھی نہ پاسکو گی۔“ وہ چلا گیا اور رشتا تلملا کر اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

☆...☆...☆

”یہ سفید محل“ ملکہ جویریہ خانم نے پہاڑ کاٹ کر اپنے لیے بنوایا تھا۔ کیونکہ انہیں پہاڑ درخت اور سمندر بہت پسند تھا۔ وہ پورا محل سفید ماربل سے تیار ہوا تھا۔ رات کو ستاروں کی مدھم اور ٹھنڈی روشنی میں چاندی کی طرح چمکتا تھا اور چاندنی میں نور سے نہایا ہوا کوئی شاہکار لگتا۔ اس کی کچی دیواروں سے سمندر کی موجیں اٹکھلیاں کرتی گنگنائی ہوئی گزرتی تھیں۔ محل کے اطراف میں سفیدے کے اونچے اونچے درخت اور ہرے بھرے باغ تھے۔ جس میں ہر قسم کے پھل دار درخت تھے۔ پھولوں کے تختے تھے اس کے بعد سروٹ

کو ارٹز تھے۔ ملکہ جویریہ کے شوہر جلال آفندی بھی بڑے رکھ رکھاؤ کے انسان تھے ان کی فیملی عرصہ ہوا ایران سے پاکستان آ گئی تھی۔ ان کے کئی بیٹے بیٹیاں تھیں۔ سب بیٹے بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ دو بیٹیاں اپنی سسرال میں تھیں اور دو سفید محل میں رہتی تھیں۔ شہزادی ناز پرور تھیں۔ بے حد حلیم طبع، مخلص نرم خواہر محبت کرنے والی تھیں۔ ساس ان سے بہت خوش تھیں کیونکہ انہوں نے سسرالی رشتے بڑے رواداری اور خلوص سے نبھائے تھے۔ سارے دیور اور ننڈیں شہزادی ناز پرور کے گرویدہ تھے۔ اسی لیے ملکہ جویریہ ناز پرور کو بہت چاہتی تھیں اور اپنی بہت سی ذمے داریوں میں بھی اسے حصے دار بنالیا تھا۔ جنہیں وہ بڑے تدبیر سے پوری کرتی تھی لیکن ملکہ جویریہ بڑی سخت مزاج، اصول پرست اور تخم پسند خاتون تھیں۔ پورے محل پر ان کا راج تھا اور ان کے بیٹے بہوان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ سارے کام دادی حضور ملکہ حضور کی خواہش پر ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ زندگی کے تمام فیصلے بھی۔ سب بیٹیوں اور بیٹوں کی شادیاں بھی ان کی مرضی سے ہوتی تھیں۔ پرنس دلشاد شہزادی ناز پرور یعنی بلال آفندی کے صاحبزادے تھے اور دلنواز دوسرے بھائی کی دوسری بیوی کی بیٹی تھی۔ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور اس سے ایک بیٹی رشتا تھی۔ دلنواز کو اس کے سب کزنز پسند کرتے تھے۔ مگر دلنواز صرف دلشاد کو چاہتی تھی اور دلشاد نے بھی ساری لڑکیوں میں صرف دلنواز کو منتخب کیا تھا۔ ابھی تک یہ بات صرف دلوں تک محدود تھی۔ زبان پر نہیں آئی تھی۔ فیصلہ ملکہ جویریہ کے ہاتھ میں تھا۔ وہی مستقبل کے فیصلے کرتی تھیں۔ شہزادی ناز پرور جانتی تھیں کہ ان کا بیٹا صرف دلنواز کو پسند کرتا ہے اور وہ اپنی دیورانی ماہ رخ کے کانوں میں بھی یہ بات ڈال چکی تھیں وہ ایک اچھی عورت تھی۔ اس نے مسکرا کر جھٹائی کی بات پر اثبات میں سر ہلادیا مگر دبی زبان میں یہ بھی کہہ دیا کہ ”بھابی جان مجھے تو کوئی اعتراض نہیں میں تو اپنے بچوں کی خوشیاں چاہتی ہوں لیکن اماں حضور جو بھی فیصلہ کریں۔“ ماہ رخ کچھ اداس ہو گئیں۔

”ہاں یہ تو ہے ماہ رخ! مگر ہم اپنی رائے تو پیش کر سکتے ہیں۔ یہ تو ہمارے بچوں کی پوری زندگی کا سوال ہے۔ برسوں سے اس خاندان میں یہی قاعدے قانون چل رہے ہیں۔ اب ان پر نظر ثانی ہونا چاہئے اور حالات دیکھتے ہوئے اصولوں پر ترمیم ضروری ہے اور بچوں کو انتخاب کا حق ملنا چاہئے۔“

”جی ہاں بھابی.... یہ سب ضروری ہے مگر ہمیں کسی خوش فہمی میں نہیں مبتلا ہونا چاہئے۔ آپ کو یاد نہیں کہ انہوں نے اپنی بیٹی فریال کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی زبردستی طے کر دی اور جب اس نے آواز احتجاج بلند کی تو ایک رات

اسے دودھ میں زہر پلا دیا۔ صبح وہ اپنے بستر پر مردہ پائی گئی۔ کیا اس ظلم کی کوئی مثال مل سکتی ہے۔ اپنی اصول پرستی، انا اور اپنے اقتدار کی خاطر انہوں نے اولاد کو قربان کر دیا تھا۔ وہ چپ ہو کر ناز پرور کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ہائے ماہ رخ۔ تم نے کیا بات یاد دلادی۔“ ناز پرور کانپ کر رہ گئیں۔

”یہ بات تو میرے ذہن سے ہی نکل گئی تھی۔ واقعی اگر انہوں نے اپنی مرضی کی اور نئی جنریشن نے علم بغاوت بلند کر دیا تو کیا ہوگا۔ اللہ میرے بچوں کی خیر ہو۔“ ناز پرور پریشان ہو گئیں۔ ماہ رخ نے کہا۔

”بھائی! ہماری دلتواؤں تو بے حد نازک احساسات کی مالک ہے۔ اسے تو فیصلے کی ایک گونج ہی ختم کر دے گی۔“ ماہ رخ کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر ناز پرور نے اسے تسلی دی اور اسے اپنے سینے لگا کر یقین دلایا۔ بولی۔

”ماہ رخ! سب سے بڑا کرتا دھرتا تو آسمان پر بیٹھا ہے۔ اماں حضور کب تک نا انصافیاں کرتی رہیں گی، کب تک دل توڑتی رہیں گی۔ ہم نے تو اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں پیش کر دیا ہے وہی مالک یوم الدین ہمارے بچوں کو انصاف دلانے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ ماہ رخ نے پر امید نظروں سے جھٹائی اور بات ختم کر دی۔

دلشاد اور دلتواؤں اسی طرح آزادانہ ملتے تھے ہنستے کھیلتے۔ ان کے ساتھ اور کزن بھی ہوتیں۔ کبھی کبھی کشتی میں سمندر کی سیر کو نکل جاتے۔ اکثر رشنا بھی ان کے ساتھ ہوتی مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب رشنا نے دلشاد سے اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد تو رشنا اور دلشاد میں سرد جنگ چھڑ گئی تھی۔

ایک دن سب سے چھوٹے چچا کے بیٹے حماد اور بیٹی عظمیٰ نے انہیں گھیر لیا بولے۔

”یار۔ کیا تم نے اس محل کی روایتوں اور قانون کو بالکل بھلا دیا ہے۔ پھوپھو فریال کے ساتھ دادی حضور نے کیا کیا، محبت اور محرومی کی یہ داستان کون نہیں جانتا۔ وہ تو بے چارہ شہزادان کے ہتھے نہ چڑھا اور نہ دونوں شہید الفت ایک ساتھ ہی عدم آباد کا ٹکٹ کٹا لیتے۔ اس کے باوجود تم دونوں آنکھیں بند کر کے اپنے راستوں پر گامزن ہو اس طرح کیا تم منزل پالو گے؟“

دلشاد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”دوست۔ محبت کرنے والے انجام کی کب پروا کرتے ہیں۔ آخر کوئی نہ کوئی تو اس صدیوں پرانی خالمانہ روایت کے بت کو توڑنے کے لیے پہلا پتھر اٹھائے گا۔ آخر دادی

حضور کتنی قربانیاں لیں گی ہم سے؟“

”اور دل نواز تمہارا کیا خیال ہے۔ تم نے اپنا وکیل کس کو بنایا ہے؟“

”حماد بھائی! ہم نے اپنا مقدمہ والدین کی عدالت میں پیش کر دیا ہے۔ وہی ہماری وکالت کریں گے۔ باقی سب سے بڑا وکیل اور مصنف ہمارا خدا ہے۔ جس نے ہمارے دلوں میں محبت کی شمع روشن کی۔“

”سبحان اللہ۔ بڑے جی دار ہو تم لوگ۔۔۔ اللہ تمہاری مدد کرے بھائی۔ ہم تو صرف دعا ہی دے سکتے ہیں۔“ حماد نے تحسین آمیز نظروں سے دونوں کو دیکھ کر کہا تو عظمیٰ، دلتواؤں کو گلے لگا کر بولی۔

”بھئی کمال ہے دلتواؤں۔ مجھے تو تم پر رشک آنے لگا ہے۔ اتنی چھوٹی سی شخصے کی طرح شفاف نازک سی گڑیا کے اتنے اونچے عزائم، اتنے مضبوط حوصلے۔“

”بس باجی۔ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔“ دلتواؤں نے شرماتے ہوئے کہا۔

دلشاد اپنی دادی حضور ملکہ جویریہ کا بڑا لاڈلا اور پسندیدہ پوتا تھا مگر گستاخ اور بے ادب نہیں تھا دادی اپنے سب پوتوں میں دلشاد ہی کو زیادہ چاہتی تھیں۔

انہیں چینی کی گڑیا جیسی دلتواؤں بھی بہت اچھی لگتی تھی۔ کبھی کبھی جو دونوں ہنستے مسکراتے ایک ساتھ دادی حضور کو سلام کرنے آتے تو وہ انہیں خوش ہو کر گلے لگالیتی تھیں۔ اکثر وہ سوچنے لگتی تھیں کہ دلتواؤں اور دلشاد کا جوڑا بہت خوبصورت لگتا ہے اور یہ دونوں شاید ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں پھر وہ سختی سے اپنا خیال مسترد کر دیتیں کہ اس طرح تو بچوں میں انکار عیب اور بد بے ختم ہو جائے گا اور محل میں لاقانونیت پھیل جائے گی اور پھر چھوٹے بڑے کا احترام کوئی نہیں کرے گا اور جس سے جس کا جی چاہے گا شادی کر کے اپنی الگ دنیا بسا لے گا پھر ان کا قدار۔ ان کی خاندانی روایتیں دم توڑ دیں گی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ پھر پہلے جیسی ملکہ جویریہ بن جاتیں۔

ان کا طریقہ کار یہی تھا کہ جب بیٹے بیٹی بھائی یا دیور کے وہاں کوئی لڑکا، لڑکی پیدا ہوئی تب ہی ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیتی تھیں اور جب وہ بچے جوان ہو کر معاشی حالات میں خود کفیل بن جاتے تو ان کی شادیاں ان لڑکیوں کے ساتھ کر دی جاتیں۔ جنہیں وہ بچپن ہی میں ایک دوسرے سے منسوب کر چکی ہوتیں۔ خواہ وہ پسند کرتے یا نہ کرتے۔ وہ مجبور تھے کیونکہ ان پر دادی حضور کے علاوہ ماں باپ کا بھی پریش تھا اور سب سے پہلے علم بغاوت جلال آفندی کی بیٹی فریال نے بلند کیا تھا۔ وہ شہزاد کو پسند کرتی تھی۔ انہوں نے ایک ساتھ کالج سے بی۔ ایس۔ سی کیا تھا وہ ایک نہایت سلجھا ہوا بڑے باپ کا بیٹا تھا۔

قطع تعجب نہیں ہوا۔ ٹھیک تو کہہ رہا تھا اب وہ کس کے لیے آئے گا۔ اس کی ماں اپنے بیٹے کے غم میں برابر کی شریک تھی اور اس معصوم بچی کے لیے کتنی بار آنسو بہا چکی تھیں۔ ملکہ جویریہ کو پہلی بار جوان اولاد کے بچھڑنے کا غم ملا تو پتا چلا کہ متاکیسی ظالم چیز ہوتی ہے۔ انہوں نے کس طرح اس دکھ کو جھیلا تھا۔ آخر ماں تھیں، کچھ ان کا ہی دل جانتا تھا کہ سینے پر ضبط کا پتھر رکھ کر اور آنسوؤں پر پہرے بٹھا کر آتی جاتی سانسوں کو کس طرح سنبھالا جاتا ہے۔ چاہے قیامت آئے، طوفان اٹھیں مگر دنیا کے کاموں میں فرق نہیں آتا۔ ملکہ جویریہ نے اپنے گرد اتنے کام پھیلا رکھے تھے اتنی ذمے داریاں اٹھا رکھی تھیں کہ انہیں بیٹی کی موت کا غم بھی منانے کی فرصت نہ ملتی۔ ان کے سامنے خاندان بھر کا مفاد اور ان فیصلوں کی تجدید باقی تھی جو وہ بہت پہلے کر چکی تھیں۔ وہ امانتیں تھیں جو انہیں حق داروں تک پہنچانی تھیں۔ آخر انہوں نے سب طرف سے اپنے کان اور آنکھیں بند کر کے سب کی شادیاں کر دیں۔ ان کے کندھوں سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اب کرنے کو جب کچھ نہ رہا تو انہیں بیٹی کی جدائیاں مارنے لگیں۔ اس کا غم ڈسنے لگا۔

☆...☆...☆

جانے کتنے موسم آتے رہے جاتے رہے باغوں میں پھول کھلتے رہے، بہاریں ان کا منہ چومتی رہیں پھر جب خزاں آئی تو مچھائے ہوئے سوکھے پھولوں کے جنازے ہوا اپنے دوش پر اٹھائے بین کرتی فضا میں تحلیل ہو گئی لیکن ملکہ جویریہ کے دل کا وہ زخم جو فریال کی جواں مرگ نے ڈالا تھا۔ کبھی کبھی اس قدر ٹیسیں دیتا تھا کہ وہ بے حال ہو کر گھنٹوں منہ چھپائے چھپائے پھرتی تھیں۔ قرار کا لفظ بے معنی ہو گیا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگ بھیگ جاتا۔ ان کی سماعت میں آوازیں کی بازگشت گونجنے لگتی۔

”امی حضور! میں شہزاد سے محبت کرتی ہوں۔ اگر وہ مجھے نہیں ملا تو میں مرنے جاؤں گی۔ پلیز امی۔ ارشد سے میری بات ختم کر دیں۔ شہزاد کو بلا لیں۔ امی پلیز، پلیز، پلیز۔“

چاروں طرف سے سسکیوں کی آوازیں گونجنے لگتیں۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے زمین و آسمان اور درمیان کی ہر شے بولنے لگی ہو اور وہ گھبرا کر اپنے کان بند کر لیتیں اور تکیے پر سر پٹک پٹک کر رونے لگتیں۔

”میری بچی۔“

”میری جان۔“

”یہ میں نے کیا کر دیا؟ میں تیری مجرم ہوں، گناہ گار ہوں، معاف کر دے مجھے اپنی

البتہ وہ خاندان کا نہیں تھا لیکن ملکہ جویریہ نے فریال کے لیے سینٹھ امجد کے اوباش مگر دولت مند بیٹے ارشد کا انتخاب کیا جو رشتے میں ان کا بھتیجا لگتا تھا اور فریال نے ماں سے دو ٹوک کہہ دیا کہ۔ ”میں شادی ارشد سے نہیں شہزاد سے کروں گی۔“ اس وقت تو ماں چپ ہو گئی۔ لیکن ان کے اندر خطرے کا الارم مسلسل بجتا رہا۔ فریال سمجھی کہ ماں ہونے کے ناتے شاید وہ اپنے فیصلے میں لچک پیدا کر لیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ ابھی تو ان کے سامنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں اور خود ان کے ایک بیٹے، ایک بیٹی کی شادی کا مسئلہ تھا جن کے لیے وہ جیون ساتھی منتخب کر چکی تھیں اگر وہ فریال کی بات مان جاتی ہیں تو پھر سارے بیٹے بیٹیاں اپنے اپنے حق کے لیے میدان میں اتر آئیں گے۔ ان کی حیثیت تو بالکل ہی ختم ہو کر رہ جائے گی پھر وہ کیا کریں گی؟ وہ سخت الجھن میں مبتلا تھیں کس سے مشورہ کرتیں۔ اس وقت جلال آفندی اور بڑا بیٹا بلال آفندی بھی ایران کے نور پر برنس کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ باقی بیٹے، دیور اور داماد کراچی میں مختلف جگہوں پر سیٹ تھے۔ کسی کا اپنا برنس تھا، کوئی سروس میں تھا اور بہوؤں کو وہ چوروں کا ساتھی سمجھتی تھیں کہ وہ کب اپنے بیٹے اور بیٹیوں کی حق تلفیوں کو پسند کریں گی۔ چنانچہ کئی دنوں کی سوچوں نے انہیں ایک منہ مگر نجات کا راستہ دکھا دیا۔ انہوں نے چپکے سے رات کو فریال کے دودھ میں زہر ملا دیا اور صبح اس کی محبت نے اپنا خراج وصول کر لیا تھا گھر کا ہر فرد دم بخود تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ کوئی آواز نکالتا۔ اس سانحے نے سب کو ملکہ جویریہ کی طرف سے متفر کر دیا تھا۔ انہوں نے چھپ چھپ کر کتنے ہی آنسو بہا ڈالے تھے۔ ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر روئے تھے اس محل کے چمن کا سب سبز یادہ خوبصورت پھول خود مالی نے اپنے ہاتھوں فنا کی گود میں سلا دیا تھا۔

شہزاد ان دنوں فرانس میں تھا۔ اسے وہاں خبر پہنچ گئی تھی پھر وہ پاکستان واپس نہیں آیا۔ کس کے لیے آتا۔ جس کے لیے اس نے اپنے مستقبل اور زندگی کی پلاننگ کی تھی والدین کو تیار کیا تھا اسے دلہن بنا کر اپنے نئے اور خوبصورت بنگلے میں لانے کے پورے انتظام کے ساتھ جو ماں نے بیٹے کی فرمائش پر بنوایا تھا۔ شہزاد ان کا بہت پیارا بیٹا تھا اگر وہ کہتا۔ ”مما مجھے آسمان کے تارے چاہئیں۔“ تو وہ بھی اپنے لاڈلے کے لیے فراہم کرنے کی کوشش کرتیں۔ انہوں نے فریال کو دیکھا تھا اس سے ملی تھیں۔ وہ کامنی سی پیاری لڑکی جسے صناعت قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا جو ان کے بیٹے کی پسند تھی وہ اس سے زیادہ اب انہیں عزیز ہو گئی تھی۔ لیکن جب اچانک انہوں نے اس کی موت کی خبر سنی تو کتنے ہی دن انہیں یقین نہیں آیا مگر ان کے بیٹے نے پاکستان نہ آنے کا فیصلہ کیا تو ماں کو

بلایا گیا تھا۔ کچھ آس پاس کی بیگمات اور باقی گھر کی خواتین اور لڑکیاں تھیں، تلاوت قرآن کی مسحور کن آوازوں نے لوگوں پر رقت طاری کر دی تھی۔ خصوصاً ملکہ جویریہ کے آنسو نہیں ختم رہے تھے۔ جب سے فریال اس دنیا سے گئی۔ آج پہلی بار اتنے بڑے پیمانے پر قرآن خوانی اور درود و سلام کی محفل کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ورنہ محل کے سارے میں عجیب طرح کے خوف میں مبتلا تھے۔ یہ بتاتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ فریال مر گئی کہ کہیں کوئی پوچھ نہ لے کہ اچھی بھلی، ہنستی کھیلتی بچی کیسے اچانک مر گئی، کیا ہوا تھا اسے؟“

پھر وہ کس کس کو بتاتی، سمجھاتی کہ یہ سانحہ عظیم ظہور پذیر کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟

چنانچہ بہت سا وقت چپ چاپتے ہوئے آگے نکل گیا اور لوگ فریال کی موت کو بھی بھول بھال گئے۔ اپنوں کو بھی یہ غم بھلا کر یقین دلانا پڑا کہ انسان کو دنیا سے جانے کا کوئی نہ کوئی تو بہانہ چاہیے بس فریال بھی اسی بہانے یہ دنیا چھوڑ گئی پھر سب کو آخر کار صبر کرنا پڑا۔ لیکن اس وقت جب کہ سب نے اپنے غموں سے سمجھوتہ کر لیا تھا ملکہ جویریہ کے ضبط کے پرچے اڑنے لگے۔ آنسوؤں کا سیلاب تھا جو آنکھوں سے رواں دواں تھا اور ان کا پورا وجود اس میں غوطے کھا رہا تھا ضمیر کی عدالت انہیں کسی طرح بری کرنے پر تیار نہیں تھی۔ وہ بیٹی کی روح سے ہزار بار معافیاں مانگ چکی تھیں مگر انہیں قرار نہیں تھا۔ اپنے کو ہزار بار لعنتیں بھیج چکی تھیں۔ کیا کوئی ماں اتنی بھی شقی القلب ہو سکتی ہے جو اپنی بالادستی اور مفاد کی خاطر اولاد کو قتل کر دے۔ تب ہی ناز پرور نے ساس کی کیفیت کا اندازہ لگا کر ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی اور غریبوں کو کھانا کھلانے کی تجویز پیش کی اور انہوں نے فوراً قبول کر لی کہ شاید اسی طرح ہمارے دلوں کو قرار مل جائے۔ وہ رب عظیم بخشش و عطا کا محور ہے اس کا ذکر غموں کو تھام لیتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیتا ہے۔ وہ یقیناً ہماری غلطیوں کو معاف کر کے ہمارے دلوں کو قرار بخش دے گا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اندر باہر سنگڑوں قرآن شریف ختم ہو گئے۔ کھانے پر کافی اہتمام کیا گیا تھا۔ کئی دیکیں چھیروں کی ہستی میں بھیج دی گئیں، غریبوں کو صدقہ خیرات دی۔

ملکہ جویریہ نے دل کھول کر غریبوں کو نوازا، صدقات دیئے دل کھول کر لٹایا۔ بڑی یادگار محفل تھی۔ سفید محل کی وہ۔ اس کے بعد واقعی ملکہ جویریہ کو بڑا سکون مل گیا تھا اور ساتھ ہی ان کی سوچیں بھی بدل گئی تھیں اور یہ سب کچھ بڑی بہوشنہادی ناز پرور کے تدبیر اور ان کی اس گھر سے محبت کا نتیجہ تھا۔ جو انہوں نے ایک مناسب اور صائب مشورہ دے کر ان کے ذہن کو ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ اس مبارک اور مقدس محل کی وجہ سے ان کی سوچیں ان کا ذہن جیسے صیقل ہو گیا تھا۔ ان کے سینے سے بوجھ سرک گیا تھا اور اب وہ ایک مہربان

ظالم ماں کو کہ احساسات کی چھین اور ضمیر کی سزا بہت کڑی ہے۔“ اس دن وہ صبح دیر سے انھیں تو سارے بیٹے اور بہوئیں ان کی مزاج پر سی کو آگئے۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے ساری رات روتی رہی تھیں۔ انہوں نے سب بچوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں اور کہا۔

”میں ٹھیک ہوں تم لوگ پریشان نہ ہو۔“ وہ لوگ چلے گئے مگر ناز پرور ان کے پاس بستر پر بیٹھ گئی اور ملکہ جویریہ کا ہاتھ پکڑ کر سہلاتے ہوئے بولی۔

”امی حضور! کیا آپ ساری رات جاگتی رہی تھیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“

”ہاں بیٹی۔ رات نیند ہی نہیں آئی۔ فریال مجھے بہت یاد آئی۔ جیسے وہ میرے آس پاس قریب ہی کہیں موجود ہو۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ناز پرور نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”امی حضور! وہ تو ہم سب کو بھی بہت یاد آتی ہے۔ آپ تو پھر ماں ہیں مگر اب صبر کے سوا چارہ کیا ہے۔ وہ اتنی ہی عمر لے کر آئی تھی دنیا میں۔ آپ محل میں زنانی اور مردانی قرآن خوانی کرادیں اور کھانا پکوا کر غریب چھیروں کی ہستی میں بھجوادیں۔ اس طرح ایصال ثواب سے اس کی روح کو سکون مل جائے گا۔“

”ہاں ناز پرور۔ یہ تم نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ آج ہم فرمان جاری کر دو اور حاکم خان کو بلا کر سارا اندر باہر کا انتظام ان کے سپرد کر دو۔“

”جی اچھا امی حضور! آپ بھی منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جائیں۔ میں ناشتا بھجوا رہی ہوں۔“

”نہیں ناز پرور! ہم ناشتا تم لوگوں کے ساتھ ڈائننگ ہال ہی میں کریں گے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”میرا خیال تھا امی حضور کہ آپ تھوڑا آرام کر لیتیں۔“ ناز پرور جاتے جاتے پلٹ آئی۔

”نہیں بیٹا! کام ہی میرا آرام ہے۔“ وہ مسکراتی ہوئی ہاتھ روم کی طرف چلی گئیں اور ناز پرور نے ناشتا میز پر لگوا دیا۔ اس دن فریال کی موت کے بعد پہلی بار ناشتا اس طرح سب نے خوشگوار ماحول میں بیٹھ کر کیا تھا۔ پھر وہ سب قرآن خوانی اور درود و سلام کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور وہ دن آ گیا جب ملکہ جویریہ کا سفید محل پھولوں اور اگریتوں کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ مردانے میں مولویوں اور قاریوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں اور زنان خانے میں درسگاہوں سے آئی ہوئی خواتین جنہیں بطور خاص

ماں اور شفیق دادی بن گئی تھیں۔ انہیں کچھ نئے فیصلے کرنے تھے لیکن اب ان کے قدم کا نپ رے تھے دل دھڑک رہا تھا، سچائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انصاف کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ آج تک انہوں نے جتنے بے دھڑک دو ٹوک فیصلے کیے تھے اور اب جو کرنے جا رہی تھیں ان میں بہت فرق تھا لیکن انہوں نے اپنے تئیں سوچ لیا تھا کہ اب میرے بچے نہیں مجھے کٹھنرے میں کھڑا ہونا ہے اور آج کل ان کی عدالت میں دلشاد اور دلنواز کا مقدمہ پیش تھا۔ ان کے والدین اپنے دلائل انہیں سمجھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اور وہ خاموش تھیں۔ ادھر دلشاد اپنی بہت ہی چاہنے والی دادی کے حضور میں درخواست لے کر حاضر ہوا تھا اور ان کے سامنے سوالی بنا کھڑا تھا۔

”دادی حضور! آج تک میں نے آپ سے کچھ نہیں مانگا مگر آج میں اس در سے خالی واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے دلنواز دے دیجئے پلیز دادی امی۔ وہ میری زندگی ہے مجھے بخش دیجئے۔“

مگر یہاں بھی ان کے لب نہ کھلے اور دلشاد ان کی خاموشی کو نیم رضا سمجھ کر چلا گیا۔ ملکہ جویریہ پر آزمائش کے ٹکھن مراحل گزر رہے تھے۔ فریال کی روح ان کے آس پاس منڈلا رہی تھی ماں سے التجا کر رہی تھیں۔

”امی حضور! آپ نے میرے ساتھ جو کیا وہ میں اپنی جان پر چھیل گئی مگر خدارا۔ اب کوئی اور فریال کو آپ اپنی انا اور خاندانی روایات پر قربان نہ کر دیجئے گا۔ دلشاد اور دلنواز بہت معصوم ہیں۔ ان کی محبت خدا کا عطیہ ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہ کیجئے گا۔ ورنہ طوفان آجائے گا اور آپ کے محل کا سارا کروفر خاک میں مل جائے گا۔“ تصور غائب ہو گیا اور آوازیں معدوم ہو گئیں۔

ملکہ جویریہ سوتے سوتے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ انہوں نے بیڈ سوئچ آن کر کے کمرے میں اپنی پوری آنکھیں کھول کر دیکھنا شروع کر دیا مگر فریال کا کہیں دور دور پتا نہ تھا۔ البتہ اس کی خوشبو کو وہ محسوس کر سکتی تھیں۔ وہ چہرے پر ہاتھ رکھ کر سسک کر رونے لگیں۔

”میری بچی۔“

”میری جان۔“

”اپنی گناہ گار ماں کو معاف کر دے۔ اب میں دلشاد اور دلنواز کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گی۔ اب اس خاندان کے قوانین اور روایتیں نئی نسل کی خواہش کے مطابق وضع کی جائیں گی۔ اب کوئی فریال اپنے حق کے لیے لڑتے ہوئے جان نہیں دے گی۔ میں وہی کروں گی جو میرے بچے چاہیں گے۔“

اس کے بعد ملکہ جویریہ کا موڈ ایک دم بدل گیا۔ کسی نے بھی انہیں اتنا خوش اور مطمئن پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے چہرے کی سختی جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ جو دور دور تھے وہ فریب آگئے تھے۔ دلشاد اور دلنواز کے چہرے پر گلاب کھل رہے تھے۔ اور آنکھوں میں کہکشاں اتر آئی تھی۔ ان دنوں صرف دلشادیاں سفید نخل میں ہونی قرار پائی تھیں۔ جن کے فیصلے وہ بہت پہلے کر چکی تھیں ایک بارایت آئی تھی۔ دوسری کی جانی تھی۔ رشنا کی شادی کرنل آصف کے بیٹے شہرام سے ہو رہی تھی اور ان کے بیٹے کی بارات لالہ زار میں کمشنر اعزاز حق کے گھر جا رہی تھی۔ یہ دونوں خاندان کے تھے۔ سب لوگ بہت خوش تھے لیکن رشنا چپ تھی۔ اسکے چہرے پر خوشی کی کوئی رقع نہیں تھی۔ وہ اپنی نانوں ملکہ جویریہ کا جھکاؤ صریحاً دلشاد اور دلنواز کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر سیکڑوں برچھیاں اتر گئی تھیں اور اس نے اپنے دل میں پلاننگ کر لی تھی۔ کہ اسے کیا کرنا ہے۔ شہرام ایک اچھا سلجھا ہوا نوجوان تھا مگر المیہ یہ تھا کہ رشنا کو اس سے محبت نہ تھی۔ اس کا دل اسے ہرگز قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس کا دل قطعی اس کی طرف مائل نہیں تھا۔ وہ تو دلشاد پر ہزار جان سے قربان تھی یہ بات الگ تھی کہ دلشاد اس کا بڑی بہن کی طرح احترام کرتا تھا۔ کیونکہ وہ دلشاد سے دو ڈھائی سال بڑی تھی۔ اس کے باوجود وہ دلشاد کی محبت سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں تھی۔ دل پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ یہ محبت بڑی ظالم شے ہوتی ہے۔ نہ عمر دیکھتی ہے نہ دھن دولت اور نہ صورت شکل دیکھتی ہے اور دل کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس نے اپنے دل میں ٹھان لی تھی کہ چاہے جو بھی حشر ہو جائے وہ ان دونوں کو ملنے نہیں دے گی۔ دلشاد نے اس کی محبت کو ٹھکرایا تھا وہ اس سے انتقام لے گی۔ اسی لیے آج کل وہ اپنی نانوں کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کر رہی تھی اور اندر ہی اندر بل کھا رہی تھی۔ آخر پروگرام کے مطابق دونوں شادیاں بہ حسن و خوبی انجام پا گئیں۔ رشنا شہرام کی دہن بن گئی اور طوبی، احتشام کی دہن بن کر نخل میں آگئی۔ رشنا کی شادی میں دلشاد اور دلنواز نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ جی بھر کے خوشیاں منائی تھیں۔ بھنگڑا ڈالا تھا۔ ورائٹی پروگرام ترتیب دیا اور سب لڑکے لڑکیوں نے مل کر ایرانی رقص پیش کیا، دف بجائی جو بہت پسند کیا گیا تھا۔ یہ ظاہر رشنا نے بے حد سراہا تھا انہیں دلنواز کو پیار کیا تھا پھر بو جھل بو جھل دل کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھرے شہرام کے ساتھ جا کر اس کی بچی ہوئی کار میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کے بعد محل کی فضا نسبتاً پہلے سے زیادہ گداز اور خوش کن ہو گئی تھی دادی حضور کی مسکراہٹیں گہری ہو گئیں اور گھر کے نوجوان بچے ان کا طواف کرنے لگے۔ بیٹوں، بہوؤں کے دلوں سے سابقہ نا انصافیوں اور حق تلفی کی سلیں گرنے لگیں اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب دلشاد اور

دلنواز کو کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ جب رشنا پہلی بار میکے آئی تو بڑی چپ چاپ تھی۔
دلنواز دوڑ کر اس سے پلٹ گئی۔

”ہائے باجی! آپ اس آتشیں کا مدار سوٹ میں کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔ یہ بتائیے
شہرام بھائی نے آپ کو کیا تحفہ دیا؟“

رشنا نے ڈائمنڈ کا سیٹ اس کے سامنے رکھ دیا اور خاموشی سے اس کے چہرے پر چاند
طلوع ہوتے دیکھنے لگی۔

”کتنا خوبصورت سیٹ ہے۔ کیا آپ کو پسند نہیں آیا؟“
”کیوں نہیں پسند آیا۔ تم تو جانتی ہو ڈائمنڈ میری کمزوری ہے۔ اس کا مجھے کتنا شوق
ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”اور شہرام بھائی آپ کو کیسے لگے؟“
”وہ بھی بہت اچھے ہیں ان کا ذوق بڑا اعلیٰ ہے۔“ اس نے کچھ بچھے بچھے لہجے میں
کہا۔

”اچھا ہوا بیٹی تم آگئیں۔ میں تو تمہیں کہلانے والی تھی۔“ رشنا کی پھوپھو نے آ کر
کہا۔
”تمہاری دادی حضور دلشاد اور دلنواز کی منگنی کا اعلان کرنے والی ہیں اس سلسلے میں
ایک چھوٹی سی تقریب ہوگی ایک دوسرے کو انگوٹھیاں پہنانے کی۔“ دلنواز شرما کر باہر چلی
گئی۔

مگر رشنا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں آنکھوں میں عجیب سا سوز کروٹیں بدلنے
لگا، اس کی طبیعت اچانک بگڑنے لگی تو اس نے جلدی سے پھوپھو کی طرف دیکھ کر کہا۔
”پھوپھو پلیز۔ تھوڑا سا پانی پلا دیجئے۔“

انہوں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا تو فرج سے بوتل نکال لائیں۔
”خیریت تو ہے بیٹا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ آسیہ بیگم نے بوتل اور گلاس اسے
تھماتے ہوئے پوچھا۔

رشنا نے جلدی سے پانی انڈیل کر ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور ان کی طرف
دیکھ کر سینہ سہلاتے ہوئے بولی۔

”جی پھوپھو! سینہ جیسے خشک ہو گیا تھا، حلق میں کانٹے سے چھبنے لگے تھے۔ اب ذرا
سکون ملا ہے۔“
آسیہ بیگم کچھ الجھی الجھی سی اسکو دیکھنے لگی۔

”کیوں بیٹا سسرال میں تو سب خوش ہیں؟“
”نہیں پھوپھو! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ مسکرائی۔
”اور شہرام؟“

”وہ بھی بہت خوش ہیں۔“ سپاٹ سا بے حد مختصر جواب تھا۔

(خوشی کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے پھوپھو سب مجھے فتح کر کے سرشار ہیں مگر میں خوش
نہیں۔ اپنی شکستگی کا ماتم کر رہی ہوں، رہی سہی کسر آپ نے پوری کر دی دلنواز اور دلشاد کی
منگنی کی خبر سنا کر میرے دل میں خنجر اتار دیا ہے۔)
وہ خلا میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ خاموشی طویل ہونے لگی تو آسیہ بیگم گھبرا کر
بولیں۔

”کیا سوچ رہی ہو رشنا؟“

”ارے کچھ نہیں پھوپھو۔“ اس نے سر جھٹک کر ان کی طرف دیکھا اور پلٹ گئی۔ آسیہ
بیگم چپ چاپ چلی گئیں لیکن انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے رشنا ان سے کچھ چھپا رہی ہے
کوئی ایسی بات جس کا تعلق خود اس اپنی ذات سے ہو مگر کوئی سرائان کے ہاتھ میں نہیں آ رہا
تھا۔

برسوں کے بعد۔ اس خاندان اور اس محل کے پتھر پلے رسم و رواج میں نرمی پیدا ہوئی
تھی یا پھر فریال کی موت نے ماں کے پتھر دل کو گدازیت بخش دی تھی۔ اب وہ گھر میں کوئی
ایسا ڈراما دیکھنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں اس لیے ملکہ جویریہ نے اپنے بچوں کی خوشیوں کی
خاطر اپنے آپ کو یکسر بدل ڈالا تھا یا پھر یہ کہ مظلوم فریال کی قربانی رنگ لائی تھی۔ بہر حال
محل دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ روش روش پھولوں سے آراستہ تھی۔ جشن بہاراں کا سماں
تھا۔ دلنواز اور دلشاد کی منگنی بڑی دھوم دھام سے منائی گئی یہ اس خاندان کی پہلی منگنی تھی
جس میں بزرگوں اور بچوں کی رضا شامل تھی۔ دلنواز دلہن بن کر اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ
ماں باپ دادا دادی اور سہیلیاں دوست ان کی نذریں اتارتے نہ تھک رہے تھے۔ رشنا
چپ تھی۔ اس کے اندر ایک الاؤ دیک رہا تھا۔ بڑے کرب سے اس نے یہ ظاہر مسکراتے
ہوئے دونوں کو مبارکباد دی اور چلی گئی اور دوسرے دن شہرام اسے واپس لے گیا۔

☆...☆...☆

رشنا کی شادی کو ابھی صرف چھ ماہ ہوئے تھے کہ ایک دن وہ شہرام سے طلاق لے کر
گھر آ گئی۔ ذرا بھی اس کے چہرے پر ملال نہیں تھا۔ بلکہ وہ سب دنوں سے زیادہ مطمئن
اور پرسکون تھی۔ ملکہ جویریہ شہزادی ناز پرور ماہ رخ، دلنواز پھوپھو آسیہ بیگم اور گھر کے

سارے لوگ حیران و پریشان تھے کہ رشنا نے یہ کیا کر دیا تھا۔ ان کے درمیان ایسی کون سی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ ان کے تعلقات اس بچ پر کیسے آگئے جس کا حل صرف طلاق ہی ہو سکتی تھی۔ دنواز کو سب سے زیادہ صدمہ پہنچا تھا اس نے روتے ہوئے کہا۔

”بابی! یہ آپ نے کیا کیا؟“

”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ اس میں رونے یا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔“ پھر

اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔

”غیر شادی شدہ لڑکیوں کو اس خاندان میں زبان کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کر کے وہ مصلوب کر دی جاتی تھیں۔ مگر شادی کے بعد اسے یہ اختیار مل جاتا ہے کہ اگر اس کی مرضی ہو تو شوہر کے ساتھ رہے نہ مرضی ہو تو چھوڑ دے۔ اس لیے میں نے اپنا وہ حق جو مجھے ماں باپ کے گھر سے نہیں ملا۔ اپنے شوہر کی رضامندی سے حاصل کر لیا۔ کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میں زیادہ دن اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اسکے اور میرے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ چنانچہ ہم دونوں اپنی اپنی مرضی سے علیحدہ ہو گئے تو اس میں کیا قیامت ٹوٹ پڑی ویسے بھی اسے دوسری بیوی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا یہ چیز تو آپ لوگوں کو شادی سے پہلے سوچنی چاہیے تھی اب کیوں واویلا ہو رہا ہے؟“

رشنا سخت غصے میں تھی۔ ہر ایک کی زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔ اس لیے کہ غلطی انہی کی تھی۔ اپنا خاندانی وقار سوسائٹی میں شملہ اونچا رکھنے کے لیے انہیں کسی تحقیق کی ضرورت تھی نہ کسی کے مشورے کہ ان کا داماد شادی شدہ ہے یا بچوں والا۔ پر ہے تو اپنے خاندان کا۔ دولت مند اور ہائی سوسائٹی کا روح رواں اور کیا چاہیے تھا پھر اب انجام کو کیوں رو رہے تھے۔ انہوں نے سمجھا ہوگا کہ رشنا بھی کوئی بے زبان گھر یلو مشرقی لڑکی ہوگی۔ جو سوکن برگزار کر لے گی مگر ایسا نہیں تھا۔ اول تو وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ دلشاد نہیں تو کوئی بھی نہیں لیکن ان ڈکلیئرٹم کے بزرگوں نے اسکی ایک نہ چلنے دی۔ تب ملکہ جویریہ اور شہزادی ناز پرور نے ان کی ساس یعنی شہرام کی والدہ سے رابطہ قائم کیا جنہوں نے بے حد اصرار پر اس رشتے کی حامی بھری تھی۔ ان سے جب رشنا کی طلاق اور شہرام کی پہلی شادی کے متعلق پوچھ گچھ کی تو وہ ایک دم بھڑک اٹھیں بولیں۔

”آپ کی بیٹی نے تو ساس‘ سر کو پڑوسی کا درجہ بھی نہ دیا۔ شروع دن سے وہ الگ تھلگ رہی، اپنے کو آسمان سے اتاری ہوئی کوئی مخلوق سمجھتی تھی اور میرا بیٹا تو ہمیشہ سے ٹھنڈے مزاج کا انسان ہے اسے تو کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوتی، ہر بات میں راضی بہ

رضارہنے والا شخص‘ ہو تو اسے بھی خاطر میں نہ لاتی تھی وہ ہر وقت اس کے سامنے فدوی بنا رہتا جیسا اس نے چاہا کر دیا۔ طلاق آپ کی بیٹی کی خواہش پر دی گئی تھی۔ رہ گئی پہلی شادی تو یہ کوئی انہونی بات نہیں آج کل لوگ دوسری تیسری شادی کرنے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ بزنس میں دونوں کی پارٹنرشپ تھی۔“

شہرام نے کہا۔

”ہاں میں نے پہلے شادی کی ہوئی تھی۔ جس کا علم میرے والدین کو نہیں تھا اور میں نے اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ یہ بات میں نے رشنا کو بتادی تھی اور یہ کہ میں اپنی پہلی بیوی کی وجہ سے آپ سوسائٹی میں سراونچا کر کے چلتا ہوں۔ اس کے ارب بتی باپ نے مجھے اپنے پاؤں پر چلنا سکھایا اور آج میں جو کچھ ہوں انہی کی وجہ سے ہوں لیکن یہ بات سن کر رشنا بھڑک اٹھی تھی۔ چیخنے لگی کہ مجھے طلاق چاہیے طلاق اور میں نے نہایت خاموشی بغیر کسی لیت و لعل کے طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ مجھے یہی زیادہ مناسب معلوم ہوا کہ ہماری علیحدگی اگر زمانہ ساز ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ میں نے اسکی خواہش پوری کر دی۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے گزارنے کا حق سب کو ملنا چاہیے۔“ وہ چپ ہو گیا۔ ملکہ جویریہ کو اندازہ ہو گیا کہ یہ ساری گڑ بڑ رشنا کی پیدا کردہ ہے اس میں شہرام کا کوئی قصور نہیں۔ اس لیے اب کسی بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ رشنا بہت خوش تھی۔ معمول کے مطابق سب سے ہنس بول رہی تھی۔ ایک دن اس نے دلشاد سے کہا۔

”میں تمہیں منگنی کی خوشی میں ٹریٹ دینا چاہتی ہوں۔ بوٹ بے سن میں پلنک منائیں گے۔“

”اصولاً مجھے تمہیں ٹریٹ دینا چاہیے اس خوشی میں کہ اللہ نے میرے دل کی مراد پوری کی تم کیوں میرے اعزاز میں بوٹ بے سن پر پلنک مناؤ گی؟“ دلشاد مسکرایا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا ہم سب ہی ششٹی محبت کے مسافر ہیں۔“ اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ دلشاد نے کچھ چونک کر رشنا کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اسکا وہ دعویٰ کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اس مقام پر سر اٹھائے کھڑا ہے۔ باطل نہیں ہوا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی منگنی ہو جانے پر وہ بہن کے حق میں دستبردار ہو جائے گی مگر لگتا تھا جیسے وہ بھی اس سفر میں اس کے شانے سے شانہ قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہو۔

”کیا سوچنے لگے دلشاد۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

”نہیں۔ نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر اور کون ہوگا ساتھ میں؟“

نفرت ہے۔“ وہ رخ موڑ کر جانے لگا۔ ☆...☆...☆

اس دن سے دلشاد رشنا کی طرف سے محتاط ہو گیا تھا۔ اسنے بات کرنا بلکہ اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اسے محل کی فضا میں جیسے دستی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ وہ زیادہ تر اپنے پورشن میں رہتا تھا یا پھر دنواز کے ساتھ باغ میں دیواروں میں بنے ہوئے ان جھروکوں میں بیٹھ کر سمندر کی شوخ گنگنائی لہروں کا تماشا دیکھتا رہتا۔ باغ کی اونچی اونچی دیواریں پہاڑ کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔ ان میں بڑے بڑے جھروکے بنائے گئے تھے سمندر کا نظارہ کرنے کے لیے۔ سمندر کی شور کرتی لہریں جب ایک دوسرے کو دھکیلتی ہوئی جب محل کی فصیلوں سے ٹکراتی تھیں تو دل نواز کو بڑا مزا آتا تھا۔ اکثر وہ دونوں اسی جگہ آکر بیٹھ جاتے تھے۔ اس سے چند فرلانگ دور ایک جگہ کافی لمبی چوڑی ڈھلوان تھی جو سمندر کے قریب چلی جاتی تھی کہ اگر جھک کر ہاتھ ڈالو تو پانی سے چلو بھرو۔ سمندر کی موجیں اس ڈھلوان تک آ جاتی تھیں۔ وہاں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ادھر کوئی نہیں جاتا تھا بڑی خطرناک جگہ تھی لیکن محل کے من چلے نوجوان اکثر اس ٹیکری پر جا کر بیٹھ جاتے تھے اور سمندر کی موجوں کا رقص دیکھتے ہوئے محفوظ ہوتے تھے۔ ملکہ جو یہ نے وہاں لکڑی کا جنگلا لگوا کر اس جگہ کو محفوظ کر دیا تھا۔ تاکہ کسی کے گرنے کا امکان نہ رہے اور سب کو منع کر دیا تھا کہ جب باغ کے جھروکوں سے سمندر کا نظارہ کر سکتے ہو تو پھر ڈھلوان کی طرف جانے کی کیا ضرورت تھی لیکن ایڈونچر کے متلاشی نوجوان کب خطروں کی پروا کرتے ہیں۔ ان کا ذہن ایسی پابندیوں کو کب قبول کرتا ہے۔ کئی ماہ گزر گئے۔ دلشاد کو ساری باتیں بھول بھال گئی تھیں۔ کیونکہ رشنا پھر اس سے بات چیت کرنے لگی تھی اسی طرح مسکرا مسکرا کر جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور دلشاد بھی کھلے دل اور صاف ستھرے ذہن کا مالک تھا۔ اس کے دل میں کسی کی طرف سے برائی نہیں تھی۔ رشنا کو وہ پسند بھی کرتا تھا ایک بہن کی طرح اس کے دل میں اس کا احترام بھی تھا۔ آخر وہ اس کی فرسٹ کزن بھی تھی۔ محبت ایک بے اختیار جذبہ تھا اگر رشنا دلشاد سے محبت کرتی تھی تو اس میں اسکا کیا قصور تھا۔ کسی کو بھی کسی سے محبت ہو سکتی تھی۔ جیسے وہ دنواز کو اپنی سانسوں کے قریب محسوس کرتا تھا۔ وہ اس کے دل میں دھڑکتی تھی۔ تو رشنا کو بھی الزام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اس لیے دلشاد چاہنے کے باوجود اس سے نفرت نہیں کر سکا تھا۔ البتہ اس دن ٹریٹ والی بات پر وہ محتاط ضرور ہو گیا تھا۔ کیونکہ محبت اندھی ہوتی ہے اور رشنا تو یوں بھی انتہا پسند تھی۔ معلوم نہیں کیا کر بیٹھے۔ کئی دنوں بعد ایک دن سارے کے سارے کزن باغ کے اندر اسی ٹیکری پر جا کر بیٹھ گئے۔ جہاں نیچے ڈھلوان شروع ہو جاتی تھی اور اطراف میں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں مگر

”صرف ہم دونوں۔“ رشنا نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔
 ”تم جانتی ہو کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔“ دلشاد نے انتہائی حیرانی سے اسکو دیکھا۔ ”مجھے تمہاری یہ ٹریٹ نامنظور ہے۔“
 ”کیا تم میری خاطر اتنی چھوٹی سی خوشی بھی نہیں پوری کر سکتے؟“
 رشنا نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر اسے دیکھا۔ اسکے چہرے پر بڑی مظلومیت تھی۔
 ”اب تم میرے ساتھ کیا کھیل کھیلنا چاہتی ہو۔ سارے کھیل تو ختم ہو گئے۔“
 ”ابھی ایک کھیل باقی ہے دلشاد۔“ وہ بڑی ادا سے مسکرائی۔
 ”کون سا کھیل؟“ دلشاد کے اندر اب پورا خوف کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔
 ”موت کا کھیل۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ دلشاد گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔
 ”دلشاد میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں نے شہرام سے اسی لیے طلاق لی تھی کہ تم میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ میں تمہاری دوری برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا دی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم مجھے نہیں مل سکتے لیکن جب تم میرے نہیں تو کسی اور کے بھی بن کر کیوں رہو۔ یہ میری محبت کی سراسر توہین ہے اگر زندگی پر نہیں تو موت پر تو اختیار ہے۔ میرا ہم دونوں سمندر کی لہروں سے کھیلنے ہوئے گم ہو جائیں گے ہمیشہ کے لیے اور محبت کو ایک نیا رنگ دے جائیں گے۔ ہماری بھی داستان ہوگی داستانوں میں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔
 ”ایک معصوم لڑکی کی زندگی برباد کر کے تمہیں کیا مل جائے گا جب کہ وہ تمہاری بہن بھی ہے۔ آخر اس نے تمہارا کیا لگاؤ ہے؟“
 ”محبت میں رشتے ناتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ میری بہن ہوتی یا ماں اس نے میرا محبوب چھینا تھا۔ وہ بھی تو آخر دائمی جدائی کی یہ لذت چکھے قانون سب کے لیے یکساں ہوتا ہے۔“

”یہ تم کس قانون کی بات کر رہی ہو رشنا؟“
 ”دل کا قانون محبت کا قانون۔“ اس نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”شاید تم پاگل ہو گئی ہو رشنا۔ دنواز کو میری جدائی مار ڈالے گی۔ تم بھی دکھی ہو گی۔“
 ”یہ پاگل پن مجھے عزیز ہے دلشاد اور دنواز بہت معصوم ہے رو دھو کر چپ ہو جائے گی اور مجھے فرار آ جائے گا۔“
 ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا رشنا کے تم ایک ناگن ہو اور تمہارے اندر اس قدر مہلک زہر بھرا ہوا ہے۔ آج سے تم مجھ سے بات نہ کرنا۔ نہ میرے سامنے آنا۔ مجھے تم سے شدید

کچھ لڑکے لڑکیاں اس ڈھلوان کے طرف چلے گئے سب سے آگے رشنا اور دلشاد تھے۔ اس کے پیچھے دلنواز عظمیٰ حماد ریفیعہ شکیلہ اور عثمانی وغیرہ پھر وہ جنگلے کے پاس جا کر رک گئے لیکن رشنا دلشاد کا ہاتھ پکڑے تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ تب ہی دلنواز چیخی۔

”دلشاد رک جاؤ۔ آگے پھسلن ہے۔“
اور وہ جنگلا ہٹا کر نیچے جانے لگی تو سب نے اسے پکڑ لیا۔
”کیا کرتی ہو دلنواز گر جاؤ گی۔“

”خدا کے لیے حماد بھائی دلشاد کو روکیے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے ادھر تو کوئی روک نہیں وہ کر جائیں گے۔“ دلنواز رونے لگی۔ تب سب نے خطرہ محسوس کر کے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

”دلشاد رشنا واپس آ جاؤ۔ آگے مت بڑھنا پھسل جاؤ گے۔“
مگر رشنا نے بڑی سختی سے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اور وہ اسے کھینچتی ہوئی پانی کی طرف لے جا رہی تھی۔ دلشاد نے گھبرا کر کہا۔

”رک جاؤ رشنا۔ یہاں تو بڑی پھسلن ہے۔“
”نہیں دلشاد۔ ہم واپس جانے کے لیے نہیں آئے۔ تمہیں یاد ہے کہ میں نے کہا تھا کہ ابھی ایک کھیل باقی ہے۔ موت کا کھیل میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر یہاں تک آئی ہوں۔“

”نہیں رشنا! خدا کیلئے ایسا مت کہو ہم گر پڑیں گے ڈوب جائیں گے۔“
”کوئی پروا نہیں۔ ہم دونوں ہی ساتھ ڈوبیں گے۔ ساتھ مریں گے۔“
”حماد عثمانی سبحان۔“ دلشاد اوپر منہ کر کے خوف زدہ آواز میں چیخا۔

وہ لوگ جو اس کے پیچھے تھے وہ اور جو اوپر بیٹھے تھے کود کر بھاگے مگر حماد دلنواز کو اپنے گھیرے میں لے کر اوپر آ گیا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ دلشاد دلشاد دوسرے لمحے پانی میں زور کی چھپا کے کی آواز آئی۔ دلشاد اور رشنا دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کی لہروں میں غم ہو گئے اور سب نے چیخنا شروع کر دیا۔

”بچاؤ۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔“ سب لوگ اپنی پوری قوت سے چیخ رہے تھے۔ لڑکیاں رورہی تھیں اور دلنواز ان کی گرفت میں تڑپ رہی تھی۔

”مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ دلشاد بلارہا ہے۔“

گھر کے نوکر مالی اور خواتین مرد بھاگتے ہوئے باہر آ گئے اور جب صورت حال معلوم ہوئی تو سب کی بری کیفیت تھی۔ ملکہ جویریہ نے فوراً حکم دیا۔ ”مچھیروں تیراکوں کو فوراً بلاؤ اللہ میرے بچوں کی خیر کرے اور بے ہوش دلنواز کو سب اٹھا کر اندر لے آئے۔ آنا فانا ما ہی

گیر غوطہ خور اور تیراک اپنی اپنی کشتیاں لے کر سمندر میں اتر گئے۔ ہر طرف سے لوگ آ رہے تھے۔ اپنی اپنی کوشش کر رہے تھے مگر بے سود کسی کو بھی زندہ مردہ برآمد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ محل میں کہرام مچ گیا۔ دلنواز کو ہوش آ گیا تھا اور وہ مسلسل دلشاد کو آوازیں دے رہی تھی۔ اٹھ اٹھ کر بھاگ رہی تھی۔ شام ہوتے ہوئے دلشاد کی لاش سمندر سے نکل آئی تھی۔ لیکن رشنا کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ خونی ڈراما رشنا نے رچایا تھا اور آخر موت کے اس کھیل میں اس نے دو محبت کرنے والوں کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ جو کہا تھا کر دکھایا۔ کسی کوشش بھی نہ ہوا کہ رشنا قریب روسیہ کا کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کر کے خود پس پردہ چلی گئی۔ یہ ساری پلاننگ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی گئی تھی۔ کتنے ہی دن گزر گئے تھے۔ سمندر کے اندر کشتیوں اور غوطہ خوروں کی دوڑ اب بھی جاری تھی۔ مرنے والوں کا صبر آ جاتا ہے لیکن جو غائب ہو جائیں جن کے جنازے انھیں نہ قبریں بنیں انہیں کوئی کس طرح صبر کر لے۔ ماہ رخ اگرچہ سوتیلی ماں تھی رشنا کی مگر وہ دلنواز سے کم اسے نہیں چاہتی تھی۔ ایک طرف دلشاد کی موت اور دلنواز کا غم تو دوسری طرف رشنا کی لاش کا نہ ملنا۔ اس غم نے انہیں پلنگ سے لگا دیا۔ سفید محل کی پوری فضا سوگوار تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر رشنا کی لاش کئی کہاں۔ اتنی جلدی تو اسے پھیلیاں بھی ہضم نہیں کر سکتی تھیں۔ ابھی دلشاد اور رشنا کا غم تازہ تھا کہ ایک رات دلنواز نے بھی دلشاد کو پکارتے پکارتے گردن ڈال دی اور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں۔ پورا محل زلزلوں کی زد میں کھڑا تھا۔ اتنے آنسو گریے تھے کہ اس سیلاب بلا میں زندگی کی ساری خوشیاں، امنگیں، سارے ارمان بہہ گئے تھے غم کے سیاہ بادل کسی طرح نہیں چھٹ رہے تھے ہوائیں مین کر رہی تھیں۔ بچے خوف زدہ تھے۔ سفید محل کے مکین یوں لگ رہے تھے جیسے حنوط شدہ لاشیں جیسے بولنا اور ہنسنا بھول گئے ہوں۔ چلتی پھرتی مورتیاں ہوں پھر جلال آندی اور بلال آندی نے فیصلہ کر لیا کہ اب انہیں یہاں نہیں رہنا۔ وہ ایران واپس جا رہے ہیں۔ ملکہ جویریہ نے پریم آنکھوں سے کہا۔

”یہ سفید محل ہمیں راس نہیں آیا ہماری آرزوؤں اور ہمارے بچوں کا مدفن بن گیا اور بہو بیٹیوں، بیٹیوں اور بھاد جوں سے کہا۔

”جس کا جہاں جی چاہے چلا جائے اور اپنا گھر محل بنا لے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں جو ہمارے ساتھ رہنا چاہے وہ ساتھ چلے۔“

صرف وہ دونوں بیٹیاں جو کراچی میں بیاہی تھیں انہیں چھوڑ کر سب نے رخت سفر باندھ لیا۔

دادی حضور نے یہاں تک کہا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گئیں۔ میں ہمیشہ سے تجس پسند تھی۔ ان کی خاموشی سے گھبرا کر بولی۔
 ”دادی حضور! پھر کیا ہوا۔ رشنا کی لاش ملی کہ نہیں اور ”سفید محل“ پھر آباد ہوا کہ نہیں؟“

پھر دادی حضور نے جو کچھ بتایا اس کا متن یہ تھا۔

”رشنا اگر دلشاد کے ساتھ واقعی ڈوب مرنی تو اس کی بھی لاش دیو سوری ضرور مل جاتی مگر اس نے تو ایک پلاننگ کے تحت یہ سب کچھ کیا تھا اور ایک ماہی گیر کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ وہ جگہ بھی دکھا دی تھی جس میں ایک کھوہ تھا جہاں اس ماہی گیر کو چھپ کر بیٹھنا تھا۔ وہ جگہ اسی ڈھلوان کے قریب تھی پر دو گرام کے مطابق جب دونوں سمندر میں گرے تو اس نے کمال پھرتی سے رشنا کو کھوہ کے اندر کھینچ لیا جو آگے ایک سرنگ کی مانند چلی گئی تھی۔ باہر گاڑی تیار کھڑی تھی انجن چل رہا تھا اس نے نیم بے ہوش رشنا کو اس میں ڈالا اور گاڑی نظروں سے غائب ہو گئی۔ یہ منصوبہ بندی مہینوں سے جاری تھی۔ اس کے تمام پہلوؤں پر اس نے نظر ثانی کر لی تھی۔ اس کے لیے دو ماہی گیر ایک نیکی ڈرائیور پہلے سے تیار کر لیے تھے۔ جنہیں راز داری کی بھاری قیمت دی گئی تھی، کئی ہفتے وہ اسی ماہی گیر کے گھر پر چھپی رہی تھی اور دوسرا شخص محل کی ساری خبریں لا کر اسے دیتا تھا۔ جب سفید محل کے ملین ایران واپس چلے گئے۔ تب رشنا نے لاہور کا قصد کیا۔ اس کی دونوں خالائیں اور دونوں پھوپھیاں اسے دیکھ بھی سکتی تھیں پھر تو اسکے قاتل ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا جاتا۔ وہ پکڑی جانی۔ مقدمہ چلتا اور بڑی بڑی عزت مآب شخصیتوں کے چہرے بے نقاب ہو جاتے۔ اس لیے وہ اپنی سہیلی ربابہ کے گھر لاہور چلی گئی۔ ایک طویل عرصے کے بعد دونوں ملی تھیں اس لیے دیر تک وہ ایک دوسرے سے لپٹی رہی تھیں۔ عجیب اتفاق تھا کہ ربابہ سے پہلی ملاقات ہی میں اس نے اپنا نام اسے شیا ہمدانی بتایا تھا۔ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس وقت اس کے ذہن میں کیا تھا۔ بہر حال نام کی تبدیلی نے فی الوقت اسکا پردہ رکھ لیا تھا۔ کسی کو شبہ نہ ہو سکا تھا۔ اس نے ربابہ کو بتایا تھا کہ سفید محل میں ہمارے کچھ رشتے دار اور کزن وغیرہ رہتے ہیں۔ میں کبھی کبھی ان سے ملنے وہاں جاتی رہتی ہوں۔ زیادہ تر میں لندن اپنے بچا کے پاس ہوتی ہوں۔ (حالانکہ یہ بات بھی جھوٹ تھی) پھر ربابہ نے اس سے کہا۔

”شیا! تمہارے سفید محل کے متعلق عجیب و غریب کہانیاں اخبارات میں آرہی ہیں۔ تم تو شاید حال ہی میں لندن سے آئی ہو۔ کیا تم وہاں گئی تھیں؟“
 ”نہیں ربابہ۔ اب وہ سفید محل بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن بن گیا ہے۔ اس محل نے

کتنے ہی بے گناہ معصوموں کی قربانیاں لی ہیں۔ ان کی روحیں وہاں بے چین و مضطرب ہوں گی کون ہے وہاں جس کے لیے میں جانی۔ مندریں اجڑ گئیں۔ تخت تاراج ہو گئے اب وہاں خاک اڑ رہی ہے۔“

”مگر شیا۔ وہ لڑکی کون تھی جو دلشاد کے ساتھ لہروں میں گم ہو گئی پھر اس کی لاش بھی نہیں ملی کیوں آخر یہ کیا اسرار تھا؟“

”ارے ربابہ۔ یہ شخص ایک ڈراما تھا خونی ڈراما۔ جو اس لڑکی نے کھیلا تھا۔“
 ”کیسا ڈراما شیا۔ وہ لڑکی کون تھی؟ تم اسے جانتی ہو؟ اس سے آخر اس کا مقصد کیا تھا؟“

”یہ ایک راز ہے ربابہ میں پھر کبھی تمہیں ضرور بتاؤں گی۔“ اس نے آہ بھر کر کہا۔
 ”اگر یہ راز تھا تو کیا اب تک تمہیں کوئی راز داں نہیں ملا جو تمہارے راز کی حفاظت کر سکتا پھر تم اس انکشاف سے ڈرتی ہو اگر ایسا ہے تو یقیناً اس خونی ڈرامے اور سفید محل سے تمہارا کوئی تعلق ضرور ہے۔ تم ان کرداروں کو جانتی ہو گی پھر کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گی۔ خواہ تم نے مجھے ابھن میں ڈال دیا۔ تم مجھ پر اعتماد کر کے تو دیکھو۔“ دادی حضور نے شکوہ کیا۔

ربانہ کی بات پر شیا نے مسکرا کر کہا۔
 ”تم ٹھیک کہتی ہو ربابہ۔ سچ پوچھو تو میرا دل اس راز کے بوجھ سے پھٹنے سا لگا ہے۔ مجھے مہلت دو۔ میں خود آ کر تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“
 ”کیوں تم کہاں جا رہی ہو؟“

”سفید محل۔“ احانک اس کی آنکھوں میں ویرانی سی اتر آئی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا۔

”کیوں خیر یہ شیا۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔“
 ”ہاں ربابہ۔ وہاں کوئی نہیں مگر میں آخری بار وہاں جانا چاہتی ہوں۔ یہ دیکھنے کہ سفید محل اب تک کیوں کھڑا ہے۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”تمہاری باتیں اپنی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ حالانکہ زبان وہی ہے مگر مفہوم بدل جاتا ہے۔“ ربابہ کی بات پر وہ مسکرائی۔

”آجائیں گی سمجھ میں ساری باتیں میری۔“ وہ کھڑی ہوئی اور اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے تمہارے ساتھ کافی اور بہت اچھا وقت گزارا ہے۔ اس دفعہ البتہ میں تمہیں زیادہ وقت نہ دے سکی۔ میں کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی ہوں۔ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہوں۔“ پھر اس نے ایک لفافہ بیگ سے نکال کر دیا اور بولی۔

”اسے پورے ایک ہفتے بعد۔ یعنی آج ہی کے دن کھولنا۔ اس سے پہلے نہیں۔“

”کیوں؟ کیا اس میں بھی کوئی اسرار بند ہے؟“ ربانہ نے مسکرا کر لفافہ لے لیا۔
 ”ہاں بہت بڑا اسرار جسے کوئی نہیں جانتا مگر وعدہ کرو پہلے اسے نہیں کھولو گی؟“
 ”ارے بھئی۔ نہیں کھولوں گی پہلے کبھی میں نے تمہاری کوئی بات ٹالی ہے۔ اچھا لو
 تمہارے اطمینان کے لیے اس لفافے کو لا کر میں بند کیے دیتی ہوں۔“ اب تو خوش ہونا؟“
 ربانہ نے اس کے سامنے وہ لفافہ سنگھار دان کی دراز میں لا کر دیا اور شیا کھڑی ہو گئی۔
 ”اچھا ربانہ۔ خدا حافظ۔“ دونوں سہیلیاں گلے مل کر الگ ہو گئیں۔

☆...☆...☆

آج پندرہ سال بعد وہ پھر ان پتھر لیے راستوں پر جا رہی تھی۔ جہاں سے وہ متعدد بار
 ہنستی مسکراتی دلشاد اور دلنواز کے ساتھ گزری تھی۔ یہ راستے اس کے جانے پہچانے تھے یہ
 ہوائیں یہ فضا میں اس کی مزاج شناس تھیں مگر سمندر کی طوفان نے جہاں سفید محل کو مسمار
 کر دیا تھا۔ وہاں ان راستوں کے خدو خال بھی بدل دیے تھے۔ دلشاد اور دلنواز اس دنیا
 سے کیا گئے تھے کہ سفید محل کی رونقیں اس کی خوشیاں اور قہقہے بھی ان کے ساتھ ہی لحد میں
 اتر گئے پھر جلال آفندی اور ملکہ جویریہ کا خاندان اس ویران محل میں رہ کر کیا کرتا۔ انہیں
 بھی آخری بچی چھی زندگی کی بقا اور خوشیوں کی تلاش کے لیے اس اجڑے دیار سے نکلنا
 پڑا۔ انہیں گئے بارہ سال گزرے تھے تب ہی ایک رات بڑا شدید سمندری طوفان آیا
 موجیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ سمیٹا ہوا سمندر لگ رہا تھا کہ پورے شہر کو اپنے
 اندر اتار لے گا لیکن قدرت کا یہ عقاب شاید سفید محل پر اترتا تھا اس نے محل کی اینٹ سے
 اینٹ بجا دی تھی۔ اور آس پاس کا پورا علاقہ تہ آب آ گیا اور اب وہاں سفید محل کی جگہ
 صرف کھنڈر باقی رہ گیا تھا۔ ویرانی اس قدر تھی کہ لوگ ادھر جاتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔
 ماہی گیران کی بستیاں بھی دور چلی گئی تھیں اس حدود سے نکل گئی تھیں۔ رشنا آہستہ آہستہ
 ان ٹوٹے پھوٹے پتھروں کو روندتی اپنی سوچوں میں گم چلی جا رہی تھی۔ اس کی سماعت میں
 دلشاد دلنواز اپنی کزنوں ماں دادی بچی تانی سب کی آوازیں اور قہقہے گونج رہے تھے۔
 سفید محل کے باغ باغے اور گلستان لہر لہر کرتے تھے خوشبو میں پھیلی ہوئی تھیں اور ہرے
 لال پیلے گلابی رنگوں کے آنچل محل کی راہدار یوں پر لہر رہے تھے باغ کے جھروکوں سے
 مسکراتے ہوئے حسین چہرے جھانک رہے تھے۔ پائے وہ پریاں کہاں اڑ گئیں وہ جنت
 کہاں گم ہو گئی وہ چاندنی راتیں وہ باتیں وہ مسکرائیں کہاں چلی گئی تھیں۔ سماعت سے
 آوازیں مٹ کر رہی تھیں کبھی دلشاد کی کبھی دلنواز کی کبھی اس کی سوتیلی ماں ماہ رخ کی تانی
 ناز پرور اور کسی لمحے بن تاج کی ملکہ جویریہ دادی حضور کی۔ آہ میں کس قدر بد نصیب لگی کہ

میری خود غرضی اور انتقام کی آگ نے بسی بسائی دل کی بستیاں آن کی آن میں خس
 و خاشاک میں بدل دیں۔ اس کا دل ماتم کر رہا تھا۔ پورا وجود چیخیں مار رہا تھا اور رو رہا تھا۔
 اس وقت اس کے اندر شدید توڑ پھوڑ مچی ہوئی تھی مگر وہ ہونٹوں پر مہر لگائے خاموشی کی
 چادر اوڑھے چلی جا رہی تھی۔ اسے وہ جگہ بھولی نہیں تھی۔ جہاں سے اس نے دلشاد کو
 دھکا دیا تھا اور جہاں سے ماہی گیروں نے اسے کھینچ کر کار میں ڈالا تھا۔ آج وہ اسی جگہ اسی
 راستے اپنے محبوب کے پاس جانا چاہتی تھی۔ حالانکہ وہ جگہ کافی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی لیکن
 راستے سمٹ گئے تھے فراز نشیب میں بدل گئے تھے۔ وہ بڑے آرام سے ایک بڑے سے
 اونچے پتھر پر بیٹھ گئی۔ سامنے حدنگاہ تک بھرتا ابلتا شور مچاتا سمندر تھا اس کی اونچی اونچی
 لہریں تھیں۔ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہی تھی اور انہیں مخاطب کر کے
 کہہ رہی تھی۔

”سنو سنو۔ آج میں تمہاری مہمان بننے والی ہوں۔ دیکھو میزبانی میں کوئی کسر نہ
 اٹھا رکھنا۔“ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی پھر اس نے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ دلشاد سمندر کے
 درمیان کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکراتی کہ ”شاید تم میرا انتظار کر رہے ہو۔ دیکھو میں آ گئی
 ۔ تم سمجھتے ہو گے کہ محبت میں ناکام ہو کر میں صرف مارنا جانتی ہوں۔ مرنا نہیں جانتی۔ نہیں
 دلشاد۔ جو محبت کرتے ہیں وہ کسی طوفان سے نہیں ڈرتے۔ آج میں تمہیں مرکز بھی
 دکھا دوں گی۔ میرے سینے پر بڑا بوجھ ہے۔ یہ زندگی مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔ ہر
 گھڑی مجھے ضمیر کی عدالت میں کھینچتی ہے۔ مر مر کر جینا نہیں چاہتی اور تم سے دور بھی نہیں
 رہ سکتی۔ یہ فاصلے سمیٹ لینا چاہتی ہوں تمہاری روح کے ساتھ میں بھی آسمان پر اڑنا
 چاہتی ہوں۔ برداشت کی حدیں ٹوٹ رہی ہیں دل شاد۔ میں آ رہی ہوں۔“
 پھر اس نے کھڑے ہو کر اونچے پتھر سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ایک زور کا چھپکا کا
 ہوا اور سمندر پھر اسی سکون سے بہنے لگا۔ محبت اور انتقام کی ایک کہانی ختم ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

اس واقعہ کو کئی ماہ گزر گئے تھے رشنا واپس نہیں آئی۔ ربانہ سخت پریشان تھی پھر اچانک
 اسے لفافے کا خیال آ گیا جو شیا سے جاتے ہوئے دے گئی تھی۔ اب اس کے وعدے کی
 میعاد بھی گزر چکی تھی اس لیے ربانہ نے بغیر کسی جھجک کے اسے کھول لیا
 ڈیر ربانہ۔ بہت جیو مگر خوشیوں اور محبتوں کے ساتھ۔

”تم سفید محل کی تقریباً پوری کہانی سے واقف ہو۔ میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا تھا
 سوائے اپنی اصلیت کے۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ بغیر اصلیت جانے کہانی میں تاثر پیدا
 ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اصلیت یہ تھی کہ اس کہانی کا اصل کردار تمہاری عزیز سہیلی تھی۔ یعنی

رشنا عزیز، جو دلشاد سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ شبیا کا تو کردار محض فرضی تھا۔ یعنی شبیا ہمدانی میرے ذہن کی اختراع تھی۔ میری نحوست نے سفید محل کو مسمار کیا۔ اس کے کینوں کو گھر بدر کیا اور دو محبت کرنے والے معصوم فرشتوں کو ان کی جنت سے نکلوا کر انہیں موت کی وادیوں میں دھکیل دیا۔ میں تمہاری سہیلی رشنا نے۔ بہت عرصہ پہلے اپنے صفحہ دل پر یہ ڈراما لکھا تھا پھر وقت آنے پر اسے انجام تک پہنچا دیا۔ لوگ حیران تھے کہ برسوں گزر گئے رشنا کی لاش کیوں سمندر سے برآمد نہیں ہوئی مگر رشنا تو تمہارے پاس شبیا ہمدانی کے روپ میں زندگی کی سوغات لے کر آئی تھی۔ تمہارے گھر آ کر مجھے بڑا سکون ملا۔ میں بچوں کو سفید محل کی کہانیاں سناتی تھی پھر تم نے یہ فرض سنبھال لیا۔ اس طرح میرے بند بوں کو تسکین کا سامان مل جاتا۔ ربانہ مجھے معاف کر دینا۔ اپنی اس گناہ گار سہیلی کی مغفرت کی دعا کرنا جس نے اپنی محبت کو پانے کے لیے تباہی کا یہ راستہ اختیار کیا جو موت کی طرف جاتا ہے۔ میں نے شہرام سے طلاق لے کر اپنا گھر اجاڑا تھا مگر ہائے افسوس کے دلشاد اور دلنواز کو بھی آباد نہ ہونے دیا۔ یہ کیسی محبت تھی؟ میں اب زندہ رہنا نہیں پاہنتی۔ جس جگہ میں نے دلشاد کو پانی میں دھکا دیا تھا۔ مرنے کے لیے میں نے بھی اسی جگہ کا انتخاب کیا ہے جہاں میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردوں گی اور سفید محل کی س پر اسرار کہانی کے ساتھ یہ نحوست بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔

ربانہ کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔ اس کا انجام ربانہ کو رلا رہا تھا۔

”رشنا۔ تمہیں اپنے آپ کو چھپانے میں کتنا ملکہ حاصل تھا۔ تمہارا ظاہر و باطن ایک دوسرے سے کس قدر مختلف نکلا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری دوست باہر سے جتنی نرم و گداز، آبشاروں کا بہتا ہوا ترنم تھی، اتنی اندر سے آتش فشاں۔ خیر رشنا تمہارے ضمیر کی مدالت نے جو سزا تمہیں سنائی۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی سزا نہیں ہو سکتی تھی۔“ ربانہ نے اپنے آنسو پونچھے اور اخبار اٹھالیا۔ اخبار میں سرخی لگی تھی کہ۔

”سفید محل“ کے ڈوبنے والے نوجوان کی سانس لڑکی کی لاش آج پندرہ سال بعد صحیح و سالم ساحل پر پڑی ہوئی پائی گئی۔ خیال کیا جاتا ہے وہ لڑکی حادثے کے وقت روپوش ہو گئی تھی۔ مگر اب اور آج۔۔۔۔۔ اس کی لاش کہاں سے آگئی؟“ ”وہ کیسے ڈوبی؟“

”اسے کس نے ڈبوایا؟“

اس کا عقدہ اب تک نہ کھل سکا۔

”اور یہ عقدہ کبھی نہیں کھل سکے گا۔“ ربانہ نے ایک آہ کے ساتھ زیر لب کہا اور لفافہ بند کر کے دراز میں دوبارہ لاک کر دیا۔